دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

# جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

ستمبر 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

www.digestpk.com

عید مبارک

مدیر اعلیٰ

# چینی نکتہ چینی

عزیزان من... السلام علیکم!

ستمبر 2011ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے... بات ایک دو ماہ کی نہیں... اس دوران میں پوری ایک نسل جوان ہو کر اپنے گھر بار کی ہو چکی... وہ 1985ء کے موسم بہار کا ایک دن تھا۔ کراچی اُس وقت تک واقعی عروس البلاد تھا لیکن شہر کو نہ جانے کس کی نظر لگی کہ پھر اس کی وہ شادابی اور رونق لوٹ کر نہ آسکی جس کی آج تک مثالیں دی جاتی ہیں۔ اُس دن جامعہ کراچی کی ایک طالبہ بشریٰ زیدی بس تلے آکر راہیِ اَجل ہوئی... اس کے بعد شہر میں جو کچھ ہوا وہ ایک تسلسل کے ساتھ آج تک ہوتا چلا آرہا ہے۔

ماتم ہے لوگو ماتم ہے کہ رمضان المبارک کے مقدس و محترم مہینے میں بھی درندہ صفت قاتل انسانی خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ یہ کسی مسلمان کا شیوہ تو نہیں ہو سکتا... کراچی کے پرانے باسی بتاتے ہیں کہ کراچی رات بھر جاگتا تھا، لوگ بے خوف و خطر آدھی رات کو بھی تفریح کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے... اب یہ قصہ کہانی معلوم ہوتا ہے۔ نئی نسل نے کراچی کا وہی روپ دیکھا ہے جو آج نظر آرہا ہے۔ کوئی اجنبی سلام کے لیے بڑھے تو دل دہل جاتے ہیں کہ یہ اب نہ جانے کیا کر گزرے گا...

ماہِ رمضان برکتوں، رحمتوں اور مغفرت کا مہینا ہے لیکن اس شہر نے ان مبارک ایّام میں بھی جو کچھ اپنے اوپر جھیلا ہے، اس کے بیان کے لیے یہ مصرع ہی بہت ہے!

ؔ اک سمندر لہو سے گزرتا ہوا آنکھ تک آگیا

سوچتے ہیں کہ اس برس آپ کو عید پر کیا دیں... عید کی مبارک باد دیں... یا پھر گلے مل کر ان لوگوں کا پُرسہ دیں جو ماہِ رمضان میں شقی القلب لوگوں کے ہاتھوں اپنی جان اور جہاں سے گزر گئے، پیچھے سیکڑوں سوگواروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر... یا خدا! ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔ اپنے بندوں کو رمضان کے مبارک مہینے کا صدقہ سمجھ کر اس عید پر شہر کا دائمی امن بخش دے... آمین۔

آئیں چلتے آپ کی بزم میں اور دیکھتے ہیں کہ آپ لوگ کیا لکھ رہے ہیں ہمیں...

اوکاڑہ سے تصویر العین کی باتیں ”جاسوسی کا ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ انکل ڈاکٹر! آپ نے لڑکی کی آنکھوں میں اتنی اداسی کیوں ظاہر کی؟ البتہ ہونٹ بہت موٹے تھے۔ اس دفعہ صدارت کی کرسی ڈاکٹر نعیم اکبر کے حصے میں آئی۔ ہم آپ کی ٹانگ کی صحت یابی کے لیے دعاگو ہیں۔ صبا گل، ماہا ایمان کی چاپلوسی کرتی نظر آئیں۔ ماہا ایمان! آپ نے ہمیں یاد رکھا مہربانی ہے۔ چینی نکتہ چینی میں سب دوستوں کے تبصرے اچھے اور جان دار تھے۔ نکتہ چینی کی محفل کے بعد ہمیں للکار نے پکار لیا اور وہاں پر عمران کا ماضی ہی چل رہا تھا۔ گرداب میں بھی کہانی آگے نہیں بڑھی۔ ہمیشہ کی طرح کاشف زبیر کی کہانی زبردست تھی۔ جانسن نے ثابت کر دیا کہ اپنے خاندانی پیشے کے جراثیم اس کے خون میں بھی شامل ہیں۔ محی الدین نواب کی کہانی کے دوسرے حصے کا انتظار رہے گا۔ دیکھتے ہیں کہ عینی کے ملتی ہے۔ ویسے ہیرو تو بلال کو دکھایا گیا ہے، میرے خیال میں تو اسی کے حصے میں آئے گی۔ ٹائمنگ کی زیادتی، کاموں کے بوجھ کی وجہ سے ابھی باقی ڈائجسٹ نہیں پڑھا۔“







اے بی ملک فرام تلہ گنگ سے لکھتے ہیں ”پچھلے ماہ کے مقابلے میں اس مرتبہ سرورق ذرا بھی متاثر نہ کر پایا۔ خیر اپنی 21 سالہ زندگی کی تاریخ میں دوسری بار اور جاسوسی ڈائجسٹ کے لیے پہلی بار اپنے خوب صورت الفاظ کے موتی بکھیرنے آپ سب کی بزم میں شامل اور مستقل رکنیت حاصل کرنے حاضر ہوا چاہتا ہوں۔ (خوش آمدید) اشتہارات کے صفحات پھلانگتا سیدھا چینی، نکتہ چینی میں پہنچا۔ نوی اے اور ماہا ایمان کے تبصرے سب سے مزے کے ہوتے ہیں لیکن ماہا ایمان! یہ آپ کا نقلی نام ہے نا، اصلی کیا ہے؟ ڈاکٹر نعیم اکبر سحر! آپ ڈاکٹر ہو کر بھی بیمار ہیں۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ ایم اے ہاشمی اور تفسیر عباس! آپ دونوں کے تبصرے، بہت اچھے لگے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے اپنی فیورٹ گرداب میں غوطے لگانے کے لیے کود پڑا۔ (سنبھل کر کہیں...) شکر ہے کشور اور آفتاب کی بچی محفوظ ہے۔ ڈیوڈ کے سامنے چودھری کی تلملاہٹ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ میرے خیال میں اب جمرو اور اسلم کا مقابلہ پھر ہوگا۔ للکار کی قسط بہت سنسنی خیز رہی۔ آہستہ آہستہ عمران کی کہانی پتا چل رہی ہے۔ شاید تابی کی طرح عمران کی محبوبہ بھی گمشدہ ہوگی... جارج گورا اور تابی کی فائٹ کا شدت سے انتظار ہے۔ پہلا رنگ پھیکا پھیکا سا لگا۔ دوسرے رنگ میں کہانی کے اختتامی لمحات ایک انڈین موی سے ملتے جلتے سے لگے لیکن مجموعی طور پر ایک دل کو چھو لینے والی کہانی تھی۔ نواب انکل کی نئی کہانی بھی اچھی تھی۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ کاشف زبیر اور پروین زبیر کا کوئی تعلق ہے؟“ (جی نہیں)۔

عبدالغفور خان کی آمد اٹک سے ”اس ماہ ڈائجسٹ دو چکر لگانے کے بعد 2، 4 پھر تیسرے چکر میں مل گیا لیکن وہ بھی مون سون کی جھڑی لگی ہوئی تھی کہ لے کر آیا۔ ٹائٹل پر نظرِ کرم ڈالی۔ حسینہ خوب صورت انداز لیے ہوئے تھی۔ اس ماہ کی پہلی کہانی محی الدین نواب کی جنگی پڑھی، خاندانی رنجش اور محبت کی کہانی تھی۔ اس کے بعد اپنی سلسلے وار کہانی گرداب پڑھی۔ کہانی میں ماہ بانو اینڈ اسلم پارٹی ڈاکوؤں سے تو نکل گئے ہیں لیکن ابھی پھر مُرات میں گھر چکے ہیں کہانی میں اے سی شہریار اپنا کردار خوبی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔ یہ کہانی اپنے



ایک ہی اور تارہ، سلسلے وار کہانی
کی گہرائیوں کو چھو لینے والی،
ماہنامہ پاکیزہ میں ملاحظہ فرمائیں

وہ صرف دیوانے کا خواب بن گیا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا میں اپنے ملک میں ہوں۔ بس میں نے تو اپنا بوریا بستر لپیٹا اور گھر کی راہ لی کہ اپنا دیس ہو یا گھر اپنا ہی ہوتا ہے جہاں بندہ اپنے آپ کو محفوظ تو تصور کرتا ہے۔ (جی آپ نے بالکل درست کہا۔ اللہ تعالیٰ یہاں کے لوگوں پر رحم فرمائے) اب دوسری بات میں نے ایک کہانی لکھ رکھی ہے۔ میرے اپنے حالات پر مبنی کہانی ہے۔ اگر اجازت ہو تو بھیج دوں۔ کسی اچھے مصنف سے لکھوا کر شائع کر دیجیے تو خوشی ملے گی۔'' (بھیج دیجیے)

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی شوخیاں ''4 اگست 2011ء کو جاسوسی ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں جگمگا رہا تھا۔ ٹائٹل پر نظر دوڑائی تو صنفِ نازک کو دہشت زدہ پایا۔ اتنی گھبرائی ہوئی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح دکھائی دی۔ اُف یہ خطرناک ہتھیار کسی کو اذیت ناک تکلیف سے بچانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ حیرت سے دوسرا مرد منہ کھولے چیخا، یہ کیا کیا تم نے؟ ذاکر صاحب نے واقعی شاہکار ٹائٹل بنایا ہے۔ چٹنی، نکتہ چینی کو مزید میٹھا کرنے کے لیے ایک ہی چھلانگ کافی تھی۔ ہماری انٹری سے مزید مٹھاس بھر جاتی۔ مابدولت کافی عرصے بعد قدم رنجہ فرما رہی ہیں۔ سب ساتھیوں کو سلام اور روزے مبارک ہوں۔ مانسہرہ سے ڈاکٹر نعیم کو کرسیِ صدارت پر بڑے مضبوط انداز میں بیٹھے پایا۔ بھئی اپنی محنت کے بل پر یہ کرسی آپ کو مل ہی گئی۔ مبارک قبول فرمائیں۔ خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آپ لوگوں کے لیے مسیحائی کا کام کرتے ہیں۔ صبا گل نے ماہا ایمان کی صحیح معنوں میں تعریف کی۔ وہ ہیں ہی اس قابل۔ ان کا اندازِ تکلم جداگانہ ہے۔ ذیشان افتخار صاحب! خدا آپ کو اس چنگل سے نجات دلائے اور آزاد فضا میں سانس لے سکیں۔ ہمارے شہر کے باسی نومی اے بھی محفل میں اکثر پائے جاتے ہیں اور محفل کی رونق بڑھاتے ہیں۔ اپنی شوخی تحریر سے لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ سعدیہ ہما شیخ، ثمینہ کوثر لطیف، عبدالرؤف عدم، باقی تمام ساتھی محفل میں آجائیں کہ مابدولت دوبارہ لکھنے میں سرگرمِ عمل ہو چکی ہیں۔ تفسیر عباس! آپ نے ماہا... کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی۔ ہمیں غصہ آرہا ہے بس کر دیں اور آپ نے کسی صنفِ نازک کو نہ بخشنے کی ٹھان لی ہے۔ چاہیے تو یہ کہ صبا گل، ماہا، پامیلا خان، عائشہ رانی اگر سب اکٹھا کر لیں تو دیکھیں یہ صنفِ کرخت کیسے میدان چھوڑ کر بھاگتے نظر آئیں گے، آزما کر دیکھ لیں۔ ہمایوں سعید بھی تفسیر عباس کے رنگوں میں رنگے نظر آئے۔ حسنین عباس بلوچ سرگودھا جیل میں ہیں بڑا دکھ ہوا۔ واقعی ماہا ایمان آپ این جی او سے وابستہ ہیں، اگر ہیں تو ضرور بتایئے۔ پامیلا خان، دلنشین صاحب نے آپ کو سپنے میں دیکھا ہے۔ دلنشین نام بہت پیارا ہے خدا آپ کو صحت عطا فرمائے۔ کہانیوں کی طرف آجائیں۔ خبطی میں چاروں کزن جو ایک لڑکی کے لیے خون ریزی کر رہے ہیں، اسی سے پوچھ لیں تو مسئلہ حل ہو جائے۔ اب تو ایک ماہ انتظار کرنا پڑے گا اگلی قسط کا۔ بھرپور سسپنس کا شاہکار نظر آیا۔ رنگوں میں دوسرا رنگ بے بس اختیار میں جابر کو ظالم اور سفاک دکھایا گیا ہے۔''

ذیشان افتخار عرف عثمانی ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے لکھتے ہیں ''اس ماہ کا شمارہ ماہ مبارک کے تیسرے روزے کو ملا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا، حسینہ سوچوں میں گم تھی۔ محفل میں وارد ہوئے۔ تمام دوستوں کی یادآوری اور حوصلہ افزائی دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ کرسیِ صدارت اس مرتبہ ڈاکٹر نعیم سحر کے حق میں آئی ڈاکٹر صاحب بہت بہت مبارک باد قبول کریں۔ آپ اس بادشاہت کے موزوں حق دار تھے۔ مالاکنڈ سے صبا گل نے اپنی نیک تمناؤں میں یاد کیا بڑی نوازش۔ نومی بھائی نے بہاولپور سے مسکا لگا کے یاد کیا (یونہاں یونہی) شکریہ۔ ایم اے ہاشمی ڈیئر! میں نے حالات کا مقابلہ تو تب سے سیکھا ہے جب میں جھولے میں جھولتا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ کافی کچھ سکھا دیا ہے وقت نے۔ ماہا ایمان جی کی شرارتیں حافظ آباد سے آرہی تھیں۔ آپ اتنی بڑی ہوئی ہیں ابھی تک وہ بچپن کی شرارتیں نہیں بھولیں، یاد آوری کا بہت شکریہ۔ اوکاڑہ سے تفسیر عباس محترم اتنی ڈھیر ساری دعائیں دینے کا شکریہ۔ بنوں سے ہمایوں سعید راج پیارے آپ نے افسوس کا اظہار کیا جو مالک کو منظور ہو اس میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ پامیلا خان بنوں سے یاد کر رہی تھیں۔ پامیلا جی! بے شک آپ نے درست فرمایا کہ ڈائجسٹ جیسی قیمتی چیز میرے پاس ہے جو میری تنہائی دور کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ ٹیلی ویژن ٹرانسسٹر ریڈیو اور بی کلاس جیسی سہولتیں بھی میسر ہیں لیکن پھر بھی بقول شاعر

ہزاروں اسبابِ راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
قفس میں آہی جاتا ہے خیالِ آشیاں اکثر

عائشہ رانی جی آپ واقعی اپنی میٹھی باتوں سے مہارانی ہی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ ماجھاں کا انجام اس طرح کا ہی ہونا چاہیے تھا۔ باقی تابش کی جارج گورا سے فائٹ کا بے صبری سے انتظار ہے۔ عمران گمو کا ماضی بھی کافی دلچسپ ہے۔ گرداب میں چودھری کے اب برے دن آگئے ہیں۔ اپنے شہریار سے اب کافی گھبرایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ماہ بانو بے چاری دکھوں کی ماری کو پتا نہیں کب سکون کا سانس نصیب ہوگا۔ آخری رنگ میں پروین زبیر نے جیل کا نقشہ بالکل صحیح بیان کیا۔ خاص طور پر جیل سپرنٹنڈنٹ کا کردار بالکل حقیقت کی عکاسی کرتا ہے اور قیدیوں کی بے بسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت بخشے، آمین۔''

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی للکاریں ''سرورق پر حسبِ روایت صنفِ دلکش کے ساتھ صنفِ خوامخواہ اور ایک عدد وسیلۂ اجل بھی موجود تھا۔ حسینہ کی آنکھیں تھیں یا جھیل سیف الملوک، نیچے کونے میں ہمایوں سعید راج، تفسیر عباس کو دیکھ کے ڈر سے چیخیں مارتے ہوئے نظر آئے۔ اسی لیے تو کمزور دل حضرات کو خوفناک چیزیں دیکھنے سے پرہیز بتایا جاتا ہے۔ چٹنی، نکتہ چینی جاسوسی کا آنگن ہے۔ اپنے اس آنگن میں جھانک کر دیکھا تو ڈاکٹر نعیم صاحب کو چکراتے ہوئے خاصی خستہ حالت میں پایا۔ موصوف کا تبصرہ اول نہ ہوتا تو میں ان کے تبصرے پر تبصرہ بھی نہ کرتی کیونکہ تبصرہ کرنے لائق کوئی بات ہی نہیں۔ بہرحال دعاؤں کا تحفہ ضرور دوں گی۔ اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے، آمین۔ جاسوسی کے اس پھولوں بھرے آنگن میں ہر طرح کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ماحول بہت شگفتہ تھا کہ اچانک ایک کونے میں نظر پڑی جہاں چنڈال چوکڑی کے نمائندہ خصوصی تفسیر عباس کے ساتھ ایم اے ہاشمی، ہمایوں سعید دھمال ڈال رہے تھے۔ تفسیر صاحب! اپنے تجربات اتنی وضاحت سے نہ بیان کریں۔ ہمیں ویسے ہی یقین ہے کہ آپ عمرِ عزیز کے اس حصے میں ہیں جہاں مصلّٰی ہوتا ہے یا مطالعہ۔ ویسے اس عمر میں بھی آپ کے قابلِ رشک اسٹیمنا کا جواب نہیں۔ پندرہ، بیس سال پرانے ماہناموں میں بھی آپ ایسے ہی بے پرکی و بے تکی بونگیاں مارتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ایم اے ہاشمی! واقعی آپ کے مقابلے میں مجھے گدھا زیادہ عزیز ہے اور آپ جیسے بھوت کی



میں نانی بننے کو تیار نہیں کسی اور سے رجوع کرو۔ ہمایوں سعید! حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے۔ اور ہیرے کی قدر تو صرف جوہری ہی جان سکتا ہے، تم جیسے تو صرف جل جل کے کالے ہو سکتے ہیں اسی لیے تو اکثر مرد حضرات کالے ہوتے ہیں۔ صبا گل! چندا تمہارا اور تمہارے بھیا کا شکریہ۔ یہ سب آپ کا حسنِ نظر ہے۔ پامیلا! ڈیئر جیتی رہو اور خوش رہو اور ایسے ہی ہمیشہ ہمارے تبصرے سے محظوظ ہوتی رہو۔ عبدالعزیز بھائی، آپ دکھوں کے مارے ہوئے کیوں ہیں؟ کسی بھی حال میں صبر اور شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ محمد اسماعیل اجاگر صاحب، پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ بدین سے نوید ساجد ایسی کوئی بات نہیں، بس میں صنفِ کرخت کو خوامخواہ سر چڑھانے کی قائل نہیں اور میں صرف تبصرہ ہی اچھا نہیں لکھتی بلکہ خود بھی بہت اچھی ہوں۔ سمیر الغاری کو ویلکم اور چودھری سسٹرز اتنے عرصے بعد آئیں لیکن انٹری نہیں ملی، صد افسوس۔ نومی صاحب آپ کو بھی زکام ہو گیا اور گدھا میں نے جس کے لیے کہا تھا اسی کے لیے رہنے دو تم نہ بنو تو اچھا ہے۔ طارق سلطان اور شکیل کاظمی کی ذہنی حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہانیوں کی طرف رخ کیا تو طویل انتظار کے بعد محی الدین نواب کی تحریر سے واسطہ پڑا۔ خبطی خاندانی چپقلشوں اور روایتوں میں جکڑی داستانِ عشق پر مشتمل تھی۔ بقیہ کا شدت سے انتظار ہے۔ للکار پڑھی تو عمران کی خفیہ صلاحیتیں آشکار ہوئیں۔ گرداب پر کیا تبصرہ کروں کچھ نیا ہو ہی نہیں رہا۔ اے سی صاحب کو ہلاک کرنے کا واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ چودھری اور ڈیوڈ کی سازشیں بھی نئی نہیں ہیں جس کام کا انتظار ہے وہ تو بالکل نہیں ہو رہا یعنی شہریار اور ماہ بانو کی ملاقات۔ عصرِ حاضر کے بلند اقبال و بلند خیال اور مصنف لازوال احمد اقبال صاحب کا نام دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ احمد اقبال کے ڈائیلاگ وسیع ذہنی کیفیتوں، خیالات، جذبات اور زندگی کے پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ لمحے کا فیصلہ احمد اقبال صاحب کی قلمی صلاحیتوں کا شاہکار ثابت ہوئی۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کی والدہ محترمہ پروین زبیر کا بے بس اختیار بھی ایک عمدہ داستان تھی۔ مصنفہ نے ایک مشکل موضوع کا انتخاب کیا۔ (نام کی مماثلت کے علاوہ کاشف زبیر اور پروین زبیر میں کوئی تعلق نہیں... پروین زبیر ہماری بہت اچھی رائٹر ہیں) مختصر تحریروں میں کاشف زبیر کی تخمل کے کانٹے سب سے پہلے پڑھی۔ جانسن گلیڈن نے بہت جلدی قتل کا معما حل کر کے خود کو اپنے آبائی پیشے کا حق دار قرار دلوایا۔''

فاروق انجم ساحلی کی شکایات لاہور سے ''جاسوسی ڈائجسٹ ایک اچھا اور معیاری جریدہ ہے جس میں لکھنے والوں کو شمولیت کی خواہش ہوتی ہے۔ آپ سے متعدد بار فون پر رابطہ ہوا اور آپ سے کہانیوں کی طرف توجہ کی درخواست کی گئی۔ لیکن ابھی تک نظرِ کرم نہیں ہوئی۔ کچھ شائع نہیں ہوا۔'' (ہمیں یاد ہے... لیکن ہر دفعہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے... آپ ہمیں اپنی کوئی نئی کہانی ارسال کر دیں تو مہربانی ہوگی)

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا چکوال سے لکھتی ہیں ''4 اگست کو افطار سے کچھ دیر قبل ہمارا ڈائجسٹ سے ملن ہوا۔ اشتہاروں کو کراس کر کے اپنی کھٹی میٹھی محفل میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نعیم کو صدری کی اور صبا گل کو وزارت کی گدی مبارک ہو۔ نومی برادر تم سے جلنے کی بو آرہی ہے۔ چلو دل بڑا کر کے ہم کہہ دیتے ہیں کہ تم لوگ بھی شہزادوں سے کم نہیں ہو۔ سمیر الغاری صاحب تینوں کی مت سینو یتا ٹھگ لیں گے۔ ہمایوں سعید صاحب! جب اس محفل میں جنت آدم کو چھیلیں کہا جاتا ہے اس وقت کوئی اشرف المخلوقات کی انسلٹ نہیں ہوتی کیا؟ عائشہ رانی! ہماری رائٹنگ ہے تو بہت اچھی لیکن جب جلدی میں لکھیں تو گزارے لائق ہوتی ہے اور ہاں اپنے تبصرے میں پنجابی کا تڑکا ضرور لگایا کرو۔ کہانیوں کی دنیا میں داخل ہوئے۔ محی الدین انکل کو دیکھ کر تو کسی اور رائٹر کے پاس جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کہانی اتنی زبردست تھی کہ اینڈ پر پہنچے تو جاری ہے لکھا ہوا نظر آیا، تب ہوش میں آئے۔ للکار میں ماجھاں تو ہمیں انڈین فلم کی کوئی وِلن لگی۔ ہیرو بھائی کی آپ بیتی دردناک اور دلچسپ بھی ہے۔ مشروب بہ خون میں کینڈی جیسے غیر حقیقی کرداروں کے بجائے بچھروں اور چمگادڑوں سے بچ کے رہنا چاہیے۔ میز کی چوری اور خواب پریشان دونوں بور تھیں۔ گرداب میں لگ رہا ہے اسلم کی زندگی مشکل میں پڑ گئی۔ ماہ بانو کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں ہے۔''

امریکا سے محمد اسد کی خوب صورت یادیں اور باتیں ''1980ء کے عشرے میں، میں اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد صاحب نے جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ کی SUBSCRIPTION لی ہوئی تھی اور ہر ماہ دونوں ڈائجسٹ ہمارے گھر MAIL سے آتے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے جب بھی ڈائجسٹ گھر آتے تھے تو ہر ایک کو ایک عجیب سی خوشی ہوتی تھی۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ وہ پہلے ڈائجسٹ پڑھے۔ چونکہ میں سب سے چھوٹا تھا، میری باری سب سے آخر میں آتی تھی۔ یہ انتظار بڑا مشکل کام تھا اور خواہش ہوتی تھی کہ کسی طریقے سے میں پہلے ان کو پڑھ لوں۔ جب میری باری آتی تھی تو بہت شوق سے اور مزے سے جاسوسی اور سسپنس پڑھتا تھا۔ مطالعے کا شوق اصل میں یہیں سے پیدا ہوا اور آج تک قائم ہے۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ والد صاحب وفات پا گئے۔ بھائی اور بہن کی شادی ہو گئی اور میں خود شادی کے بعد امریکا آگیا۔ کل رات کو جب میں نے اپنا MAIL BOX کھولا تو جاسوسی کا تازہ شمارہ ملا۔ کچھ دیر لفافے کو ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ وہی خاکی لفافہ جو کہ بالکل بھی نہیں بدلا اور وہی جاسوسی ڈائجسٹ جو کہ بالکل نہیں بدلا۔ اگر کچھ بدلا تو وہ یہ کہ آج مجھے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں سب سے پہلے جاسوسی پڑھوں گا اور کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ جاسوسی کا یہ شمارہ مجھے واپس اسی وقت میں لے گیا جہاں سب سے چھوٹے ہونے کا DISADVANTAGE تھا۔ اس ماحول میں جب ہمارا پیارا پاکستان سخت مشکل وقت سے گزر رہا ہے جاسوسی آج بھی لوگوں میں خوشیاں بانٹ رہا ہے۔ وہ عجیب سی خوشی جو جاسوسی کا ٹائٹل دیکھ کر ہوتی تھی، ویسی ہی قائم و دائم ہے۔ اردو زبان کی خوب صورتی اور جاسوسی میں لکھنے والے مصنف آج بھی لوگوں کو خوشیاں دے رہے ہیں۔'' (آپ کی ذرہ نوازی ہے پسندیدگی کا شکریہ)

اوکاڑہ سے تفسیر عباس کی پھبتیں ''سرورق بس ایویں سا تھا... لہٰذا اسے یکسر نظرانداز کر کے میدانِ کارزار میں پہنچے۔ بہرحال مسندِ صدارت کے لیے مبارک باد اور تہِ دل سے دعا کہ ربِ عظیم آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ مالاکنڈ سے صبا گل... پہلی فرصت میں آنکھوں کا چیک اپ کروا لیں کہ آپ کو خوف صورت نمونے، خوب صورت لگ رہے ہیں یا پھر آپ کے قدیم ترین چشمے کا دھاگا ٹوٹ گیا ہے۔ بونیر سے ایم اے ہاشمی! واہ بھئی، دل خوش کر دیا بھوتوں کا شجرۂ نسب بتا کر... حافظ آباد سے ماہا ایمان! ہاتھ ہولا رکھنے میں ہی آپ کی بہتری ہے کیونکہ یہاں اکثر سے زیادہ بونگیوں کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ آپ کہیں تو ہم آپ کو ہیلتھی ٹی سی ایس کر دیں تاکہ آپ اپنی



www.digestpk.com

چونچ کی نوک پر لگالیں۔ قصور سے علی آتش! ناخن جتنا بھی لمبا ہو آتش پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ٹھٹھہ سے سمیر الغاری! ہوسکتا ہے صبا گل نے آئینہ دیکھ کر چیخ ماری ہو کیونکہ آئینہ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ ڈی آئی خان سے سید عبادت کاظمی! آپ نے ہمیں یاد کیا، پر غور نہیں کیا۔ ہم آپ کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ بنوں سے ہمایوں سعید! آپ نے قوم یاجوج ماجوج کو چھیڑ دیا ہے۔ ہاشمی صاحب کا منہ کھلے نہ کھلے، عائشہ کی چونچ ضرور متحرک ہوگی۔ اٹک سے محمد اسماعیل اجاگر! انکل کو گرما گرم گلاب جامن پسند ہیں ٹھنڈے نہیں۔ اور اپنا نظام ڈاک تو ماشاء اللہ ایسا ہے کہ چشم بدور... بنوں سے پامیلا خان، دلنشین بلوچ نے مذاق کیا اور آپ نے سچ مان لیا۔ ملتان سے عائشہ رانی! آپ کا تبصرہ پڑھ کر ذیشان صاحب کو اپنی دادی کی کوئی سہیلی یاد آتی ہوں گی۔ ویسے یہ ہمارا ایک محتاط اندازہ ہے۔ اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی! دل پہ مت لیجیے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے ہنگاموں میں... بنافس دوراں نواب صاحب کی فیطلی سے کہانیوں کا آغاز کیا۔ ہمارے شہر اوکاڑہ سے ایک محبت بھری دل گداز کہانی... یقیناً کہ یہ شہر محبتوں کا امین ہے۔ موضوع وہی یعنی وجود زن سے پوری کائنات میں جنگ۔ تبصرہ ابھی محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ کہانی ابھی جاری ہے۔ مغل اعظم کی للکار زبردست شاندار... ماجھاں کا عبرت اثر انجام... خس کم جہاں پاک۔ عمران کی روداد نہایت سنسنی خیز اور دلچسپ ہے۔ گرداب بس ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ احمد اقبال کے شبنم فشاں و شربار قلم کا شاخسانہ... لمحے کا فیصلہ دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ اب ایسے مصنف کی تعریف... گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ آغاز تا اختتام تحریر کا تجسس، سنسنی خیزی اور دلچسپی برقرار رہی۔ پروین زبیر کی تحریر کا اکثر ہمیں انتظار رہتا ہے سو اس انتظار کے صبر کا میٹھا پھل اس ماہ بے بس اختیار کی صورت میں ملا۔ کہتے ہیں عورت سب سے بڑا معما ہے لیکن یہاں عمیر ہاشمی معما ثابت ہوئے۔ جمال دستی کے احمق قاتل نے بھی متاثر کیا۔ مختار آزاد کی عبرتناک تحریر زندہ درگور، قوانین قدرت کے مطابق باب ریان مکافات عمل سے نہ بچ سکا۔ نامی اور سیلی بھی فائدے میں رہے۔ سیر ناراض کی مشروب خون نے بھی بور نہیں کیا۔ انسانی خون کی رسیا خطرناک عورت... کینڈی براؤن کے جنون اور مشروب خون نے حیرت زدہ کر دیا۔ میز کی چوری اور خواب پریشاں عام سی تحریریں ثابت ہوئیں۔ محمد عفان آزاد کے انوکھے چوروں نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ انسان محض حصول دولت کے لیے پستی کے تحت الثریٰ تک جا پہنچتا ہے کچھ یہی مکروہ کارنامہ بیلے اور اس کے ساتھیوں نے سرانجام دیا۔ کاشف زبیر کی مخمل کے کانٹے بھی خوب رہی پھر وہی بات کہ عورت ایک معما ہے اور اسے سمجھنا بہت مشکل ہے۔'' (آپ بھی سمجھیں اس بات کو کہ نہ سمجھیں...)

لودھراں سے نازیہ اشفاق کی تحسین ''جاسوسی پڑھتے ہوئے یوں تو کئی سال کا عرصہ ہو گیا ہے اور جاسوسی کی سب سے بہترین کہانی کچھ عرصہ پہلے تک آتش فشاں ہی لگتی تھی، وجدان تو ہیرو تھا ہمارا بھی۔ پھر اس کے بعد طاہر جاوید مغل صاحب نے تو ایک کے بعد ایک شاہکار تخلیق کر کے ہمارے پسندیدہ مصنفین میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ جاسوسی میں بلاشبہ طاہر جاوید مغل میرے پسندیدہ ترین مصنف ہیں اور پھر گرداب بھی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ پاکستان کے حالات کی عکاسی کرتی، حقیقت سے قریب تر ایک خوب صورت تحریر ہے۔ اس کے علاوہ مجھے مغربی کہانیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ مختصر مگر جامع و بھرپور۔ اس دفعہ کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح بہترین تھا اور آخر میں آپ سے ایک درخواست کہ طاہر جاوید مغل تک پیغام پہنچا دیجیے گا کہ لودھراں میں کوئی آپ کی تحریروں کا ڈائی ہارٹ فین ہے۔''

ملتان سے عائشہ رانی کی توضیح ''جاسوسی 4 اگست کو موصول ہوا۔ ٹائٹل نارمل لگا۔ وکٹری اسٹینڈ پر ڈاکٹر نعیم اکبر اپنے خوب صورت انداز کے ساتھ مسکرا کر داد وصول کر رہے تھے۔ نومی اے جناب کس پاکستانی ایکٹریس سے مشابہ تھی وہ حسینہ؟ کہیں آپ کی...؟ محسن علی، خود بھی نہیں دیکھی آپ نے کیا؟ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ایم اے ہاشمی صاحب کو کہیں آپ کو پتا ایڈریس بتا دیں گے، جتنے وثوق سے آپ سے پوچھ رہے ہیں۔ ہاشمی جی ملتان تشریف لائیں آپ کو ملتان کی اسپیشل سوغات گرمی کھلاؤں گی۔ عبدالغفور خان آپ نے چھلانگ تو لگا دی مگر دھیان کیجیے ہمیں کہیں روند کر نہ چلے جائیے گا۔ علی آتش آپ کی آبزرویشن کے تحت میں نے طویل تبصرہ لکھا ہے لیکن اب مدیر اعلیٰ کو دیکھیں کہ کتنی اور کہاں کہاں سے کٹنگ ہونے کے بعد تبصرہ شائع ہونے کا شرف حاصل کرے۔ ایم عزیر اسد! کب تمہارے لیے رسالہ ہیرو ئن نمبر ہوگا؟ سمیر الغاری! بے وقوفیاں رسالے میں پڑھ کر یاد کیجھ کر...؟ سید عبادت کاظمی! شکریہ پسندیدگی تبصرے کا۔ آپ نے تفسیر عباس کو یاد کیا، وہ اپنی تمام تر بے وقوفیوں کے ساتھ آپ کے تبصرے کے عین نیچے حاضر ہیں۔ تنقید برائے تنقید کرنے... نہ کہ تنقید برائے تعمیر کرنے۔

ہمایوں راج، ہاشمی اپنا منہ کھول تو چکے ہیں مگر مانگا بھی کیا ملتان کی سوغات۔ آپ کہیں تو آپ کے جگری دوست کو ملتان کی سوغات گرمی بھجوا دوں؟ اسماعیل عید الفطر کی خوشی ہے۔ گلاب جامن تھوڑے سے اس محفل میں بھی بھجوا دینا۔ یہ بات بھی درست فرمائی۔ ''نوید ساجد زیدی'' نے کہ مغرب پیچیدہ پیچیدہ کیسز کو آسانی سے حل کر لیتے ہیں۔ وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے رائٹرز زیادہ خاندانی دشمنیوں یا کرنٹ افیئرز پر لکھتے ہیں ورنہ ان میں خداداد صلاحیتیں بے حد ہیں۔ سید شکیل کاظمی! اتنی ناراضی جاسوسی کے ساتھ اچھی نہیں... اس کے بعد کہانیوں کی طرف قدم رنجہ فرمائیے۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اتنی زبردست کہانی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ راجا کا کردار دلچسپ لگا۔ بہت زبردست خصوصیت دیکھی ہیرو بھائی میں... شبانہ کی کہیں موت واقع نہ ہو جائے خدشہ ہے۔ پہلا رنگ لمحے کا فیصلہ نہایت عمدہ اسٹوری رہی۔ ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جو فیصلہ کرنے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے اور وہ فیصلہ زندگی بھر کا میابی کا فیصلہ بن جاتا ہے۔ دوسرا رنگ نہایت زبردست تھا۔ واقعی دل چاہا کہ اس کی مصنفہ کو گلے لگالوں۔ مبارک باد... اتنا اچھا موضوع تلاش کر کے اس پر کہانی لکھنے کی۔ بدلہ کہانی نارمل درجے کی تھی، ہر کوئی پیٹر کی طرح نہیں ہوتا بس کام سے عشق کرنے والا۔ احمق قاتل میں اپنے نظریات کے باعث ہی اپنی سابقہ بیوی کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ رینجر کا کردار پسند آیا۔ زندہ درگور ایک بدلے کی کہانی تھی۔ دنیا مکافات عمل ہے وہ خود بھی زندہ درگور کر دیا گیا۔''

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی فرمائش ''روزے میں دو تین چکر لگا کے جاسوسی ملا۔ حسینہ اچھی نہیں تھی اور نہ ہی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ (وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کا روزہ خراب ہو) محفل میں گئے تو ڈاکٹر نعیم صاحب کو تخت نشین پایا۔ آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ صبا گل! کیا آپ نے ماہا ایمان کو دیکھا ہوا ہے؟ نومی اے جی! آپ کو انڈین ایکٹریسوں کے نام یاد ہوں گے نا! ایم اے ہاشمی! کیا خوب شعر آپ نے لکھا ہے۔ میم ماہا ایمان! ڈوبتے ہوئے لوگوں کے تاثرات دیکھ کر آپ کو ڈر نہیں لگا؟ بڑی بہادر ہیں آپ تو۔ سید عبادت کاظمی



صاحب! ڈیرہ اسماعیل خان کیسا ہے یار؟ تفسیر عباس صاحب! آپ کو پتا تو ہے وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی پھر بھی آپ مذاق سے باز نہیں آتے۔ ہمایوں سعید جی! بس اس بار وہ آپ ہی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ میم عائشہ رانی بلکہ مہارانی صاحبہ ہمیں ایک اور بات کا بھی پتا چلا ہے کہ آپ غالباً کسی دور میں پڑھتی بھی رہی ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے (ہاہاہا) سب سے پہلے فیطلی پڑھی۔ عینی کا حصول، اس کے کزنز کی لڑائی اور ایکشن مزے دار ہے۔ تاہم اس بار نواب انکل نے اپنے مخصوص اسٹائل سے تھوڑا ہٹ کر لکھا ہے۔ پہلا رنگ زبردست تھا۔ احمد اقبال کافی عرصے بعد آئے اور چھا گئے۔ لمحے کا فیصلہ میں ڈاکٹر شیرازی جیسے لوگوں کا ایسا ہی حال ہونا چاہیے۔ شہر بانو کا انجام برا ہوا۔ وہ ایک بد کردار عورت تھی، اس کا یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ ایک فرمائش ہے۔ نواب انکل جلد از جلد کوئی نئی قسط وار کہانی شروع کریں اور وہ جاسوسی میں ہو تو اور بھی مزہ ہے۔''

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی پسندیدگی ''ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد سوچا محفل میں حاضری دی جائے۔ جاسوسی کا ٹائٹل شمارے کے شایان شان ہے۔ دیکھ کے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ٹائٹل جاسوسی کا ہے۔ حسینہ کی خوابیدہ آنکھیں اور بھرے بھرے لب بہت پرکشش ہیں تاہم ولن نے ہمیشہ کی طرح منہ پھاڑا ہوا ہے۔ کرسی صدارت ڈاکٹر نعیم کے حصے میں مگر ڈاکٹر صاحب تو خود مریض بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خیریت تو ہے، کہیں کسی مریض کو ٹانکیں تا کیں فٹ کرنے کے نتیجے میں ٹانگ میں فریکچر تو نہیں کروا بیٹھے؟ نومی اے! اس عمر میں کیوں ضعیف دماغ پر زور دے کر ایکٹریس کے نام یاد کرتے ہو۔ خوامخواہ اگر... عبادت کاظمی! تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بہت چھوٹا تھا۔ ماہا ایمان، پامیلا خان دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ محی الدین نواب فیطلی لائے جو کہ خاص پسند نہیں آئی۔ کہانی میں کئی جھول تھے، دل و دماغ الجھ گئے۔ بہت عزیز بلکہ ہر دلعزیز مصنف کی للکار پڑھی۔ عمو کی داستان جاری ہے، بار بار آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ گرداب میں بہت سستی آگئی ہے جو دم خم پہلی اقساط میں تھا، وہ نہیں رہا۔ کہانی یکسانیت کا شکار ہے۔ پلیز اسما قادری صاحبہ! اس میں پہلے والی روانی اور دلچسپی پیدا کریں۔ اس ماہ جو کہانی نمبر لے گئی، وہ پروین زبیر صاحبہ کی بے بس اختیار ہے۔ جیسے جیسے کہانی پڑھتی گئی، تصور میں حسنین بلوچ اور ذیشان تھے۔ پہلی سطر سے لے کر آخری تک کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ آنسو تواتر سے بہتے رہے۔ یہ آنسو عمیر ہاشمی کے لیے بھی تھے تو کرن کے لیے بھی تھے۔ جیلر جابر کے لیے تھے تو زونی کے لیے بھی تھے۔ نذیر چاچا کے لیے بھی تھے تو ثریا کے لیے بھی۔ پروین زبیر صاحبہ اتنی حساس اسٹوری کے لیے بہت تھینکس۔''

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی باتیں ''سرورق پر نظر پڑتے ہی ہم قائل ہو گئے معراج انکل اور ذاکر انکل کی دوستی کے۔ اب دیکھیے نا، ذاکر انکل کے کسی شریر بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی نے ان کے شاہکار کے بیچوں بیچ ڈیڑھ انچ چوڑی پٹی اڑا دی۔ دوسرا شاہکار بنانے کا ٹائم نہیں تھا سو اسی کو لے کر معراج انکل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے فراخ دلی سے نہ صرف اس کو قبول کیا بلکہ جوں کا توں چھاپ بھی دیا۔ دوستی ہو تو ایسی۔ سیدھے محفل کی جانب دوڑے۔ سحر خیز ڈاکٹر صاحب کی سحر خیزی رنگ لائی اور محفل میں سب سے پہلے پہنچے اور سیدھے کرسی صدارت میں لیٹ گئے۔ ماہا جی! متاثر تو ہم ویسے بھی ہیں لیکن آپ کی خود اعتمادی اور خود شناسی اور متاثر کر رہی ہے۔ ویسے آپ کے رخ روشن نے تو حافظ آباد میں کافی حد تک لوڈشیڈنگ کا ازالہ کر لیا ہوگا؟ کاظمی صاحب! بڑے بڑے ڈائجسٹوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں، جانے دو نا یار۔ نومی جی! آپ تیمور اور شامی کے کارنامے سے کیسے مستفید ہوئے، وضاحت فرمائیے۔ صبا جی! کسی لڑکی کے منہ سے کسی لڑکی کے لیے اتنی تعریفیں؟ یا اللہ کیا ہو رہا ہے اس دیس میں۔ معصوم عمو کے حالات جاننے کے لیے ہم اتنے بے چین تھے کہ ڈائریکٹ للکار سے آغاز کیا۔ اف اتنے ناموافق اور نامساعد حالات اور ذہنی اذیتوں کا شکار عمو نس مکھ اور زندہ دل عمران کیسے بن گیا۔ یقین نہیں آتا۔ گرداب میں اپنے اے ای صاحب پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان ہے جب ہی تو چودھری خبیث عالم کے ایک اور وار نے بھی انہیں بال برابر نقصان نہیں پہنچایا۔ چودھری کی پے در پے ناکامیاں ہمیں روحانی لذت فراہم کر رہی ہے اور اپنی ماہ بانو نہ جانے کب سکھ کا سانس لے گی۔ یہ تو شاید خود اسامی کو بھی نہیں معلوم۔ ابتدائی صفحات کی کہانی نواب صاحب کے مخصوص فارمیٹ سے خاصی مختلف تھی۔ نواب صاحب کی کہانی دھیرے دھیرے اسپیڈ پکڑتی ہے اور اتنے خوب صورت انداز میں جوبن پر آتی ہے کہ قاری اس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ یہاں تو پہلے ہی صفحے سے جاری ایکشن نے ہمیں اٹین شین بیٹھے رہنے پر مجبور رکھا۔ دونوں رنگ فلیش بیک پر مبنی تھے۔ لمحوں کا فیصلہ میں غلام علی کا فیصلہ جو انہوں نے لمحوں میں کیا ہمیں بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ اگر وہ شیرازی کے بجائے علی مراد کو ڈھیر کرتا تب اچھا ہوتا۔ پروین زبیر کی بے بس اختیار حد سے زیادہ پسند آئی۔ جابر پر جابر ہونے کے باوجود بے پناہ ترس آیا۔ جب دل جلتا ہے اور روح پر لگے زخم خون اگلتے ہیں تو اس کا نتیجہ یقیناً دوسروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ عمیر علی اور ان کی بیوی کے چٹان جیسے حوصلوں نے متاثر کیا۔ احمق قاتل اور میز کی چوری پڑھ کے نہ جسم میں سنسنی ابھری اور نہ دل میں کچھ کچھ ہوا۔''

ان قارئین کے نام جن کے نامے شامل بزم نہ ہو سکے۔

سمیر الغاری عرف سومی، ٹھٹھہ۔ اختر عباس تھراج، کبیر والا۔ ملک امتیاز اعوان، ضلع خوشاب۔ جویریہ خاتون، ضلع جہلم۔ عمران اسلم شیخ، پشاور۔ محمد اقبال بھٹی، قصور۔ منور خان، ضلع و تحصیل کرک۔ عبدالعزیز خان سکھوی، تحصیل و ضلع میانوالی۔ ساحل دعا بخاری، اوکاڑہ۔ سرمد مشتاق، کوٹلی آزاد کشمیر۔ سفیان ہاشمی، کراچی۔ قدرت اللہ نیازی، خانیوال۔ ارشاد حسین، ضلع خوشاب۔ احتشام احمد احسان، صفدر آباد۔ حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ محمد طاہر شاہ، گوجرانوالہ (کہانی مل گئی)۔ ملک عتیق مظہر، گجرات۔ جمیل صدیقی، چوک سرور شہید۔ جان جاناں، چارسدہ۔

## انتقال پرملال

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے جنرل منیجر اور مشہور کہانی کار جناب اقلیم علیم کی والدہ ۱۵ رمضان المبارک کو مختصر علالت کے بعد رحلت فرما گئیں... انا للہ و انا الیہ راجعون ۰ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک بار سورہ فاتحہ ضرور پڑھیں...



www.digestpk.com

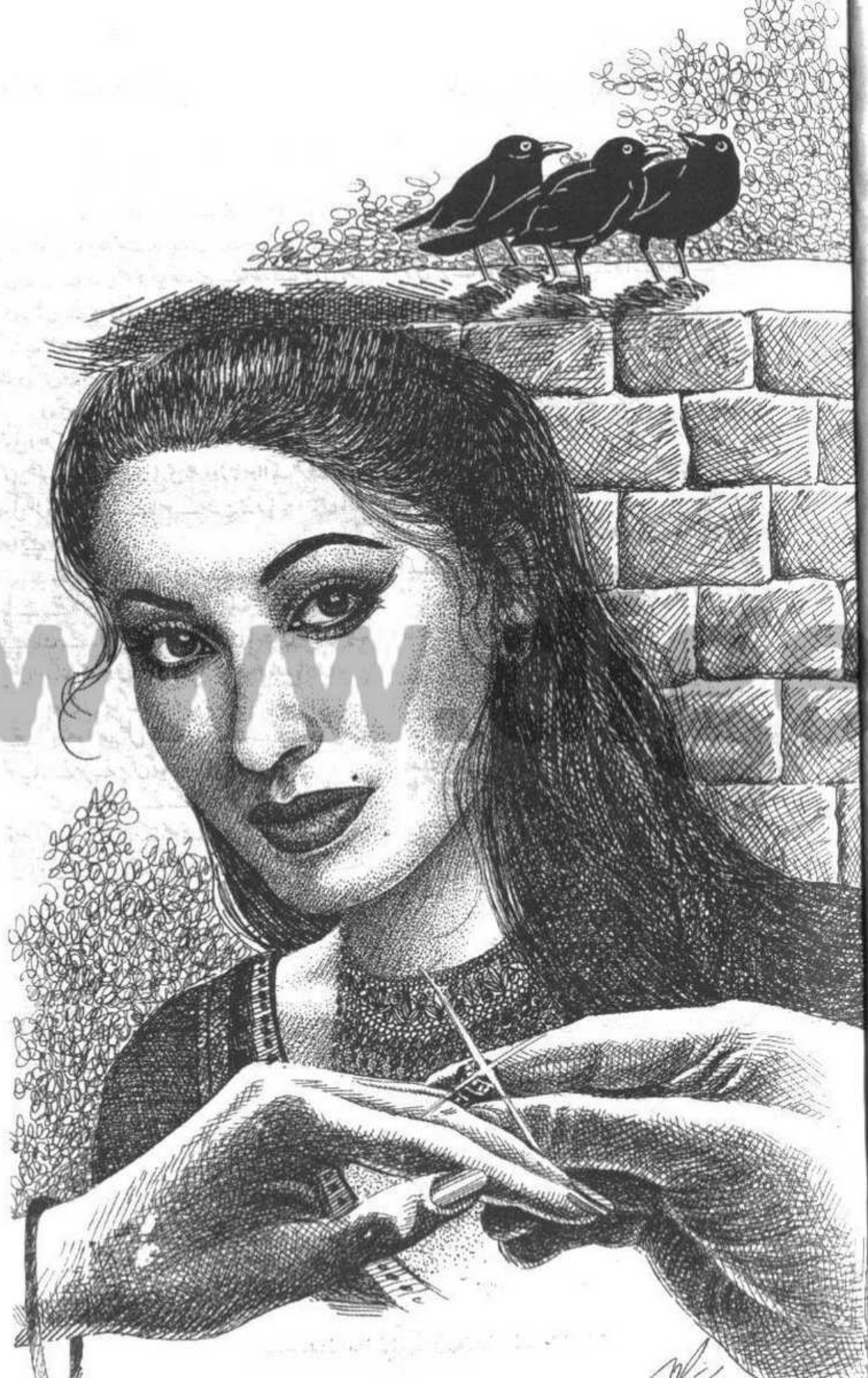

# خبطی

محی الدین نواب

**طویل انتظار کے بعد محی الدین نواب کی اولین صفحات پر رونق افروزی**

دل خواہشات کا مسکن ہے--- بقول کسی کے--- خواہشوں کو پیدا نہ ہونے دو--- ورنہ تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے--- مگر ہر دل میں خواہشات جنم لیتی ہیں--- امنگیں آرزوئیں پنپتی ہیں--- جب آرزو کی کونپل پھوٹتی ہے تو--- انسان چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح تکمیل تک ضرور پہنچے--- اس کے حصول میں قدرت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے--- لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواہش کے پورے نہ ہونے کی راہ میں انسان خود حائل ہو جاتا ہے--- ہزار کوششوں کے باوجود تشنہ کام رہتا ہے--- ایسے دل والوں کی داستان جن کی بے کلی اور بے قراری کا سبب صرف ایک ہی ہستی تھی--- وہ سب انتظار اور انتخاب کے کڑے پیمانے میں جھول رہے تھے--- اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ مسلسل انتظار کس خوش نصیب پر ختم ہوتا---

**خاندانی الجھاوؤں اور روایات کے شکنجے میں جکڑی داستان عشق**

اس کی بات سے اور لہجے سے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ باتھ روم کے باہر اچھی خاصی تعداد میں بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے تولیے سے بدن پونچھ کر لباس پہننا چاہا تو وہاں دیوار پر صرف بنیان اور شلوار ہاتھ آئی۔ قمیص غائب تھی۔

میں اس ادھورے لباس کو پہن کر باتھ روم سے باہر آیا۔ وہاں باسو کے ہاتھ میں اپنی قمیص دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ اسے چند بزرگوں کے سامنے ایک چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”بنا ثبوت کے کسی کو مجرم نہیں کہنا چاہیے۔ پہلے اس کی تلاشی لے لو۔“

میں حیرانی اور سوالیہ نظروں سے اپنی قمیص...اور ان بزرگوں کو دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، آخر ماجرا کیا ہے؟ باسو دیوار سے قمیص اٹھا کر انہیں کیوں پیش کر رہا ہے؟ جاکھے کے والد اس قمیص کی تلاشی لے رہے تھے۔

ایسے میں میرا بہنوئی حشمت آگیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ”بڑی گہری نیند میں تھا۔ یہ شور سن کر اٹھنا پڑا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

جاکھے کے والد قمیص کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہی میں پوچھ رہا ہوں، آخر یہ تلاشی---“

میں بولتے بولتے رک گیا۔ تلاشی لینے والا ہاتھ میری قمیص کی جیب سے باہر آیا۔ سب کے سامنے مٹھی کھل گئی۔ پھیلی ہوئی ہتھیلی پر ایک انگوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی تمام افراد کے تیور بگڑ گئے۔ ان میں سے کچھ تو مجھے غصے سے گھورنے لگے۔ کچھ نے منہ سے گالیاں نکالیں۔ میں نے ایک دم بھڑک کر کہا۔ ”زبان کو لگام دو۔ آخر بات کیا ہے؟ یہ انگوٹھی کس کی ہے؟ میری جیب میں کیسے آگئی؟“

میرے سوالوں کے جواب میں ایک نے کہا۔ ”جادو سے آگئی ہے۔“

شکوریا، باسو اور کاچھی گرجتے ہوئے جیسے اچھل کر آئے۔ تینوں نے مجھے جکڑ لیا۔ یہ جانتے تھے کہ میں کسی ایک کے قابو میں نہیں آسکوں گا۔ لہٰذا تینوں زور آزمائی کے لیے آگئے۔

حشمت نے کہا۔ ”میرے سالے کو چھوڑو۔ ہاتھ سے نہیں، منہ سے بات کرو۔“

وہ میری مدد کے لیے آگے آیا مگر کچھ لوگوں نے اسے پکڑ کے مجھ سے دور کر دیا۔ ایسے وقت باسو نے میرے منہ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تو نے جاکھے جیسے بھائی اور دوست

کے گھر میں ڈاکا ڈالا ہے۔"

میں نے تڑپ کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

اس نے کہا۔ "تو نے نئی دلہن کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔۔۔ تھو ہے تجھ پر۔"

اس نے آخ تھو کہتے ہوئے مجھ پر تھوکا۔ میں ایک طرف ہوگیا۔ وہ غلاظت مجھ پر نہیں آئی۔ یہی بے عزتی کیا کم تھی کہ میرے منہ پر تھوکا گیا تھا۔ میرے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔ میں نے پوری قوت سے تینوں کو جھٹکے دیئے۔ وہ اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتے تھے مگر بپھرے ہوئے زخمی اور ضدی شخص کو زنجیروں کے بغیر قابو میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ تینوں زنجیر کی کڑیوں کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئے۔ کوئی ادھر گیا، کوئی ادھر گیا۔ میں نے کاچھی کو ایک گھونسا رسید کیا۔ شکوریا کو ایک لات ماری پھر دوڑتا ہوا ایک طرف پڑی ہوئی لکڑی۔۔۔ اٹھا کر اسے باسو کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

کچھ لوگ مجھ پر حاوی ہونے کے لیے آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن میرے ہاتھوں میں ایک مضبوط لکڑی دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے ذہنوں میں یہی بات تھی کہ میں ایک پاگل اور گناہ گار ہوں۔ اندھا دھند ہر ایک کو مار رہا ہوں۔

وہ تینوں بھاگ کر لوگوں کے پیچھے چھپ کر کہہ رہے تھے۔ "دیکھو! بھید کھل گیا۔ اس کے خلاف ثبوت مل گیا ہے تو یہ مارنے مرنے پر تل گیا ہے۔"

میں نے حملہ کرنے کے انداز میں لکڑی کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔ "یہ تینوں کتے بھونک رہے ہیں اور آپ لوگ ان کی باتوں میں آکر مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں۔ آخر میں نے کیا کیا ہے؟ یہ ذلیل، بدمعاش، دلہن کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھاؤ تو سہی؟"

ایسے وقت جاکھے کے دو ساتھی رائفلیں لے کر آگئے۔ ایک نے فائر کیا۔ گولی میرے قدموں کے پاس فرش کو ایک ذرا ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرے رائفل بردار نے میرا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "لکڑی پھینک کر زمین پر بیٹھ جا۔ نہیں تو گولی سینے کے پار ہوجائے گی۔"

جاکھے کے باپ نے کہا۔ "تو نے گھر کی عزت کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ جاکھے کی وہ بہن تیری بہن جیسی تھی۔ تو نے اس کے ساتھ جیسی حرکت کی ہے، اس کی سزا یہی ہے کہ مار مار کر تیرا قیمہ بنا دیا جائے۔ تیرے گھر والوں کا حقہ پانی بند کردیا جائے۔ آج سے جو بھی تیرے گھر کے سامنے سے گزرے گا، وہ تیرے دروازے پر تھوکتا ہوا جائے گا۔"

میں اتنا شرمناک الزام سنتے ہی لرز گیا۔ چیخ مار کر لکڑی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "آپ کیا ماریں گے؟ میں آپ کی باتیں سن کر شرم سے مرا جارہا ہوں۔ جاکھے کی دلہن میرے لیے چھانو جیسی ہے۔ آپ بزرگ ہیں، آپ کو سوچے سمجھے بغیر ایسی باتیں زبان پر نہیں لانی چاہئیں۔"

شکوریا نے لوگوں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا۔ "یہ انگوٹھی تیرے خلاف پکا ثبوت ہے۔ تو اسے دلہن کے کمرے سے لایا ہے۔"

"یہ انگوٹھی نہ پہلے کبھی میں نے دیکھی، نہ ہی میرے پاس تھی۔ پتا نہیں میری جیب میں کہاں سے آگئی؟ تم لوگ مجھے گناہ گار اور پاگل ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

ایک رائفل بردار مجھے نشانے پر رکھ کر قریب آتے ہوئے بولا۔ "ہم تجھ سے کہہ رہے ہیں۔ زمین پر اکڑوں بیٹھ جا۔ تیری اوقات یہی ہے۔"

میں نے دونوں رائفل برداروں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ "یہ تمہاری اوقات ہوگی۔ زمین پر مجرموں کو اکڑوں بٹھایا جاتا ہے اور میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔"

پھر میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو! وہ کیا کہہ رہا ہے؟"

اس نے بے اختیار اُدھر دیکھا۔ میں نے پھرتی سے بندوق کی نال کو اوپر اٹھا دیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی، گولی چل گئی۔ اگرچہ وہ ہوائی فائر تھا مگر سب ہی اپنی سلامتی کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ میں اسے رگیدتا ہوا دوسرے رائفل والے سے ٹکراتا ہوا ذرا دور تک گیا۔ پیچھے بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ رائفل سمیت وہاں گوبر میں گر کر لت پت ہوگیا۔

میری گرفت میں آنے والا اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر بوکھلا گیا اور ذرا کمزور پڑ گیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے بندوق چھین کر اسے دھکا دیا۔ وہ بھی چیختا ہوا گوبر میں گر پڑا۔

میرے ہاتھ میں بندوق آگئی تھی لہٰذا کوئی قریب نہیں آرہا تھا۔ میں نے پائدان پر پڑی ہوئی دوسری بندوق بھی اٹھالی۔ وہاں سب ہی سہم کر پیچھے ہٹ رہے تھے۔ مگر ان تین دشمنوں کا برا حال تھا۔ وہ اس بھیڑ میں پیچھے جا کر چھپنا چاہتے تھے۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اے! تم تینوں سامنے آؤ۔ ورنہ گولیاں چلاؤں گا تو دوسروں کو لگیں گی۔"



یہ بات سنتے ہی وہ سب اپنی سلامتی کے لیے ان تینوں کو دھکے دیتے ہوئے آگے آنے لگے۔ جاکھا اور اس کے بھائیوں نے ان تینوں کو اپنے حصار میں لے کر کہا۔ "بلال! گولی نہ چلانا۔ پہلے ہماری بات سن لے۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا ہے۔ تم سب کو بتانا ہے کہ یہ میرے خلاف سازش کررہے ہیں۔ ان شیطانوں کے آگے سے ہٹ جاؤ۔"

جاکھے نے دونوں بازو پھیلا کر سینہ تان کر کہا۔ "یہ بھی میرے مہمان ہیں۔ تم بھی مہمان ہو۔ یہاں کوئی کسی کا خون نہیں بہائے گا۔ مجھے امن و امان سے سچی بات معلوم کرنے دو کہ کس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اور میری غیرت کو للکارا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس کا جواب یہی تینوں دیں گے۔ ان سے کہو، یہ سچ بول دیں۔ ورنہ میں انہیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔"

کاچھی نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہم سے چاہے جیسی قسم لے لو۔ ہم نے یہاں بلال کے خلاف کچھ نہیں کہا ہے۔"

شکوریا نے کہا۔ "باسو بھائی نے یہ انگوٹھی بلال کے پاس دیکھی تھی۔ آپ سب نے یہاں آکر دیکھا تو یہ اس کی جیب سے نکلی۔"

باسو نے کہا۔ "جو سچ ہے، وہ سامنے آیا ہے۔ یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "بلال! اگر خود کو ہوش مند ثابت کرنا چاہتے ہو تو کسی پر گولی نہ چلاؤ۔ ہم بزرگوں کو سہولت سے معلوم کرنے دو کہ دلہن کے کمرے میں تم نہیں گئے تھے تو پھر کون گیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "یہ بات دلہن ہی بتا سکے گی۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ نہ اس نے مجھے دیکھا ہے، نہ مجھے الزام دے گی۔ وہ بیچاری کسی کو بھی چہرے سے پہچان نہیں سکے گی۔ صرف یہ انگوٹھی پہچان ہے۔ مگر یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو دلہن کے کمرے سے لائی گئی تھی یا کوئی دوسری ہے؟"

جاکھے نے اپنے باپ سے انگوٹھی لیتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ بلال! یہ ہتھیار بزرگوں کے حوالے کردو۔"

میں نے کہا۔ "سوری۔ جب یہ میرے ہاتھوں میں نہیں تھا، تب تم آئے تھے اور نہ بزرگ حضرات مجھے بچانے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ میری سلامتی اسی میں ہے کہ یہ میرے ہاتھوں میں رہے۔ تم انگوٹھی لے کر جاؤ اور سچ معلوم کرو۔"

جاکھے کے باپ نے کہا۔ "ہم سب وہاں جائیں گے۔"

وہاں سب ہی کہنے لگے کہ ہم بھی جائیں گے، ہم بھی جائیں گے۔

میں نے کہا۔ "جو جانا چاہتا ہے، جائے مگر یہ تینوں میرے نشانے پر رہیں گے۔"

جاکھے نے کہا۔ "نہیں بلال! برسوں سے تم لوگوں کی دشمنی چلی آرہی ہے۔ ہم یہاں سے جائیں گے تو تم انہیں زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

"انہوں نے خود اپنی موت کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ مجھ پر الزام ثابت نہیں ہوگا تو ہر حال میں مارے جائیں گے۔"

ایک بزرگ نے سمجھایا۔ "خدا کرے تم پر الزام ثابت نہ ہو۔ یہ دیکھو کہ باسو نے تم پر الزام نہیں لگایا تھا اس نے جو دیکھا تھا وہ کہہ دیا اور یہ سچ ہے۔ سب نے اس انگوٹھی کو تمہاری جیب سے نکالتے دیکھا ہے۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "اب یہ دلہن کی انگوٹھی ہے یا نہیں؟ ہمیں یہ معلوم کرنے دو۔ مگر باسو، کاچھی اور شکوریا کو مار ڈالنے کی بات نہ کرو۔ تم پاگل نہیں ہو۔ خود کو ہوش مند ثابت کرو۔"

حشمت نے کہا۔ "بلال! یہ ٹھیک کہتے ہیں۔ بندوق سے نہیں، عقل سے کام لو۔ ابھی سارا قصہ معلوم ہوجائے گا۔"

میں نے چند لمحے تک سوچنے کے بعد کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں بھی اس انگوٹھی کے ساتھ دلہن کے سامنے جاؤں گا۔"

باسو نے کہا۔ "وہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھیار دیکھ کر ڈر جائے گی۔ سچ نہیں بولے گی۔"

سب ہی اس کی تائید کرنے لگے۔ ادھر میری پوزیشن ایسی تھی کہ اپنی سلامتی کی ضمانت لیے بغیر وہاں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے رائفل کی نال کو باسو کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تینوں میں سے یہ ایک ضمانت کے طور پر یہاں رہے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں، مجھے سلامتی ملے گی تو یہ سلامت رہے گا۔"

وہ میری یہ بات مان گئے۔ باسو کو میرے پاس چھوڑ



www.digestpk.com

کر جانے لگے۔ خوف کے مارے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''تو پہلوان کہلاتا ہے۔ حوصلہ رکھ اگر گلاب بویا ہے تو ببول کے کانٹے نہیں چبھیں گے۔''

وہ سب قافلے کی صورت میں دلہن کے کمرے میں چلے گئے۔ حشمت ان کے ساتھ تھا مگر کمرے کے باہر ہی رک گیا۔ وہ لوگ آگے بڑھتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اس نے پیچھے رہ کر ادھر ادھر محتاط نظروں سے دیکھا پھر ایک کھڑکی کے پاس آ کر اندر دیکھنے لگا۔ اندر خواتین کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ عینی، چھانو اور میری امی بھی موجود تھیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھیں کہ مجھ پر لگایا ہوا الزام کہاں تک درست ثابت ہونے والا ہے؟

جاکھے نے کمرے میں آ کر اپنی ماں کو انگوٹھی دکھائی اور کہا۔ ''یہ بلال کی جیب سے نکلی ہے۔''

عینی کا دل دھک سے رہ گیا۔ میری امی پریشان ہو کر اس انگوٹھی کی طرف دیکھنے لگیں۔ جاکھے نے اسے دلہن کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''بول وہ یہی لے گیا تھا؟''

دلہن نے سارے زیورات اتار دیے تھے۔ وہ سب سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتی، کتنے زیورات تھے اور منہ دیکھنے والیوں میں سے کس نے مجھے کتنی انگوٹھیاں پہنائی تھیں؟ وہ سب یہاں رکھی تھیں۔ وہ ان میں سے ایک اٹھا کر لے گیا تھا۔''

جاکھے کی ماں نے کہا۔ ''بہو کے اس ہاتھ کی تین انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔ کل چھ تھیں۔ یہاں سرہانے پانچ رکھی ہیں۔ ایک یہی ہے، جو جاکھا لایا ہے۔''

میری امی نے اس انگوٹھی کو ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا تم اس انگوٹھی کو پہچانتی ہو؟ کیا یہاں آنے والا تمہاری بہو کے پاس سے یہی انگوٹھی لے گیا ہے؟''

چھانو نے کہا۔ ''یہاں سب ہی عورتوں نے انگوٹھیاں پہنی ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی کی انگوٹھی گم ہوگئی ہو اور گم ہونے والی انگوٹھی یہی ہو۔''

پھوپھی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور یہ گم ہونے والی انگوٹھی تیرے بھائی کے پاس کیسے پہنچ گئی؟ باتیں بنانے سے بھائی کا گناہ نہیں چھپے گا؟''

عینی پریشان تھی۔ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ اس نے دلہن کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ''رب کا واسطہ۔ ذہن پر زور ڈالو، یاد کرنے کی کوشش کرو۔ بلال کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ تمہاری ایک غلط فہمی اس بے قصور کو لے ڈوبے گی۔''

شکوریا کی بہن نے کہا۔ ''تو کون ہوتی ہے، اس کی طرف داری کرنے والی؟ وہ یہاں نہیں تھا تو کیا تیرے پاس تھا؟''

عینی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''اے اس لڑکے کی نیت ہی خراب تھی۔ صبح میں نے دیکھا تھا، وہ لڑکیوں کے کمرے کے پاس منڈلا رہا تھا۔''

ایک اور خاتون نے کہا۔ ''ہاں میرے چھوٹے بیٹے نے بتایا تھا کہ اس نے چھت پر عینی کا پراندہ پکڑ لیا تھا۔''

شکوریا کی بہن نے عینی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ناں۔ اب کہہ دے یہ سب جھوٹ بول رہی ہیں؟''

ایک اور خاتون نے کہا۔ ''یہاں سب نے دیکھا ہے، دلہن کی منہ دکھائی کے وقت آس پاس گھوم رہا تھا۔ اس کی نیت پہلے سے ہی خراب تھی۔''

ایک اور خاتون نے کہا۔ ''جب سب ہی جانتے تھے کہ وہ پاگل ہے تو اسے شادی میں بلایا ہی کیوں تھا؟''

عینی پریشان ہو کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں نے ایسی شرمناک حرکت نہیں کی ہے۔ میرے خلاف ایسی زبردست سازش کی گئی ہے کہ میں لاکھ قسمیں کھانے کے باوجود جھوٹے الزام سے بچ نہیں پاؤں گا۔

اس کے نتائج سمجھ میں آ رہے تھے۔ جاکھے کے خاندان والے میرے جانی دشمن بن سکتے تھے۔ وہاں اسی وقت فساد برپا ہوسکتا تھا۔ خون کی ندیاں بہہ سکتی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی۔ جھوٹے الزام کے باعث مجھے پاگل وار دا تیا کہہ کر غصے اور جنون میں مبتلا کیا جائے گا تو میں جواباً انتقامی کارروائی پر اتر آؤں گا تو مجھے خطرناک پاگل قرار دے دیا جائے گا۔

وہاں عورتوں کے دو گروہ بن گئے تھے۔ میری امی کی طرف داری کرنے والیاں مجھے بے قصور کہہ رہی تھیں۔ جبکہ مخالفت کرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ اس ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ جو انگوٹھی میری جیب سے برآمد ہوئی ہے، وہ دلہن کی ہے۔ مجھ جیسا ہوس ناک پاگل ہی اس کے کمرے میں آیا تھا۔

عینی کا دل ڈوب رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مجھے ڈوبنے سے کیسے بچائے گی؟ اس پر بری طرح گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے سے باہر آئی پھر حشمت کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا کمرے کے اندر ہونے والی



باتیں سن رہا تھا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ''بھائی حشمت! آپ ادھر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر کیوں نہیں جاتے؟''

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''بس یونہی۔ اندر بہت بھیڑ ہے۔ گرمی بھی ہے۔ تم کہاں جا رہی ہو؟''

''بلال کو یہاں ہونا چاہیے۔ اسے بلانے جا رہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں، وہ کہاں ہیں؟''

''وہ سیڑھیوں کے اوپر ہے۔ ادھر بہت ہنگامہ ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق آ گئی ہے۔ اس نے باسو کو نشانے پر رکھا ہوا ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ دوڑتی ہوئی مکان کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو میں وہاں باسو پہلوان کو نشانے پر لیے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ اسے گولی نہ مارنا۔ ایک تو تمہیں گناہ گار کہا جا رہا ہے اوپر سے قاتل بھی کہلاؤ گے۔''

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح مجھے بندوق کے زور پر بے بس اور مجبور بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب میں نے اپنی سلامتی کے لیے باسو کو یرغمال بنا کر رکھا ہے۔ کوئی مجھ پر گولی چلانے آئے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اس نے باسو کو دیکھا پھر کہا۔ ''ذرا ادھر چلو میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

میں خود اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ باسو کو ایک کمرے میں دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا۔ باہر سے کنڈی لگا دی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسے موقع سے کس طرح فائدہ اٹھائے گا؟

میں عینی کے ساتھ وہاں سے دوسرے کمرے میں آیا۔ وہ بولی۔ ''سب ہی تمہاری مخالفت میں بول رہے ہیں۔ تم غصے اور جنون میں مبتلا ہو کر ایسی ہی حرکتیں کرو گے جیسی باسو کو نشانے پر رکھ کر کر رہے ہو۔ کوئی تمہاری مجبوری نہیں سمجھے گا۔ سب ہی تمہیں خطرناک قاتل کہیں گے۔ تم کتنے لوگوں سے مقابلہ کر سکو گے؟ وہ تمہیں گولی مار دیں گے۔ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ تمہارے گناہ اور پاگل پن کا ثبوت پیش کریں گے۔ یہ بندوق پھینک دو۔ میں جو کہتی ہوں، وہ کرو۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ جو سوچ کر آئی تھی، وہی سمجھانے لگی۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ تم جو چاہتی ہو۔۔۔''

میری بات ادھوری رہ گئی۔ باسو کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ''بچاؤ۔ بچاؤ۔ بچاؤ یہ پاگل کا بچہ مجھے مار ڈالے گا۔ دوڑو۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ مجھے بچاؤ۔۔۔''

ہم تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''چپ ہو جاور نہ سچ مچ مار ڈالوں گا۔''

اس نے کہا۔ ''ابے جا پاگل کی اولاد! تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

میں نے کمرے کی کنڈی گرا کر اسے کھولنا چاہا تو وہ اندر سے بند تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ دروازہ بہت مضبوط ہے۔ جب تک اسے توڑے گا تب تک میری مدد کرنے والے آ جائیں گے۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو مجھے گولی مارنے آ۔ سالے! تیری ماں نے تجھے دودھ نہیں۔۔۔''

وہ گندی باتیں کرنے لگا۔ میں جوش میں آ کر دروازے کو لاتیں مارنے لگا۔ دھکے مار کر اسے توڑنے کی کوششیں کرنے لگا۔ اس نے مدد حاصل کرنے کے لیے پہلے کی طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

عینی دروازے کے سامنے آ گئی۔ مجھے روکتے ہوئے بولی۔ ''طیش میں نہ آؤ۔ اس کی چالاکی کو سمجھو۔ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے، ابھی تم دروازہ توڑ کر اسے گولی مارنا چاہتے ہو۔ میری بات مانو۔ میرے ساتھ چلو۔''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے اس کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ ''عینی! میرے لیے اتنی بڑی قربانی نہ دو۔ تم بدنام ہو جاؤ گی۔''

وہ میرے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے نام سے بدنامی ہوگی تو ہونے دو۔ میرے لیے تو نیک نامی ہوگی۔ مگر میں تمہیں جھوٹے الزام سے ضرور بچاؤں گی۔''

باسو کی چیخ سن کر کتنے ہی لوگ دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ پھر میرے ہاتھوں میں ایک نہیں دو بندوقیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ میں نہتا ہوتا تو وہ مجھے مار ہی ڈالتے۔ میں نے کہا۔ ''باسو خیریت سے ہے۔ مجھے جھلا ثابت کرنے کے لیے خواہ مخواہ شور مچا رہا ہے۔ جاؤ خود جا کر دیکھ لو۔''

وہ سب ادھر دوڑتے ہوئے گئے۔ میں عینی کے ساتھ دلہن کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں پہلے کی طرح عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ میرے ساتھ عینی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ عورتیں طنزیہ انداز میں بہت کچھ کہہ سکتی تھیں مگر میرے



www.paksociety.com

ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ہتھیار بڑے ہی ظالم ہوتے ہیں۔ بڑے بڑوں کی بولتی بند کردیتے ہیں۔

میں نے دلہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی ہے۔ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، نہ اب دیکھ رہا ہوں۔ یہ میرے بھائی جاکھے کی عزت ہے اور میری بہن ہے۔ میں نے کل رات سے آج تک اور اب سے پہلے اس کمرے میں قدم نہیں رکھا۔ یہ سب کچھ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں۔''

ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''خدا رسولؐ کا واسطہ دے گا تو نہ یقین کرتے ہوئے بھی یقین کرنا ہوگا۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''پھر بندوقیں بھی لے کر آیا ہے، جو کہے گا، ہم اسے مان لیں گے۔''

چچی نے کہا۔ ''پھر بھی ہم پوچھیں گے کہ دلہن کی انگوٹھی تیرے پاس کیسے پہنچ گئی؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے عینی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''انگوٹھی دلہن کی نہیں ہے، میری ہے۔''

اس انکشاف پر سب ہی نے چونک کر عینی کو دیکھا۔ پھوپھی نے پوچھا۔ ''یہ تمہاری کیسے ہوگئی؟''

اس نے پوچھا۔ ''آپ کی انگلی میں جو انگوٹھی ہے، وہ آپ کی کیسے ہوسکتی ہے؟''

''اس لیے ہوسکتی ہے کہ اسے میں نے پہن رکھا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میں بھی کل رات اسے پہننے والی تھی۔ بلال مجھے انگوٹھی پہنانا چاہتا تھا۔''

عینی کا باپ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟ بے غیرت! تو ہوش میں تو ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ابو! میں جو کہہ رہی ہوں اس سے صرف میری ہی نہیں، آپ کی اور پورے خاندان کی بدنامی ہوسکتی ہے۔ مگر میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اسے میں نے پہنا نہیں تھا۔ یہ کہہ کر واپس کردیا تھا کہ اسے پہن کر بدنام ہوجاؤں گی۔ بلال نے اسے واپس اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔''

شکوریا نے کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ یہ انگوٹھی اس کی جیب سے نکلی، تب اس نے یہ بات کیوں نہیں کہی؟''

''اس لیے کہ یہ مجھے بدنام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ صرف جھوٹے الزام سے انکار کر رہے تھے۔''

چچی نے پوچھا۔ ''اب تمہیں بدنام کرنے کیوں آیا ہے؟''

''یہ خود نہیں آئے۔ میں انہیں زبردستی لائی ہوں۔ جب یہ مجھے بدنامی سے بچا رہے ہیں۔ خود پر جھوٹا الزام برداشت کر رہے ہیں تو کیا میں انہیں بدنامی سے بچانے کے لیے سب کے سامنے سچ نہیں بول سکتی؟''

پھوپھی نے کہا۔ ''واہ کیا لیلیٰ مجنوں والی محبت ہے؟ مجنوں کے عشق میں لیلیٰ بدنامی کے پتھر کھانے آئی ہے۔''

''جو ایمان والے ہوتے ہیں، وہ سچ کی خاطر سولی پر چڑھ جاتے ہیں۔ مجھے تو صرف پتھر مارے جائیں گے کوئی بات نہیں مگر آپ لوگوں کی سازش اور مکاری یہاں نہیں چلے گی۔''

جاکھے اور اس کے خاندان والے یہ باتیں سن رہے تھے اور آپس میں مشورہ ... کر رہے تھے۔ پھر جاکھے نے کہا۔ ''کوئی لڑکی خواہ مخواہ بدنامی نہیں چاہتی۔ عینی کی بات دل کو لگ رہی ہے۔ اس نے جو انگوٹھی واپس کی تھی، وہی انگوٹھی بلال کی جیب سے نکلی ہے۔''

حشمت پھر کھڑکی کے پاس آگیا تھا۔ عینی کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں بھی اُس پانسا پلٹنے والی کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ابھی کچا چبا جائیں گے۔

جاکھے کے باپ نے کہا۔ ''باسو کی یہ بات بھی درست ہے کہ اس نے بلال کے پاس وہ انگوٹھی دیکھی تھی۔ اس نے یہی سمجھا کہ وہ دلہن کے کمرے سے لائی گئی ہے۔ ہم غلط فہمی کی بنا پر بلال کو خواہ مخواہ پاگل اور گناہ گار کہہ رہے ہیں۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں، اس نے ایسی کوئی شرمناک حرکت نہیں کی ہے۔''

یہ سنتے ہی میں نے آگے بڑھ کر دونوں بندوقیں جاکھے کے باپ کے قدموں میں رکھ دیں۔ کچھ لوگ باسو کو وہاں لے آئے تھے۔ اس نے کہا۔ ''جاکھے! تو نے پہلی رات بھی نہیں گزاری اور یہاں اندھیر ہوگیا۔ کیا تو اس کی گردن نہیں پکڑے گا، جس نے تیری عزت مٹی میں ملا دی؟ یہ ڈاکو تیری غیرت کو نہیں للکار رہا ہے؟''

جاکھے نے کہا۔ ''معلوم تو ہو کہ وہ کون ہے؟ کہاں چھپا ہوا ہے؟''

''عقل سے سمجھو گے تو سمجھ میں آئے گا۔ چور چوری کے مال کے ساتھ پکڑا گیا تھا مگر عینی نے بڑی چالاکی سے اپنے یار کو بچا لیا ہے۔''

عینی کے باپ نے گرج کر کہا۔ ''بکواس مت کر۔ یار ہوں گے تیری بہن کے۔۔۔ میری بیٹی نے سب کے سامنے کہا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس نے بلال کی انگوٹھی قبول نہیں کی تھی۔ واپس کردی تھی اور یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ



رہے ہیں۔''

جاکھے نے کہا۔ ''باسو! تمہاری بلال سے دشمنی چلی آرہی ہے۔ یہاں جو بھی دشمن ہیں، میں ان سب سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں، میرے گھر کو میدانِ جنگ نہ بناؤ۔''

میں نے کہا۔ ''جاکھے! تو میرا بھائی بھی ہے اور دوست بھی ہے۔ میں سب کے سامنے اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جس نے پہلی رات تیرا گھر برباد کیا ہے اور مجھے جھوٹے الزام میں پھانسنے کی ناکام کوشش کی ہے، میں اسے جوتے مارتا ہوا تیرے سامنے لاؤں گا۔ اس کی موت میرے ہاتھوں ... ہوگی۔''

ان تینوں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ حشمت باہر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ضدّی اور سر پھرا ہوں۔ یقیناً سازش کرنے والوں کو اور دلہن کے کمرے میں واردات کرنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

میری امی نے مجھ سے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے تم پر لگا ہوا الزام جھوٹا ثابت ہوگیا۔ دشمنوں کا منہ کالا ہوگیا۔ ہم کالے منہ والوں کو بے نقاب کر کے ہی رہیں گے۔ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں امی! جب تک جاکھا نہیں کہے گا۔ ہم نہیں جائیں گے۔ جنہیں میدان چھوڑنا ہے، وہ جائیں۔''

شکوریا، کاچھی، باسو پھوپھی اور دونوں چچیوں کی حالت قابلِ دید تھی۔ حشمت بھی پریشان تھا۔ وہ اپنے شیطانی مقاصد میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ اندر ہی اندر تلملا رہے تھے۔ یہ خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ میری طرف سے زبردست انتقامی کارروائی ہوگی۔ میں خاموش نہیں رہوں گا۔ اب تو پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاؤں گا۔

☆☆☆

صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ شادی اور خانہ بربادی ایسی ہوئی تھی کہ سب ہی جاگ کر رات گزار رہے تھے۔ شدید سردی کے موسم میں کسی کا گھر جل رہا ہو تو اس کی تباہی پر افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ آگ تاپنے کا بھی مزہ آتا رہتا ہے۔

رت جگے کی ایک اہم وجہ یہی تھی کہ کتنی ہی عورتوں اور مردوں کو مزہ آرہا تھا۔ یہ تجسس باقی تھا کہ دلہن کے ساتھ جو زیادتی ہوچکی ہے، اس کا انجام کیا ہوگا؟

کیا زیادتی کرنے والا پکڑا جائے گا؟ اسے پکڑنے کے لیے کیا کیا جارہا ہے؟

دلہن کورے کاغذ کی طرح آئی تھی، وہ کاغذ میلا ہوچکا تھا۔ کیا دولھا اسے قبول کرے گا؟

اگر قبول نہیں کرے گا تو وہ گھر کی رہے گی، نہ گھاٹ کی، کدھر جائے گی؟ اس کے ساتھ انصاف کیسے ہوگا؟

سب ہی کے ذہنوں میں ایسے بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔ ساری رات جاگنے کے باوجود نیند اس لیے نہیں آرہی تھی کہ ابھی بہت کچھ ہونے والا تھا۔ کیونکہ دلہن کے میکے والے آپہنچے تھے اور بیچاری دلہن اپنی ماں اور بہنوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔

اس کا باپ، تین جوان بھائی اور کئی رشتے دار بندوقیں اور گنڈاسے لے کر آئے تھے۔ بڑکیں لگا رہے تھے۔ گرجتے ہوئے مطالبہ کر رہے تھے کہ مجرم گناہ گار جو بھی ہے، اسے ان کے حوالے کیا جائے۔ وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دیں گے۔ وہ للکارنے کے طور پر رہ رہ کر ہوائی فائر کر رہے تھے۔

مسلسل فائرنگ کے باعث پورے چک میں دہشت پھیل گئی تھی۔ تھانے دار سپاہیوں کے ساتھ آگیا تھا۔ اصل مجرم تک پہنچنے کے لیے لوگوں سے طرح طرح کے سوالات کیے جارہے تھے۔ تھانے دار کی ان تینوں سے خوب بنتی تھی۔ اکثر معاملات میں اور خاص طور پر میرے کسی بھی معاملے میں وہ اس پولیس والے کی مٹھی گرم رکھتے تھے۔

تھانے دار جواد اکبر نے ان تینوں سے کہا۔ ''میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ بلال کو ہوس پرست ثابت کرنے کے لیے جیسی چالیں چلی گئی ہیں اور جس طرح انگوٹھی اس کی جیب میں ڈالی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تم تینوں کی کارستانی ہے۔''

وہ سب کان پکڑ کر توبہ کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''توبہ توبہ۔ ہماری دشمنی اس سے ہے، جاکھے اور اس کی دلہن سے نہیں ہے۔ ہم نے ان کا گھر برباد نہیں کیا ہے۔ اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔''

جواد نے کہا۔ ''ماؤں کی قسم نہ کھاؤ۔ وہ بھی تمہاری سازشوں میں شریک رہتی ہیں۔ جو سچ ہے وہ اگل دو۔ لڑکی والے غصے سے پاگل ہورہے ہیں۔ تم لوگوں کی حرکت سے یہ دوسری بار اس علاقے میں فائرنگ ہورہی ہے۔ مجھے اپنا رازدار بناؤ اور کچھ نہ چھپاؤ۔ بات بگڑنے نہیں دوں گا۔ مک مکا کرادوں گا۔''

وہ کچے کھلاڑی نہیں تھے۔ ایک تھانے دار کو رازدار بنا



www.digestpk.com

کر اس کے تھلے لگنا نہیں چاہتے تھے۔ شکوریا نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''ہم ایک بار نہیں بار بار کان پکڑ کر کہیں گے کہ ہم میں سے کسی نے جاکھے کے گھر نہ گناہ کیا ہے، نہ کرایا ہے۔''

باسو نے کہا۔ ''آپ یہ مان لیں کہ گناہ گار اس انگوٹھی کے ساتھ پکڑا گیا تھا مگر عینی نے بڑی چالاکی سے اسے بچا لیا ہے۔ آپ اس لڑکی کو دھمکی دیں گے، کسی طرح سچ اگلوائیں گے تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ بلال پاگل ہے۔''

جوادا کبر نے کہا۔ ''میں اپنے علاقے کے ایک ایک بندے کو پہچانتا ہوں۔ ادھر کوئی شخص عورتوں کے معاملے میں جنونی اور ہوس پرست نہیں ہے۔ اس دلہن کے ساتھ سوچی سمجھی واردات کی گئی ہے۔ مجھ سے بات چھپاؤ، کوئی بات نہیں مگر میں نے ثبوت اور گواہوں کے ساتھ پکڑ لیا تو سمجھو، آنکھیں پھیر لوں گا، تم لوگوں کے کسی کام نہیں آؤں گا۔ ایک طرف تمہیں قانون کے کوڑے پڑیں گے اور دوسری طرف لڑکی والے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''آپ ہمارے لڑکوں کو خواہ مخواہ ڈرا رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، انہوں نے جاکھے کی خانہ بربادی نہیں کی ہے۔ آپ بلال کے خلاف کارروائی کریں گے تو وہی گناہ گار ثابت ہوگا۔''

پھوپھی میرے خلاف بول رہی تھیں۔ جبکہ مجھ سے جاری رکھی جانے والی دیرینہ دشمنی کے سبب یہ صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ ان تینوں نے مجھے پاگل اور ہوس ناک مجرم ثابت کرنے کے لیے جاکھے کا گھر برباد کیا ہے۔ تھانے دار کو پورا یقین تھا۔ اس نے تینوں سے سچ اگلوانے کی بہت کوششیں کیں پھر ناراض ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

انہیں یقین تھا کہ بھید نہیں کھلے گا مگر میرے چچا یعنی کاچھی کے باپ نے کہا۔ ''پولیس والوں سے نہ دوستی اچھی نہ ہی ان کی دشمنی اچھی۔۔۔۔ تھانے دار مٹھی گرم کرنے آیا تھا، خالی ہاتھ گیا ہے۔ وہ بڑا کائیاں ہے۔ اسے پورا یقین ہے کہ تم لوگوں نے ہی جاکھے کے گھر واردات کی ہے مگر تم بُرے وقت پر کام آنے والے تھانے دار کو اپنا راز دار نہیں بنا رہے ہو۔''

میرے چچا نے کہا۔ ''وہ ہمارا بھیدی بنتے ہی پہلے تو تگڑی رقم وصول کرے گا پھر ہر مہینے آکر پانچ دس ہزار مانگتا رہے گا۔''

شکوریا نے کہا۔ ''ہم نے اپنے خلاف کوئی ثبوت، کوئی کمزوری نہیں چھوڑی ہے۔ وہ خالی ہاتھ گیا ہے۔ ناراض ہو گیا ہے تو ہوتا رہے۔''

میرے پھوپھا یعنی باسو کے باپ نے کہا۔ ''میں تھانے دار جواد کی فطرت کو برسوں سے سمجھتا ہوں۔ وہ بہت کمینہ ہے۔ ہمیں پھانسنے کے لیے کسی طرح کی ہیرا پھیری کرے گا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اس شیطان سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو جائے گا۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''جب ہمارے بچوں نے کچھ کیا ہی نہیں تو وہ ہمارے خلاف کیا کرلے گا؟''

''یہ مت بھولو کہ حشمت ہمارا رازدار ہے۔ ہمارے بہت کام آرہا ہے۔ تھانے دار اسے تاڑ لے گا، اسے کسی طرح پھانس لے گا تو پھر کیا ہوگا؟''

کاچھی نے کہا۔ ''حشمت نادان بچہ نہیں ہے، بہت چالاک ہے۔ تھانے دار کے چکر میں نہیں آئے گا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ بزدل ہے۔ اپنے سالے سے ڈرتا ہے اور اچھا ہے کہ ڈرتا ہے۔ کبھی کسی کے دباؤ میں آکر سچ بولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

چچا نے کہا۔ ''ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ راز کبھی نہ کھلے۔ لیکن اتنی محنت کرنے کے باوجود ہمیں حاصل کیا ہو رہا ہے؟''

چاچی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔۔۔ بلال کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ منتو بھابھی نے سب کے سامنے کہا ہے کہ وہ اصل مجرموں کو بے نقاب کر کے رہیں گی۔''

''انہوں نے ہمارا نام نہیں لیا ہے۔''

''نام نہ لینے سے کیا ہوتا ہے؟ یہاں سب ہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے ہی بلال کے خلاف سازش کی ہے۔''

''ہاں۔ بلال اور منتو بھابھی کے رویے سے تھانے دار اور دلہن کے میکے والے ہمارے خلاف سوچ رہے ہیں۔ ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔''

''وہ تو ہم رہیں گے مگر ہمیں حاصل کیا ہو رہا ہے؟ ہم بلال کو پاگل، جنونی اور گناہ گار ثابت نہ کر سکے۔ اب بھی موقع ہے، ہم اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل سکتے ہیں۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''یہی بات میرے دماغ میں پک رہی ہے۔ یہاں سب ہی اس چور اور گناہ گار کو تلاش کر رہے ہیں۔ اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ وہ انگوٹھی عینی کی نہیں تھی۔ اس نے اپنے یار کو بچانے کے لیے جھوٹ کہا ہے اور کسی طرح اس کا جھوٹ کھل جائے تو بلال کو صرف جوتے ہی نہیں پڑیں گے، بلکہ مار مار کر اس کا قیمہ بنا دیا جائے گا۔''

چچی نے کہا۔ ''دلہن کے ساتھ جو کھیل ہوا، وہ عینی



کے ساتھ ہوتا، اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی جاتیں اور الزام بلال پر آتا تو ہم ہر حال میں کامیاب رہتے۔''

پھوپھی نے تائید کی۔ ''ہاں۔ تب بلال قانونی گرفت میں آتا۔ جیل یا پاگل خانے ضرور جاتا اور عینی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔''

پھوپھا نے کہا۔ ''ہم نے دور تک نہیں سوچا۔ ہمارے دماغوں میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ کسی بھی طرح بلال کو ذلیل کیا جائے۔ ہمیں جلد بازی میں جو سجھائی دیا، وہی کر گزرے۔''

چچی نے کہا۔ ''میں کہتی ہوں، اب بھی موقع ہے۔ دلہن کے میکے والوں سے ملو۔ اسپتال اور ڈاکٹروں کا حوالہ دے کر انہیں یقین دلاؤ کہ وہ پاگل اور جنونی ہے۔ اسی نے دلہن کی عزت خاک میں ملائی ہے۔''

شکوریا نے کہا۔ ''عینی نے ہماری کوششوں کو ناکام بنایا ہے، ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ پھوپھی ٹھیک کہتی ہیں۔ اس لڑکی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔''

باسو نے کہا۔ ''عینی برباد ہوگی تو وہ پاگل کا بچہ غصے سے اور پاگل ہو جائے گا۔ پتا نہیں، وہ میرا ہی دشمن کیوں ہے؟ کئی بار مجھے لہولہان کر چکا ہے۔ کاچھی اور شکوریا سے کبھی نہیں لڑتا۔''

پھوپھی نے بیٹے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''فکر نہ کر۔ وہ کتے کی موت مرے گا۔ اب ایک ہی تدبیر سوچو کہ عینی کو کس طرح برباد کیا جا سکتا ہے؟''

وہ میرا اور عینی کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ میں بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ ان کی سازشوں کا منہ توڑ جواب دوں گا۔ میری طرح کتنے ہی لوگوں کا خیال تھا کہ ان تینوں نے مجھ پر شرمناک الزام لگانے کے لیے ایک کنواری دلہن کی عزت کو مٹی میں ملا دیا ہے۔

لوگ ان کے خلاف سوچ رہے تھے مگر زبان سے کچھ بولتے نہیں تھے۔ اگر میں کسی طرح ثبوت کے ساتھ انہیں بے نقاب کر دیتا تو انہیں ایسی سزائیں ملتیں کہ وہ بری طرح برباد ہو جاتے، کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ زمین جائداد بیچ کر اس علاقے سے چلے جاتے۔ ان سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ جاتا۔

میں نے حشمت سے کہا۔ ''ان تینوں سے تمہاری ملیک سلیک ہے۔ شادی سے ایک رات پہلے تم ان کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔''

وہ گھبرا کر بولا۔ ''ہاں۔۔۔ زمین جائداد کے معاملات میں ان سے بول چال رکھنی پڑتی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو مگر آج کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا انہوں نے میرے بارے میں کوئی بات یہاں پہنچائی ہے؟''

''وہ بھلا کیا بات پہنچائیں گے؟ میں چاہتا ہوں، ان کے اندر سے بات نکالی جائے۔ مجھے بدنام کرنے کے لیے کتنی زبردست سازش کی گئی تھی۔ تم کسی طرح معلوم کر سکتے ہو کہ دلہن کے کمرے میں کون گیا تھا؟''

وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بات سن کر ایسے پہلو بدلنے لگا جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہو۔ میں انجانے میں ایک چور سے کہنے آیا تھا کہ وہ چور کو پکڑنے میں میری مدد کرے۔

وہ بولا۔ ''میں کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟ اگر ان میں سے کسی نے واردات کی ہوگی تو وہ میرے سامنے کبھی سچ نہیں بولیں گے۔''

''ٹھیک ہے کہ وہ نہیں بولے گا مگر ان سے باتیں کرتے رہو گے تو روانی میں کوئی ایسی بات منہ سے نکل جائے گی جو ہمیں اصل چور تک پہنچا دے گی۔''

وہ اپنے اندر کے آئینے میں اصل چور کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم کہتے ہو تو میں ان سے ملوں گا۔ کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں سر کھجاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں دلہن کا نام بھول گیا ہوں۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔۔۔؟''

اس نے کہا۔ ''روبینہ ہے۔۔۔ پر تم نام کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے معلوم تھا پر بھول گیا تھا۔ کل سے سب ہی اسے دلہن دلہن کہہ رہے ہیں۔ بیچاری اب دلہن کہاں رہی؟ پتا نہیں کس کتے نے اسے برباد کیا ہے؟ میرے ہتھے چڑھے گا تو اسے تڑپا تڑپا کرماروں گا۔''

میں اسے دیکھتے ہوئے غصے سے کہہ رہا تھا۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''مجھے دشمن کی طرح غصے سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''میں تمہیں دشمن کیوں سمجھوں گا؟ جسے غصہ دکھا رہا ہوں اسے ڈرنا چاہیے۔ تم یہ بات اپنے اوپر کیوں لے رہے ہو؟''

وہ فوراً ہی چارپائی سے اترتے ہوئے سنبھل کر بولا۔ ''نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ میں مسجد سے نکل کر ان تینوں کے پاس جاؤں گا۔ پر یاد رکھنا، تمہارے کہنے پر ان کے پاس جاؤں



www.pksociety.com

گا۔ ورنہ میری ان سے رشتے داری نہیں ہے۔''

وہ بولتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اکثر اپنے چک میں اور شہر کے تھانہ کچہری میں ان تینوں سے ملتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود احسان جتا رہا تھا کہ میرے کہنے سے ان کے پاس جانے والا ہے۔

ایسے وقت پہلی بار میرے ذہن میں حشمت کے خلاف کوئی بات کھٹکنے لگی۔ میں اس کے خلاف بول رہا تھا جس نے روبینہ سے زیادتی کی تھی۔ ایسے وقت بے خیالی میں حشمت کو غصے سے دیکھ رہا تھا اور وہ گھبرا کر چارپائی پر پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آنے لگی۔

یہ سوال کھٹکنے لگا کہ وہ کیوں گھبرا رہا تھا؟ نماز کا بہانہ کر کے اٹھ گیا تھا۔ جبکہ اذان نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چھانو صحن میں آئی وہاں سے حقہ اٹھا کر لے جانے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''بھائی حشمت کہاں ہیں؟''

وہ بولی۔ ''ابھی تو آپ کے پاس سے گئے ہیں۔ کمرے میں پڑے ہیں۔ حقے کی طلب ہو رہی ہے۔''

''وہ تو مسجد جا رہے تھے؟''

وہ بولی۔ ''یہاں شادی میں آ کر تو جیسے نماز پڑھنا بھول گئے ہیں۔ میں نے پوچھا فجر کی نماز کیوں نہیں پڑھی؟ تو پہلے کہا ناپاک ہیں، پھر کہا، طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں، کچھ پریشان سے ہیں؟''

وہ حقہ اٹھا کر چلی گئی۔ یہ بات میرے دماغ میں پتھر کی طرح لگی کہ وہ صبح ناپاک تھا۔ چور خواہ کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو کسی نہ کسی غلطی یا کوتاہی کے باعث پکڑا جاتا ہے۔ حشمت نے فجر کی نماز نہ پڑھ کر میرے دماغ میں شبہے کی لکیر کھینچ دی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جس کمرے میں جا کر لیٹا تھا۔ اس کے دروازے پر آیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور جلدی سے بولا۔ ''ابھی اذان نہیں ہوئی ہے۔ ذرا کمر سیدھی کر رہا ہوں۔''

میں نے اس کے پاس چارپائی کے سرے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہو؟''

''یہ تم برسوں سے دیکھتے آئے ہو پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی پوچھ رہا ہوں۔ کبھی نماز چھوٹ جاتی ہوگی؟''

''میری کوشش ہوتی ہے کہ ایک نماز بھی نہ چھوٹے۔''

''لیکن آج فجر کی نماز تو نہ پڑھ سکے۔''

اس نے ایک دم سے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے گرجتے ہوئے چارپائی سے اتر گیا۔ ''کیا تم انکوائری افسر لگے ہو؟ وہاں صحن میں بھی ایسی باتیں کر رہے تھے، جیسی وہ تھانے دار جوادا کبر کرتا ہے۔''

''تھانے دار کسی سے دین ایمان کی بات نہیں کرتا۔ میں تم سے نماز کے سلسلے میں بات کر رہا ہوں۔ صرف فجر کی نماز نہ پڑھنے کی بات آئی تو تم ایسے اچھل رہے ہو جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو؟''

''بکواس نہ کرو۔ نہ میں نے کہیں چوری کی ہے نہ کوئی گناہ کیا ہے۔''

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''پھر بھی ناپاک ہو گئے اور نماز نہ پڑھ سکے؟''

وہ چیخ کر بولا۔ ''نماز نہ پڑھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ناپاک تھا اور کہیں سے منہ کالا کر کے آیا تھا۔''

میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''پھر کہاں سے آئے تھے؟''

اسے ایک دم چپ لگ گئی۔ جیسے میں نے اچانک ہی اسے پکڑ لیا ہو۔ چھانو نے آ کر پوچھا۔ ''یہ کس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے؟''

وہ چھانو کے سامنے غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اپنے بھائی سے پوچھ۔۔۔ یہ مجھ پر تھوک رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ میں نے روبینہ کی عزت لوٹی ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' چھانو نے حیرانی اور بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''چور کی داڑھی میں تنکا۔۔۔ میں نے روبینہ کا نام نہیں لیا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ تم کہیں منہ کالا کرنے گئے تھے۔ ناپاکی کی اور بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ تم خود ہی اپنی زبان سے ناپاکی کی وجہ روبینہ کو بتا رہے ہو۔''

حشمت کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے واقعی اسے صرف ناپاک کہا تھا۔ روبینہ کے ساتھ بدنام نہیں کیا تھا۔

چھانو نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ میرے بھائی سے کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ منہ کالا کرنے والی بات کیا ہے؟ آپ کا نام روبینہ کے ساتھ کیوں آ رہا ہے؟''

''میرے ساتھ کیوں اس کا نام آئے گا؟ یہ تیرا بھائی مجھے بدنام کر رہا ہے۔''

میں اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ نظریں چرانے کے



لیے چھانو کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ وہ بولی۔ ''میرا بھائی روبینہ کا نام نہیں لے رہا ہے۔ آپ ہی اس کی بات کر رہے ہیں۔''

''مگر یہ بات ہی کچھ ایسی کر رہا ہے کہ خیال ادھر ہی جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جس نے چوری نہ کی ہو۔ اس کا خیال چوری کی طرف کبھی نہیں جائے گا۔''

اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو دیکھو! یہ مجھے چور کہہ رہا ہے۔''

میری امی نے آ کر کہا۔ ''یہ کیا بحث ہو رہی ہے؟ روبینہ کا نام باہر تک سنائی دے رہا ہے۔ یہ ہمارا گھر نہیں ہے جو چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہو۔''

انہوں نے حشمت سے کہا۔ ''تمہارے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ کس بات پر اتنا چیخ رہے ہو؟''

وہ کیا جواب دیتا؟ الجھ کر رہ گیا۔ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم سب مجھے معاف کر دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ سنو اذان ہو رہی ہے۔ نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رک جاؤ۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میرے اندر ایک پھانس اٹکی ہوئی ہے۔ اسے تم مسجد میں نکالو گے۔''

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''کیسی پھانس۔۔۔؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں مسجد میں جو پوچھوں گا تم اس کا صحیح جواب دو گے۔''

''کیا تم مجھے چور سمجھ کر اقبالِ جرم کرانے کے لیے میرے ساتھ چل رہے ہو؟''

''جب کچھ کیا نہیں ہے تو بحث نہ کرو، چپ چاپ چلو۔''

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ میرے ساتھ مسجد میں چلنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ میں خدا کے گھر میں بیٹھ کر اس سے کیا کہنے والا ہوں؟ جب مصیبت سر پر آتی ہے تو اس سے نمٹنے کا حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بڑے حوصلے سے میرے ساتھ مسجد میں آ گیا۔

وہاں ہم نے مغرب کی نماز ادا کی۔ جب نمازی وہاں سے جانے لگے تو میں نے کہا۔ ''قبلہ رخ بیٹھے رہو۔ خدا دیکھ رہا ہے۔ ہماری باتیں سن رہا ہے۔ اپنے معبود کے سامنے سچ بولو۔ تم نے روبینہ سے زیادتی کی ہے؟''

اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ روبینہ کو میں نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ ایک انگلی سے بھی نہیں چھوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم اسے ابھی اپنی بہن کہو۔''

وہ ذرا ہچکچایا پھر بولا۔ ''نہیں۔۔۔ میں اسے بہن نہیں کہوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''جو سچ ہے وہی بولو۔ اسے بہن کیوں نہیں کہو گے؟''

وہ ذرا دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''خدا کے گھر میں پوچھ رہے ہو۔ سچ سننے سے پہلے وعدہ کرو کہ جو کہوں گا، وہ بات اپنی بہن چھانو سے نہیں کہو گے۔ ورنہ اسے تکلیف پہنچے گی۔ مجھ سے جھگڑا کرے گی۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں، ہماری باتیں اس مسجد سے باہر نہیں جائیں گی مگر گناہ گار ہو تو سزا ضرور ملے گی۔''

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔''

''تو پھر اسے بہن کیوں نہیں کہتے؟''

''وہ۔۔۔ وہ پہلے میری معشوق تھی۔''

میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ان دنوں تمہاری بہن سے میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد میں گھر داماد بن کر وہاں سے تمہارے گھر آ گیا۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔''

''کس بات کا افسوس۔۔۔؟''

''وہ پارسا تھی۔ اس نے کبھی اپنا ہاتھ پکڑنے نہیں دیا۔ کیا یہ افسوس اور دکھ کی بات نہیں ہے کہ سہاگ رات منانے سے پہلے اس کی پارسائی کو خاک میں ملا دیا گیا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ یہ بہت دکھ کی اور بہت افسوس کی بات ہے۔ کیا تمہیں کسی پر شبہ ہے؟''

''جب تم مجھ پر شبہ کر رہے تھے تو مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ سوچ کر تکلیف ہو رہی تھی کہ اصل مجرم پکڑے نہیں جاتے خواہ مخواہ ہم جیسوں پر شبہ کیا جاتا ہے۔''

''ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو سب پر ہی شک کیا جاتا ہے۔ تم روبینہ کے لیے دکھی ہو۔ یہ کوئی نہیں جانتا مگر یوں غصہ دکھاؤ گے تو سب ہی تم پر شبہ کریں گے اور تمہارا محاسبہ کریں گے۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں مجھ سے یہ غلطی ہو جاتی ہے۔



www.digestpk.com

میں روبینہ کے معاملے میں بہت جذباتی ہوں۔ اس ذلیل شخص کو بڑی خاموشی سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ جب تک اسے پکڑ کر سزا نہیں دلاؤں گا، تب تک سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔''

''سب ہی اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے، ان تینوں میں سے ہی کسی نے واردات کی ہے۔ یا پھر اپنے کسی آدمی سے کرائی ہے۔''

میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ''اگر کسی سے کرائی ہے تو وہ کون ہوسکتا ہے؟ اس واردات کرنے والے سے ان کے گہرے تعلقات ہوں گے۔''

وہ میری گرفت میں تھا، پریشان ہوکر بولا۔ ''میرا بازو تو چھوڑو۔''

میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا ہاتھ ہے یا ہتھوڑا؟ شکوریا اور کاچھی کہہ رہے تھے کہ اسپتال کے واش روم میں تمہارا ایک ہاتھ پڑتے ہی باسو خون تھوکنے لگا تھا۔ وہ تینوں تم سے ڈرتے بھی ہیں اور دشمنی سے باز بھی نہیں آتے۔''

''ڈرتے ہیں... اسی لیے دشمنی کرتے ہیں۔ میرا خوف طاری رہتا ہے... اسی لیے مجھے ختم کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔''

جاکھے کی شادی میں بے شمار عزیز و اقارب اور دوست احباب آئے ہوئے تھے۔ سب ہی خاندانوں کے لیے مختلف گھروں میں رہائشی انتظامات کیے گئے تھے۔ وہ تینوں ہم سے دور اپنے بزرگوں کے ساتھ ایک مکان میں تھے۔ حشمت ان سے ملنے چلا گیا۔

وہ میرے رویے سے گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے مسجد میں جھوٹ بول کر بڑی کمینگی سے مجھے ٹال دیا تھا۔ مگر اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے جھوٹ بول کر مجھے پوری طرح مطمئن نہیں کیا ہے۔ یقیناً میں چپ چاپ اس کی ٹوہ میں رہوں گا۔ یہ اندیشہ... یہ خوف اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

ان تینوں نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ کاچھی نے کہا۔ ''میں نے بلال کے ساتھ تمہیں دیکھا تھا، وہ تمہارے ساتھ مسجد جا رہا تھا۔''

حشمت نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ نماز پڑھنے نہیں گیا تھا۔ بس دکھاوے کے لیے سجدے کیے تھے۔ دراصل میری گردن دبوچنے وہاں گیا تھا۔''

وہ تینوں چونک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ باسو نے پوچھا۔ ''تمہاری گردن دبوچنے...؟ وہ بھی مسجد میں...؟ لوگوں نے دیکھا ہوگا؟''

''وہ ہاتھوں سے نہیں، باتوں سے دبوچ رہا تھا۔ سچ اگلوانے کے لیے مجھے مسجد میں لے گیا تھا۔''

شکوریا نے پوچھا۔ ''کیسا سچ؟ کیا اسے شبہ ہوگیا ہے؟''

حشمت نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ویسا شبہ...؟ پتا نہیں، وہ کیسی شیطانی کھوپڑی رکھتا ہے؟ یونیورسٹی سے پڑھ کر آیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیسی ہیرا پھیری سے اس نے مجھے بدحواس کر دیا تھا؟ یاد نہیں آرہا ہے کہ اس نے کیسے بات شروع کی تھی مگر بڑی حد تک جیسے چوری پکڑ لی تھی۔''

وہ سب پریشان ہوکر اس کا منہ تک رہے تھے۔

کاچھی نے کہا۔ ''تم پر شبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعے ہم تک پہنچے گا؟''

باسو نے حشمت کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جو انگوٹھی مجھے دی تھی۔ وہ میں نے بلال کی جیب میں ڈال دی تھی۔ بات کھلے گی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''آگ لگے اس کی جوانی اور پہلوانی کو... میرے بیٹے کو دو بار لہولہان کر چکا ہے۔ مرتا بھی نہیں ہے کم بخت...''

چچا نے کہا۔ ''پہلے حشمت کی بات تو سنو۔ وہ اسے مسجد میں لے جا کر کیا پوچھ رہا تھا؟''

سب ہی اس کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ بولا۔ ''اس نے سیدھا اور صاف سوال کیا۔ پوچھا... بولو کیا تم نے روبینہ کے ساتھ زیادتی کی ہے؟''

چچی نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہائے... کیا اسے پکا یقین ہوگیا ہے؟''

''ہوگیا تھا۔ اسی لیے تو مسجد میں لے گیا تھا۔''

''پھر تم نے اس سے کیا کہا؟''

''کہتا کیا؟ اگر سچ بولتا تو کیا وہ مجھے بہنوئی سمجھ کر معاف کر دیتا؟ وہ تو مجھے بندوق کے نشانے پر رکھ کر سب کے سامنے تم لوگوں کا بھی کچا چٹھا اگلوا لیتا۔ آج تو ہم سب کی شامت آنے والی تھی۔''

اچانک ہی ان سب کا سکون برباد ہوگیا۔ وہ پوری بات سننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''جلدی سے اتنا بتا دو کہ تم نے صاف انکار کر دیا ہے ناں...؟ وہ تم پر یا ہم پر شبہ نہیں کرے گا ناں؟''

''میں نے ایسی باتیں بنائی ہیں کہ اس کا شبہ دور ہو جانا



چاہیے۔ پر اس کے دماغ میں یہ بات پھانس کی طرح چبھی ہوئی ہے کہ ہم چاروں میں سے کسی نے واردات کی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، میں تم تینوں سے ملتا رہوں۔ کسی طرح معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ تم میں سے کس نے روبینہ کو خراب کیا ہے؟''

تینوں ماؤں نے پریشان ہوکر اپنے اپنے بیٹوں کو دیکھا۔ ایک چچی نے حشمت سے کہا۔ ''کرنے والے تو تم ہو اور وہ ہمارے بیٹوں پر شبہ کر رہا ہے۔''

حشمت نے کہا۔ ''ایسا نہ کہو چاچی! یہ تو ہم سب نے کیا ہے۔''

''ہاں۔ مگر روبینہ کے پاس ہمارا کوئی بیٹا نہیں گیا تھا، تم گئے تھے۔''

''میں سب کے مشورے سے گیا تھا۔ شکوریا نے بلال پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ کاچھی جلہ عروسی کے باہر پہرا دے رہا تھا۔ کوئی ادھر آتا، کسی طرح کا خطرہ ہوتا تو یہ سیٹی بجا کر مجھے ہوشیار کر دیتا۔ باسو نے مجھ سے انگوٹھی لے کر بلال کی جیب میں ڈالی تھی۔ یہ واردات ہم سب نے مل کر کی تھی۔''

پھوپھا نے پوچھا۔ ''وہ تمہیں نشانے پر رکھے گا تو کیا تم یہ ساری باتیں اس سے کہہ دو گے؟''

''یہی تو میں کہنے آیا ہوں کہ ایسا وقت نہ آنے دو۔ میں مسجد میں بیٹھ کر جھوٹ بولتا رہا۔ خدا کا خوف نہیں تھا مگر بندوق کے آگے گولی چلنے سے ڈر لگتا ہے اور گولی چلانے والا بلال ہو تو وہ ضرور چلے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا، اس سالے سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟''

''تم اس کے خلاف کتنی ہی وارداتوں میں ہمارا ساتھ دے چکے ہو۔ پر اب تک اس کی زمینوں کا مالک بننے کا خواب پورا نہیں ہوا۔ جب تک وہ سالا زندہ رہے گا، تب تک نہ تمہارے خواب پورے ہوں گے، نہ ہمارا اس سے پیچھا چھوٹے گا۔''

''مشکل تو یہ ہے کہ ہم اسے قتل نہیں کر سکتے۔ سب ہی جانتے ہیں، ہم اس کے جانی دشمن ہیں۔ وہ کسی حادثے میں مارا جائے گا، تب بھی ہم پر ہی شبہ کیا جائے گا۔''

چچا نے کہا۔ ''ہم تو شروع سے یہی کہتے آرہے ہیں کہ اسے مارا نہ جائے۔ کسی طرح پاگل خانے پہنچا دیا جائے۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''اسے پاگل ثابت کرنے کا اچھا موقع ملا تھا۔ اس کا حافظہ کمزور ہوگیا تھا۔ بے تکی باتیں کرتا تھا۔ سب ہی اسے خبطی کہنے لگے تھے۔''

پھوپھا نے کہا۔ ''اب بھی کہیں گے۔ اسے طیش دلایا جائے، جنون میں مبتلا کیا جائے تو وہ ہمیشہ مجنوں ثابت ہوتا رہے گا۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''میں تو ایک ہی بات کہتی ہوں، اس کی لیلیٰ کو اٹھوا لو۔ پھر دیکھو، وہ کیسے انگاروں پر لوٹے گا اور الٹی سیدھی حرکتیں کرے گا؟''

''عینی کو اغوا کیا جائے گا تو اس کا الزام بھی ان تینوں پر ہی آئے گا۔ وہ خرد ماغ ان کے پیچھے پڑ جائے گا۔''

شکوریا نے کہا۔ ''ہم نے طے کیا ہے، اسے اغوا کرانے سے پہلے ہم تینوں لاہور اور اسلام آباد چلے جائیں گے۔ یہاں اسے اٹھوایا جائے گا تو بلال ہم پر شبہ نہیں کرے گا۔ ہمارے پاس ٹھوس ثبوت ہوگا کہ ہم شہروں میں کہاں کہاں وقت گزارتے رہے ہیں، اس طرح ہم قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکیں گے۔''

کاچھی نے کہا۔ ''اس کتیا نے اپنے یار کو بدنامی سے بچایا ہے۔ خود بدنامی سے نہیں بچے گی۔ اسے ایسی جگہ رکھا جائے گا۔ اس کی ایسی درگت بنائی جائے گی کہ وہ توبہ توبہ کرتی رہے گی۔ رحم کی بھیک مانگتی رہے گی۔ پر ہمارے خلاف کچھ بولنے کے لیے زندہ واپس نہیں آئے گی۔''

حشمت نے کہا۔ ''تھانے دار ہم لوگوں سے ناراض ہوکر گیا ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہو۔ روبینہ کے میکے والے آئے ہیں۔ وہ بھی تم تینوں پر شبہ کر رہے ہیں۔ ادھر بلال سے جھوٹ بولنے کے باوجود یہ دھڑکا سا لگا ہوا ہے کہ وہ اب بھی مجھ پر شبہ کر رہا ہے۔ آئندہ میری ٹوہ میں رہے گا۔ میں سوچ رہا ہوں، کچھ عرصے کے لیے یہاں سے چلا جاؤں۔ مجھے فیصل آباد جا کر بھائی کے پاس کچھ روز رہنا چاہیے۔''

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے چلنا چاہیے۔ عشاء کی اذان ہونے والی ہے۔''

باسو اس کے ساتھ دروازے تک آیا پھر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس نے پلٹ کر صحن میں آتے ہوئے کہا۔ ''یہ حشمت ہمارے لیے خطرہ بن گیا ہے۔ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ بلال اپنے بہنوئی پر شبہ کرے گا۔''

چچا نے کہا۔ ''اسے شبہ نہیں، یقین ہے... تب ہی وہ حشمت کو مسجد میں لے گیا تھا۔ پتا نہیں اس نے وہاں کیا جھوٹ سچ بولا ہے؟ کیا بلال اس کے جھوٹ کو سچ مان لے گا؟''

پھوپھی نے کہا۔ ''یہ ابھی خود کہہ کر گیا ہے کہ بلال اس



www.pksociety.com

کی ٹوہ میں لگا رہے گا اور اگر غلطی سے پکڑا گیا تو وہ سالا اپنے بہنوئی کا لحاظ کبھی نہیں کرے گا۔''

''سالے بہنوئی کا سمجھوتا بھی ہوسکتا ہے کہ حشمت اگر سالے کا ساتھ دے اور ہمارے خلاف بیان دے کہ ہم تینوں میں سے کوئی ایک روبینہ کے پاس گیا تھا تو بلال تھانے دار سے مل کر اس بات کو خوب اچھالے گا۔ پھر ہم میں سے کسی ایک کو گناہ گار ثابت کیا جائے گا۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''یہ بات موٹی سی عقل میں بھی آتی ہے۔ حشمت کی جان پر بن آئے گی تو وہ اپنا گناہ ہمارے کسی بیٹے کے سر ڈال دے گا۔ بلال بھی تم تینوں سے انتقام لینے کے لیے بہنوئی کو تمہارے خلاف استعمال کرسکتا ہے۔''

چچا نے کہا۔ ''ہمیں ابھی یہ نہیں سوچنا ہے کہ عینی کو اغوا کیا جائے اور بلال کو پاگل خانے پہنچایا جائے۔ فی الحال ایک سالے نے بہنوئی کو مسجد میں لے جا کر ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اب حشمت کا گناہ ہمارے کسی بھی بیٹے کے سر تھوپا جاسکتا ہے۔''

''اس وقت ہمارے لیے سب سے خطرناک حشمت ہے۔ وہ کسی وقت بھی پٹری بدل کر ہمارے خلاف اپنے سالے کی حمایت حاصل کرلے گا۔''

''لہٰذا جس سے خطرہ ہے، اس سے پہلے نجات حاصل کرنی چاہیے۔''

کاچھی نے کہا۔ ''حشمت کی زندگی ہماری موت ہے۔''

شکوریا نے کہا۔ ''اور اس کی موت ہماری زندگی ہے۔''

چچا نے کہا۔ ''وہ نہیں رہے گا تو تم تینوں کے خلاف کوئی چشم دید گواہ نہیں رہے گا۔''

''آج بلال نے اسے مسجد میں لے جا کر اس کا سختی سے محاسبہ کیا ہے۔ یقیناً اس نے بہنوئی کے جھوٹ کو سچ نہیں سمجھا ہے۔ پتا نہیں وہ آج یا کل تک کیا کر گزرے گا؟''

''وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ بہنوئی کو پہلے قابو میں کرے گا۔ اسے وعدہ معاف گواہ بنا کر سارا راز اگلوائے گا پھر ہم پر چڑھ دوڑے گا۔''

پھوپھا نے کہا۔ ''بلال کو اتنا موقع نہ دو۔ اس سے پہلے ہی حشمت کو ختم کردو۔ وہ ہمارے لیے بہت بڑی مصیبت بننے والا ہے۔''

لوگ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے بہت کچھ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیٹھ موڑ کر جانے والا ان کی باتیں سن نہیں پائے گا مگر حشمت دروازے سے کان لگائے سن رہا تھا۔

اسے مسجد کی طرف جاتے وقت یاد آیا کہ جیب میں چابیاں نہیں ہیں۔ وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں بھول آیا ہے۔ اسے واپس آنا پڑا مگر دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس وقت چچا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت ہمارے لیے سب سے خطرناک حشمت ہے۔ وہ کسی وقت بھی پٹری بدل کر ہمارے خلاف اپنے سالے کی حمایت حاصل کرلے گا۔

چچا کی اس بات نے حشمت کو چونکا دیا۔ وہ وہیں رک کر ان کی باتیں سننے لگا۔ اس کے بعد دوسرے بھی اس کے خلاف بولتے ہوئے اور اس کے قتل کا منصوبہ بناتے ہوئے سنائی دیے۔ جن پہ تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے۔

اس کے دیدے حیرانی سے پھیل گئے۔ جن پر بھروسا کر کے وہ مجھ سے دشمنی کر رہا تھا۔ مجھے پاگل خانے بھیجنے یا مار ڈالنے کی کوششیں کرتا رہا تھا، وہی لوگ اس کی ہلاکت کا فیصلہ کر رہے تھے، بلکہ کر چکے تھے۔ اب کسی وقت بھی موقع پا کر اس فیصلے پر عمل کرنے والے تھے۔

وہ فوراً ہی وہاں سے پلٹ گیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ان لمحات میں وہ بالکل تنہا ہوگیا تھا۔ دوست اچانک دشمن ہوگئے تھے۔

ہم اس کے رشتے دار تھے۔ اپنی چھت کے سائے میں اسے گھر داماد بنا کر اس کی پرورش کر رہے تھے۔ محبتیں دے رہے تھے۔ اس کے عوض وہ میٹھی چھری بن کر ہمیں ہی کاٹ رہا تھا۔ اب نتیجہ اس کے سامنے تھا۔

مگر لوگ برے انجام سے دوچار ہو کر بھی اپنی غلطیوں کو یاد نہیں کرتے۔ یہی کہتے ہیں کہ مقدر کی خرابی تھی۔

حشمت کی بھی سوچ یہی تھی کہ مال و دولت اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے مقابل کو کچلتے ہوئے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اسی سوچ کے مطابق وہ جو کرتا آرہا تھا، وہ اپنے اور بیوی بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ایک طرح کی جدوجہد تھی۔ اپنی بہتری کے لیے جنگ لڑنا اس کا فرض تھا۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔

اب وہ زندگی اور موت کے درمیان آکر اٹک گیا تھا۔ وہ تینوں اپنی سلامتی کی خاطر ہر حال میں اسے موت کا مزہ چکھانے والے تھے اور مجھ سے یہ توقع نہیں تھی کہ میں روبینہ کی زندگی برباد کرنے والے کو معاف کردوں گا۔

وہ جانتا تھا کہ میری بہن چھانو بھی ایسے شوہر پر تھوکے گی۔ اسے گھر سے تو کیا اپنی زندگی سے بھی نکال دے گی۔



# Raigzar-e-Tamana by Maha Malik

6:01 AM , Posted in Maha Malik , Social , 0 Comments

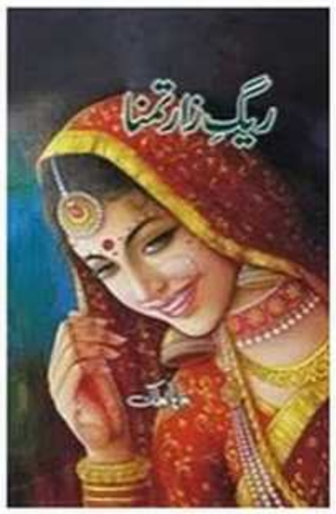


Raigzar-e-Tamana by Maha Malik
Format: PDF
Category: Social
**Download**

Anda mungkin juga meminati:

Jo Chale To Jaan Se Guzar Gay Maha Malik

Bae Faez by Malik Safdar Hayat

Meethi Churi by Malik Safdar Hayat

Aafat Zadi by Malik Safdar Hayat

وہ عیش وعشرت کی زندگی سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ خوب جانتا تھا کہ اپنے رشتے داروں کا محتاج بن کر رہ جائے گا۔ در در کا بھکاری کہلائے گا۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ وہ میرے سامنے امی اور چھانو کے سامنے ایک سعادت مند، وفادار اور سیدھا سادہ سا داماد بن کر رہے۔

ان حالات میں ان تینوں کے خلاف اسے اپنی بقا کی جنگ تنہا لڑنی تھی۔ اس کے پاس ایک رائفل تھی۔ جس سے اس نے پرندے مارے تھے۔ بندے مارنے والا مزاج نہیں تھا۔ میرے مسلح کارندوں کو اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ کارندے میری اجازت کے بغیر اس کا حکم مان سکتے تھے۔

فی الحال اس کے پاس پیسے کی طاقت تھی۔ وہ میری منقولہ کے معاملات سنبھال رہا تھا۔ ہیرا پھیری کے ذریعے لاکھوں روپے جمع کیے تھے۔ وہ اتنی بڑی رقم کہیں چھپا کر رکھتا تھا۔ آئندہ یہی دولت اس کے کام آسکتی تھی۔

یہ اس کی مجبوری تھی۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ مگر بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے کرائے کے قاتلوں سے کام لے سکتا تھا۔ ان تینوں کا جینا حرام کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ وہ اسی ایک پہلو سے ایسی تدبیر سوچنے لگا جس پر عمل کر کے سانپوں کو بھی مار دیتا اور اس کی ساکھ بھی برقرار رہتی۔

☆☆☆

دلہن کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ سارے اختلافات اور مسائل اسی جملہ عروسی سے شروع ہوئے تھے۔ وہ کورے کاغذ کی طرح آئی تھی۔ اس کاغذ کو داغدار کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''کیا جاکھا اسے قبول کرلے گا؟''

جاکھا کشمکش میں تھا۔ چور نے اس کے مال پر ہاتھ صاف کیا تھا اور مال وہیں چھوڑ گیا تھا۔ یعنی یہ کہہ گیا تھا کہ لو! میرا تھوکا ہوا چاٹو۔۔۔

لڑکی کی عمر زیادہ ہو، وہ برسوں میکے میں پڑی رہی ہو۔ تازگی ختم ہوگئی ہو۔ باسی لگ رہی ہو، تب بھی کسی دن دلہن بن جاتی ہے۔ باسی کھانا کھالیا جاتا ہے۔ مگر جھوٹا کھایا نہیں جاتا۔ مردانگی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

اس نے روبینہ کے والدین سے کہا۔ ''میں ابھی الجھن میں ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ مجھے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے وقت دیا جائے۔ تب تک آپ بیٹی کو اپنے پاس رکھیں۔''

سسر نے پوچھا۔ ''کیوں اپنے پاس رکھیں؟ کل تم اسے بیاہ کر لائے آج اسے واپس کر رہے ہو۔۔۔ کیوں؟''

''کیا ہم نے جو بیٹی دی تھی، اس میں کوئی عیب یا داغ دھبا تھا؟''

جاکھے کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ساس نے کہا۔ ''بیٹی ہمارے لیے پرائی ہو چکی ہے۔ یہاں لا کر اسے واپس کرنا چاہتے ہو تو جیسی بے داغ ہم نے دی تھی۔ ویسی ہی صاف ستھری واپس کرو۔''

جاکھے نے کہا۔ ''ہم نے آپ کی بیٹی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔''

''نقصان تمہارے گھر آکر پہنچا ہے۔ تمہارے کسی رشتے دار نے برات میں آنے والوں میں سے کسی نے تمہارے گھر میں گھس کر شرمناک حرکت کی ہے۔ ہماری بیٹی کو اپنے گھر لا کر اس کی عزت کو مٹی میں ملا کر کہتے ہو، تم نے اسے نقصان نہیں پہنچایا ہے؟''

روبینہ کے میکے سے آنے والے تمام بزرگوں نے اتفاقِ رائے سے کہا۔ ''روبینہ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس بیچاری کو لوٹا گیا ہے۔ جس نے غلطی کی ہے، جرم کیا ہے اسے پکڑو۔ اسے سزا دو۔ روبینہ کو قبول کرو۔ یا جیسی کوری کنواری لائے تھے، ویسی ہی واپس کرو۔''

چونکہ بات دین ایمان ..... اور انصاف کے مطابق تھی۔ اس لیے جاکھے کے بزرگوں نے بھی یہی کہا کہ لڑکی سے ناانصافی نہ کی جائے۔ اس پر ظلم ہوا ہے۔ جاکھا اسے قبول نہیں کرے گا تو یہ اس سے بڑا ظلم ہوگا۔

یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ دلہن کا قصور نہیں ہے تو دولھے کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ جس نے زیادتی کی ہے، اسے پکڑ کر سزا دی جائے۔ سزا دولھا کو نہیں ملنی چاہیے۔

روبینہ اپنی ماں بہنوں کے درمیان بیٹھی خاموشی سے تمام باتیں سن رہی تھی۔ وہ گونگی بہری بن کر رہنے والی تابعدار خواندہ لڑکی نہیں تھی۔ اس نے لاہور میں اپنی پھوپھی کے پاس رہ کر بارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔

اس نے کہا۔ ''میں کچھ کہنا چاہتی ہوں اور یہ میرا معاملہ ہے۔ مجھے ہی کہنا چاہیے۔''

وہ سب اسے دیکھنے لگے۔ وہ نصف گھونگھٹ میں تھی۔ پوری طرح گھونگھٹ الٹ کر بولی۔ ''اب کاہے کی شرم؟ میرے ساتھ جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ جس کے گھر آکر لٹ گئی ہوں، انہیں شرم آنی چاہیے۔''

اس نے جاکھے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں میکے



سے نکل کر یہاں آئی۔ یہاں سے نکل کر واپس جاؤں گی تو سسرال سے دھتکاری ہوئی لڑکی کتنے دن میکے میں رہ پائے گی؟ کون میرا بوجھ اٹھائے گا؟ میں تو گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔''

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ''جو پہلی رات برباد ہوگئی۔ بدنام ہوگئی۔ اسے کون قبول کرے گا؟ ابھی تو امی اور ابو مجبوراً مجھے لے جائیں گے۔ پر میرا میکا اب میری امی کا اور ابو کا نہیں رہا ہے۔ وہاں بھائیوں اور بھابیوں کی حکمرانی ہے۔ میں وہاں جانے کا نتیجہ جانتی ہوں۔ اس لیے کیوں واپس جاؤں؟''

پھر اس نے میکے والوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے آپ سب چلے جائیں۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں ایک مرد کے سہارے زندگی گزارنے کے لیے آئی تھی۔ وہ مرد بھی میرے لیے ناکارہ ہوگیا ہے۔ لہٰذا اب میں آزاد ہوں۔ اپنی مرضی سے جہاں چاہوں جاسکتی ہوں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گی؟ تمہیں اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ دربدر کی ہو جاؤ اور ہم تماشا دیکھتے رہیں۔''

وہ بولی۔ ''آپ اطمینان رکھیں میں تماشا نہیں بنوں گی۔ لاہور میں پھوپھی کے پاس رہ کر کہیں بھی جاب کروں گی۔ اپنے بل پر زندگی گزاروں گی۔''

اس نے جاکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ کبھی ایسے مرد کا سہارا نہیں لوں گی۔''

جاکھا کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے جانے لگا۔

تھانے دار دروازے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جاکھے سے کہا۔ ''رک جاؤ۔ تمہارے گھر میں بہت بڑی واردات ہوئی ہے۔ جب تک قانونی کارروائی مکمل نہیں ہوگی، مجرم کا سراغ نہیں ملے گا تب تک دلہن یہاں سے نہیں جائے گی۔ تم اسے قبول کرو یا نہ کرو۔ مگر قانوناً اس کے نگراں سرپرست اور مجازی خدا ہو۔ یہ تمہاری نگرانی میں یہاں رہے گی۔''

روبینہ نے کہا۔ ''پتا نہیں وہ مجرم کب پکڑا جائے گا؟ دو گھنٹوں میں، دو دنوں میں یا دو برسوں میں؟ ممکن ہے، وہ پکڑا ہی نہ جائے۔ کیا تب تک میں یہاں قیدی بن کر رہوں گی؟''

''تم یہاں ایک شریف زادی کی طرح آزاد رہو گی۔ میں مجرموں کی بو سونگھ لینے میں دیر نہیں کرتا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اس کی گردن دبوچ کر یہاں لے آؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''پھر تو میں اس پر تھوکنے کے لیے یہاں ضرور رہوں گی۔''

تھانے دار نے کہا۔ ''میں دلہن کے باپ، اس کے ..... بھائیوں، جاکھے اور اس والد سے کہتا ہوں، کسی بند کمرے میں مجھ سے باتیں کریں۔ اس کمرے میں صرف یہ چھ بندے رہیں گے۔ میں کسی ساتویں کو وہاں آنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد تھانے دار کی ہدایت کے مطابق وہ سب ایک کمرے میں آگئے۔ انہوں نے دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر دیا پھر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ گئے۔

تھانے دار جواد نے کہا۔ ''میں بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا کہ لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ جھگڑا یہ ہے کہ لڑکی جاکھے کے گھر آکر لٹ گئی۔ جبکہ اس بیچارے دولھے کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

وہ روبینہ کے باپ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک جاکھے کا ہی گھر نہیں ہے۔ جوان اور خوبصورت عورتیں کہیں بھی لٹ جاتی ہیں۔ ہم پولیس والے یہ نہیں دیکھتے کہ کس جگہ زیادتی ہوئی ہے؟ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ زیادتی کس نے کی ہے؟''

وہ ان سب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''آپ سب کو اس چور اور لٹیرے کی گردن دبوچنا چاہیے۔ اسے تلاش کرنا چاہیے۔ تعجب ہے اسے بھول کر اس بحث میں پڑے ہیں کہ لڑکی سسرال میں رہے گی یا میکے جائے گی؟ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ برباد ہونے والیاں دیر سویر کہیں نہ کہیں آباد ہو ہی جاتی ہیں۔''

وہ انگلی اٹھا کر بولا۔ ''بات آکر اٹکتی ہے، ایک مجرم پر۔۔۔ اس مجرم نے باپ اور بھائیوں کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ جاکھے کے لیے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ وہ بھری برادری میں آکر اس کے کمرے میں تھوک کر گیا ہے۔''

اس نے روبینہ کے باپ اور بھائیوں سے پوچھا۔ ''کیا طمانچہ کھا کر ایک بیٹی اور بہن کو یہاں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟ اس مجرم کو پکڑنے میں مدد نہیں کریں گے؟''

انہوں نے کہا۔ ''ہم ابھی واپس نہیں جائیں گے۔ اس کمینے کو ڈھونڈ نکالنے میں آپ کا ساتھ دیں گے۔''

جاکھے نے کہا۔ ''ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔''

جواد نے کہا۔ ''میں پچھلے چھ گھنٹوں سے یہاں کی ایک ایک عورت، ایک ایک مرد کتنے ہی بچوں اور بوڑھوں سے سوالات کرتا پھر رہا ہوں۔ یہ معلوم کر رہا ہوں کہ پچھلی رات گیارہ بجے کے بعد کون سو رہا تھا اور کون جاگ رہا تھا؟



www.pklink.com

سونے والے کہاں سو رہے تھے اور جاگنے والے کیا کر رہے تھے؟"

جاکھے کے باپ نے کہا۔ "ہم بھی یہ معلوم کرتے رہے ہیں۔ گھوم پھر کر بلال اور ان تین بھائیوں کی عداوتیں ہمیں الجھا دیتی ہیں۔ یہی بات عقل میں آتی ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو مجرم ٹھہرانے، ذلیل کرنے اور بدنام کرنے کے لیے ایسی شرمناک حرکت کی ہے۔"

روبینہ کے بڑے بھائی نے کہا۔ "جب ہمیں معلوم ہوا کہ ان کے درمیان جان پر کھیل جانے والی دشمنی چل رہی ہے تو ہم بھی ان پر شبہ کرنے لگے ہیں۔"

جواد نے کہا۔ "میری انکوائری کے مطابق بلال رات گیارہ بجے سے بیٹھک میں لیٹا ہوا تھا۔ جب وہ غسل خانے میں گیا تب اس پر انگوٹھی کے ذریعے الزام لگایا گیا۔ جو بعد میں جھوٹا ثابت ہوا۔ اب عقل کیا کہتی ہے؟"

اس نے سوال کیا پھر خود ہی جواب دیا۔ "صاف ظاہر ہے، وہ تینوں اپنی کمینگی چھپانے کے لیے بلال کو پھانس رہے تھے۔ یہ تو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، مجرم ان تینوں میں سے کوئی ایک ہے۔"

"آپ ان تینوں کو حراست میں لے کر اقبالِ جرم کرا سکتے ہیں۔"

"وہ پکے بدمعاش ہیں۔ ڈھیٹ ہیں۔ اپنے چک کے معزز زمیندار ہیں۔ میں تھانے میں لے جا کر ان کی پٹائی نہیں کر سکتا اور نہ وہ مار کھا کر سچ اگلنے والوں میں سے ہیں۔ صبح انہیں حوالات میں ڈالوں گا تو شام تک ضمانت پر رہائی حاصل کر لیں گے۔"

روبینہ کے باپ نے پوچھا۔ "اس کا مطلب، وہ قانون کی گرفت میں نہیں آئیں گے؟"

وہ بولا۔ "جو سیدھی طرح قابو میں نہیں آتے، ان بدمعاشوں کو بدمعاش بن کر قابو میں لایا جاتا ہے۔ آپ سب یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس معاملے میں ان کے خلاف قانونی کارروائی سے کچھ نہیں بنے گا۔"

روبینہ کے بھائی نے کہا۔ "ہم سب انہیں پکڑ کر باندھیں گے۔ ان کے منہ ہاتھ توڑیں گے۔ پھر وہ سچ اگل دیں گے۔"

جواد نے کہا۔ "آپ مار پیٹ کریں گے تو وہ لوگ اوکاڑہ شہر سے پولیس کی مدد حاصل کریں گے۔ پھر مجھے جواب دینا ہوگا کہ میں نے اپنے علاقے میں دنگا فساد کیوں ہونے دیا؟"

"یعنی آپ ان تینوں کے آگے بے بس ہیں؟"

"میں تھانے دار ہوں۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ جب کوئی بدمعاش سیدھی طرح قابو میں نہیں آتا تو میں بڑی رازداری سے مجرم کی کمزوریوں سے کھیلتا ہوں اور اسے اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔ اگر آپ سب میرا ساتھ دیں گے تو میں ایک چال چلوں گا۔ وہ دو چار دنوں میں ہی سب کے سامنے اپنا گناہ قبول کر لیں گے۔"

روبینہ کے باپ نے اور بھائیوں نے جاکھا اور اس کے باپ نے یک زبان ہو کر کہا۔ "ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کھل کر یا رازداری سے جو کرنا چاہتے ہیں وہ کریں۔ ہم آپ کے سپاہی بن کر ساتھ رہیں گے۔ ان میں سے جو مرد ود ہے، اسے پکڑنے کے بعد تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔"

روبینہ کے بھائی نے پوچھا۔ "آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"بدمعاشی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے تمہاری بہن کو بدنام کیا۔ ہم سب مل کر ان کی بہنوں کو بدنام کریں گے۔"

"ایسا کرنے سے وہ طیش میں آئیں گے۔ ہمارے آگے جھکنے نہیں آئیں گے۔"

جواد نے کہا۔ "جھکانے کا طریقہ ہوتا ہے۔ میرے آدمی ان میں سے کسی ایک کی بہن کو اغوا کریں گے۔ اسے ایسی جگہ چھپا کر رکھیں گے کہ وہ لوگ اس کے سائے تک بھی پہنچ نہیں پائیں گے۔"

روبینہ کے باپ نے کہا۔ "بیٹی اپنی ہو یا دشمن کی۔ وہ ایک معصوم بیٹی ہی ہوتی ہے۔"

اس کے بیٹے نے کہا۔ "آگے نہ بولو ابا! انہوں نے ہماری بہن کو بہن نہیں سمجھا اور تم ان کی بیٹی کو بیٹی سمجھنا چاہتے ہو؟"

جواد نے کہا۔ "بزرگو! ہم بھی خدا کا خوف رکھتے ہیں۔ ان کی کسی بہن کو اغوا کیا جائے گا مگر اس کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس کے بھائیوں کو دھمکی دی جائے گی کہ وہ اقبالِ جرم نہیں کریں گے، تب ان کی عزت کو خاک میں ملایا جائے گا اور یہ محض دھمکی ہوگی۔"

ایک اور بھائی نے کہا۔ "لو تو پھر اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ ہم ان بدمعاشوں کی بہن کے ساتھ شریفانہ بدمعاشی کریں گے۔ اسے اٹھا کر ضرور لائیں گے پر داغدار نہیں کریں گے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "تمہیں اٹھانے کی ضرورت نہیں



پڑے گی۔ یہ کام میرے آدمی کریں گے۔ تم چاروں بڑی رازداری سے ان تینوں کو دھمکیاں دیتے رہو گے کہ... روبینہ کو برباد کرنے والا جرم قبول نہیں کریں گے تو ان کی بہن کو بھی برباد کر دیا جائے گا۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "ہم چپ چاپ انہیں دھمکیاں دیں گے۔ سب کے سامنے اسے اغوا کرنے والی بات قبول نہیں کریں گے۔"

جواد نے کہا۔ "میں تھانے دار ہوں۔ میرے سامنے بھی تم قبول نہیں کرو گے۔ میں تمہارے خلاف دکھاوے کی انکوائری کروں گا۔ پھر فیصلہ سنا دوں گا کہ تم لوگوں نے ان کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا ہے۔"

جاکھے نے کہا۔ "میں نے شادی سے پہلے روبینہ کو دیکھا تھا۔ اسے پسند کیا تھا۔ اب بھی اسے چاہتا ہوں۔ پر ایک چور نے میرے گھر آ کر اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اور میں کچھ نہیں کر پا رہا ہوں اس لیے ندامت کے باعث روبینہ سے کترا رہا ہوں۔"

وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ مجرم پکڑا جائے اور اسے میرے حوالے کیا جائے تو میں اسے اپاہج بنا کر انتقام لوں گا۔ اس طرح میری مردانگی کو تسکین ملے گی۔ پھر میں روبینہ کے سامنے سر اٹھا کر اسے قبول کروں گا۔"

روبینہ کے تینوں بھائی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بڑکیں لگائیں پھر ایک نے کہا۔ "اوئے! ہم نے بہن دی ہے۔ اسے یہاں عزت سے رکھنے کے لیے گناہ گار شیطان کو تیرے حوالے ضرور کریں گے۔"

وہ چاروں آگے بڑھ کر جاکھے سے مصافحہ کرنے لگے۔ اسے گلے لگانے لگے۔ تھانے دار جواد اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والا تھا۔ ان تینوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرنے کے لیے پھر ان کی گردنیں دبوچنے والا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے وہ دولھا اور دلہن کے بھائیوں کو اپنے لیے استعمال کر چکا تھا۔ وہ بڑے فاتحانہ انداز میں مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

☆☆☆

جاکھا اور میں بچپن سے دوستوں کی طرح رہتے آئے تھے۔ رشتے دار اور دوست ہونے کے باوجود اس نے روبینہ کے سلسلے میں مجھ پر شبہ کیا تھا۔ اب وہ شبہ تو نہیں رہا تھا پھر بھی وہ مجھ سے دور دور رہنے لگا تھا۔ اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ بند کمرے میں تھانے دار کے ساتھ کیسی مجرمانہ پلاننگ کی گئی ہے؟

اس پلاننگ کے مطابق شکوریا کی بہن شینا کو یا باسو کی بہن زرینہ کو اٹھایا جانے والا تھا۔ کاچھی کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ان دنوں زرینہ کا رشتہ طے ہونے والا تھا۔ اس لیے وہ اسی شام اپنی پھوپھی کے ساتھ فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب وہاں صرف شینا رہ گئی تھی۔ تھانے دار کے منصوبے کے مطابق اسی کے ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔ وہ روبینہ کے سلسلے میں مجھے بدنام کرنے لیے خوب زہر اگلتی رہی تھی۔ عورتوں میں جہاں بیٹھتی تھی، میرا ہی ذکر چھیڑ دیتی۔ مجھے پاگل، جنونی اور گناہ گار کہتی رہتی۔

میں عینی کی محبت اور حکمتِ عملی کے نتیجے میں شرمناک الزام سے بری ہو گیا تھا اور یہ شینا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہ سرگوشیوں میں یہ بات پھونکنے لگی تھی کہ میرے اور عینی کے درمیان ناجائز تعلقات قائم ہو چکے ہیں اور وہ جلد ہی ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑانے والی ہے۔

ایک بار اس سے سامنا ہوا تو میں نے کہا۔ "تم میرے چچا کی بیٹی ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو۔ ہمارے خلاف گندی گندی باتیں کرو گی تو لوگ تمہیں بھی ایسا ہی سمجھیں گے۔ پھر کہیں سے تمہارا رشتہ نہیں آئے گا۔ خدا کے لیے کم از کم عینی کو میرے ساتھ بدنام نہ کرو۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "عینی کا نام نہ لو۔ اس کالی بلی نے میرا راستہ کاٹا ہے۔ ورنہ میرا رشتہ تم سے ہونے والا تھا۔"

"رشتہ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میرے خلاف زہر اگلنا شروع کر دو۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ مگر عینی پر رحم کرو۔ خواہ مخواہ اسے بدنام نہ کرو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "اس کی بہتری چاہتے ہو تو میرے بارے میں سوچو۔ میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ بدنام ہونے کو تیار ہوں۔ اس طرح عینی کو نیک نامی ملے گی۔"

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لو بلکہ گرہ میں باندھ لو کہ عینی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

چند عورتیں اپنے گھر والوں کے ساتھ اس گلی سے گزر رہی تھیں۔ شینا نے اچانک ہی تیور بدل کر چیختے ہوئے کہا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں تمہاری چچا زاد بہن ہوں اور مجھ سے ایسی گندی باتیں کر رہے ہو؟"

گزرنے والے رک گئے۔ میں نے اس کی مکاری سمجھ لی اور فوراً ہی مسکرا کر کہا۔ "میں تمہیں نماز پڑھنے کو کہہ رہا ہوں۔ اس سے پہلے یہ سمجھا رہا ہوں کہ ناپاکی کو اور ناپاک

خیالات کو سمجھو۔ منہ سے گندی بات نہ کہو۔"

وہ آس پاس جمع ہونے والوں کو دیکھتے ہوئے اپنے دونوں کان پکڑتے ہوئے بولی۔ "توبہ توبہ۔ ابھی تم نے نماز کی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "اسی طرح کان پکڑ کر توبہ توبہ کرتے ہوئے سچ بولو۔ میں نے بھی کوئی گندی بات نہیں کی تھی۔"

وہ بولی۔ "جھوٹ نہ بولو۔ تم ابھی یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ مجھے گھر سے بھگا کر لے جاؤ گے؟"

"کیوں گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہی ہو؟ خدا سے ڈرو اور جھوٹ سے توبہ کرو۔"

اس کا بھائی شکور یا بھی وہاں پہنچ گیا۔ چچا اور چچی بھی آ گئے۔ وہ سب ہی مجھے لعن طعن کرنے لگے۔ شکور یا مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ چچا نے اور دوسرے لوگوں نے اسے پکڑ رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ "اسے چھوڑ دو۔ مار کھانا چاہتا ہے۔ اسے اپنی حسرت پوری کرنے دو۔"

جاکھے اور اس کے باپ نے ہم سب کی نگرانی کے لیے کئی بندے مقرر کیے تھے۔ ہم ان کے براتی تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہاں ایک دوسرے سے لڑتے رہیں۔ ان نگرانی کرنے والوں نے وہاں آ کر بات بڑھنے نہیں دی۔ وہ مجھے ان سے دور لے آئے۔

میں ایک ضروری کام سے اوکاڑہ جانے والا تھا۔ رات دس بجے تک واپسی تھی۔ میرے جانے کے بعد حشمت نے امی اور چھانو سے کہا۔ "ہم اور کتنے دنوں تک جاکھے کے مہمان بن کر رہیں گے؟ ہمیں اب واپس جانا چاہیے۔"

وہ ان تینوں سے خوفزدہ تھا۔ انہیں اپنے برے وقت کا ساتھی سمجھتا تھا مگر اب وہی اس کے جانی دشمن بن گئے تھے۔

میری بہن چھانو نے کہا۔ "واپس جانے کی ایسی جلدی کیا ہے؟ شادی بیاہ کے بہانے کبھی کبھی گھر سے نکلنے کا موقع ملتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، تم یہاں آ کر پریشان کیوں رہنے لگے ہو؟"

شادی کے بعد ولیمہ ہونے والا تھا مگر یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ یہ شادی ہوئی بھی ہے یا نہیں؟ دلہن کو قبول کیا جاتا تو ولیمہ ہوتا۔

حشمت نے کہا۔ "جب تک ولیمہ نہیں ہوگا، تب تک ہم یہاں بیٹھیں رہیں گے؟"

امی نے کہا۔ "آج کل میں فیصلہ ہو جائے گا۔ تمہیں زمینوں کی فکر ہے تو چلے جاؤ۔ ہم بلال کے ساتھ آ جائیں گے۔"

وہ ان تینوں سے دور جانا چاہتا تھا۔ امی نے جانے کی اجازت دی تو اس نے کہا۔ "بلال رات تک واپس آ جائے گا۔ میں کل صبح چلا جاؤں گا۔ بلال کی رائفل لے جاؤں گا۔"

چھانو نے پوچھا۔ "تم اپنی بندوق کیوں نہیں لائے؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں میرے لیے ضروری ہو جائے گی۔"

امی نے تعجب سے پوچھا۔ "یہاں تمہارے لیے بندوق کیوں ضروری ہے؟ وہ کم بخت جو ہمارے دشمن ہیں وہ بھی تم سے صاحب سلام رکھتے ہیں۔ تم پریشان کیوں لگ رہے ہو؟"

"دشمن کی صاحب سلامت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ ان کا دماغ پھرے گا تو بلال کا غصہ مجھ پر اتاریں گے۔ مجھ سے غلطی ہوئی، اپنی رائفل لے کر نہیں آیا۔"

چھانو نے پوچھا۔ "اب یہاں سے میرے بھائی کی بندوق لے جانا چاہتے ہو۔ کیا اسے نہتا کر کے جاؤ گے؟"

وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ پاؤں پٹخ کر جاتے ہوئے بولا۔ "خالی ہاتھ جاؤں گا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

وہ دروازے کو زوردار آواز سے بند کرتا ہوا چلا گیا۔

امی نے چھانو سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ گیا ہے کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا آخر کیا ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا، اسے پریشانی کیا ہے؟"

اور پریشانی ایسی زبردست تھی کہ اس کے لیے ہتھیار رکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ جس خطرے سے دوچار ہونے والا تھا، اس کے متعلق انہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ تنہا اپنی سلامتی کی فکر کر رہا تھا۔

وہاں بیٹھک میں رات گئے تک تاش کی بازی جاری رہتی تھی۔ اس رات خاص طور پر جاکھا، باسو، کاچھی، شکور یا، حشمت اور روبینہ کے بھائی تاش کھیلنے آئے۔ جاکھے اور روبینہ کے بھائی وہاں صبح تک اس لیے رہنا چاہتے تھے کہ کسی کی بہن کے اغوا کا الزام ان پر نہ آئے۔

اور وہ تینوں اس لیے بیٹھک میں رہنا چاہتے تھے کہ حشمت کسی وقت بھی وہاں سے اٹھ کر جائے گا تو رات کی تاریکی میں مارا جائے گا۔ پھر سب گواہی دیں گے کہ اس کی ہلاکت کے وقت وہ تینوں بھائی مہمان باراتیوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔

حشمت نادان نہیں تھا۔ وہ بھی کچھ سوچ سمجھ کر اس



بیٹھک میں تاش کھیلنے اور تہجد کی نماز پڑھنے آیا تھا۔ وہاں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک تہجد گزار وہاں بیٹھے بیٹھے کیسی واردات کر گزرے گا؟

بڑا عجیب سا شادی کا ماحول تھا۔ بڑے ارمانوں سے دلہن لائی گئی تھی مگر وہاں شادیانے نہیں بج رہے تھے۔ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ دلہن وہاں رہے گی یا واپس کر دی جائے گی؟

عجیب سی بات یہ بھی تھی کہ دولھا اور دلہن والوں کے درمیان اختلافات تھے۔ وہ اختلافات دشمنی میں بدلنے والے تھے۔ لیکن وہ دوستانہ انداز میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے میری چچی یعنی شینا اور شکور یا کی ماں بیٹھک میں آ کر ہائے ہائے کرنے لگی۔ شینا لاپتا ہو گئی تھی۔ چچا نے تاش کے پتے ایک طرف پھینک دیے۔ کاچھی، شکور یا اور باسو اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "کہاں ہے شینا۔۔۔؟ وہ یہاں کسی کے گھر میں ہوگی۔"

چچی نے کہا۔ "سارے رشتے دار اور محلے کی عورتیں گھر گھر جا کر دیکھ چکی ہیں۔ وہ کسی کی چار دیواری میں نہیں ہے۔"

"تو پھر کہاں ہے؟ وہ کس کے ساتھ گھر سے نکلی تھی؟ کب نکلی تھی؟"

"مغرب کے بعد اپنے ماما جی کے گھر گئی تھی۔ وہاں دائی ماں اپنی بہو مینا کے ساتھ آئی تھی۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد وہ گھر آنے والی تھی۔ ماما جی نے شینا کو ان کے ساتھ کر دیا۔"

"کیا دائی ماں شینا کو گھر نہیں لائی؟"

"نہیں۔ شینا نے راستے میں کہا کہ دائی ماں تم چلو میں اپنی ایک سہیلی سے مل کر آتی ہوں۔ بس یہ کہہ کر وہ دوسری گلی میں چلی گئی۔"

چچی رو رو کر کہہ رہی تھی۔ "دائی ماں نے مجھے آ کر بتایا کہ وہ کسی سہیلی سے ملنے گئی ہے۔ میں حیران ہوئی کہ یہاں تو اس کی کوئی سہیلی نہیں ہے پھر کہاں گئی ہے؟"

وہ اپنے سینے پر دوہتڑ مار کر روتے ہوئے بولی۔ "ہائے میری بچی کہاں ہوگی؟ اگر کوئی سہیلی ہے بھی تو ہم اس کا گھر نہیں جانتے۔ پھر بھی ایک ایک گھر میں گھس کر دیکھ چکے ہیں۔"

اس کی گمشدگی سے سب ہی حیران تھے۔ اسے

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مُقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

ڈھونڈنے کے لیے بیٹھک سے نکل آئے تھے۔ وہ تینوں اپنے کمروں سے بندوقیں نکال کر گرج رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کسی نے ان کی بہن کو ہاتھ بھی لگایا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور یہ جتانے کے لیے تڑاتڑ ہوائی فائر کر رہے تھے کہ کسی طرح زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

روبینہ کے ایک بھائی نے کہا۔ ''ہم نے بھی یہاں آکر گولیاں چلائی تھیں۔ پر بہن کی لٹی ہوئی عزت واپس نہیں آئی۔ تمہاری بہن ابھی محفوظ ہوگی۔ اسے اغوا کرنے والے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ بندوقیں نیچی کرو اور اسے تلاش کرو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔''

وہاں عورتوں اور مردوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ امی بھی وہاں تھیں۔ ایسے وقت کسی نے کہا۔ ''بلال نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ کہاں ہے؟''

ان تینوں نے چونک کر امی کو دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ اوکاڑہ گیا ہے۔''

شکوریا نے کہا۔ ''وہ شام کو یہاں تھا۔ شینا سے بدتمیزی کر رہا تھا۔''

اس کی ماں نے کہا۔ ''وہ شینا کو بھگا کر لے جانے کی بات کر رہا تھا۔''

شام کو جن عورتوں اور مردوں نے میرا اور شینا کا جھگڑا دیکھا تھا، انہوں نے کہا۔ ''وہ یہی کہہ رہی تھی کہ بلال اسے بھگا کر لے جانا چاہتا ہے۔''

امی نے کہا۔ ''کیا تم لوگوں نے میرے بیٹے کی زبان سے یہ بات سنی تھی؟''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''یہ شینا نے کہا تھا اور بلال اسے جھٹلا رہا تھا۔''

شکوریا نے کہا۔ ''وہ تم لوگوں کے سامنے سچ کو جھٹلا رہا تھا۔''

کاچھی نے کہا۔ ''آپ لوگ مان لیں، وہ بہت بڑا مکار اور چالباز ہے یا پھر خبطی ہے۔ ادھر عینی سے عشق کر رہا ہے اور ادھر ہماری بہن کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

باسو نے کہا۔ ''بلال کہیں نہیں گیا ہے۔ گھر میں چھپا ہوا ہے۔ اسے باہر نکالو۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

امی نے کہا۔ ''برسوں سے یہی کہتے آرہے ہو کہ اسے زندہ نہیں چھوڑو گے۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔ وہ اپنی آخری عمر تک جیے گا۔''

''اسے یہاں بلاؤ۔''

امی نے کہا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔ اوکاڑہ گیا ہوا ہے۔''

شکوریا نے کہا۔ ''ہم نہیں مانتے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

امی نے اسے غصے سے گھورا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنے فون پر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر پوچھا۔ ''بیٹے! تم کہاں ہو؟''

میں نے کہا۔ ''آپ تو جانتی ہیں، میں اوکاڑہ میں ہوں۔ جیپ خراب ہوگئی ہے۔ اسے گیراج میں دیا ہے۔ کل دوپہر تک آسکوں گا۔''

''بیٹے۔۔۔! یہاں گڑبڑ ہوگئی ہے۔ شینا لاپتا ہے۔ شبہ کیا جارہا ہے کہ تم اسے بھگا کر لے گئے ہو۔ میں یہ فون چند بزرگوں کو دے رہی ہوں۔ تم اپنی صفائی پیش کرو۔''

امی نے ایک بزرگ کو فون دیا۔ میں نے کہا۔ ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں، میں نے شینا کو شام کے بعد دیکھا ہے نہ ہاتھ لگایا ہے۔ میں اوکاڑہ شہر میں ہوں۔ اپنی جیپ کی مرمت کرا رہا ہوں۔ کل صبح یا دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔''

یہ باتیں میں نے جاکھے کے باپ اور تین بزرگوں سے کہیں۔ انہوں نے تمام لوگوں کے سامنے گواہی دی کہ بلال اوکاڑہ شہر میں ہے۔

شکوریا نے کہا۔ ''وہ تو امریکا میں بیٹھ کر بھی فون پر کہہ سکتا ہے کہ اوکاڑہ میں ہے۔ جہاں میری بہن کو لے گیا ہے، وہاں سے بھی یہی کہہ سکتا ہے۔''

امی نے کہا۔ ''یقین نہیں ہے تو وہاں جاکر دیکھ لو۔ ادھر سب ہی گواہی دیں گے کہ وہ کل شام سے اسی شہر میں ہے اور اس کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں ہے۔''

میری بہن چھانو نے کہا۔ ''جب میرا بھائی بے قصور نکلے تو ڈھونڈتے پھرنا کہ بہن کس کے ساتھ بھاگی ہے؟''

چچی نے کہا۔ ''اے خبردار! میری بیٹی بھاگی نہیں ہے۔ ہم سے دشمنی کی جارہی ہے۔''

روبینہ کے بھائی نے کہا۔ ''دشمنی کی بات کی جائے گی تو پھر بتانا ہوگا کہ دشمن کون ہے؟ شینا کے ساتھ کب سے دشمنی کا چکر چل رہا ہے؟ بلال تو کل اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور گواہوں کے ساتھ آئے گا۔''

روبینہ کے دوسرے بھائی نے کہا۔ ''تم سب کیسے بھائی ہو؟ یہاں لمبی لمبی باتیں کر رہے ہو مگر بہن کو ڈھونڈنے نہیں جارہے ہو۔''

وہ تینوں اپنے رشتے داروں کے ساتھ وہاں سے



جانے لگے۔ جاکھے نے اپنے کارندوں کو ساتھ لے لیا۔ روبینہ کے چاروں بھائی بھی پیچھے نہ رہے۔ اس طرح وہ ان تینوں کے غم میں شریک ہو رہے تھے۔ خود چور ہوکر چور کو ڈھونڈنے نکل گئے تھے۔ یہ سمجھ گئے تھے کہ تھانے دار جواد اپنا کام دکھا چکا ہے۔

میرے پھوپھا اور دونوں چچا نے تھانے جاکر دہائی دی۔ جواد اکبر نیند سے اٹھ کر آیا پھر بولا۔ ''ایسی کیا مار پڑی ہے کہ رات کے ایک بجے نیند خراب کرنے آئے ہو؟ صبح نہیں آسکتے تھے؟''

چچا نے کہا۔ ''میری بیٹی شام سے لاپتا ہے۔ سب ہی اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم آپ کی مدد حاصل کرنے آئے ہیں۔''

''میں کیا مدد کروں؟ کیا اس اندھیری رات میں تمہاری بیٹی کو ڈھونڈنے نکلوں؟''

پھوپھا نے کہا۔ ''جواد صاحب! یوں غیروں کی طرح تو نہ بولیں۔ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے درمیان کیسا پکا لین دین رہتا ہے۔''

''میں پولیس والا ہوں، بہت جلد بھول جاتا ہوں۔ پھر لین دین شروع ہوگا تو یاد آجائے گا۔''

''بس یوں سمجھیں کہ شروع ہوگیا ہے۔ کسی بھی طرح میری بیٹی کو ڈھونڈ نکالیں اور اس مجرم کو ہمارے سامنے ڈال دیں۔ ہمارے بیٹے اسے اور اس کے پورے خاندان کو خاک میں ملا دیں گے۔''

''وہ تینوں کتنے سورما ہیں، یہ میں جانتا ہوں۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اسے اغوا کیا گیا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو؟''

''ایسی باتیں نہ کریں۔ ہماری بیٹی بڑی شرم والی ہے۔ کوئی اسے زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے۔''

''تم لوگوں کا ایک ہی دشمن ہے اور وہ ہے بلال۔۔۔''

چچا نے کہا۔ ''وہ اوکاڑہ میں ہے۔ کل ثبوت اور گواہوں کے ساتھ آئے گا۔ خود کو بے گناہ ثابت کرے گا۔ ہمیں یقین ہو رہا ہے، ہم سے دشمنی کرنے والا کوئی اور ہے۔''

''تم نے اور تمہارے بیٹے نے کسی کو دشمن بنایا ہوگا۔ کسی کی بہن کو برباد کیا ہوگا تو دشمن کی طرف سے بھی جوابی کارروائی ہو رہی ہے۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''جو اس چک میں ہو چکا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔ ایک دلہن کے ساتھ زیادتی ہو چکی ہے۔ اس کے چار بھائی وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے دماغوں میں یہ بات سمائی ہوگی کہ شکوریا نے ان کی بہن کو خراب کیا ہے اس لیے انہوں نے اس کی بہن کو اٹھا لیا۔''

''نہیں۔ دلہن کے چاروں بھائی ہمارے بیٹوں کے ساتھ ہیں۔ وہ بھی شینا کو تلاش کر رہے ہیں۔''

جواد نے کہا۔ ''میں نہیں مانتا۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ چوروں کو بھی پہرے داری کرتے دیکھا ہے۔ قاتلوں کو مقتول کی لاش پر ماتم کرتے پکڑا ہے۔ تمہاری بیٹی کے مجرم کو بھی پکڑ سکتا ہوں۔''

''اسی لیے تو ہم آئے ہیں۔ آپ ضرور اس کی گردن دبوچ لیں گے۔ ہماری شینا واپس آجائے گی۔''

چچا نے ایک رومال میں لپٹا ہوا نذرانہ پیش کیا۔ جواد نے کہا۔ ''اتنے سے رومال میں دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہوں گے۔''

چچا نے کہا۔ ''جی ہاں۔ چائے پینے کے لیے دس ہزار ہیں۔''

وہ حقارت سے بولا۔ ''کیا بھیک دینے آئے ہو؟ ایک لاکھ سے کم نہیں لوں گا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ وہ تینوں سچ بولیں گے کہ دلہن کے پاس کون گیا تھا؟''

''آپ تو اسی ایک بات کو پکڑے بیٹھے ہیں۔ دلہن کے معاملے پر مٹی ڈالیں۔ یہ یقین کرلیں کہ وہ حرکت بلال نے کی تھی۔''

وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''میں فضول باتیں نہیں سنوں گا۔ تمہارے دروازے سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ مجھ جیسے تھانے انچارج کو دوست بنایا ہے تو سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو، دھوکا نہ دو۔ میں دھوکا دینے والوں کو قبر تک دوڑا دوڑا کر مارتا ہوں۔''

اس نے ایسا کہتے ہوئے اپنے فون پر روبینہ کے بڑے بھائی کے نمبر پنچ کیے۔ ایک مس کال دے کر فون بند کر دیا۔ ادھر روبینہ کے چاروں بھائی ان تینوں اور چک کے درجنوں افراد کے ساتھ کھیتوں میں اور آس پاس کی چھوٹی بستیوں میں شینا کو تلاش کر رہے تھے۔

اس نے مس کال پر جواد کا نام پڑھتے ہی کال کاٹ دی۔ پھر شکوریا سے کہا۔ ''شینا واپس مل سکتی ہے۔ ابھی فون پر میرے چھوٹے بھائی نے کہا ہے کہ تمہاری بہن اس کے پاس ہے۔''

شکوریا کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے فوراً ہی بندوق

تان لی۔ روبینہ کے بھائی نے کہا۔ ''ادھر گولی چلاؤ گے۔ ادھر بہن کی عزت کا جنازہ نکلے گا۔ پھر کیا ثبوت ہے کہ وہ ہمارے پاس ہے؟''

''ابھی تو تم کہہ رہے ہو؟''

''سب کے سامنے نہیں کہوں گا۔ اسی طرح قسمیں کھا کر انکار کرتا رہوں گا۔ جیسا تم لوگ میری بہن کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد انکار کرتے رہے ہو۔''

''ہم قسم کھا کر کہتے ہیں، ہم نے تمہاری بہن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔''

''ہاتھ لگانے کے لیے کسی دوسرے کو بھیجا تھا۔ بڑی سے بڑی قسم کھا کر بولو گے، تب بھی ہم یقین نہیں کریں گے۔''

شکوریا سر گھما کر دور تک دیکھنے لگا۔ قریب کوئی نہیں تھا۔ شینا کو تلاش کرنے کے لیے سب ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ دور ٹارچ کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔

روبینہ کے بڑے بھائی نے کہا۔ ''بہتر ہے واپس چلو اور یہ یاد رکھو کہ ہم سے کوئی اقبالِ جرم نہیں کرا سکے گا۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔''

شکوریا نے اس سے ذرا دور جا کر اپنے باپ کو فون پر مخاطب کیا۔ ''ابا! تو کہاں ہے؟''

جواب ملا۔ ''میں تھانے میں جواد صاحب کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

''فون جواد صاحب کو دے۔ میں بات کروں گا۔''

چند لمحوں کے بعد تھانے دار کی آواز سنائی دی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو بہن کا سراغ مل گیا ہے؟ مجرم سامنے آ گیا ہے؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''ملک الموت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت موت لے آتا ہے۔ تھانے دار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت کسی کی بھی شامت بن جاتا ہے۔ روبینہ کے بھائی تم لوگوں کو پہچان گئے ہیں۔ اپنی بہن کا انتقام لینا چاہیں گے۔ ابھی تو شینا کو صرف اغوا کیا ہے۔ بعد میں پتا نہیں اس کا کیا حشر کریں گے؟ میں اس لڑکی کو واپس لا سکتا ہوں۔ اس سے پہلے وہاں ایک بھی گولی نہ چلے۔ ورنہ تم لوگوں کو بھاگنے اور منہ چھپانے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں چک میں آ رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔

☆☆☆

دائی ماں کا بیٹا مقبول چوری کے مال سمیت پکڑا گیا تھا۔ وہ دس ہزار کا مال تھا۔ تھانے دار جواد نے اس کی خوب پٹائی کی تھی۔ دائی ماں اور اس کی بہو مینا اس کے لیے رحم کی بھیک مانگتی رہیں۔

جواد نے کہا۔ ''میرا ایک کام کرو گی تو مقبول کے خلاف کیس نہیں بناؤں گا۔ ورنہ حوالات میں مار مار کر ہی جان نکال دوں گا۔ پھر لمبی سزا کے لیے جیل بھیج دوں گا۔''

دائی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ آپ جو کرنے کو کہو گے، ہم وہ کریں گے۔''

جواد نے پوچھا۔ ''تو شکوریا کی بہن کو جانتی ہے؟''

''جانتی ہوں اس کا نام شینا ہے۔ پورے خاندان کو جانتی ہوں۔''

''آج رات اسے کسی بھی طرح ٹوٹی ہوئی پلیا کے پاس لے آ اور اتنی ہوشیاری سے لا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ میرے آدمیوں کے قابو میں آئے گی تو اسی وقت تیرے بیٹے کو چھوڑ دوں گا۔''

مینا نے کہا۔ ''ہم یہ کام کر دیں گے لیکن بعد میں شینا واپس آئے گی تو اس کے بھائی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

وہ بولا۔ ''جو میرا کام کرتے ہیں، میں ان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ کوئی تم پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔''

دائی ماں نے کہا۔ ''پورے چک والے ہم سے ناراض ہو جائیں گے۔ پھر کوئی ہمیں اپنے گھر میں گھسنے نہیں دے گا۔''

''تم آج کے بعد تھانے کی مخبر کہلاؤ گی تو کوئی تمہارے سامنے دم نہیں مارے گا۔ سب ہی تم سے ڈرے سہمے رہیں گے اور تمہیں سلام کریں گے۔''

''پھر تو میں سوچتی ہوں کہ کس طرح اسے ٹوٹی ہوئی پلیا کے پاس لا سکوں گی۔''

مینا نے کہا۔ ''اماں! کچھ سوچنا نہیں پڑے گا۔ باراتیوں میں ایک بہت ہی گبرو جوان ہے۔ اس کا نام سلامت ہے۔ شینا کا چکر اس سے چل رہا ہے۔ کل رات اس نے مجھے ایک چٹھی دی تھی۔ میں نے وہ سلامت کے پاس پہنچا دی تھی۔ پھر اس کی جوابی چٹھی شینا کو لا کر دی تھی۔''

جواد تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''تم سلامت سے ملو اور کہو کہ شینا سے پلیا پر ملنے کے لیے اسے چٹھی لکھے پھر وہ ضرور اس سے ملنے جائے گی۔''



دائی ماں نے کہا۔ ''سلامت چٹھی لکھے گا تو وہ بھی اس سے ملنے وہاں آئے گا۔''

''آنے دو۔ یہ ہمارے لیے اچھا ہے۔ ہم میں سے کسی پر الزام نہیں آئے گا کہ اسے اغوا کرایا گیا ہے۔ میں ان دونوں کو پلیا کے پاس بدکاری کے الزام میں گرفتار کر لوں گا۔ بعد میں وہ چک والوں کے سامنے لائے جائیں گے تو کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

تھانے دار سمجھ رہا تھا کہ شینا کو اغوا کرانے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ مگر خلافِ توقع یہ معاملہ انتہائی آسان ہو گیا۔ دوپہر کو مینا سلامت کے پاس گئی۔ اس سے کہا۔ ''شینا تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ پر ایک لڑکی خود ملنے کی بات نہیں کرے گی۔ تم اس سے ملنے کے لیے ایک چٹھی لکھو۔''

سلامت نے خط لکھ دیا۔ مینا نے اسے شینا کے پاس پہنچایا۔۔۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔۔۔ کے مصداق شینا نے جواباً لکھ دیا کہ وہ رات کو ملنے آئے گی۔ ملاقات کے لیے جگہ بھی مقرر ہو گئی۔ پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق دائی ماں اور مینا رات کے نو بجے ماما جی کے گھر گئیں۔ شینا ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ماما جی نے اسے دائی ماں کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی۔

یوں بات بن گئی۔ دائی ماں اور مینا اسے پلیا تک پہنچانے گئیں۔ وہاں سلامت اس کا منتظر تھا۔ جواد اور اس کے سپاہی بھی ان کے انتظار میں چھپے ہوئے تھے۔ جب وہ ساس بہو وہاں سے چلی گئیں اور دو دلوں کا ملاپ ہونے لگا تو سپاہیوں نے آ کر انہیں گھیر لیا۔ جواد نے ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟''

پھر اس نے شینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو تم شکوریا کی بہن ہو؟ جوانی کا بخار اتارنے آئی ہو اور تم کون ہو؟''

سلامت یوں پکڑے جانے کے باعث ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں جاکھے کا براتی ہوں۔ میرا نام سلامت علی ہے۔ ہمیں جانے دیں جنابِ عالی۔۔۔! ہماری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم ایسی غلطی پھر کبھی نہیں کریں گے۔''

شینا نے منہ پر دوپٹا ڈال لیا تھا۔ خود کو چھپا رہی تھی۔ رونے کے انداز میں بولی۔ ''جواد صاحب! آپ ہمارے پورے خاندان کو اچھی جانتے ہیں۔ ہمارے محسن بھی ہیں۔ مجھ پر احسان کریں۔ مجھے چھپ کر جانے دیں۔ آپ کارروائی کریں گے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''تم دونوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ ملنے آئے ہو تو اچھی طرح ملو، پر یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ ہماری طرح کوئی بھی ادھر آ سکتا ہے۔ حولات میں کوئی نہیں آئے گا۔ وہاں صبح تک مستیاں کرتے رہو۔ جس کام کے لیے آئے ہو، اسے ضرور کرو۔''

ان دونوں کو حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ شینا رو رہی تھی۔ سلامت نے کہا۔ ''اوکاڑہ میں میری ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میں غریب ہوں۔ پھر بھی دس ہزار دوں گا۔ مجھے جانے دیں۔''

''کیا اپنی معشوق کو چھوڑ کر جاؤ گے؟''

وہ بولا۔ ''ایک بڑے گھرانے میں میری بہن کا رشتہ ہو چکا ہے۔ میں گناہ کرتا ہوا پکڑا جاؤں گا تو رشتے سے انکار ہو جائے گا۔ میری بہن کا گھر بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گا۔''

وہ بولا۔ ''شینا بھی کسی کی بہن ہے۔ اس کے ساتھ منہ کالا کرتے وقت تم نے اپنی بہن کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟ اور جب نہیں سوچا تو اب کیوں سوچ رہے ہو؟''

پھر وہ شینا سے بولا۔ ''تمہیں بدنام ہونے سے صرف میں ہی بچا سکتا ہوں۔ اگر نیک نامی چاہتی ہو تو یہ بیان لکھ دو کہ جاکھے کی دلہن کے ساتھ تمہارے بھائی نے زیادتی کی ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میرا بھائی گناہ گار نہیں ہے۔''

''اسی طرح قسم کھا کر کہہ دو کہ واردات کس نے کی تھی؟ یہ بات تو پکی ہے کہ تم اسے جانتی ہو۔ کیونکہ وہ شکوریا، کاچھی یا باسو میں سے کوئی ایک ہے۔''

''میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔''

''جتنی قسمیں یاد ہیں، سناتی رہو مگر یہ بات سب ہی کی سمجھ میں آ رہی ہے کہ بلال کو بدنام کرنے کے لیے وہ واردات ان تینوں نے کی ہے یا کسی سے کرائی ہے۔''

وہ ذرا چپ رہی۔ بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔ کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''آپ یقین کریں، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ مردوں کے معاملات ہیں۔ وہ لوگ گھر سے باہر کیا کرتے ہیں؟ گھر کی عورتوں کو نہیں بتاتے۔ مگر میں سچ کہتی ہوں، وہ تینوں بے قصور ہیں۔''

جواد نے ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا۔ اس کے منہ

تان لی۔ روبینہ کے بھائی نے کہا۔ ''ادھر گولی چلاؤ گے۔ ادھر بہن کی عزت کا جنازہ نکلے گا۔ پھر کیا ثبوت ہے کہ وہ ہمارے پاس ہے؟''

''ابھی تو تم کہہ رہے ہو؟''

''سب کے سامنے نہیں کہوں گا۔ اسی طرح قسمیں کھا کر انکار کرتا رہوں گا۔ جیسا تم لوگ میری بہن کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد انکار کرتے رہے ہو۔''

''ہم قسم کھا کر کہتے ہیں، ہم نے تمہاری بہن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔''

''ہاتھ لگانے کے لیے کسی دوسرے کو بھیجا تھا۔ بڑی سے بڑی قسم کھا کر بولو گے، تب بھی ہم یقین نہیں کریں گے۔''

شکوریا سر گھما کر دور تک دیکھنے لگا۔ قریب کوئی نہیں تھا۔ شینا کو تلاش کرنے کے لیے سب ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ دور ٹارچ کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔

روبینہ کے بڑے بھائی نے کہا۔ ''بہتر ہے واپس چلو اور یہ یاد رکھو کہ ہم سے کوئی اقبالِ جرم نہیں کرا سکے گا۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔''

شکوریا نے اس سے ذرا دور جا کر اپنے باپ کو فون پر مخاطب کیا۔ ''ابا! تو کہاں ہے؟''

جواب ملا۔ ''میں تھانے میں جواد صاحب کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

''فون جواد صاحب کو دے۔ میں بات کروں گا۔''

چند لمحوں کے بعد تھانے دار کی آواز سنائی دی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو بہن کا سراغ مل گیا ہے؟ مجرم سامنے آ گیا ہے؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''ملک الموت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت موت لے آتا ہے۔ تھانے دار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت کسی کی بھی شامت بن جاتا ہے۔ روبینہ کے بھائی تم لوگوں کو پہچان گئے ہیں۔ اپنی بہن کا انتقام لینا چاہیں گے۔ ابھی تو شینا کو صرف اغوا کیا ہے۔ بعد میں پتا نہیں اس کا کیا حشر کریں گے؟ میں اس لڑکی کو واپس لا سکتا ہوں۔ اس سے پہلے وہاں ایک بھی گولی نہ چلے۔ ورنہ تم لوگوں کو بھاگنے اور منہ چھپانے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں چک میں آ رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔

☆☆☆

دائی ماں کا بیٹا مقبول چوری کے مال سمیت پکڑا گیا تھا۔ وہ دس ہزار کا مال تھا۔ تھانے دار جواد نے اس کی خوب پٹائی کی تھی۔ دائی ماں اور اس کی بہو مینا اس کے لیے رحم کی بھیک مانگتی رہیں۔

جواد نے کہا۔ ''میرا ایک کام کرو گی تو مقبول کے خلاف کیس نہیں بناؤں گا۔ ورنہ حوالات میں مار مار کر ہی جان نکال دوں گا۔ پھر لمبی سزا کے لیے جیل بھیج دوں گا۔''

دائی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ آپ جو کرنے کو کہو گے، ہم وہ کریں گے۔''

جواد نے پوچھا۔ ''تو شکوریا کی بہن کو جانتی ہے؟''

''جانتی ہوں اس کا نام شینا ہے۔ پورے خاندان کو جانتی ہوں۔''

''آج رات اسے کسی بھی طرح ٹوٹی ہوئی پلیا کے پاس لے آ اور اتنی ہوشیاری سے لا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ میرے آدمیوں کے قابو میں آئے گی تو اسی وقت تیرے بیٹے کو چھوڑ دوں گا۔''

مینا نے کہا۔ ''ہم یہ کام کر دیں گے لیکن بعد میں شینا واپس آئے گی تو اس کے بھائی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

وہ بولا۔ ''جو میرا کام کرتے ہیں، میں ان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ کوئی تم پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔''

دائی ماں نے کہا۔ ''پورے چک والے ہم سے ناراض ہو جائیں گے۔ پھر کوئی ہمیں اپنے گھر میں گھسنے نہیں دے گا۔''

''تم آج کے بعد تھانے کی مخبر کہلاؤ گی تو کوئی تمہارے سامنے دم نہیں مارے گا۔ سب ہی تم سے ڈرے سہمے رہیں گے اور تمہیں سلام کریں گے۔''

''پھر تو میں سوچتی ہوں کہ کس طرح اسے ٹوٹی ہوئی پلیا کے پاس لا سکوں گی۔''

مینا نے کہا۔ ''اماں! کچھ سوچنا نہیں پڑے گا۔ باراتیوں میں ایک بہت ہی گبرو جوان ہے۔ اس کا نام سلامت ہے۔ شینا کا چکر اس سے چل رہا ہے۔ کل رات اس نے مجھے ایک چٹھی دی تھی۔ میں نے وہ سلامت کے پاس پہنچا دی تھی۔ پھر اس کی جوابی چٹھی شینا کو لا کر دی تھی۔''

جواد تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''تم سلامت سے ملو اور کہو کہ شینا سے پلیا پر ملنے کے لیے اسے چٹھی لکھے پھر وہ ضرور اس سے ملنے جائے گی۔''



دائی ماں نے کہا۔ ''سلامت چٹھی لکھے گا تو وہ بھی اس سے ملنے وہاں آئے گا۔''

''آنے دو۔ یہ ہمارے لیے اچھا ہے۔ ہم میں سے کسی پر الزام نہیں آئے گا کہ اسے اغوا کرایا گیا ہے۔ میں ان دونوں کو پلیا کے پاس بدکاری کے الزام میں گرفتار کر لوں گا۔ بعد میں وہ چک والوں کے سامنے لائے جائیں گے تو کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

تھانے دار سمجھ رہا تھا کہ شینا کو اغوا کرانے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ مگر خلافِ توقع یہ معاملہ انتہائی آسان ہو گیا۔ دوپہر کو مینا سلامت کے پاس گئی۔ اس سے کہا۔ ''شینا تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ پر ایک لڑکی خود ملنے کی بات نہیں کرے گی۔ تم اس سے ملنے کے لیے ایک چٹھی لکھو۔''

سلامت نے خط لکھ دیا۔ مینا نے اسے شینا کے پاس پہنچایا۔۔۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔۔۔ کے مصداق شینا نے جواباً لکھ دیا کہ وہ رات کو ملنے آئے گی۔ ملاقات کے لیے جگہ بھی مقرر ہو گئی۔ پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق دائی ماں اور مینا رات کے نو بجے ماما جی کے گھر گئیں۔ شینا ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ماما جی نے اسے دائی ماں کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی۔

یوں بات بن گئی۔ دائی ماں اور مینا اسے پلیا تک پہنچانے گئیں۔ وہاں سلامت اس کا منتظر تھا۔ جواد اور اس کے سپاہی بھی ان کے انتظار میں چھپے ہوئے تھے۔ جب وہ ساس بہو وہاں سے چلی گئیں اور دو دلوں کا ملاپ ہونے لگا تو سپاہیوں نے آ کر انہیں گھیر لیا۔ جواد نے ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟''

پھر اس نے شینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو تم شکوریا کی بہن ہو؟ جوانی کا بخار اتارنے آئی ہو اور تم کون ہو؟''

سلامت یوں پکڑے جانے کے باعث ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں جاکھے کا براتی ہوں۔ میرا نام سلامت علی ہے۔ ہمیں جانے دیں جنابِ عالی۔۔۔! ہماری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم ایسی غلطی پھر کبھی نہیں کریں گے۔''

شینا نے منہ پر دوپٹا ڈال لیا تھا۔ خود کو چھپا رہی تھی۔ رونے کے انداز میں بولی۔ ''جواد صاحب! آپ ہمارے پورے خاندان کو اچھی جانتے ہیں۔ ہمارے محسن بھی ہیں۔ مجھ پر احسان کریں۔ مجھے چھپ کر جانے دیں۔ آپ کارروائی کریں گے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''تم دونوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ ملنے آئے ہو تو اچھی طرح ملو، پر یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ ہماری طرح کوئی بھی ادھر آ سکتا ہے۔ حولات میں کوئی نہیں آئے گا۔ وہاں صبح تک مستیاں کرتے رہو۔ جس کام کے لیے آئے ہو، اسے ضرور کرو۔''

ان دونوں کو حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ شینا رو رہی تھی۔ سلامت نے کہا۔ ''اوکاڑہ میں میری ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میں غریب ہوں۔ پھر بھی دس ہزار دوں گا۔ مجھے جانے دیں۔''

''کیا اپنی معشوق کو چھوڑ کر جاؤ گے؟''

وہ بولا۔ ''ایک بڑے گھرانے میں میری بہن کا رشتہ ہو چکا ہے۔ میں گناہ کرتا ہوا پکڑا جاؤں گا تو رشتے سے انکار ہو جائے گا۔ میری بہن کا گھر بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گا۔''

وہ بولا۔ ''شینا بھی کسی کی بہن ہے۔ اس کے ساتھ منہ کالا کرتے وقت تم نے اپنی بہن کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟ اور جب نہیں سوچا تو اب کیوں سوچ رہے ہو؟''

پھر وہ شینا سے بولا۔ ''تمہیں بدنام ہونے سے صرف میں ہی بچا سکتا ہوں۔ اگر نیک نامی چاہتی ہو تو یہ بیان لکھ دو کہ جاکھے کی دلہن کے ساتھ تمہارے بھائی نے زیادتی کی ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میرا بھائی گناہ گار نہیں ہے۔''

''اسی طرح قسم کھا کر کہہ دو کہ واردات کس نے کی تھی؟ یہ بات تو پکی ہے کہ تم اسے جانتی ہو۔ کیونکہ وہ شکوریا، کاچھی یا باسو میں سے کوئی ایک ہے۔''

''میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔''

''جتنی قسمیں یاد ہیں، سناتی رہو مگر یہ بات سب ہی کی سمجھ میں آ رہی ہے کہ بلال کو بدنام کرنے کے لیے وہ واردات ان تینوں نے کی ہے یا کسی سے کرائی ہے۔''

وہ ذرا چپ رہی۔ بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔ کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''آپ یقین کریں، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ مردوں کے معاملات ہیں۔ وہ لوگ گھر سے باہر کیا کرتے ہیں؟ گھر کی عورتوں کو نہیں بتاتے۔ مگر میں سچ کہتی ہوں، وہ تینوں بے قصور ہیں۔''

جواد نے ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا۔ اس کے منہ

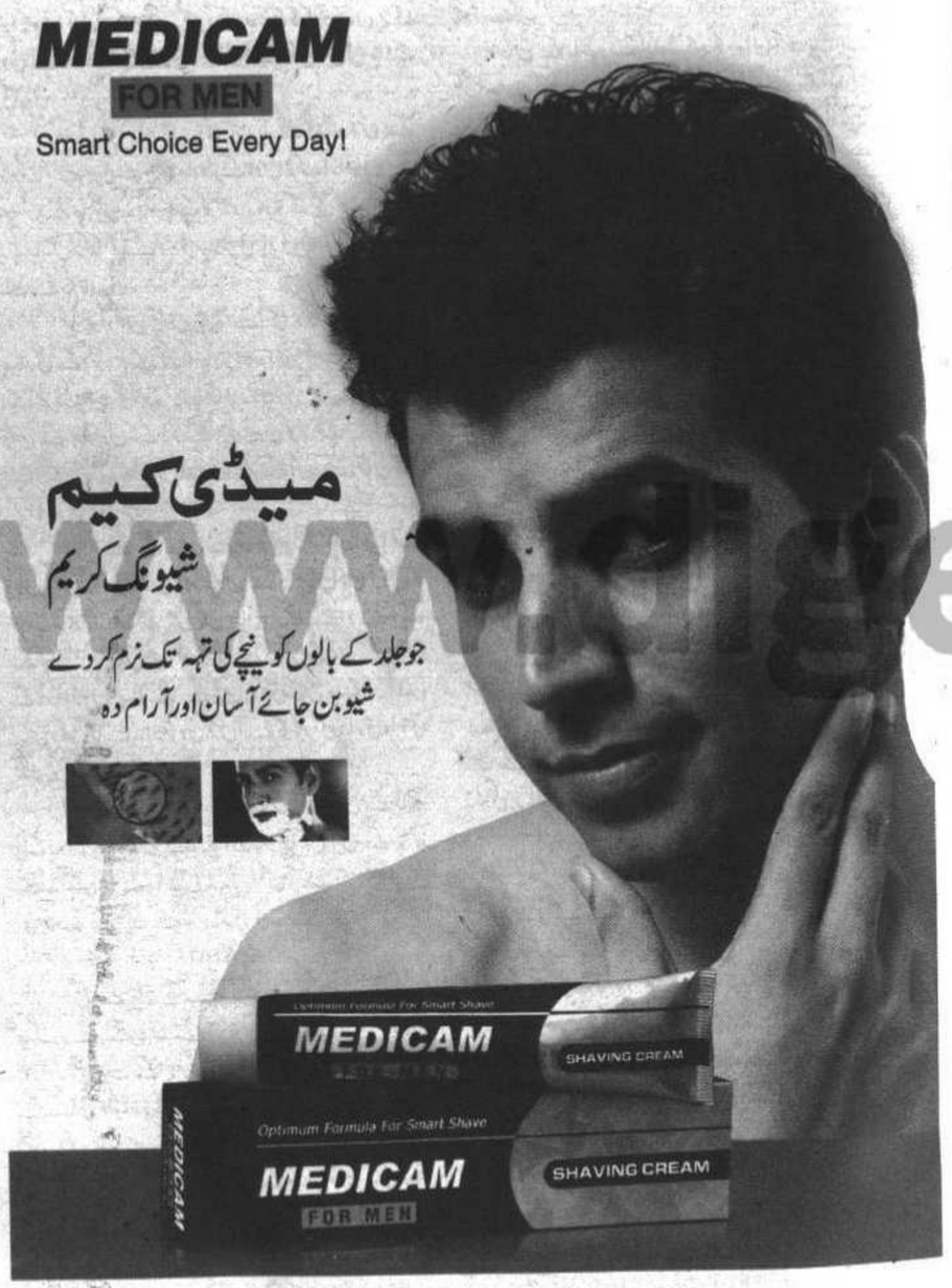

سے چیخ نکل گئی۔ وہ رونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''ہم پولیس والے عورتوں پر ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں اور ہاتھ صاف بھی کرتے ہیں۔ جب میرے بعد میرے سپاہی بھی تیرا آپریشن کریں گے تو تُو چیخ چیخ کر سچ بولنا شروع کر دے گی۔''

سلامت کو حوالات کی دوسری کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ وہاں اس کی تلاشی لی گئی تو شینا کی لکھی ہوئی چٹھی ملی جس میں اس نے لکھا تھا کہ رات کو اس سے ملنے آئے گی۔ دوسرے کمرے میں جواد نے شینا کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تلاشی لینے دے۔''

وہ اس سے کترانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

وہ اسے دبوچتے ہوئے بولا۔ ''تیرے پاس تو خزانے ہیں۔''

اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہ چٹھی نکالی۔ جس میں سلامت نے لکھا تھا کہ وہ آج رات اس سے ٹوٹی ہوئی پلیا کے پاس ملنا چاہتا ہے۔ یوں دونوں تحریریں بڑے کام کی تھیں۔ جواد پر کوئی الزام آنے والا نہیں تھا۔ وہ دونوں چٹھیاں ثابت کرتی تھیں کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے یار کے ساتھ بھاگنے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔

اس سارے کھیل میں روبینہ کے مجرم کو بے نقاب کرنا ضروری تھا اور ابھی تک بات نہیں بن رہی تھی۔ جواد نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر پوچھا۔ ''عزت سے واپس جانا چاہتی ہے یا نہیں؟''

وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوششیں کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ خدا جانتا ہوں ہے، میں سلامت کے پاس محبت سے کچھ باتیں کرنے آئی تھی۔ ایک ذرا گناہ کا خیال بھی نہیں تھا۔ میں بے حیائی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ خدا کی قسم مر جاؤں گی۔ مجھے برباد نہ کرو۔''

''دلہن کے ساتھ جو بے حیائی ہوئی، اسے دیکھ کر خوش ہوتی رہی کیونکہ بلال پر الزام آ رہا تھا۔ بہرحال مجھے بلال سے کچھ لینا نہیں ہے۔ ایسی ہی شرم والی ہے تو ان تینوں کے خلاف سچ بول۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تجھے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تُو عزت آبرو سے گھر جائے گی۔''

اس نے شینا کو چھوڑ دیا پھر کہا۔ ''میں صبح تک سوچنے سمجھنے کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر سچ نہیں بولے گی۔ تحریری بیان نہیں دے گی تو تیری آبرو کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکلے گا۔''

وہ اسے دھمکی دے کر سونے کے لیے چلا گیا۔ اس تھانے میں کل چار سپاہی تھے۔ ایک اپنے گھر میں بیمار پڑا تھا۔ باقی تین میں سے دو سو گئے۔ ایک پہرے داری کے لیے جاگتا رہا۔ شینا اور سلامت کو الگ الگ کمروں میں رکھا گیا تھا۔ انہیں اتنی چالاکی اور مکاری نہیں آتی تھی کہ ایک سپاہی کو دھوکا دے کر فرار ہو جاتے۔ وہ صرف دعائیں مانگ رہے تھے کہ نصیب پھر جائے اور انہیں عزت سے رہائی مل جائے۔

ایسے حالات میں عورت کی آبرو ہمیشہ لوٹی جاتی ہے۔ شینا سمجھ گئی تھی کہ جواد اسے نہیں چھوڑے گا اور سلامت کے ساتھ بدکاری کے جرم میں پورے چک والوں کے سامنے، برادری کے سامنے کیچڑ اچھالے گا۔ پھر حدود آرڈیننس کے تحت اسے سزا دلائے گا۔

وہ کوٹھڑی کے فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اگرچہ میری دشمن تھی مگر شرم والی تھی۔ اس کے اندر خاندانی شرافت اور خودداری تھی۔ اگر اس کے ساتھ زیادتی ہوتی تو وہ کسی کو منہ دکھانے سے پہلے ہی جان پر کھیل جاتی۔

ایسی خودداری اور شرافت کے باوجود اس نے آج شام کو ہی مجھ پر کیچڑ اچھالی تھی کہ میں اس سے گندی باتیں کر رہا ہوں اور اسے بھگا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ ایسا شرمناک الزام لگاتے وقت اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرے ساتھ نہ سہی، کسی دوسرے کے ساتھ بھاگنے کا الزام اس پر آئے گا اور اس کی شرم و حیا بدنامی کے چولھے پر چڑھا دی جائے گی۔ اس وقت وہ حوالات کے فرش پر نہیں چولھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تھانے دار آ کر چولھا گرم کرنے والا تھا۔

ان لمحات میں وہ لٹ جانے والی دلہن کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب روبینہ کے نام کے ساتھ میری بدنامی ہو رہی تھی تو وہ بہت خوش تھی۔ اب ایسا ہی زخم اسے لگنے والا تھا۔

اپنا گھر جلنے والا تھا۔ اس لیے ابھی سے جلن سمجھا رہی تھی کہ وہ پچھلی غلطیوں کا حساب کرے۔ کان پکڑے، توبہ کرے۔ اگر میں سامنے آ جاؤں تو مجھ سے معافی مانگے۔ شاید توبہ کرنے سے اللہ اسے معاف کر دے اور اسے وہاں سے نجات مل جائے۔

جب غلطیوں پر غلطیاں ہوتی چلی جاتی ہیں اور پانی سر سے گزر جاتا ہے، تب کوئی مدد کے لیے نہیں آتا۔ تقدیر بھی کہتی ہے کہ اپنے اعمال کی سزا ابھی ملے گی اور اسی جگہ ملے گی۔ وہ منہ پر آنچل رکھ کر رو رہی تھی۔ یوں آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جا کر مر جائے؟ اور ہمیشہ کے لیے منہ چھپا لے۔

رات کے دو بجے دو سپاہیوں نے آکر اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تاکہ حلق سے آواز نہ نکال سکے۔ پھر ایک نے کہا۔ ''تیرا باپ اور تیرا پھوپھا آیا ہے۔ ان کو یہ نہیں بتایا جائے گا کہ تو یہاں پڑی ہوئی ہے۔ جب مک مکا ہو جائے گا تو تجھے بھی مکتی مل جائے گی۔''

وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ اس کے بزرگ اسے ہر قیمت پر تھانے دار کے ہوس ناک ارادوں سے بچا کر لے جائیں۔ اگر باپ کو معلوم ہوتا کہ بیٹی کو جبراً حبسِ بے جا میں رکھا گیا ہے تو وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر اسے وہاں سے لے جاتا۔

مگر جواد ان تینوں میں سے کسی کو دلہن کے ساتھ بدکاری کے الزام میں جکڑنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک طرف شینا کو مجبور کر رہا تھا اور دوسری طرف جاکھا اور دلہن کے بھائیوں کے ذریعے ان تینوں کو ٹریپ کر رہا تھا۔ اب انہیں مختلف پہلوؤں سے مجبور کر کے ان سے اقبالِ جرم کرانا رہ گیا تھا۔

ایسا کرنے کے لیے اسے تھانہ چھوڑ کر چک جانا تھا۔ وہاں دلہن دولھا والوں اور پنچوں کے درمیان ان تینوں کا محاسبہ کرنا تھا۔ تھانے میں تین سپاہی تھے۔ جواد نے ایک سے کہا۔ ''تم یہاں شینا اور سلامت کی نگرانی کرو گے۔ ان کے دروازوں پر تالے لگے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ انہیں یہاں رکھا گیا ہے۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا پھر بھی ہماری واپسی تک چوکنا رہنا۔''

وہ ایک سپاہی کو ہدایات دے کر دو سپاہیوں کے ساتھ چک روانہ ہو گیا۔ میرے چچا اور پھوپھا بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہیں جاتے جاتے ایک ذرا بھی آہٹ نہیں ملی کہ بیٹی اسی تھانے کے پچھلے حصے میں بند پڑی ہے۔

☆☆☆

صبح کے چار بج رہے تھے اور چک کے تمام لوگ جاگ رہے تھے۔ تھانے دار جواد، دلہن اور .... تمام رشتے دار اور پنچائیت کے بزرگ چارپائیوں اور کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ باقی افراد زمین پر بیٹھے یا کھڑے ہوئے تھے اور شکوریا کو دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو کے کہہ رہا تھا۔ ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں، میں نے کسی کی بہن کے ساتھ زیادتی نہیں کی ہے۔ دلہن روبینہ کے بھائی مجید نے میری بہن شینا کو اغوا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے، میں روبینہ کا مجرم ہوں۔ اس لیے وہ معصوم شینا سے انتقام لے رہا ہے۔ اسے کسی جگہ قیدی بنا کر کہہ رہا ہے کہ میں اپنا جرم قبول کر لوں۔ اگر ایسا نہیں کروں گا تو وہ میری بہن کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔''

دلہن کے باپ نے کہا۔ ''مجید کو یہاں آکر یہ ثابت کرنا چاہیے کہ شکوریا نے اس کی بہن کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے گا تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو قتل کر دوں گا۔''

دلہن کے بڑے بھائی اشرف نے کہا۔ ''ہم اپنے بھائی مجید کی جگہ یہاں موجود ہیں۔ بعض مجرموں کے خلاف کبھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ شکوریا، باسو اور کاچھی میں سے کوئی ایک مجرم ہے۔ پر ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے بھائی مجید کے خلاف بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے شینا کو اغوا کیا ہے۔''

دلہن کے دوسرے بھائی اسد نے کہا۔ ''شینا نہ تو مجید کے پاس ہے، نہ میرے بھائی نے یہ کہا ہے کہ وہ شینا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔''

جواد نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''دونوں طرف سے ایک دوسرے کو الزامات دیے جا رہے ہیں۔ اصل مجرم پکڑا نہ گیا تو یہ جھگڑا برسوں تک چلتا رہے گا۔ ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ جس طرح شکوریا کو پورا یقین ہے کہ مجید نے اس کی بہن کو اغوا کیا ہے۔ اسی طرح مجید کو بھی کسی شک و شبے کے بغیر یقین ہے کہ شکوریا، باسو یا کاچھی نے روبینہ کی زندگی برباد کی ہے۔''

شکوریا نے کہا۔ ''ابھی ایک گھنٹا پہلے اشرف نے کھیتوں میں مجھ سے کہا تھا کہ اس کا بھائی مجید ہماری شینا کو اٹھا کر لے گیا ہے۔''

اشرف نے کہا۔ ''یہ جھوٹا ہے۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

جواد نے کہا۔ ''بس ایک دوسرے کو الزام دیتے رہو اور انکار کرتے رہو۔ اس طرح یہ بات نہیں بنے گی۔ یاد رکھو جس طرح دلہن کی عزت واپس نہیں آسکتی اسی طرح شینا واپس نہیں آئے گی۔ واپس لانے کے لیے جو بھی مجرم ہے، اسے جرم قبول کرنا پڑے گا۔''

باسو نے کہا۔ ''جو جرم ہم نے کیا ہی نہیں ہے، اسے زبردستی کیسے قبول کر لیں؟''

اشرف نے کہا۔ ''یہ بات پورا گاؤں، پورا علاقہ جانتا



ہے کہ بلال سے تم تینوں کی پرانی دشمنی ہے۔ ہمارا دماغ ہمارا تجربہ کہتا ہے کہ بلال کو پاگل، جنونی اور ہوس پرست ثابت کرنے کے لیے اسے ایک انگوٹھی کے ذریعے پھانسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس انگوٹھی کو صرف باسو نے بلال کے پاس دیکھا تھا۔ کسی اور نے نہیں دیکھا تھا۔ بعد میں وہ انگوٹھی ہماری بہن کی نہیں نکلی۔''

جواد نے کہا۔ ''سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ شکوریا، کاچھی اور باسو انکار نہیں کر سکتے کہ وہ بلال کے دشمن ہیں۔ میں ایک پولیس افسر ہوں۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ یہ یقین سے کہتا ہوں کہ ان تینوں نے اگر دلہن کے کمرے میں واردات نہیں کی ہے تو کسی سے ضرور کرائی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، یہ اس مجرم کو پیش کریں گے تو میں کسی بھی طرح شینا کو واپس لے آؤں گا۔''

حشمت لوگوں کی بھیڑ میں سب سے پیچھے تھا۔ شکوریا، باسو اور کاچھی سے کترا رہا تھا۔ ان کی طرف سے آنے والی موت کا رخ پھیرنے کے لیے اپنے طور پر ایک چال چل چکا تھا۔ نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر وہاں اچانک ہی حالات بدل گئے تھے۔ وہ تینوں اپنی بہن کو واپس لانے کے لیے مجبوراً کہہ سکتے تھے کہ واردات انہوں نے نہیں، حشمت نے کی ہے۔

اس وقت جواد ان تینوں سے کہہ رہا تھا۔ ''اگر شینا کو عزت آبرو سے واپس لانا چاہتے ہو تو کسی بحث میں نہ پڑو۔ تو بھی مجرم ہے، اسے چپ چاپ پیش کر دو۔ اگر وہ خطرناک ہے۔ اس سے ڈرتے ہو تو اس کا نام اور پتا خاموشی سے مجھے بتا دو، میں اسے قبر سے بھی نکال لاؤں گا۔ فیصلہ تم تینوں پر اور تمہارے بزرگوں پر ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ شینا کو عزت آبرو سے واپس لانا چاہتے ہو یا نہیں؟''

حشمت وہاں سے پلٹ کر لوگوں کی بھیڑ سے دور آیا۔ پھر اپنا فون نکال کر نمبر پنچ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہونے پر جھنجلا کر بولا۔ ''میں رات دس بجے سے کال کر رہا ہوں، تمہارا فون بند کیوں تھا؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''بیٹری ڈاؤن تھی۔ میں کہیں ایک جگہ رہ کر فون کو چارج نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نہیں جانتے، یہاں کن حالات سے گزر رہا ہوں؟''

''تم جیسے بھی حالات سے گزر رہے ہو، یہ بتاؤ، میرا کام ہو گیا ہے یا نہیں؟''

''نہیں۔۔۔ ہم نے زرینہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ پر پولیس کی نظروں میں آگئے۔ میرے آدمی اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ میں نے ابھی ایک ہوٹل میں آکر فون کو چارجر سے لگایا ہے۔ آپ کو بتانے والا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔''

''لعنت ہے تم پر۔۔۔''

اس نے غصے سے فون بند کر دیا۔ اس کی ساری پلاننگ خاک میں مل گئی۔ باسو کی بہن زرینہ کا رشتہ طے ہونے والا تھا۔ وہ اپنی پھوپھی کے ساتھ فیصل آباد گئی ہوئی تھی۔ حشمت نے کرائے کے مجرموں کو اچھی خاصی رقم دے کر کہا تھا کہ زرینہ کو اغوا کر کے اپنے خفیہ اڈے لے جائیں۔ وہ دوسرے دن وہاں آئے گا۔

اس نے سوچا تھا، باسو کی بہن کو یرغمال بنا کر انہیں بتائے گا کہ وہ ان کی باتیں چھپ کر سن چکا ہے۔ وہ تینوں اسے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اب نہیں کریں گے۔ اپنی بہن کی عزت و آبرو سے واپسی کے لیے حشمت کی سلامتی چاہیں گے اور پکے کاغذ پر یہ لکھیں گے کہ انہوں نے اسے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اب ایسا نہیں کریں گے۔ آئندہ اس کے محافظ بن کر رہیں گے۔

وہ اپنے مقصد کے لیے باسو کی بہن زرینہ کو اسی طرح اغوا کرانا چاہتا تھا، جس طرح تھانیدار اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے شینا کو اغوا کرا چکا تھا۔ یہ حشمت کی بدنصیبی تھی کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا اب ان تینوں پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس ان تینوں میں سے کسی کے ہاتھوں مارا جانے والا تھا۔

موجودہ حالات کہہ رہے تھے کہ وہ شینا کی واپسی کے لیے اسے تھانے دار اور روبینہ کے بھائیوں کے حوالے کر دیں گے۔

وہ دور کھڑا لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔ اس بھیڑ میں صرف وہ تین بھائی اس کے جانی دشمن نہیں تھے۔ دلہن روبینہ کے تینوں بھائی بھی کسی وقت اس کی تکا بوٹی کر سکتے تھے۔ بس انہیں اتنی سی بات معلوم ہونی تھی کہ جلہ عروسی میں جانے والا بدکار حشمت تھا۔

اس نے اپنے فون پر شکوریا کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ چند لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو حشمت! تم کہاں ہو؟''

''یہ نہ پوچھو کہ میں کہاں ہوں؟ یہ سمجھو کہ ہم سب کس طرح قانونی گرفت میں آنے والے ہیں۔ روبینہ کے بھائی اور جاکھے کے مسلح کارندے ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''تم یہاں آکر ہم سے بات کرو۔''



www.paksociety.com

"پہلے میری بات سنو اور سمجھو۔ اپنی بہن کو واپس لانے کے لیے مجھے سب کے سامنے بدکار کہو گے۔ مجرم کہو گے تو تم تینوں میرے جرم میں برابر کے شریک کہلاؤ گے۔ کیونکہ تم تینوں ہی چشم دید گواہ ہو۔"

شکوریا نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ یہاں ہم سے پوچھا جائے گا کیا ہم تمہارے جرم میں شریک رہے ہیں؟ ہم نے اسی وقت تمہیں گرفتار کیوں نہ کرایا، جب تم روبینہ کے پاس گئے تھے۔ یہ بھی ثابت ہوگا کہ ہم بلال پر الزام دھرنے کے لیے خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔"

حشمت نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ میں نے اسی لیے فون کیا ہے کہ اپنی بہن کے اغوا ہونے سے غیرت میں نہ آؤ۔ بہن کی واپسی چاہو گے تو میرے ساتھ تم تینوں بھی حرام موت مرو گے۔ کاچھی اور باسو.... اور اپنے بزرگوں سے کہو، میرا نام زبان پر نہ لائیں۔ میں بہت مہنگا پڑوں گا۔ میرے مقابلے میں بہن سستی پڑے گی۔ روبینہ جیسی اور تمہاری بہن جیسی کتنی ہی لڑکیاں برباد ہوتی رہتی ہیں۔ آج ایک نقصان برداشت کرو گے۔ اپنی بہن کو روبینہ کی طرح برباد اور بدنام ہونے دو گے تو اس کے عوض ہم سب کو سلامتی ملے گی۔"

حشمت جو کہہ رہا تھا، وہ ساری باتیں شکوریا کا چھی باسو، میری پھوپھی اور دونوں چچا اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ چشم دید گواہی کے بغیر حشمت کو بدکار نہیں کہا جاسکتا تھا اور وہ تینوں چشم دید گواہ بن کر اس کے جرم میں ذلیل ہونا اور جان سے جانا نہیں چاہتے تھے۔

ان سب نے آخری فیصلہ یہ کیا کہ شینا کے ساتھ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہوگا۔ اسے واپس لایا جائے گا تو وہ روبینہ کی طرح برباد ہو چکی ہوگی۔ ساری زندگی میکے میں منہ چھپا کر رہے گی۔ اب وہ جس حال میں بھی واپس آئے یا نہ آئے، اس کی خاطر تین جوان بھائی حشمت کا نام زبان پر نہیں لائیں گے۔ کبھی یہ اقرار نہیں کریں گے کہ انہوں نے حجلہ عروسی میں اس کے ذریعے واردات کرائی تھی۔

شکوریا کے باپ نے تمام چک والوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ "میرے بیٹے شکوریا نے روبینہ کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے اور نہ ہی یہ کسی وارادت کرنے والے بدکار کو جانتا ہے۔ کسی ٹھوس ثبوت اور چشم دید گواہ کے بغیر تھانے دار جواد صاحب بھی ہمارے تین بیٹوں کو مجرم کہہ رہے ہیں۔ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق میری بیٹی کو اغوا کرایا گیا ہے۔ خدا ہی اس کی حفاظت کرے۔ ورنہ وہ کس حال میں واپس آئے گی اور ہماری عزت کس طرح مٹی میں مل چکی ہوگی؟ یہ آپ تمام بہنوں اور بیٹیوں والے شرم سے سر جھکا کر سمجھ سکتے ہیں۔"

شکوریا نے کہا۔ "میں نے اور میرے بھائی کاچھی اور باسو نے جاکھا کو ہمیشہ اپنا بھائی کہا ہے۔ ہم نے بھائی کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی ذلالت نہیں کی ہے اور نہ ہی ایسی بے حیائی کسی کے ذریعے کرائی ہے۔ میں آپ سب کے سامنے روبینہ کے بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں، یہ لوگ انتقام میں اندھے ہو کر میری بہن کو برباد کریں گے اور بعد میں ہماری بے گناہی کا یقین ہوگا تو پھر یہ پچھتائیں گے۔ بعد میں شرمندہ ہونے سے بہتر ہے، میری بہن مجھے واپس کر دی جائے۔"

روبینہ کے کسی بھائی نے شینا کو اغوا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے قسمیں کھا کر کہہ دیا کہ شینا ان کے پاس نہیں ہے۔ حشمت کو یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ بے نقاب ہونے والا نہیں ہے۔ تھانے دار جواد ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ابھی شینا اس کے قبضے میں تھی۔ وہ اس کی زبان سے اس کے بھائیوں کا کچا چٹھا اگلوا سکتا تھا اور ایسا کرنے کے لیے اس کی عزت کی دھجیاں بھی اڑانے والا تھا۔

اس نے تمام لوگوں سے کہا۔ "یہ بڑے ڈھیٹ ہیں۔ میں آج رات ان کی ڈھٹائی ناک کے راستے نکال دوں گا۔ ان کی بہن یہاں آکر بتائے گی کہ بلال کو بدنام کرنے کے لیے شکوریا، کاچھی اور باسو نے کیسی سازشیں کی تھیں؟ آج دوپہر آپ تمام لوگ اسی جگہ حاضر ہو جائیں۔"

ان تینوں نے اغوا ہونے والی بہن پر اپنی عزت اور سلامتی کو ترجیح دی تھی۔ انہوں نے میرے خلاف کی گئی سازشوں سے اور روبینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی سے انکار کیا تھا۔ حشمت بھی تھوڑی دیر کے لیے مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن تھانے دار کے چیلنج نے پھر ان سب کا اطمینان غارت کر دیا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ پولیس والا ان کی بہن کو کہاں سے لائے گا؟ اور کس طرح اس کے ذریعے ان کی سازشوں... اور جرم کو سب کے سامنے پیش کرے گا؟

حشمت پھر ان تینوں سے آملا تھا۔ وہ چاروں سر جوڑ کر سوچ رہے تھے۔ سمجھنا چاہتے تھے کہ شینا کو کس نے اغوا کیا ہے؟ کیا تھانے دار بدمعاشی کر رہا ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ شینا کہاں ہے اور اس سے کس طرح کام لینا چاہیے؟

کاچھی نے کہا۔ "تھانے دار کی دشمنی مہنگی پڑ رہی ہے۔ وہ ہم سے ناراض ہو کر گیا تھا۔ اب روبینہ کے بھائیوں



کو مہرہ بنا کر ہمارے لیے مصیبتیں لا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں، اسے اچھی خاصی رقم دے کر دوست بنا لینا چاہیے۔"

شکوریا نے کہا۔ "وہ روبینہ کے بھائیوں کو ہمارے خلاف بھڑکا کر ان کا ہمدرد اور دوست بن گیا ہے۔ ان سے رقمیں وصول کر رہا ہوگا۔ اب وہ ہمارے کام نہیں آئے گا۔ ہماری صرف ایک کمزوری شینا ہے۔ وہ ہمیں خیر خیریت سے مل جائے اور جواد کے ہتھے نہ چڑھے تو پھر وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

حشمت نے پوچھا۔ "مگر شینا ہے کہاں؟ میری عقل کہتی ہے، اسے جواد نے یا روبینہ کے بھائیوں نے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔ اگر ہم اپنے آدمیوں کے ساتھ دور ہی دور سے ان سب کی نگرانی کرتے رہیں گے تو شاید شینا کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔"

کاچھی نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، یوں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جواد دوپہر کو پھر یہاں مجمع لگائے گا۔ ہمیں اس سے پہلے معلوم کرنا چاہیے کہ شینا کہاں ہے اور وہ تھانے دار اسے اچانک ہی کہاں سے لائے گا؟"

وہ سب بولتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔ اب وہ تھانے دار اور روبینہ کے بھائیوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ سب کہاں ہیں اور کیا کرتے پھر رہے ہیں؟

☆☆☆

عینی بظاہر مجھ سے دور دور رہتی تھی۔ ہماری محبت کو خواہ مخواہ افواہوں کی زد میں لانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آدھی رات کے بعد فون کے ذریعے میرے قریب آجاتی تھی۔ جس رات شینا کو اغوا کیا گیا، اس رات سب ہی جاگ رہے تھے۔ اسے فون پر بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

میں نے امی سے فون پر پوچھا۔ "وہاں حالات کیسے ہیں؟ کیا شینا واپس آگئی ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں ہے بیٹے! وہ ہم سے ہزار دشمنی کریں۔ پھر بھی شینا ہمارے خاندان کی بچی ہے۔ پتا نہیں کہاں گم ہو گئی ہے؟ خدا ہی جانتا ہے، یہاں بے شمار لوگ اسے تلاش کرنے کے لیے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہاں گیرج کا ایک کاریگر میرا دوست ہے۔ بیچارہ آدھی رات کو میری جیپ کی مرمت میں لگا ہوا ہے۔ ابھی یہ ٹھیک ہو جائے گی تو میں یہاں سے شینا کو تلاش کرتا ہوا آتا ہوں۔"

"آجاؤ بیٹے! میں نہیں چاہتی کہ لوگ تم پر شبہ کریں۔ خدا کا شکر ہے۔ ابھی تمہارے خلاف کوئی نہیں بول رہا ہے۔"

"شینا کے اغوا کے سلسلے میں کیا رائے قائم کی جا رہی ہے؟"

"روبینہ کے میکے سے آنے والی عورتیں اور مرد کہہ رہے ہیں کہ شکوریا، باسو اور کاچھی نے تم سے دشمنی نکالنے کے لیے روبینہ کو برباد کیا ہے۔ تمہاری پھوپھی، چچی اور دونوں چچا کہہ رہے ہیں کہ روبینہ کے بھائیوں نے شینا کو اغوا کیا ہے۔"

"امی! آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بولیں۔ "ہم برسوں سے خود غرض تھانے دار کی مکاریاں دیکھتے آرہے ہیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آرہی ہے کہ وہ تمہارے تینوں دشمنوں... اور روبینہ کے بھائیوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ اس نے شینا کو اغوا کرایا ہے اور دونوں پارٹیوں سے بھاری رقمیں وصول کر رہا ہے۔"

"ہاں۔ وہ ایسی ہی چالیں چلتا ہے، جن کے نتیجے میں اس کی اچھی خاصی کمائی ہوتی رہتی ہے۔ آپ کی باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔ میں اپنے طور پر بھی تھانے دار کو ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔"

میں فون بند کر کے تھانے دار کے متعلق سوچنے لگا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے تینوں دشمنوں سے ناراض ہے۔ ظاہر ہے، لین دین کے معاملات میں اختلافات پیدا ہوئے ہوں گے۔ وہ پولیس والا ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ یقیناً ان کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہا ہوگا۔

وہ ایسا کم ظرف اور کمینہ تھا کہ انتقام لینے کے لیے اور مخالفین کو سزائیں دینے کے لیے ان کی بہنوں اور بیٹیوں کو بھی اٹھوا لیتا تھا۔ تقریباً چار برس پہلے اس نے ایک بار ایک مزارعے کی بیٹی کو اٹھوا لیا تھا اور الزام دوسرے مزارعے پر ڈال کر اسے جیل بھیج دیا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

رات کے ایک بجے فون پر عینی کی رس بھری آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "میں زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گی۔ گھر میں سب ہی جاگ رہے ہیں... بلکہ آج تو پورا چک جاگ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ شینا کا معاملہ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "سنگینی کے باوجود یہ اطمینان ہے کہ لوگ تمہارے خلاف نہیں بول رہے ہیں۔ تمہاری پھوپھی اور چچی کے علاوہ دوسری عورتیں بھی روبینہ کے بھائیوں کے خلاف بول رہی ہیں اور اس کے میکے والے انہیں الزام



www.digestpk.com

Asifzamil

دے رہے ہیں۔ ہوا کا رخ ایک دم سے بدل گیا ہے۔ اب تمہیں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"میں ایک گھنٹے بعد ہی یہاں سے نکل سکوں گا۔"

"ابھی معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پھوپھا اور دونوں چچا تھانے کی طرف گئے ہیں۔ اتنی بڑی واردات ہوگئی ہے اور تھانے دار کہیں آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یقیناً اس کے آرام اور اطمینان کے پیچھے کوئی راز ہوگا۔ مجھے اس سے بات کرنی پڑے گی۔"

"تم پولیس والوں کے منہ نہ لگو۔ سیدھے یہاں چلے آؤ۔"

پھر اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "سوری کوئی آرہا ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ پھر کسی وقت بات کروں گی۔"

اس نے اچانک ہی بولتے بولتے فون بند کر دیا۔ میں نے حسرت سے فون کو دیکھا۔ کاریگر نے کہا۔ "جیپ اے ون ہوگئی ہے۔ اسے اسٹارٹ کرو۔"

میں گیرج میں تھا۔ صحیح وقت پر جیپ کی مرمت ہوگئی تھی۔ میں نے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ کاریگر کا معاوضہ ادا کرنے کے ساتھ اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پھر وہاں سے چل پڑا۔ چک چوالیس اور پینتالیس کے درمیان ایک چھوٹا سا تھانہ تھا۔ ان علاقوں میں جواد اکبر کی حکمرانی تھی۔ میں اس سے ملاقات کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ شکوریا کی بہن کے سلسلے میں کچھ کر رہا ہے یا اپنے طور پر کوئی بازی کھیل رہا ہے؟

جواد اکبر رات کے دو بجے ہی میرے پھوپھا اور چچا کے ساتھ چک کی طرف چلا گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو تھانے میں صرف ایک ہی سپاہی تھا۔ وہاں کے تمام سپاہی زمینداروں کو جانتے تھے۔ ہم بوقتِ ضرورت انہیں کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

وہاں اکلوتے سپاہی نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں سناٹا کیوں ہے؟ جواد صاحب اور باقی سپاہی کہاں ہیں؟"

وہ بولا۔ "آپ شینا کے معاملے سے تو باخبر ہی ہوں گے۔ وہ چک چوالیس میں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "وہ سب ادھر ہیں۔ پر شینا کہاں ہے؟ تمہارے جیسے سپاہی اپنے تھانے دار کے اندر کی باتیں خوب جانتے ہیں۔"

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ کبھی جانتے ہیں۔ کبھی نہیں جانتے۔ وہ کبھی کبھی ہم سے بہت کچھ چھپاتے ہیں۔"

"شینا کے بارے میں بھی چھپا رہے ہوں گے؟"

وہ بے اختیار سر ہلا کر بولا۔ "جی ہاں۔۔۔"

میں نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ "کیا چھپا رہے ہیں؟"

وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر بولا۔ "کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔"

"یعنی کچھ نہیں چھپا رہے اور نہیں چھپا رہے تو پھر تم جانتے ہوگے۔"

وہ سنبھل کر بولا۔ "آپ بڑی ہیرا پھیری سے کر رہے ہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ آپ صاحب سے بات کریں۔ وہ چک چوالیس میں ملیں گے۔"

میں نے اس پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا۔ میں نے کہا۔ "مجھے یاد آرہا ہے، کوئی چار یا پانچ ماہ پہلے تم نے کہا تھا، تمہاری بیٹی کا رشتہ کہیں طے ہوگیا ہے۔ کچھ رقم جمع ہوگی تو تاریخ پکی کرو گے۔"

میں نے اس کی پریشانی کو سمجھا اور اس کی ضرورت کو چھیڑا تو اس نے ہائے کے انداز میں کہا۔ "ہاں۔ ہماری اوقات کیا ہے؟ لاکھوں روپے نہ کما سکتے ہیں، نہ لٹا سکتے ہیں۔ پچیس پچاس ہزار میں بیٹی کو رخصت کر دیتے ہیں۔ پر ایسے چھوٹے اور ویران تھانوں میں نوکری کرنے والوں کو اتنی رشوت بھی کہیں سے نہیں ملتی۔ جو ملتی ہے، وہ صاحب لے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرے کام آؤ گے تو صاحب کی جھولی میں ایک پیسہ بھی نہیں جائے گا۔ بڑی رازداری سے پچاس ہزار تمہیں ملیں گے۔"

اس نے اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی حاصل نہیں کی تھی۔ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا، میں نے کہا۔ "ابھی پانچ ہزار دوں گا۔ صبح نو بجے بینک کھلتا ہے۔ اوکاڑہ چلو گے تو وہاں بقیہ پینتالیس ہزار مل جائیں گے۔"

یقیناً اس کے تصور میں بیٹی دلہن بن رہی ہوگی۔ ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت ابھر رہے ہوں گے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہیں پیچھے والی کوٹھری میں شینا کو قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ جوان بیٹی کا باپ تو جانتا تھا۔ شینا بھی اس کی بیٹی کی ہم عمر ہوگی۔ اس کے دل میں ایک ذرا یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ اس کی اپنی بیٹی اس کوٹھری میں ہوتی اور تھانے دار اس کی عزت لوٹنے کی دھمکیاں دے چکا ہوتا تو



ایک باپ کے دل پر کیا گزرتی؟

پرائی بہنوں اور بیٹیوں کے لیے کوئی ایسے نہیں سوچتا۔ مگر ہاں۔۔۔ ضرورت سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے ضرورت مند تھا۔ اس کے اندر پچاس ہزار دھماکے کر رہے تھے۔ وہ غیرت مند اور ایماندار بن کر سوچنے لگا۔ "مجھے شینا جیسی مظلوم لڑکی سے نیکی کرنی چاہیے۔ میں اپنی بیٹی کو سہاگن بنانے کے لیے نیکی کر کے پچاس ہزار لوں گا تو یہ رشوت نہیں ہوگی۔ مجھے ثواب بھی ملے گا۔"

میں سمجھ رہا تھا، گاؤں دیہاتوں میں پچیس برسوں سے لاٹھی لے کر یا زنگ آلود بندوق لے کر پھرنے والا وہ سپاہی پچاس ہزار کے نوٹوں سے پرزہ پرزہ ہو کر ہواؤں میں اڑ رہا ہوگا۔ میں چپ تھا، اسے اڑتے رہنے کا اور پھر ضرورت کی دہلیز پر آگرنے کا موقع دے رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "صاحب کو پتا چلے گا تو وہ میری بیوی اور بیٹی سمیت مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔ وہ ایسے ظالم ہیں کہ ہمیں زندہ جلا دیں گے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھ پر بھروسا کرو۔ جواد کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ تم نے مجھے شینا کے بارے میں اہم باتیں بتائی ہیں۔"

"اسے معلوم ہو جائے گا۔ فرض کریں، اس نے شینا کو کہیں چھپایا ہے۔ آپ اسے وہاں سے لے جائیں گے تو یہ بات صاحب سے کیسے چھپی رہے گی؟"

"چھپے گی۔ ہم ڈراما کریں گے۔ تم جواد سے کہو گے کہ میں نے تمہیں بندوق کے نشانے پر رکھ کر تمہاری پٹائی کی ہے۔ تمہیں یہاں باندھ کر چھوڑ گیا ہوں اور شینا کو لے گیا ہوں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ مسلح کارندے تھے۔"

وہ قائل ہو رہا تھا اور ہاں کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں یہ کہنا ہوگا کہ شینا کو لے جانے والے منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے تھے۔ تم آئندہ انہیں چہروں سے نہیں پہچان سکو گے۔"

وہ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "پر۔۔۔ وہ پچاس ہزار مجھے کیسے ملیں گے؟ میں تو یہاں بندھا پڑا رہوں گا اور آپ مجھے پوری رقم دیے بغیر شینا کو یہاں سے لے جائیں گے۔"

"تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا ہوگا۔ میں صبح بینک کھلتے ہی رقم نکال کر تمہاری بیوی کے پاس بڑی رازداری سے پہنچا دوں گا۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ میں نے اپنی مٹھی اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ گھونسا جس کے منہ پر پڑتا ہے، وہ خون تھوکنے لگتا ہے۔ تم بوڑھے ہو مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ ایسی پٹائی کروں گا کہ شینا کے بارے میں سچ بولنے لگو گے۔ فوراً فیصلہ کرو۔ مار کھا کر اپاہج بنو گے یا مجھ پر بھروسا کر کے بیٹی کو سہاگن بناؤ گے؟"

"آ۔ آپ مار پیٹ والی بات نہ کریں۔"

"میں اس سے بھی آگے ایک کام کروں گا۔ اپنے آدمیوں سے تمہاری بیٹی کو اغوا کراؤں گا۔ پھر اپنے خلاف بیان دینے کے لیے تمہیں یہاں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ سہما ہوا تھا، یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اس نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ "آپ مجھے پورے پچاس ہزار دیں گے ناں؟"

"ضرور دوں گا۔"

"صبح بینک کھلنے کے بعد وہ رقم میری بیوی تک ضرور پہنچ جائے گی ناں؟"

"اگر میں شینا کے معاملے میں مصروف رہا تو شام تک رقم پہنچا دوں گا۔ اب وقت برباد نہ کرو۔ بتاؤ شینا کہاں ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ یہیں پیچھے حوالات میں ہے۔"

میں ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ "چابیاں کہاں ہیں؟ چلو۔۔۔ تالا کھولو۔"

"چابیاں میرے پاس ہیں۔ گریبان تو چھوڑیں۔"

میں نے اسے آگے چلنے کے لیے دھکا دیا۔ پھر اس کے ساتھ تھانے کے پچھلے حصے میں آگیا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ کھڑکیاں نہیں تھیں۔ لکڑی کے دروازے تھے۔ ایک دروازہ کھلنے کے بعد شینا نظر آئی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے لگ رہا تھا کہ دیر تک روتی اور پریشان ہوتی رہی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تو حیران ہوئی۔ پھر فوراً ہی تڑپ کر گھسٹتی ہوئی میری طرف آنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے جھک کر اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھولنے لگا۔

وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں تمہاری چھوٹی بہن ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں سمجھ گئی ہوں، تھانے دار سے مل کر دشمنی کرنے آئے ہو۔ میں رشتہ بھول گئی تھی۔ تم نہ بھولو۔



www.digestpk.com

Asifzamil

ہم ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چپ ہوجاؤ۔ میں دشمن نہیں ہوں۔ تھانے دار جواد یہاں نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

وہ بے یقینی سے میرا منہ تکنے لگی پھر بولی۔ "سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ گے؟"

"ہاں۔ چلو اٹھو۔۔۔ جلدی کرو۔"

اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں لے جارہے ہو؟ تھانے دار مجھے ہاتھ تو نہیں لگائے گا ناں؟"

میں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "میری بہنا! میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔"

وہ دھاڑیں مار کر روتی ہوئی میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ "بھائی بلال! بس ایک بار مجھے بچالے۔ میں ساری زندگی تیری سچی بہن بن کر رہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ تُو جانے اور تیرا ایمان جانے۔ تو اچھی رہے گی یا بری بن کر رہے گی۔ ہر حال میں پہلے بھی میری بہن تھی آئندہ بھی رہے گی۔"

میں اسے قدموں سے الگ کر کے رسیاں اٹھا کر سپاہی کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگا۔ وہ حیرانی سے یہ دیکھنے لگی کہ سپاہی کسی اعتراض کے بغیر چپ چاپ خود کو بندھوا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "آپ کی بہن کے ساتھ ایک اور قیدی ساتھ والے کمرے میں ہے۔ ہم ان دونوں کو ٹوٹی ہوئی پلیا سے پکڑ کر لائے تھے۔"

میں نے شینا سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں اپنی غلطی کی وجہ سے یہاں پہنچی ہوں۔ یہاں سے تم لے جاؤ گے تو چک میں جا کر بدکار کہلاؤں گی۔"

میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ یہ فکر لاحق ہوئی کہ اپنے ہی ہاتھوں مول لینے والی بدنامی سے اسے کیسے بچاؤں گا؟ کسی بھی طرح بچانے کے لیے لازم تھا کہ اس سے منسوب ہونے والے سلامت علی کو بھی وہاں سے لے جایا جائے۔

میں نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سلامت کو شینا کے پاس لا کر کہا۔ "اب تک جو ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق ایک ایک بات مجھے بتاؤ؟ کچھ نہ چھپاؤ۔ مجھے سچ معلوم ہوگا تو اپنی بہن کو بدنامی سے بچا سکوں گا۔"

شینا نے سلامت کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سے دھوکا کھایا ہے۔ یہ خودغرض ہے۔ تھانے دار کو رشوت دینے کے بعد یہاں سے رہائی پانا چاہتا تھا۔"

وہ بولا۔ "میری مجبوری کو سمجھو۔ میں تمہارے ساتھ پکڑا جاتا تو میری بہن کا رشتہ ٹوٹ جاتا۔ وہ ایک بدکار بھائی کی بہن کہلاتی۔"

شینا نے کہا۔ "میں بھی کسی کی بہن ہوں۔ یہ ایک بھائی تمہارے سامنے ہے۔ یہ تمہاری طرح منہ چھپا کر بھاگنے نہیں، میری عزت بچانے اور گھر لے جانے آیا ہے۔ مجھ سے عشق لڑاتے وقت تمہیں اپنی بہن یاد کیوں نہیں آئی؟"

میں نے کہا۔ "شینا! بات نہ بڑھاؤ۔ یہ بتاؤ، جواد کس حال میں تم دونوں کو یہاں لایا تھا؟ اس نے اب تک کیا کارروائی کی ہے؟ کیا بیان لیا ہے؟"

وہ دونوں مجھے شام سے لے کر اب تک کی رُوداد سنانے لگے۔ میں نے سب کچھ اچھی طرح سننے کے بعد کہا۔ "تم دونوں کسی کے بھی سامنے یہ نہ کہنا کہ رات کے اندھیرے میں پلیا کے پاس ملنے گئے تھے۔"

سلامت نے کہا۔ "میں نے شینا کو وہاں ملنے کے لیے چٹھی لکھی تھی۔ اس نے بھی چٹھی کا جواب لکھا تھا۔ جواد نے وہ دونوں تحریریں ہم سے لے کر اپنے پاس رکھی ہیں۔ وہ ثابت کردے گا کہ۔۔۔"

میں نے کہا۔ "میری بات یاد رکھو۔ تم دونوں نے کوئی چٹھی نہیں لکھی ہم کہیں گے، تھانے دار تمہارے خلاف کیس بنانے کے لیے جعلی چٹھیاں پیش کر رہا ہے۔ جب تم دونوں سے تحریر کا نمونہ طلب کیا جائے گا۔ تمہیں سب کے سامنے کچھ لکھنے کو کہا جائے گا تو اندازِ تحریر اور الفاظ کی بناوٹ بدل کر کچھ بھی لکھ دینا۔"

شینا نے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر احسان مندی سے کہا۔ "بھائی بلال! تم بہت اچھے ہو۔ میں بہت بری ہوں۔ خدا کی قسم شرم سے مری جارہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "فوراً یہاں سے چلو۔ ورنہ وہ شیطان یہاں آدھمکے گا۔ ابھی بہت سی اہم باتیں سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے رہ گئی ہیں۔ ہم راستے میں باتیں کریں گے۔"

وہ سپاہی رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ فرش پر تڑپنے لگا۔ اس کی ناک اور باچھوں سے لہو رسنے لگا۔ میں نے کہا۔ "سوری۔ تھانے دار کو معلوم ہونا چاہیے کہ شینا اور سلامت کو لے جانے والوں نے تم پر ظلم کیا



ہے۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "اب نہ مارنا ورنہ میں مرجاؤں گا۔ یہ بتاؤ، میری رقم کا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا۔ "میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ تمہیں رقم ملے گی۔ تم ہمارے جانے کے بعد یہی بیان دو گے کہ یہاں کچھ لوگ منہ پر ڈھاٹا باندھ کر آئے تھے اور تم انہیں پہچانتے نہیں تھے۔"

میں اسے وہیں چھوڑ کر شینا اور سلامت کے ساتھ باہر آکر جیپ میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "حوالات میں واردات کرنا اور قیدیوں کو وہاں سے نکال لانا بہت بڑا جرم ہے۔ جواد اکبر مجھے قانونی شکنجے میں لے سکتا ہے۔"

شینا نے کہا۔ "وہ سپاہی شناخت نہیں کرے گا تو تھانے دار تمہیں کیسے الزام دے گا؟"

میں نے کہا۔ "چک میں اور اپنے گھر میں پہنچنے کے بعد یہ کہنا ضروری ہے کہ تم اب تک میرے ساتھ تھیں۔ جب سب ہی کو ایک بھائی کے ساتھ رہنے کی بات معلوم ہوگی تو تمہاری نیک نامی قائم رہے گی۔ ایسے وقت جواد سمجھ لے گا کہ میں ہی تمہیں تھانے سے لایا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ہاں۔ پھر تو اس سے یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی ہم اوکاڑہ جارہے ہیں۔ ہم تینوں کے لیے ضروری ہے کہ جلد سے جلد قانونی تحفظ حاصل کریں۔ صبح عدالت کھلتے ہی اپنے وکیل کے ذریعے مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ وہاں تم دونوں اپنا اپنا تحریری بیان دو گے۔"

اس نے پوچھا۔ "ہمیں وہاں کیا کہنا ہوگا؟"

"تم کہو گی کہ سلامت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تھانے دار تمہارے بھائی شکوریا کو دلہن روبینہ کے شرمناک معاملے میں پھانسنا چاہتا ہے۔ شکوریا سے جبراً اقبالِ جرم کرانے کے لیے اس نے تمہیں اٹھوا کر حوالات میں رازداری سے قیدی بنا کر رکھا تھا۔ تم سے زبردستی یہ بیان لکھوانا چاہتا تھا کہ تم روبینہ کے معاملے میں اپنے بھائی کے ساتھ شریک رہی ہو۔"

میں بولتے بولتے رک گیا۔ تھانے دار کی سازش کو ناکام بنانا تھا۔ اسے قانونی شکنجے میں لانا تھا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ شینا، شکوریا اور میرے تمام مخالفین نے سازشیں کی تھیں۔ روبینہ کو برباد کردیا تھا۔ میں اب بھی شینا کو بدنامی سے بچانے کی تدبیر کر رہا تھا۔ میرا فرض تھا کہ روبینہ کے ساتھ بھی انصاف کروں۔ اس کے مجرموں کو بے نقاب کرنا اور انہیں سزا دلانا بھی ضروری تھا۔

شینا نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہوگئے؟ آگے سمجھاؤ، مجسٹریٹ کے سامنے اور کیا کہنا ہے؟"

"مجسٹریٹ کے سامنے بیان دیتے وقت روبینہ کا ذکر ہوگا۔ تمہیں اس سلسلے میں سچ کہنا ہوگا۔ تم مجرموں کو جانتی ہو، کیا انہیں بے نقاب کروگی؟"

وہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی، پریشان ہوکر بولی۔ "نہیں۔۔۔ میں کسی مجرم کو نہیں جانتی۔ تھانے دار نے دھمکی دی تھی کہ میں اپنے بھائیوں کے خلاف بیان نہیں دوں گی تو وہ مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔"

"خدانخواستہ تھانے دار بدمعاشی کرتا، تب بھی تمہارا ضمیر یہ نہ سمجھاتا کہ روبینہ کے ساتھ بھی جبراً ایسا ہوا ہے؟"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ تمہاری محبت اور شفقت نے اور سمجھا دیا ہے روبینہ کے مجرموں کو سزا ملنی چاہیے اور ایسا ہوگا تو ہمارا پورا خاندان بدنام ہوگا۔ میں سچ بولوں گی تو روبینہ کے بھائی ہم سب کے جانی دشمن بن جائیں گے۔ خون کی ندیاں بہائے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ تھانے دار بھی میرے بھائیوں کو قانون کے شکنجے میں جکڑ لے گا۔ وہ ہر طرف سے مارے جائیں گے۔ کیا میں یہ دیکھ سکوں گی برداشت کرسکوں گی؟"

میں خاموشی سے سب سن رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ہم سب ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔ تینوں کی ذلالت کے باعث میرے باپ دادا کی بدنامی ہونے والی تھی۔ شینا نے کہا۔ "میں نہ ہی مجسٹریٹ کے سامنے اور نہ ہی چک والوں کے سامنے ان تینوں کا نام لوں گی۔ پر آج کے بعد تم میرے سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہو۔ تمہارے سامنے سچ کہوں گی۔"

"چلو میرے سامنے ہی کہو۔"

"یہ سچ ایسا ہے کہ تمہارا سر بھی شرم سے جھک جائے گا۔"

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "بھائی شکوریا' کا چچی اور باسو نے تمہیں بدنام کرنے کے لیے سازش کی اور اس سازش کو کامیاب بنانے کے لیے تمہارا بہنوئی حشمت جملہ عروسی میں گیا تھا۔"

یہ ایسا انکشاف تھا کہ دماغ میں پتھر سا آکر لگا۔ میں نے بریک لگاتے ہوئے جیپ سڑک کے کنارے روک دی۔ شینا کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔ "حشمت تمہاری چھت



www.digestpk.com

Asifzamil

کے نیچے آستین کا سانپ بن کر رہتا ہے۔ وہ تمہیں راستے سے ہٹا کر یا پاگل خانے بھیج کر تمہاری تمام زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔''

اتنا تو میں بھی سمجھتا تھا کہ وہ میری زمینوں کی دیکھ بھال کے دوران میں بہت ہیرا پھیری اور بے ایمانی کرتا ہے۔ مگر وہ مجھے ایب نارمل، پاگل اور خبطی ثابت کر کے پاگل خانے بھیجنا چاہتا تھا یا ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا، یہ نہیں جانتا تھا۔ میرا بہنوئی، میری بہن کا سہاگ جو ہمارے پاس چاندی کے برتن میں سونے کے نوالے کھا رہا تھا۔ وہ ایسا نمک حرام نکلے گا، میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

شینا نے کہا۔ ''بہنوئی کے کرتوت سن کر صدمہ پہنچا ہے؟ تم نے گاڑی روک دی۔ اب بولو اس کے خلاف کیا کر سکو گے؟ کیا یہ چاہو گے کہ روبینہ کے بھائی اسے مار ڈالیں تمہاری بہن چھانو بیوہ ہو جائے اور اس کے بچے یتیم ہو جائیں؟''

رشتہ کتنا ہی گہرا ہو، خون کا ہو۔ میں ایک ہی بات جانتا ہوں کہ خطاوار کو اس کی غلطیوں کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ میری بہن سات برس سے سہاگن تھی۔ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ روبینہ تو سہاگ کی سیج پر پہنچتے ہی لٹ گئی تھی۔ اب سہاگن ہوتے ہوئے بھی جیسے مطلقہ یا بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کا دکھ میری بہن چھانو سے بھاری تھا۔

ایمان کی بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ قانون کا تقاضا تھا کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ خواہ وہ میرا بہنوئی ہی کیوں نہ ہو۔

وہ بولی۔ ''لیکن ہم دونوں کو مل کر پورے خاندان کو بدنامی سے بچانا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے تو پرانی تمام عداوتیں ختم ہو جائیں گی۔''

میں نے جواب نہیں دیا۔ جیپ آگے بڑھا دی۔

اگرچہ شینا مجھ سے متاثر ہو گئی تھی۔ سچے دل سے مجھے اپنا محسن اور بھائی تسلیم کر رہی تھی۔ اس کے باوجود اپنے بھائیوں کے خلاف زبان کھولنے والی نہیں تھی۔ میں اسے لاکھ سمجھاتا کہ اخلاق، تہذیب اور انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ روبینہ کے مجرموں کو بے نقاب کر کے انہیں سزائیں دی جائیں تو وہ بدکاری کے الزام سے بچ کر نکل آنے والی بھی بھائیوں کو سزا دلانے پر راضی نہ ہوتی۔

میں نے فی الحال اس سلسلے میں بحث نہیں کی۔ دل میں یہ طے کر لیا کہ جو کرنا ہے، وہ اپنی صوابدید کے مطابق تنہا کروں گا۔ میں نے اوکاڑہ پہنچ کر اپنے وکیل سے ملاقات کی۔ اسے اپنے، شینا.... اور سلامت کے حالات بتائے۔ وہ تمام باتیں سننے کے بعد بولا کہ ہم سب کو مجسٹریٹ کے سامنے تحریری بیان دے کر قانونی تحفظ حاصل کرنا چاہیے۔

ہم دن کے بارہ بجے تک کچہری میں مصروف رہے۔ ہمارے بیان کے مطابق تھانے دار جواد نے شینا اور سلامت کو جھوٹے الزام میں پکڑ کر حبس بے جا میں رکھا تھا۔ ایک شریف زادی کو اغوا کرایا تھا اور اس کے بھائیوں کے خلاف اس سے جبراً بیان لکھوانا چاہتا تھا۔ مجسٹریٹ نے اوکاڑہ کے ایک پولیس افسر کو جواد کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا حکم دے دیا۔

ادھر جواد صبح چھ بجے تھانے میں واپس آیا تو بوڑھے سپاہی کو وہاں بندھا ہوا پایا۔ اس کے بیان کے مطابق چار مسلح افراد منہ پر ڈھاٹا باندھ کر آئے تھے پھر اسے باندھ کر شینا اور سلامت کو وہاں سے لے گئے۔

جواد چکرا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون لوگ اس کے اصل مہرے کو اس سے چھین کر لے گئے ہیں؟

وہ دوڑتا بھاگتا پھر چک واپس آیا۔ اس کا خیال تھا' شینا کو لے جانے والوں نے اسے گھر پہنچا دیا ہو گا مگر معلوم ہوا کہ وہ واپس نہیں آئی ہے۔

وہ جاکھا اور روبینہ کے بھائیوں کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہو کر بولا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کچھ لوگ شینا اور سلامت کو حوالات سے نکال کر لے گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کون ہیں؟ اگر شینا کے ہمدرد ہیں تو وہ اپنے گھر واپس کیوں نہیں آئی؟''

روبینہ کے بھائی اشرف نے کہا۔ ''آپ کے تھانے سے قیدیوں کو لے جانے والے پیشہ ور مجرم ہوں گے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ وہ لوگ شینا کو وہاں سے کیوں لے گئے ہیں؟ اور کہاں لے گئے ہیں؟''

وہ سب میرے متعلق کبھی سوچ نہیں سکتے تھے کہ میں اپنے دشمنوں کی بہن کو وہاں سے لے جا سکتا ہوں۔ اگر مجھ پر شبہ ہوتا تو جواد اوکاڑہ کی طرف چلا آتا۔ میں شبہے سے بالاتر رہا اس لیے کسی رکاوٹ کے بغیر جواد کے خلاف قانونی کارروائیاں کرنے میں کامیاب رہا۔

دن کے ایک بجے اوکاڑہ کے ایک اعلیٰ پولیس افسر نے جواد کو فون پر حکم دیا کہ وہ فوراً اس کے دفتر میں حاضر ہو جائے۔ ادھر شینا نے فون پر شکوریا سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ وہ عزت آبرو اور خیر خیریت سے میرے ساتھ ہے۔

وہ تینوں بھائی حیران ہوئے۔ ایک تو اس لیے کہ ان



کی توقع کے خلاف وہ خیریت سے اور عزت سے تھی۔ فون پر خوب چہک رہی تھی۔ دوسری حیرانی کی بات یہ تھی کہ مجھ جیسے دشمن کے ساتھ تھی۔

شینا نے کہا۔ ''ابھی کسی کو نہ بتایا جائے کہ میں اوکاڑہ میں ہوں۔ تم ابا اور بھائیوں کے ساتھ فوراً یہاں آ جاؤ۔''

وہ تینوں اپنے بزرگوں کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ کر جانے لگے۔ جاکھے نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟ کیا شینا کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے؟''

شکوریا نے کہا۔ ''ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔ شام تک واپس آ جائیں گے۔''

وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں شینا نے فون پر رابطہ رکھا۔ انہیں پچھلی رات سے اب تک کی تمام روداد سناتی رہی۔ انہیں یہ معلوم ہوتا رہا کہ میں نے کس طرح اسے تھانے دار کے چنگل سے نکالا ہے اور ان کی بہن کی آبرو رکھی ہے۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''اب ہمیں پرانی دشمنی ختم کرنی چاہیے۔ میں نے بھائی بلال کو بتا دیا ہے کہ روبینہ کے معاملے میں ہم سب نے مل کر ان کے خلاف سازش کی تھی۔''

شکوریا نے پوچھا۔ ''تم نے اتنی بڑی بات اسے کیوں بتا دی؟''

''اس لیے کہ اب میں بھائی بلال کی سچی بہن بن کر رہوں گی۔ جو بھی سچائی ہے، ان سے نہیں چھپاؤں گی۔ نہ کبھی جھوٹ بولوں گی اور نہ اپنے سونے جیسے بھائی کو کبھی دھوکا دوں گی۔''

''ہم نے بلال کے خلاف شرمناک سازش کی۔ کامیاب ہو جاتے، تو وہ مجرم ثابت ہوتا اور روبینہ کے بھائی اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ اتنی بڑی دشمنی کے بعد کیا وہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا؟ ہم سے انتقام نہیں لے گا؟''

شینا نے کہا۔ ''نہیں۔۔۔ میرا یقین کرو۔ پرانی دشمنی کو بھول جاؤ۔ ہم سب ایک ہی دادا کی اولادیں ہیں۔ بھائی بلال کے گلے لگ جاؤ۔''

ان تینوں نے اوکاڑہ میں میرے سامنے آ کر کہا۔ ''تم نے شینا کی عزت بچا کر ثابت کر دیا ہے کہ ہم سب ایک ہی لہو سے ہیں۔ لڑنے جھگڑنے کے باوجود اپنے خاندان کی نیک نامی پر آنچ نہیں آنے دیتے۔''

وہ باری باری آگے بڑھ کر مجھے گلے لگانے لگے۔ میں نے انہیں بتایا۔ ''ہم نے مجسٹریٹ کے روبرو بیان دے کر جواد کے خلاف قانونی کارروائی شروع کرائی ہے۔ تم بھی میرے وکیل کے ذریعے اس کے خلاف بیان دو کہ اس نے ذاتی دشمنی کی بنا پر تمہاری بہن کو اغوا کرایا تھا۔''

وہ تھانے دار کو پہلے ہی گالیاں دیتے رہے تھے۔ اب اس کے خلاف قانونی کارروائی کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ شکوریا اور اس کے باپ نے یعنی میرے پھوپھا وغیرہ نے بھی وقت بے وقت جواد کے ظالمانہ رویے اور رشوت خوری کے خلاف بیان داخل کیا۔

ایک اعلیٰ پولیس افسر کے دفتر میں جواد سے ہمارا سامنا ہوا۔ اس کا رعب اور دبدبہ ختم ہو چکا تھا، سر جھکا ہوا تھا۔ کیونکہ وہاں سختی سے اس کا محاسبہ کیا جا رہا تھا۔ شینا اور سلامت رو رو کر بیان دے رہے تھے کہ وہ تھانے دار کس طرح انہیں زبردستی اٹھا کر ان پر ٹارچر کرتا رہا تھا۔

بہرحال اس کی شامت آ چکی تھی۔ اسے عارضی طور پر معطل کیا جا رہا تھا۔ ہم سب کو اس سے نجات مل چکی تھی۔

جب شینا ہمارے ساتھ چک پہنچی تو اسے دیکھنے کے لیے پورا گاؤں امڈ آیا۔ جاکھا اور روبینہ کے چار بھائی جانتے تھے کہ وہ تھانیدار کے قبضے میں ہے۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ شینا اس کے قبضے سے کیسے نکل آئی ہے اور وہ تھانے دار کہاں گم ہو گیا ہے؟

ہم نے بتایا کہ اس کے خلاف قانونی کارروائی ہو رہی ہے۔ اس نے شینا کو اغوا کرایا تھا اور تینوں بھائیوں کے خلاف اس سے زبردستی بیان لینا چاہتا تھا۔ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ تینوں بے قصور ہیں اور جواد آئندہ کبھی یہاں تھانے دار بن کر جھوٹے الزامات عائد کرنے اور مظالم ڈھانے نہیں آئے گا۔

ہم حالات کے ایک عجیب موڑ پر آ گئے تھے۔ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے اور ایک ہی لہو سے منسلک ہونے کے باوجود پہلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ شینا اغوا کے بعد واپس آئی تو دشمنی اچانک ہی دوستی اور پیار و محبت میں بدل گئی۔

شکوریا، باسوار کاچھی نے عینی کے بزرگوں اور اپنے بزرگوں کے سامنے کہا۔ ''ہماری دشمنی کی سب سے اہم وجہ عینی کی طلب تھی۔ ہم سب ہی اسے اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتے تھے۔ آج یہ جھگڑا ختم کر رہے ہیں۔ اپنے تمام بزرگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ عینی اور بلال کی نسبت طے کر دیں۔ ہم تمام بھائی خوش ہو کر بھنگڑا ڈالیں گے۔''

میری پھوپھی نے، دونوں چچیوں، چچا اور ان کے



www.digestpk.com

Asifzamil

تینوں بیٹوں نے میرے خلاف سازش کی تھی۔ روبینہ کی زندگی برباد کردی تھی۔ اب وہ اس جرم اور شرمناک واردات کو قصۂ پارینہ بنا کر بھلا رہے تھے، جیسے روبینہ مٹی کا کیڑا ہو۔ اسے پیروں تلے کچل کر جانا کوئی بات نہ ہو۔

یہ انسانیت اور شرافت نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں دل پر جبر کرکے بظاہر ان سے سمجھوتا کر رہا تھا۔ یوں سمجھوتا کرنے سے عداوتیں ختم ہو رہی تھیں۔ امن و امان قائم ہو رہا تھا مگر ضمیر مطمئن نہیں تھا۔ ایک مظلوم عورت کی خاموشی میرے اندر چیخ رہی تھی اور ظلم کرنے والے آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ یہ طے کرچکا تھا کہ شرمناک جرم کرنے والوں کو زیادہ دنوں تک بھنگڑا ڈالنے نہیں دوں گا۔

حشمت سمجھ رہا تھا کہ اس کے سر سے خطرہ ٹل گیا ہے۔ ہم سب نے صلح صفائی کے ذریعے اس کی بدکاری پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اب کوئی اس کا محاسبہ کرنے اور اسے سزا دینے والا نہیں رہا ہے۔

میں نے پھوپھی اور چچی سے کہا۔ ''میری امی اور میری بہن چھانو کو یہ معلوم نہ ہو کہ حشمت نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ معلوم ہوگا تو امی ایسے داماد کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کریں گی اور چھانو اپنے بدکار شوہر کا منہ نہیں دیکھنا چاہے گی۔ اپنے بچوں کی خاطر اسے برداشت کرے گی۔ اس کے باوجود اس کی ازدواجی زندگی تلخ ہوجائے گی۔''

اس واردات سے تعلق رکھنے والی پھوپھی اور دوسرے بزرگوں نے وعدہ کیا کہ امی اور چھانو کو حشمت کی کمینگی اور ذلالت کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ میرے سامنے بھید کھلنے کے بعد حشمت نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ 'شکوریا' کاچھی 'باسو اور ان کے بزرگوں نے اس کی سفارش کی۔ میں نے بظاہر تین دشمنوں کو معاف کردیا تھا۔ لہٰذا حشمت کو بھی معاف کرکے اسے بھی ڈھیل دے دی۔ بعد میں سب ہی کی رسیاں کھینچنے والا تھا۔

جاکھا اور روبینہ کے بھائیوں کو پورا یقین تھا کہ وہ اصل مجرموں تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ ایسے وقت میں نے تھانے دار کو قانونی شکنجے میں پہنچا کر انہیں مایوس کیا تھا۔ روبینہ کے بڑے بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''تم نے اپنے خاندان کی نیک نامی برقرار رکھنے کے لیے مجرموں کو گرفت میں آنے سے بچالیا ہے۔ کیا تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کررہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہم میں سے کسی نے 'شکوریا' کاچھی اور باسو کو شرمناک جرم کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ان کے خلاف کہیں سے کوئی ثبوت نہیں مل رہا ہے۔ پھر بھی وہ مجرم ہیں تو ہم تم انہیں سزا نہیں دے سکتے۔ وہ قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکتے۔ میں نے ان کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ تم بھی صبر کرو۔ یا پھر انہیں ثبوت اور گواہوں کے ساتھ پکڑو۔''

جاکھے نے کہا۔ ''تمہیں ایب نارمل یا خبطی کہا جارہا تھا مگر تم بہت چالاک ہو۔ عینی کو حاصل کرنے کے لیے شکوریا باسو اور کاچھی سے تمہارا جھگڑا چل رہا تھا۔ ان تینوں سے تمہارا معاہدہ ہوگیا ہے۔ وہ عینی سے تمہارے حق میں دستبردار ہوجائیں گے۔ اسی لیے تم لوگوں کی پرانی دشمنی اچانک ختم ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم لوگ میرے خلاف کچھ بھی سوچ سکتے ہو۔ مجھے خبطی بھی سمجھ سکتے ہو اور چالباز بھی۔ سچ کیا ہے؟ یہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہم تمہاری شادی میں چار دنوں کے لیے آئے تھے۔ آج یہاں سے جارہے ہیں۔''

ہمارا پورا خاندان وہاں سے واپس چلا آیا۔ دوسرے دن میں اپنے بڑے ماموں سے ملنے ان کے چک پہنچا۔ وہاں دوسرے ماموں بھی تھے۔ انہوں نے میری پیشانی کو چوم کر گلے لگایا پھر کہا۔ ''اچانک کیسے آئے ہو؟ کم از کم فون پر اپنے آنے کی اطلاع تو دے دیتے۔''

دوسرے ماموں نے گلے لگاتے ہوئے کہا ''معلوم ہوتا ہے، ہمارا بھانجا چھپ چھپا کر آیا ہے۔ بھئی سچ بولو ہماری بہن کو بتا کر آئے ہو یا نہیں؟''

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''سچ یہی ہے۔ سمجھ لیں، چھپ کر آیا ہوں۔ امی اور چھانو کو نہیں بتایا ہے۔''

انہوں نے سنجیدگی سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟''

میں نے جاکھے کے گھر میں دلہن کے ساتھ ہونے والی رُوداد سنائی۔ حشمت اور ان تینوں مجرموں کے متعلق بتایا۔ شینا کے اغوا اور تھانے دار کو قانونی شکنجے میں پھنسانے والی ساری تفصیلات بیان کیں پھر کہا۔ ''اس طرح ان تینوں سے اور پھوپھی، چچی، چچا وغیرہ سے دشمنی ختم ہوگئی ہے۔ ہمارے چک میں اور ہماری زندگی میں امن و امان رہے گا۔ لیکن مجرموں کو قرار واقعی سزا نہیں ملے گی۔ روبینہ ہم سب کی بہن اور بیٹی ہے۔ اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔''

انہوں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک۔ انہیں سزائیں ملنی چاہئیں۔ پر تم نے تو ان مجرموں کو گلے لگایا ہے۔''




سگریٹ اور ہر نشے سے چھٹکارا ہمیشہ کیلئے

حلال

SPRAY Smokend

American Formula

Stop Smoking Support Program

تمباکو نوشی کا انجام۔ زندگی کا خاتمہ تمام

1 cigarette swallows
7 minutes of your life

اپنے اور اپنی فیملی کو کینسر سے بچائیں اور صحت پائیں۔
اپنے قریبی ہومیو میڈیکل اور سپر سٹور سے طلب فرمائیں۔

100% Result, No any Side effects, none toxic speedy treatment

FOREVER Naturo Pharma
Health Care Products
Registration no. 613
10-Al-Hamra Center, 10-Allama Iqbal Road, Bohar Wala Chowk, Lahore.
Ph: 042-36291685, 0345-4036128
0322-4452133

ہیپاٹائیٹس B/C فری چیک اپ فری دوائی

اسٹاکسٹ

| | | | |
|---|---|---|---|
| راولپنڈی | بادشاہ دی ہٹی | 0333-5203553 | شاہ جی دواخانہ 0306-5402966 |
| وزیر آباد | جرمن ہومیو سٹور | 0321-6433848 | سمندری جرمن ہومیو سٹور 0345-6682682 |
| حیدر آباد | ڈاکٹر عبدالجبار | 0301-3513093 | میر پور آزاد کشمیر اکبر ہومیو کلینک 0300-5415761 |
| گجر خاں | ڈاکٹر عابد اشفاق | 0300-9544961 | کراچی بسم اللہ ہومیو سٹور 0333-2133099 |


www.digestpk.com

Asifzamil

"میں ایسے مجرموں کو گلے لگا کر ان کے گلے کاٹنا چاہتا ہوں۔"

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ "ہمارے ملک میں ایسے بے شمار مجرم ہیں جن کے خلاف نہ کوئی ثبوت ملتا ہے۔ نہ ہی چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔ وہ سیاسی مجرم ہوتے ہیں جو ملک سے باہر جا کر پناہ لیتے ہیں۔ پھر حالات سازگار ہوتے ہی واپس چلے آتے ہیں۔ ان کے دامن سے بدترین جرائم کے داغ دھبے دھل جاتے ہیں۔ وہ قانون کی گرفت سے آزاد ہو جاتے ہیں اور ہم ان کا کچھ بگاڑ نہیں پاتے۔"

ایک ماموں نے سر ہلا کر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ حشمت، شکوریا، باسو اور کاچھی بھی ایسے ہی مجرم ہیں، جو کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔ تم کہو گے تو ہم ان کے ہوش اڑا دیں گے۔"

"میں یہی کہنے آیا ہوں۔ ان کے خلاف جو بھی واردات ہوگی، وہ پُراسرار طور پر ہوگی تو کوئی ہم پر شبہ نہیں کرے گا۔ ہم کبھی پکڑے نہیں جائیں گے۔"

جرائم کی دنیا میں ایک مجرم سکندر بخت ہے، جو کبھی پکڑا نہیں جاتا۔ مجھے سکندر بخت نہیں بننا تھا اور نہ ہی میں کوئی جرم کرنے جا رہا تھا۔ گرفت میں نہ آنے والوں کو سزا دے کر اپنا فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔

ماموؤں کے ساتھ یہ پلاننگ ہوگئی کہ کس طرح انہیں سزائیں دی جائیں گی؟ میں تمام معاملات طے کر کے وہاں سے چلا آیا۔ یہ خبر ملی کہ جاکھے نے روبینہ کو قبول نہیں کیا ہے۔ اس کے بھائیوں سے اچھا خاصا جھگڑا ہو چکا ہے۔ وہ واپس میکے چلی گئی ہے۔

روبینہ جیسی لٹ جانے والی لڑکیوں کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ وہ پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ میکے واپس جائے گی تو وہاں بھی بھائی اور بھابیاں اسے طعنے دے دے کر مار ڈالیں گے۔ اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا کہ لاہور میں اپنی پھوپھی کے پاس جا کر رہے گی اور کہیں جاب کر کے اپنے بل پر زندگی گزارے گی۔

رات کو عینی نے فون پر پوچھا۔ "آج صبح کہاں گئے تھے؟ سنا ہے، ابھی۔ واپس آئے ہو؟"

"میں بڑے ماموں سے ملنے گیا تھا۔ واپسی میں جاکھے سے ملتا ہوا آیا۔ پتا چلا، روبینہ کو واپس میکے بھیج دیا گیا ہے۔"

عینی نے کہا۔ "ہاں میں نے بھی سنا ہے۔ بہت دکھ ہو رہا ہے۔ بیچاری ارمانوں سے لدی ہوئی آئی تھی۔ خالی ہاتھ ایسے گئی، جیسے سہاگ کی سیج پر پہنچتے ہی بیوہ ہوگئی ہو۔"

میں نے پوچھا۔ "عینی! کیا ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟"

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میں وہاں تین دن تک رہی ہوں۔ اس سے بڑی محبت اور اپنائیت ہوگئی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا پتا اور فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ بعد میں بھی ہماری دوستی رہے گی۔"

"میں چاہتا ہوں، تمہاری اس سے دوستی رہے۔ میں تمہارے تعاون سے اسے اپنی بہن بنا کر اس کے کام آسکتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں روبینہ سے بات کروں گی۔"

"ضرور بات کرو۔ کل رات مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ ابھی اس کا موجودہ پتا اور فون نمبر بتاؤ؟"

عینی نے اپنی ڈائری میں دیکھ کر اس کا فون نمبر اور پتا لکھوا دیا۔ میں سوچنے لگا کہ کس طرح اس کے کام آسکتا ہوں؟ ایک تو اس طرح کام آرہا تھا کہ اس کے مجرموں کو جلد ہی سزا دینے والا تھا پھر یہ چاہتا تھا کہ سزا پانے والوں کی رُوداد روبینہ کو بھی معلوم ہوتی رہے۔ کسی حد تک اس کا کلیجا ٹھنڈا ہوتا رہے۔

دوسری رات عینی نے فون پر کہا۔ "روبینہ تم سے بدظن ہے۔ تم نے شینا کی عزت بچائی، اچھا کیا لیکن اس کے بھائیوں کو سزا سے بچا کر ایک لٹ جانے والی بے یار و مددگار لڑکی پر ظلم کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ جاکھے کے گھر والے اور روبینہ کے میکے والے سب ہی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔"

وہ بولی۔ "میں نے روبینہ کو سمجھایا ہے کہ تم ثبوت اور گواہوں کے بغیر ان تینوں کو مجرم نہیں کہہ سکتے تھے۔ روبینہ جانتی ہے، ہم دونوں کی نسبت طے ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ میرے سامنے تمہارے خلاف کچھ بولنے سے کترائی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں دعا کروں گا کہ میری طرف سے جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے، وہ جلد ہی ختم ہو جائے۔"

ایسے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میری امی نے کہا۔ "بیٹے! باہر آؤ۔ غضب ہوگیا ہے۔ شکوریا کو کسی نے



گولی مار دی ہے۔"

میں نے فون پر عینی سے پوچھا۔ "تمہیں امی کی آواز سنائی دے رہی ہے؟ وہ کہہ رہی ہیں، کسی نے شکوریا کو گولی ماری ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ہمارے چک کا امن و امان پھر غارت ہونے والا ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔"

میں نے عینی سے رابطہ ختم کر کے دروازہ کھولا۔ امی جو سنانے آئی تھیں۔ اس کے متعلق میں پہلے سے جانتا تھا۔ میری چچی یعنی شکوریا کی ماں بھی آئی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ "وہ کھیتوں میں پانی دینے گیا تھا۔ کھیت کے مزدوروں نے بتایا کہ کچھ لوگ بندوقیں لے کر آئے تھے۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر شکوریا کو گولی مار کر چلے گئے۔"

گولی اس کی کمر پر لگی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ باسو کاچھی، چچا اور پھوپھا اسے اوکاڑہ کے اسپتال لے گئے تھے۔ باقی رشتے دار کھیت مزدوروں سے معلوم کر رہے تھے کہ وہ مسلح افراد کون تھے؟ دیکھنے میں کیسے تھے؟ ان کا حلیہ کیسا تھا؟

جواب ملا کہ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ منہ پر ڈھاٹے بندھے تھے۔ تعداد میں تین تھے۔ پتا نہیں رات کے اندھیرے میں کہاں سے آئے تھے؟ پھر گولی مار کر اسی اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہوگئے؟ کوئی ان مسلح افراد کا تعاقب کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

ان کے بیان سے ایک بات پکڑی گئی کہ وہ مسلح افراد تعداد میں تین تھے۔ پھوپھی نے کہا۔ "روبینہ کے تین بھائی ہیں۔"

سب ہی نے چونک کر پھوپھی کو دیکھا۔ پھر تائید میں سر ہلایا۔ شکوریا کی ماں نے کہا۔ "اور وہ تینوں میرے بیٹے کے دشمن ہیں۔ انہوں نے اسے پھانسنے کے لیے میری شینا کو اغوا کیا تھا۔ آج اسے گولی مار کر چلے گئے۔"

وہ رونے لگی۔ میری امی نے کہا۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ بیٹا بچ گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو کل اسپتال سے گھر آجائے گا۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں نے گھر واپس آکر اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اٹیچی کھول کر ایک سم نکالی۔ وہ میرے پاس فاضل رکھی ہوئی تھی، اب کام آنے والی تھی۔ میں نے اسے اپنے فون میں لگایا۔ اپنی آواز میں تبدیلی لانے کے لیے کاغذ کا ایک چھوٹا سا گولا بنا کر اسے منہ میں رکھا پھر چچا کا نمبر پنچ کرنے لگا۔

وہ بیٹے کے پاس اسپتال میں تھا۔ فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے حلق اور ناک سے آواز نکالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بیٹا بچ گیا ہے؟"

چچا نے پوچھا۔ "کون ہو تم۔۔۔؟"

میں نے کہا۔ "موت کا فرشتہ ہوں۔ کبھی کبھی جان سے نہیں مارتا۔ آدھی جان لے کر سچ بولنے کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ تمہارا بیٹا سچ بولے گا۔ اپنا جرم قبول کرے گا تو دوسری گولی نہیں چلے گی۔"

اس نے پوچھا۔ "تم۔۔۔ کیا تم وہی گولی مارنے والے دشمن ہو؟ کون ہو تم؟ ہم سے کیا دشمنی ہے؟"

میں نے کہا۔ "روبینہ سے کیا دشمنی تھی؟ کوئی دشمنی نہیں تھی ناں؟ پھر بھی اسے برباد کر دیا گیا۔"

"میرے بیٹے نے اسے برباد نہیں کیا ہے۔ کیا تم روبینہ کے بھائی ہو؟"

"میں کہہ چکا ہوں، موت کا فرشتہ ہوں۔ اپنے بیٹے کو اس وقت تک واپس نہ لانا۔ جب تک وہ تھانے میں جا کر اقرارِ جرم نہ کر لے۔ یاد رکھو! اس کے بعد کاچھی اور باسو کی شامت آنے والی ہے۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ اس کی سم نکال کے رکھ دی۔ پھر آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ بڑا سکون مل رہا تھا۔ اب دشمنوں کو سچ بولنا تھا۔ نہ بولنے والوں کے آگے موت تھی۔

ادھر اسپتال میں ایک سب انسپکٹر موجود تھا۔ شکوریا کا بیان لینے کے لیے اس کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔

چچا نے اس سے کہا۔ "ابھی ایک دشمن نے فون پر دھمکی دی ہے کہ میرے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ میرے دوسرے بھانجے بھتیجے کو بھی مار ڈالنے کی بات کر رہا تھا۔"

سب انسپکٹر نے اس سے فون لے کر کال کرنے والے کا نمبر دیکھا۔ اس نمبر کو نوٹ کیا پھر رابطہ کرنا چاہا تو مایوسی ہوئی۔ اس نے چچا سے پوچھا۔ "کیا فون کرنے والے کو پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔ وہ آواز بنا کر بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوگیا ہے، یقیناً وہ روبینہ کے بھائیوں میں سے کوئی ایک تھا۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟ ان کے نام اور پتے بتاؤ؟"

"ان کے نام اشرف، اسد اور مجید ہیں۔ وہ بہاولپور کے رہنے والے ہیں۔ میں ابھی ان کا پتا معلوم کرتا ہوں۔"

چچا نے جاکھے سے فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ "تمہارے کسی سالے نے میرے بیٹے شکوریا کو گولی ماری ہے۔ ہم ابھی اوکاڑہ کے اسپتال میں ہیں۔ یہاں انسپکٹر صاحب سے



www.digestpk.com

Asifzamil

بات کرواور اپنے سالوں کا پتا اور فون نمبر بتاؤ۔"

جاکھے نے انسپکٹر سے بات کی۔ ان سب کے فون نمبر اور پتے بتائے۔ انسپکٹر نے بھاولپور کی پولیس سے رابطہ کیا اور کہا۔ "اب سے چار گھنٹے پہلے چک پینتالیس میں ایک بندے کو گولی ماری گئی ہے۔ تین وارداتیے منہ پر ڈھاٹا باندھ کر آئے تھے۔ ان میں سے کسی نے فون کر کے مزید بندوں کو گولی مارنے کی دھمکی دی ہے۔ میں ان کے فون نمبرز اور پتے بتا رہا ہوں۔ آپ ان کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر سکیں گے۔"

اس نے روبینہ کے تینوں بھائیوں کے نام' پتے اور فون نمبر نوٹ کرا دیے۔ ایک گھنٹے بعد بھاولپور کے ایک پولیس افسر نے کہا۔ "یہ تینوں بندے یہاں موجود ہیں۔ وہ اس شہر تو کیا، اپنے گھر سے بھی باہر نہیں گئے۔ اگر جاتے تو چار گھنٹے میں واردات کر کے واپس نہیں آسکتے تھے۔ یہاں سے چک پینتالیس تک جانے آنے میں کئی گھنٹے لگتے ہیں۔"

یہ ثابت ہو رہا تھا کہ ان تینوں نے شکوریا کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اس فون نمبر کے متعلق معلومات حاصل کی جا رہی تھیں۔ جس کے ذریعے میں نے دھمکیاں دی تھیں۔ وہ سم میرے نام اور میری آئی ڈی سے خریدی ہوئی نہیں تھی۔ وہ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے تھے۔

وہ سب بھٹک رہے تھے۔ جواد کے معطل ہونے کے بعد دوسرا تھانے دار بشیر بابر آیا تھا۔ وہ اپنے طور پر انکوائری کر رہا تھا۔ روبینہ کے تینوں بھائی وہاں سے بہت دور بھاولپور میں تھے۔ شکوریا پر حملہ ہوا تھا۔ وہ خوش ہو رہے تھے اور حیران بھی تھے کہ وہ کون ہے، جو ان کی بہن کے حوالے سے آئندہ کاچھی اور باسو کو بھی گولی مارنے کی دھمکیاں دے چکا ہے؟

ان چاروں نے بشیر بابر کے پاس آکر روبینہ کی بربادی سے لے کر شینا کے اغوا ہونے تک کی روداد سنائی۔ یہ بتایا کہ پچھلا تھانے دار جواد ان تینوں مجرموں کو گرفتار کرنے والا تھا۔ مگر اس نے شینا کو اغوا کرانے کا غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اسی لیے وہ تینوں مجرم ہونے کے باوجود قانون کی گرفت میں نہیں آرہے ہیں۔

بابر نے پوچھا۔ "یہ کون ہو سکتا ہے، جو شکوریا کو زخمی کر کے باسو اور کاچھی کو دہشت زدہ کر کے اقبالِ جرم کرا رہا ہے؟ ایک طرح سے وہ قانونی تقاضے پورے کر رہا ہے۔ ہماری مدد کر رہا ہے۔ کسی طرح معلوم کرو وہ کون ہے؟"

شکوریا اسپتال میں تھا۔ چچا نے بشیر سے کہا۔ "میرے بیٹے کو اسپتال سے چھٹی ملے گی۔ پر اس نامعلوم دشمن نے دھمکی دی ہے کہ شکوریا اقبالِ جرم کیے بغیر گھر آئے گا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔"

بشیر بابر نے کہا۔ "تم باپ بیٹے سوچو، اقبالِ جرم کرو گے یا خطرہ مول لے کر گھر جاؤ گے؟"

کاچھی نے کہا۔ "جناب عالی! شکوریا نے اور ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ کوئی ہمیں زبردستی مجرم ثابت کرنا چاہتا ہے۔ جو گناہ ہم نے نہیں کیا ہے، اسے کیسے قبول کر سکتے ہیں؟"

"نہیں کیا ہے تو قبول نہ کرو۔ شکوریا کو اسپتال سے لے جاؤ۔ میں تمہارے گھر کے سامنے دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ میں بھی آتا جاتا رہوں گا۔ دیکھوں گا کہ کون تم لوگوں پر حملہ کرنے آتا ہے؟"

"جناب! وہ تینوں رات کے اندھیرے میں آئے تھے۔ ایک نے گولی چلائی تھی۔ پھر آگے جا کر اسی اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔ آئندہ بھی وہ کب آئیں گے؟ ہمیں کہاں گھیریں گے؟ ہم نہیں جانتے۔ ہم تو دھوکے میں مارے جائیں گے۔"

"ایسا تو موت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کب آئے گی؟ کہاں ہمیں گھیرے گی؟ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ اچانک ہی بم دھماکے ہوتے ہیں۔ کوئی خودکش حملہ آور ایک دم سے آتا ہے۔ سانس لینے والوں کو سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملتی اور زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ تم سب یہاں سے جاؤ۔ کہیں بھی جاؤ اور موت سے ڈرتے رہو۔"

وہ بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ تھانے دار بشیر بابر نے کہا۔ "ذرا عقل سے سوچو ڈر لگ رہا ہے تو کیا کرو گے؟ نہ دن رات یہاں تھانے میں بیٹھے رہ سکتے ہو اور نہ وہ شکوریا باقی زندگی اسپتال میں گزار سکتا ہے۔ گھر تو جانا ہی ہوگا۔"

بے شک وہ گھر سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے دن شکوریا کو گھر لے آئے۔ یہ فیصلہ کیا کہ وہ تینوں فی الحال اس چار دیواری سے باہر نہیں نکلیں گے۔ حملہ کرنے والے اتنے بے باک نہیں ہو سکتے کہ گھر میں گھس آئیں؟ اگر آئیں تو زندہ واپس نہیں جائیں گے۔

وہ گھر کی چار دیواری میں کب تک رہ سکتے تھے؟ زراعت کے مختلف شعبوں میں کسی نہ کسی کام سے جانا پڑتا تھا۔ غلہ منڈی کے تاجروں سے صرف فون پر رابطہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ بازار کے اترتے چڑھتے بھاؤ کے مطابق منڈی میں جانا ضروری ہو جاتا تھا۔



وہ ایک ہفتے تک اپنے گھروں میں چھپے رہے۔ یہ اندیشہ تھا کہ شکوریا اقبالِ جرم کیے بغیر گھر آیا ہے۔ میری دھمکی کے مطابق ان تینوں میں سے کسی ایک پر حملہ ہوگا۔ مگر ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ خوف کم ہو رہا تھا۔ اب تک دھمکی پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ کسی نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ ان کے اندر حوصلہ پیدا ہوا تو وہ گھر سے باہر نکلنے کے لیے اپنی اپنی رائفل لوڈ کرنے لگے۔

میں چھت پر ایک دیوار کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ وہاں سے ان تینوں کے گھر نظر آرہے تھے۔ شکوریا کی کمر پر گولی کا ایسا گہرا زخم تھا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بستر پر اوندھا پڑا رہتا تھا۔ اس وقت کاچھی اور باسو اپنی اپنی رائفلیں لیے باہر آئے۔

میں نے کاچھی کا نمبر ملایا۔ میری ایک داڑھ میں کاغذ کا چھوٹا سا گولا تھا۔ ادھر رابطہ ہونے پر کاچھی نے فون کو کان سے لگایا۔ میں نے حلق اور ناک سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔ "آخر سانپ بل سے نکل آئے۔ آؤ۔۔۔ ذرا اور آگے بڑھو۔"

کاچھی نے ایک دم خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر باسو کو دھکا دیتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔ "اندر چلو۔۔۔ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔"

وہ دونوں بوکھلا کر گرتے پڑتے اندر چلے گئے۔ میں چھت سے اتر کر اپنے کمرے میں آگیا۔ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ "ارے یہ کیا۔۔۔؟ پھر بل میں گھس گئے؟ اسلحہ ہوتے ہوئے بھی ڈر رہے ہو؟"

کاچھی نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ "بزدل! کمینے! کیا چھپ کر حملے کر رہا ہے؟ ماں کا دودھ پیا ہے تو سامنے آ۔۔۔"

"آیا تو ہوں۔ اتنے قریب آکر بلا رہا ہوں اور تم چھپ رہے ہو۔ بزدل کمینے تو تم ہوئے۔ تھو ہے تم پر۔۔۔ دیکھتا ہوں، کب تک باہر نہیں آؤ گے؟"

میں نے فون بند کر کے سم بدل دی۔ حشمت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے فون پر مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ ابھی کاچھی اور باسو پر کہیں سے گولی چلنے والی تھی۔ وہ نامعلوم دشمن ہمارے محلے میں پہنچا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنے کمرے میں ہوں۔ تم کہاں ہو؟"

"میں کاچھی کے پاس ہوں۔ ہم تھانے دار بشیر کو اطلاع دے رہے ہیں۔ تم بھی آجاؤ۔"

"میں ابھی چھت پر جا کر دیکھتا ہوں شاید وہ دشمن نظر آجائے۔ تم بھی چھت پر آجاؤ۔"

"نہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی چلائے گا۔ میں چھت پر نہیں آؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "حشمت! تم دیکھ رہے ہو، وہ نامعلوم دشمن صرف شکوریا' کاچھی اور باسو کے پیچھے پڑا ہے۔ تمہیں مجرم کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اس نے اب تک نہ تمہارا نام لیا ہے اور نہ تمہیں دھمکی دی ہے۔"

اس نے کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ میں ابھی باہر نہیں آؤں گا۔"

میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آکر بولا۔ "میں اس وقت چھت پر ہوں۔ دور دور تک دیکھ رہا ہوں۔ وہ دو سپاہی جو گھر کے سامنے ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر گلیوں میں جا کر اس دشمن کو تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے تو کوئی ایسا بندہ نظر نہیں آرہا ہے جس پر کسی طرح کا شبہ کیا جا سکے۔"

تھانے دار بشیر بابر آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ ایک سپاہی نے کہا۔ "ادھر کھیت مزدور نے ایک شخص کو موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید اسی نے فون پر دھمکی دی ہو۔"

یہ سوچا جا رہا تھا کہ وہی ہوگا۔ جبکہ وہ ایک مسافر تھا۔ ادھر سے گزر رہا تھا۔ فی الحال اسی پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ اس موٹر سائیکل والے نے چھپ کر کاچھی اور باسو کو دیکھا تھا۔ پھر فون کال کے ذریعے دہشت زدہ کر کے وہاں سے جا چکا ہے۔

بہر حال وہ پھر گھر کی چار دیواری میں قید ہو گئے۔ تھانے دار نے انہیں حوصلہ دیا۔ ان سے کہا۔ "میرے ساتھ باہر چلو۔ جو آیا تھا' وہ جا چکا ہے۔ اپنے کارندوں کو ساتھ رکھو۔ وہ دشمن تمہاری طرف نہیں آسکے گا۔"

باسو نے کہا۔ "کہیں سے کوئی اندھی گولی آئے گی اور ہماری زندگی چاٹ جائے گی۔ بعد میں اسے آپ گرفتار کریں گے۔ ہم تو اپنی جان سے جا چکے ہوں گے۔"

وہ باہر نکلنے کا حوصلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بشیر بابر تھانے کے سپاہیوں کو زیادہ دنوں تک ان کی پہرے داری کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے کھیت مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ دن رات باری باری وہاں لاٹھیاں اور گنڈاسے لیے باہر پہرا دیتے رہیں گے اور بھری بندوقیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔

دوسرے دن بڑے ماموں نے فون پر پوچھا۔ "وہ مرغے کہاں ہیں؟ ہمارے شکاریوں کو باہر دکھائی نہیں دے رہے ہیں؟"



www.digestpk.com

Asifzamil

میں نے کہا۔ ”آپ کے آدمیوں نے شکوریا کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ وہ بستر پر اوندھا پڑا رہتا ہے۔ کاچھی اور باسو بری طرح سہمے ہوئے ہیں۔ ان کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ ساری زندگی چار دیواری میں نہیں رہ سکیں گے۔ میرے پھوپھا اور چچا اپنے بیٹوں کا کام نمٹانے کے لیے منڈی جاتے ہیں۔ آپ انہیں منڈی اور دوسری جگہ جانے سے روکیں۔“

دوسرے دن پھوپھا اور دونوں چچا منڈی سے واپس آرہے تھے شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ایسے وقت درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے تڑاتڑ فائرنگ شروع ہوگئی۔ انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ گولیاں ان کے آس پاس سے گزر رہی تھیں۔ وہ دہشت زدہ ہو کر زمین پر اوندھے منہ گر پڑے۔

جھاڑیوں کے پیچھے سے کسی نے کہا۔ ”بیٹوں کا کام بیٹوں کو کرنے دو۔ آئندہ ان کے کام سے نکلو گے تو مارے جاؤ گے۔ چلو اٹھو اور یہاں سے دوڑتے ہوئے جاؤ۔“

وہ تینوں وہاں سے اٹھ کر بھاگتے ہوئے گھر پہنچے۔ اپنے بیٹوں کو ہانپتے کانپتے ہوئے بتایا کہ ان پر کس طرح گولیاں چلائی گئی تھیں؟ انہیں اس شرط پر زندہ چھوڑا گیا ہے کہ آئندہ وہ اپنے بیٹوں کے کام سے باہر نہیں نکلیں گے۔

اب تو دہشت اور بڑھ گئی۔ کبھی باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے آدھی رات کے بعد کاچھی سے فون پر کہا۔ ”یہ گھر تمہارا مقبرہ بن گیا ہے۔ جیتے جی مردہ ہو۔ مقبرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ میں کل سے تمہارے کھیتوں میں کسی کو کام نہیں کرنے دوں گا۔ تمہارے باپ اور پھوپھا کی طرح کھیت مزدور بھی فائرنگ سے خوف زدہ ہو جائیں گے۔ تمہاری زمینوں پر ٹریکٹر نہیں چلیں گے۔ فصل نہیں اُگے گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔۔۔ تم سب کس طرح تباہ و برباد ہونے والے ہو؟“

کاچھی نے عاجزی سے کہا۔ ”ہمیں معاف کر دو۔ ایسی دشمنی نہ کرو۔ ہم سے جو بھی غلطی ہوئی ہے، اس کی سزا کے طور پر ہم سے بھاری جرمانہ وصول کر لو۔“

”میں ایک ہی بات جانتا ہوں‘ روبینہ کے سلسلے میں اپنا جرم قبول کرو۔ تم تینوں کو اقبالِ جرم کے بعد ہی مجھ سے نجات ملے گی۔“

ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ جرم قبول کرتے تو قانون کی گرفت میں آتے۔ پھر جاکھا اور روبینہ کے بھائی ان پر تھوکتے۔ دو چار برس کی قید بامشقت کے بعد واپس آتے تو کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتے۔ وہ ایسی ذلت اور رسوائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے ان کے گھر جا کر مشورہ دیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے لاہور چلے جائیں۔ یہاں جس بے جا سے نکل کر کھلی فضا میں سانسیں لیں۔ ورنہ بیمار پڑ جائیں گے۔

وہ تقریباً ایک ماہ سے چار دیواری میں قید رہ کر گھبرا گئے تھے۔ ذہن میں یہ بات آئی کہ لاہور جائیں گے تو دشمن سے دور نکل جائیں گے۔ اگر راز داری سے نکلیں گے تو دشمن کو خبر نہیں ہوگی۔

میں نے کہا۔ ”شکوریا کا زخم بھر گیا ہے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔ تم دونوں لاہور میں کسی حد تک محفوظ رہ کر اپنے انجانے دشمن کا سراغ لگا سکو گے۔“

وہ وہاں سے کسی بھی طرح بھاگ جانا چاہتے تھے۔ بزرگوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ راتوں رات چپ چاپ وہاں سے نکل جاؤ۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں انہیں لاہور تک چھوڑنے جاؤں۔ اتفاق سے میری امی بیمار تھیں۔ میں نے معذرت چاہی۔ انہیں بیماری کی حالت میں چھوڑ کر لاہور نہیں جا سکتا تھا۔ یہ طے پایا کہ آدھی رات کے بعد پھوپھا اور چچا ان کے ساتھ جائیں گے۔

میں نے بڑے ماموں کو اطلاع پہنچا دی اور ادھر رات کو پھوپھا، چچا، کاچھی اور باسو کے ساتھ ان کے گھر میں رہا۔ آدھی رات کے بعد ہم نے باہر نکل کر دور تک دیکھا۔ انہیں تسلی دی کہ کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

میں نے گھر آکر اپنے کمرے میں پہنچ کر ماموں کو بتا دیا کہ وہ چاروں وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ میں ان کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ ایسی ہی سازش وہ تینوں بھی میرے خلاف کرتے رہے تھے۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا تھا۔

ان کے پاس ایک پرانی لینڈ کروزر تھی۔ چچا اسے ڈرائیو کر رہے تھے۔ وہ چک سے نکل کر کھیتوں کے ایک درمیانی راستے سے گزر رہے تھے۔ ایسے وقت فائر کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی ذرا سی ڈگمگائی پھر رک گئی۔ اس کا ایک پہیا بیکار ہو گیا تھا۔

وہ سہم کر کھڑکیوں کے پار دیکھنے لگے۔ سامنے ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی۔ باقی دائیں بائیں اور پیچھے تاریکی تھی۔ کاچھی اور باسو نے اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔ کھڑکیوں سے ذرا نیچے جھک گئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوششیں کرنے لگے۔ کہیں سے گولی چلتی تو وہ اسی سمت جوابی فائر کر دیتے۔



وہ بری طرح خوفزدہ تھے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ وہی فون کرنے والا پُراسرار دشمن حملہ کرنے آیا ہے۔ پتا نہیں، اس کے ساتھ کتنے مسلح افراد تھے؟ انہیں وہاں سے بچ کر جانے کی امید نہیں تھی۔ چچا نے چیختے ہوئے کہا۔ ”تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ دشمنی نہ کرو۔ ہمارے پاس نقدی ہے۔ یہ سب لے لو۔ ہمیں جانے دو۔“

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر سے گولی چلی۔ اس کے ساتھ ہی چچا کے سر کے پاس کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک چھوٹا سا آگ کا گولا گاڑی کے پاس آیا۔ وہ کپڑے کا گولا بنا کر اسے پیٹرول میں بھگو کر ان کی طرف پھینک رہے تھے۔ انہیں گاڑی سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہے تھے۔

دوسرا آگ کا گولا آکر گاڑی کے نیچے چلا گیا۔ باسو نے چیخ کر کہا۔ ”نیچے ٹینکی میں آگ لگے گی۔ یہاں سے نکلو۔“

وہ سب اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر گاڑی سے دور بھاگنے لگے۔ کاچھی اور باسو دائیں بائیں فائر کرتے جا رہے تھے۔ تاریکی میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ محض اپنی سلامتی کی خاطر اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے۔ پھر باسو کے ایک بازو میں اور پسلیوں میں جیسے انگارے بھر گئے۔ دو گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔

پھوپھا نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے دور لے جانے لگا۔ ایسے ہی وقت زور دار دھماکا ہوا۔ پیٹرول کی ٹینکی پھٹ گئی تھی۔ گاڑی فضا میں اچھل پڑی تھی اس کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ٹکڑے اڑتے ہوئے دور تک جا رہے تھے۔ دھماکے کی آواز دور ہمارے چک تک آئی تھی۔

وہاں کے کتنے ہی افراد گھروں سے نکل آئے تھے۔ چھتوں پر چڑھنے والوں کو بہت دور آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں کیا ہو چکا ہے؟ میں اپنی جیپ میں شکوریا کے باپ اور پھوپھی کو بٹھا کر ادھر جانے لگا۔ ہمارے کارندے اور چک کے کتنے ہی لوگ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

ہمارے علاقے کے لوگوں نے ایسا دھماکا پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ایسی تباہی نہیں دیکھی تھی‘ جو وہاں نظر آرہی تھی۔ گاڑی کے ٹکڑے اڑتے ہوئے پتا نہیں کتنی دور تک گئے تھے؟ وہ چاروں دور بھاگنے میں ناکام رہے تھے۔ ادھر ادھر لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

باسو کے بازو اور پسلیوں میں گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ کاچھی کی دونوں ٹانگوں سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اس کا باپ قریب ہی بے جان پڑا ہوا تھا۔ باسو کا باپ بھی بے جان دکھائی دے رہا تھا۔ مگر ابھی اس میں جان تھی۔

میں فون پر تھانے دار بشیر کو اس سانحے کی اطلاع دیتے ہوئے بولا۔ ”زخمیوں کو فوراً اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ میں انہیں اوکاڑہ لے جا رہا ہوں۔ آپ فوراً جائے واردات پر پہنچیں۔ یہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔“

میرے کارندوں نے کاچھی، باسو اور پھوپھا کو کسی طرح جیپ میں لٹایا۔ چچا کی لاش بعد میں جا سکتی تھی۔ میں تیزی سے جیپ ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی طرف جانے لگا۔ صبح ہونے تک اوکاڑہ کے پولیس افسران الرٹ ہو گئے۔ وہاں سے جائے واردات تک پولیس کی گاڑیاں دوڑنے لگیں۔ معلوم کیا جا رہا تھا کہ ایسی بھیانک واردات کس نے کی ہے؟ کیوں کی ہے؟ ایسی دہشت گردی کے اسباب کیا ہیں؟

اعلیٰ افسران کو دلہن روبینہ کی شرمناک بربادی سے لے کر موجودہ دھماکے تک ہونے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات معلوم ہو رہے تھے۔ کوئی بات چھپی نہیں رہی تھی۔ صرف یہ بات معلوم نہیں ہو رہی تھی کہ ان تین مجرم بھائیوں سے اقبالِ جرم کرانے والا وہ پُراسرار شخص کون ہے؟

جاکھا اور روبینہ کے بھائیوں نے بیان دیا کہ وہ تینوں مجرم ہیں مگر ان کے خلاف ثبوت اور گواہ نہیں ہیں۔ کوئی دل جلا ہے، جو روبینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ایسا بھیانک انتقام لے رہا ہے۔

ایک اعلیٰ افسر کے حکم سے جاکھا اور روبینہ کے بھائیوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ یہ شبہ تھا کہ جاکھا اپنی کنواری دلہن کے لٹ جانے کے باعث ان تینوں کا دشمن بن گیا ہے اور وہ تینوں بھائی غیرت کے جوش میں بہن کی بربادی کا انتقام لے رہے ہیں۔

ویسے یہ محض مفروضہ تھا۔ یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ ان تینوں پر جان لیوا حملے کرتے آرہے ہیں۔ وہ پولیس والے اپنی روٹین اور اپنی صوابدید کے مطابق کمزوری کارروائیاں کر رہے تھے۔ جاکھا اور روبینہ کے بھائی ضمانت پر رہا ہو کر آگئے۔

چچا کی موت پر پورے خاندان میں سوگ منایا گیا۔ جو زندہ بچ سکتے تھے وہ اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ ان کی صحت یابی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ پولیس والوں



www.digestpk.com

Asifzamil

اخبارات والوں اور فوٹو گرافرز کی آمد و رفت سے چک میں رونق لگی ہوئی تھی۔

دوسرے ہی دن کے اخبارات میں ہمارے ساتھ ہونے والے واقعات کی تفصیلات شائع ہوگئیں۔ روبینہ نے ایک اخبار میں اپنے متعلق بہت کچھ پڑھا اور یہ پڑھ کر حیران ہوئی کہ کوئی پُراسرار شخص اس کی حمایت میں مجرموں کا جینا حرام کر رہا ہے۔

اس نے فون پر عینی سے کہا۔ ''تم اس چک میں موجود ہو۔ وہاں جو ہو رہا ہے، اسے آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ پلیز۔۔۔ اس پُراسرار شخص کے متعلق بتاؤ؟ تمہارے خیال میں وہ کون ہوسکتا ہے؟''

عینی نے کہا۔ ''یہاں سب ہی حیران ہیں۔ کوئی سمجھ نہیں پا رہا ہے کہ وہ کون ہے؟''

روبینہ نے کہا۔ ''وہ کوئی آسمان سے اتر کر آنے والا فرشتہ نہیں ہوگا۔ اس کا تعلق اسی چک سے ہوگا۔ ہوسکتا ہے، پہلے سے ہی اس کی دشمنی ان تینوں سے چلی آ رہی ہو یا پھر اسے مظلوموں کو انصاف دلانے کا خبط ہو۔ میں ایسے کسی خبطی کو نہیں جانتی اور وہ ہے کہ میرے لیے ایسی خطرناک جنگ لڑ رہا ہے۔''

اس رات عینی نے مجھے فون پر بتایا۔ ''شکوریا' کا چھی اور باسو کے ساتھ جو ہو رہا ہے، روبینہ اس کے متعلق اخبار میں پڑھ کر حیران ہو رہی ہے اور اپنی باتوں سے بڑی حد تک مطمئن لگ رہی ہے۔ اس بیچاری کو کسی حد تک انصاف مل رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جب وہ پُراسرار شخص ان تینوں سے اقبالِ جرم کرانے میں کامیاب ہوگا اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے والے کو سزا ملے گی تو روبینہ کو قلبی سکون حاصل ہوگا۔''

میں اپنی عینی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ فی الحال اپنی موجودہ سرگرمیوں کو چھپا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فون پر اتنا گہرا اور سنگین راز سنا نہیں سکتا تھا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں روبرو بیٹھ کر بڑی رازداری سے کی جاتی ہیں اور رازداری برتنے کے لیے اس سے کہیں ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔

وہ مجھ سے منسوب ہونے والی تھی۔ اس لیے بزرگوں نے ہمارے درمیان فاصلہ رکھا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کبھی کہیں اتفاق سے ملنے کا موقع ملے گا تو اسے اپنا رازدار بنالوں گا۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ روبینہ ان تینوں کی حالتِ زار پر کسی حد تک مطمئن ہے۔ وہ یقیناً یہ چاہتی ہوگی کہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے والا بے نقاب ہو جائے اور اسے قرار واقعی سزا ملے۔

سارے ہی مجرم میرے سامنے تھے اور سزائیں پا رہے تھے۔ حشمت اصل گناہ گار تھا۔ اب اس کا آرام و سکون ختم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کاچھی باسو اور تمہارے پھوپھا اسپتال میں پڑے ہیں۔ اب تک انہوں نے میرے متعلق کچھ اگلا نہیں ہے مگر اب اگل دیں گے۔ دشمن نے انہیں توڑ کر رکھ دیا ہے۔ سب ہی کو اپاہج بنا دیا ہے۔ وہ اس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا اندیشہ' تمہارا خوف درست ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ ان کی قوتِ مدافعت ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ اقبالِ جرم کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی تمہاری شامت آجائے گی۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے یہاں سے کہیں دور جا کر چھپ کر رہنا چاہیے۔''

''ہاں۔ کہیں چھپ کر رہنا چاہیے۔ جب حالات سازگار ہوں تو واپس چلے آنا مگر کہاں جاؤ گے؟''

''کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں روپوش رہ سکوں گا۔''

میں اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا، وہ بولا۔ ''امی اور چھانو سے کوئی بہانہ کروں گا۔ یہ کہہ دوں گا کہ اپنے رشتے داروں سے ملنے فیصل آباد جا رہا ہوں۔''

''ان کی فکر نہ کرو۔ میں امی اور چھانو کو سمجھا دوں گا۔ حالات جلد ہی سازگار ہو جائیں گے۔''

''میں دوپہر کے کھانے کے بعد یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''میں تمہیں جیپ میں لے چلوں گا۔ تم اوکاڑہ سے کسی بس میں چلے جانا۔''

وہ نئی منزل کا تعین کر کے نئے سفر کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ فون کی سم بدل کر پھوپھی کا نمبر ملایا۔ وہ اپنے بیٹے باسو اور اپنے شوہر کی تیمارداری کے لیے اسپتال میں تھی۔ فون پر ایک اجنبی کی آواز سن کر بولی۔ ''ہیلو کس سے بات کرنی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارے بیٹے یا شوہر سے۔''

وہ بیٹے سے بولی۔ ''باسو کوئی تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ لو بات کرو۔''

چند لمحوں بعد باسو کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، کون ہو تم۔۔۔؟''

''مجھے آواز سے پہچان لو۔''



ایسے وقت میں آواز بدل کر حلق اور ناک سے بولتا تھا۔ منہ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا گولا ہوتا تھا۔ اس طرح آواز بالکل ہی بدل جاتی تھی اور وہ آواز ان کے لیے موت کا پیغام بن جاتی تھی۔

وہ خوفزدہ ہو کر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ ''ہمیں معاف کر دو۔ خدا کے لیے ہمیں معاف کر دو۔ تم جو کہہ رہے ہو، ہم وہی کریں گے۔ مجسٹریٹ کے سامنے بیان دیں گے کہ ہم ایک نو بیاہتا دلہن روبینہ کے مجرم ہیں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے، اب ہم سے دشمنی نہ کرو۔''

''مجھے یقین ہے، اسپتال سے باہر آ کر مرنا نہیں چاہو گے۔ تم چاروں اپنا اپنا جرم قبول کرو گے، جاؤ میں نے پیچھا چھوڑ دیا۔ باقی کی زندگی اپاہج بن کر گزارتے رہو۔''

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ آئندہ ان کے قریب رہ کر دیکھ سکتا تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں؟ دوپہر کو حشمت میرے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہونے لگا۔

میں نے آگے جا کر راستہ بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے ماموں کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہاں ان سے ملاقات کروں گا۔ وہیں سے تمہیں گاڑی مل جائے گی۔''

وہ ہمارے علاقے سے جلد سے جلد دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے اعتراض نہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم بچپن سے کمینے ہو یا پہلی بار روبینہ کے ساتھ کمینگی دکھائی ہے؟''

اس نے ٹھٹک کر مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ ''مجھے کمینہ کیوں کہہ رہے ہو؟ اس بات کو سیدھی طرح بھی پوچھ سکتے ہو۔''

''چلو سیدھی طرح بتا دو۔ ایک معصوم کنواری لڑکی کی عزت لوٹنے کے بعد تمہارا ضمیر بھی ملامت کرتا ہے یا نہیں؟''

''...تم فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟ کوئی دوسری بات کرو۔''

''تم سب مجھے ایب نارمل اور خبطی کہتے رہے اور خبطی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں جو کمینوں اور بدمعاشوں کے مزاج پر گراں گزرتی ہیں۔ میں تمہیں روبینہ کی عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا روبینہ نے کہیں عدالت لگا رکھی ہے جو تم مجھے اس کی عدالت میں پیش کرو گے۔''

''نہیں، تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ روبینہ یہاں آئے گی۔''

ہم تقریباً بیس کلو میٹر دور نکل آئے تھے۔ ویران راستے سے گزر رہے تھے۔ وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں پختہ سڑک کو چھوڑ کر کچے راستے پر جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''ادھر کہاں جا رہے ہو؟''

''روبینہ کے پاس۔۔۔''

وہ میری سنجیدگی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی روکو۔۔۔''

میں گاڑی روک کر اتر گیا۔ پچھلی سیٹ کے نیچے سے رائفل نکالتے ہوئے بولا۔ ''نیچے اترو۔''

وہ رائفل دیکھتے ہی سمجھ گیا۔ جیپ سے اترتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے تیور اچانک ہی بدل گئے ہیں۔ تم نے رائفل کیوں نکالی ہے اور اسے چھپا کر کیوں لائے ہو؟''

میں جیپ کے ایک طرف سے گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔ اسے نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''زندگی کتنی عزیز، کتنی حسین اور قیمتی ہوتی ہے، اس سے زیادہ بہن کی آبرو قیمتی ہوتی ہے۔''

میں نے ٹریگر دبا دیا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی ایک گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ وہ اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ روتے ہوئے گڑگڑانے لگا۔ ''مجھے نہ مارو۔ میں تمہارا بہنوئی ہوں۔''

''کیسے ہو تم لوگ؟ ایک عورت کے مجازی خدا بن کر باقی عورتوں کے لیے شیطان بن جاتے ہو۔ میری بہن سے اپنا گناہ چھپاتے ہو۔ اسے دھوکا دیتے ہو اور اس کے سرتاج بھی کہلاتے ہو۔ تم کیا سمجھ رہے تھے' گناہ کرنے کے بعد سزا سے بچ جاؤ گے؟''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''میری ایک بات مان لو۔ مجھے ابھی چھانو کے پاس لے چلو۔ بہن کی صورت دیکھ کر تم مجھ پر گولی نہیں چلاؤ گے۔''

''میری ایک بہن روبینہ بھی ہے۔ کیا وہ تمہیں معاف کر دے گی؟''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، میں نے کہا۔ ''کچھ نہ کہو، روبینہ آ رہی ہے۔ وہی تمہیں سزا سنائے گی۔''

عینی نے مجھے روبینہ کے نمبر بتائے تھے۔ میں نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ تھوڑی دیر میں رابطہ ہوتے ہی روبینہ کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔ کون۔۔۔؟''

میں نے کہا۔ ''میں تمہارا وہی پُراسرار بھائی ہوں، جسے دشمن اور قانون کے محافظ سب ہی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ کیا تم میرے وہی محسن' وہی بھائی ہو؟''

''یقین کر لو۔ میں وہی ہوں۔ تمہاری زندگی برباد



www.digestpk.com

Asifzamil

کرنے والے چار مجرم ہیں۔ ان میں سے تین کو میں نے اپاہج بنا دیا ہے۔ وہ اپنا جرم قبول کرنے والے ہیں۔ چوتھا مجرم اس وقت میرے سامنے زخمی حالت میں پڑا ہے اور یہی تمہارا اصل مجرم ہے۔ یہی کمینہ تمہاری حجلۂ عروسی میں آیا تھا۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "اگر یہ وہی ہے تو پہلے اس پر تھوکو پھر بولو۔"

میں نے آخ تھو کہتے ہوئے حشمت پر تھوک دیا پھر کہا۔ "تم روبینہ کی عدالت میں ہو۔ اس کی طرف سے تم پر تھوکا جا رہا ہے۔ یہ لو فون اور اس کے سامنے اپنے گناہ کو قبول کرو۔"

وہ فون لینے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایک لات ماری۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف گر پڑا۔ میں نے سختی سے کہا۔ "اٹھو۔ وہ انتظار کر رہی ہے۔"

اس نے فوراً ہی اٹھ کر میرے ہاتھ سے فون لیا پھر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ خدا مجھے معاف نہیں کرے گا۔ تم معاف کردو۔"

روبینہ نے پوچھا۔ "کیوں معاف کردوں؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا کتے۔۔۔؟"

"انسان کبھی شیطان کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ شیطان انسان کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے تم سے بدترین دشمنی کی ہے۔ تم مجھے بلال کا بہنوئی سمجھ کر معاف کردو۔"

اس نے پوچھا۔ "یہ بلال کون ہے؟"

"یہی میرا سالا ہے۔ یہی مجھے تمہاری عدالت میں لایا ہے۔ تمہارا محسن ہے۔ ذرا سوچو۔۔۔ میں مرجاؤں گا تو تمہارے محسن کی بہن بیوہ ہوجائے گی۔"

اس نے کہا۔ "فون میرے بھائی کو دو۔"

اس نے میری طرف فون بڑھا دیا۔ میں نے اسے لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ یہ بتادوں کہ یہ ذلیل، کمینہ بدقسمتی سے میرا بہنوئی ہے۔ میں انصاف کی خاطر رشتے کا لحاظ نہیں کروں گا۔ ایسے شیطان کو مرجانا چاہیے۔"

"کیا میری خاطر اپنی بہن کا سہاگ اجاڑ دوگے؟"

"اس نے حجلۂ عروسی میں میری ایک بہن کا سہاگ اجاڑا ہے۔ یہ مرے گا تو میری بہن چھانو کو ایک شیطان سے نجات مل جائے گی۔"

وہ بولی۔ "مجھے یاد آرہا ہے، تم وہی بلال ہو جس کی جیب سے انگوٹھی نکال کر اسے میرے ساتھ بدنام کیا جا رہا تھا؟"

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔"

"اس کا مطلب، تم میری سہیلی کے منگیتر ہو؟"

"ہاں۔ میں اس کا منگیتر ہوں۔"

"اور تم نے ہی شینا کو اغوا ہونے والی بدنامی سے بچایا ہے؟"

"ہاں۔ وہ بھی میری بہن ہے۔"

"تم بہت اچھے اور عظیم ہو۔ نہ جانے کتنی بہنوں کے لیے کتنے محاذوں پر لڑتے آرہے ہو؟ میں تمہاری بہن بن کر فخر کر رہی ہوں۔"

"ابھی یہ بات زبان پر نہ لانا کہ ان مجرموں سے اقبالِ جرم کرانے والا وہ پُراسرار شخص میں ہی ہوں۔ یہ بات عینی بھی نہیں جانتی۔ میں اسے بعد میں بتاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "تمہاری ہر بات سر آنکھوں پر۔ جو بولوگے، میں وہی کروں گی۔ تم نے مجرموں کو سزا دے کر میرے دل کا بوجھ ہلکا کردیا ہے۔ اب میں سر اٹھا کہہ سکوں گی کہ تم میرے منصف اور غیرت مند بھائی ہو۔"

"یہ تمہارا اصل مجرم اور گناہ گار ہے، اسے سزا سناؤ۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "میرے اندر آہیں، کراہیں اور چیخیں دبی ہوئی ہیں۔ انہیں کوئی سننے والا نہیں تھا۔ میں یہ سب کچھ اپنے مجرم کی آہوں اور کراہوں میں سننا چاہتی ہوں۔ یہ تڑپے گا، چیخے گا تو میرے اندر سے سارا غبار نکلتا رہے گا۔"

"اچھا تو پھر سنو۔۔۔"

میں نے حشمت کی دوسری ٹانگ پر گولی ماری۔ وہ چیختے اور تڑپنے لگا۔ ایسے وقت وہ رونے لگی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "سہاگ کی سیج پر میری شرم و حیا ایسے ہی چیخ رہی تھی۔"

میں نے حشمت کو نشانے پر لے کر کہا۔ "یہاں سے بھاگو۔ دونوں ٹانگیں ناکارہ ہوچکی ہیں۔ روبینہ تصور میں دیکھے گی کہ تم کس طرح زمین پر گھسٹ رہے ہو؟"

وہ وہاں سے گھسٹتا ہوا دور جانے کی کوشش کرتے ہوئے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ میں نے اس کے ایک بازو پر گولی ماری۔ وہ پھر تڑپنے اور چیخیں مارنے لگا۔ تین گولیاں کھا چکا تھا۔ چوتھی گولی گردن میں لگی۔ وہ ایک دم سے اوندھے منہ مٹی میں مل گیا۔ اس کے حلق سے آخری چیخ نکلی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔

مجھے فون پر دھیمی دھیمی سی سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا مجرم مارا گیا تھا مگر ان لمحات میں اس کا دکھ بھاری ہوگیا۔ وہ جیتے جی اپنی آبرو کی میت پر رو رہی تھی۔

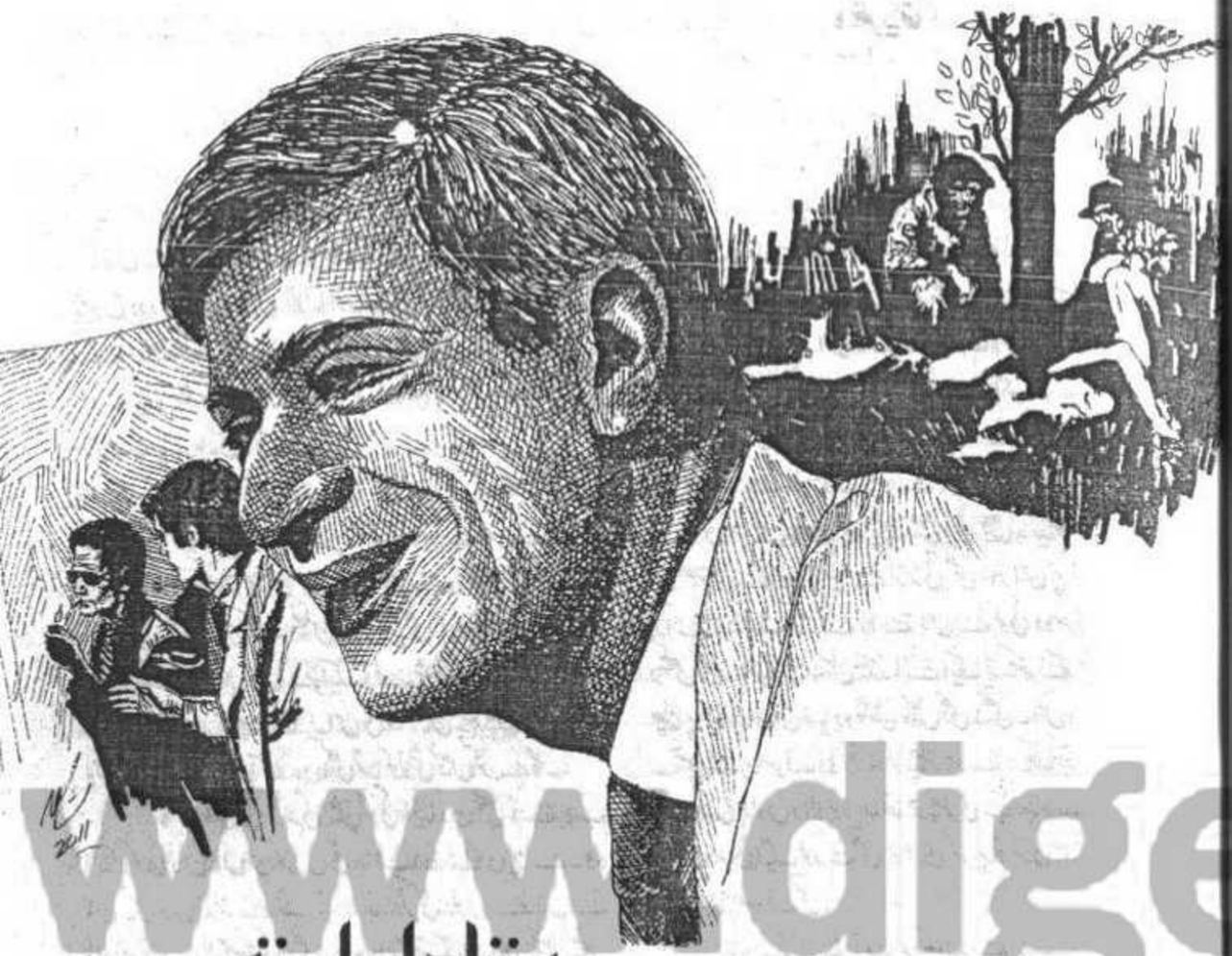

▼▼▼





# متبادل راستہ

تنویر ریاض

یکسانیت کا جمود زندگی کو بے کیف۔۔۔ سپاٹ بنادیتا ہے۔۔۔ تبدیلیوں کے بغیر کسی شے میں مزہ نہیں۔۔۔ وہ بھی اپنے لگے بندھے معمولاتِ زندگی سے تنگ آچکا تھا۔۔۔ اسے کسی تبدیلی۔۔۔ تغیر کی اشد ضرورت تھی۔۔۔ بالآخر اسے اپنی زندگی کو بدلنے کا ایک طریقہ سوجھ گیا۔۔۔

**جانے راستوں سے گھبرا کر ایک نئی راہ اختیار کرنے والے خبطی کی مجرمانہ روداد**

اس نے کار روک کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اسے یہ جگہ مناسب معلوم ہوئی۔ حالانکہ اس کا رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن بعض اوقات کچھ کام بلا ارادہ بھی کرنے پڑ جاتے ہیں۔ اس نے گاڑی سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ کے پاس روکی اور باہر آگیا۔ دراصل اسے شدت سے حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فارم کی دیوار کی طرف بڑھا جو درختوں کی قطار کے عین پیچھے نظر آرہی تھی۔ فراغت پانے کے بعد اس نے پتلون کی بیلٹ باندھی اور فارم کے جنگلے



www.digestpk.com

Asifzamil

والے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے جھک کر وادی کی ڈھلوان سطح کا نظارہ کرنا پڑا اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایک خوش گوار دن تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور دور دور تک بادلوں کا پتا نہیں تھا، ایسے موسم میں پکنک منانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ اپنی گاڑی سے پکنک باسکٹ نکالتا۔ گھاس پر کپڑا بچھا کر بھنا ہوا مرغ اور وائن کی بوتل نکالتا اور کھا پی کر درخت کے سائے میں اونگھنے لگتا۔ کاش اس کی گاڑی میں پکنک باسکٹ ہوتی۔ ورنہ ایک سینڈوچ اور بیئر کی بوتل سے بھی کام چل سکتا تھا لیکن اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ اس دنیا میں اس کی آمد کا مقصد کیا ہے۔ یہی کہ وہ فارم کے گیٹ پر جھک کر ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھتا رہا۔ کم از کم اس موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ پائپ ہی سلگا سکتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ تمباکو نوشی نہیں کرتا تھا۔ بچپن میں اس نے ایک دفعہ یہ شوق پورا کرنا چاہا لیکن اسے اتنے زور کا پھندا لگا کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس نے تہیہ کرلیا کہ آئندہ وہ کبھی تمباکو نوشی نہیں کرے گا۔

کاش اس کی زندگی میں کوئی ایسا دن بھی آئے جب اسے کوئی فون کال سن کر اس کی جانب دوڑ نہ لگانی پڑے۔ وہ ان ٹیلی فون کالز سے تنگ آچکا تھا اور کئی دنوں سے اس نے ان پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا ریجنل منیجر پیٹرسن اسے کبھی برداشت نہیں کرے گا لیکن اس نے عرصہ ہوا، پیٹرسن کی پروا کرنی چھوڑ دی تھی بلکہ اب تو اسے اپنی ملازمت، کمپنی کی پروڈکٹ اور ساتھ کام کرنے والے لوگوں کی بھی فکر نہیں تھی۔ ان لوگوں نے بیس سال پہلے اس کے ساتھ ہی ملازمت شروع کی تھی اور اب بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں کوئی سیلز منیجر تھا تو کسی نے مارکیٹنگ کی ذمے داری سنبھالی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک سیلز مین ہی تھا۔ ایک ایسا سیلز مین جس کی ان دنوں کوئی چیز فروخت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کام بس یہ رہ گیا تھا کہ مختلف اسٹورز میں جا کر اپنی کمپنی کی پروڈکٹ کا اسٹاک چیک کرتا اور آرڈر بک کر لیتا۔ گویا اس کی ذمے داری محض آرڈر لینے تک محدود ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی تھی جب تک وہ کوئی مختلف راستہ اختیار نہ کرتا۔ جب آگے بڑھنے کے راستے بند ہو جائیں تو لوگ متبادل راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے ساتھیوں نے کیا، وہ ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں جاتے رہے۔ اس کے لیے بعض اوقات انہیں لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑا لیکن اس کے نتیجے میں وہ پہلے سے بہتر پوزیشن میں آتے چلے گئے۔ ان کا نظریہ تھا کہ آگے بڑھو اور اوپر پہنچو جبکہ اس کی قسمت میں تنزلی اور پیچھے ہٹنا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے کبھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور آگے بڑھنے کے لیے کوئی متبادل راستہ اختیار نہیں کیا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور وہاں سے جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے ریٹ کلف سے ملنے جانا تھا جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا لیکن کام کے سلسلے میں اس سے ملنا مجبوری تھی۔ اس کا ویسے ہی بہت وقت ضائع ہوگیا تھا کیونکہ وہ موٹروے پر جانے کے بجائے اس سڑک پر چلا آیا تھا۔ یہ بھی کام کو ٹالنے اور وقت برباد کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ حالانکہ وہ بہت ہی خوب صورت سڑک تھی اور آج کل اس طرح کی سڑکیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ سڑک جنگلوں اور کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور اس پر ٹریفک بھی برائے نام تھا۔ سارے راستے اس نے کوئی دوسری کار نہیں دیکھی تھی۔ البتہ چند میل تک اسے ایک ٹریکٹر کے پیچھے ضرور چلنا پڑا تھا۔ وہاں زیادہ چہل پہل بھی نہ تھی۔ اس دوران اس نے سڑک پر صرف دو افراد کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں ایک سرخ بالوں والا بوڑھا تھا جو چھڑی کے سہارے چلا جا رہا تھا۔ دوسری ایک عورت تھی جو اپنی کمر پر ٹوکری جمائے پھول چننے میں مصروف تھی۔

اس نے اپنے آپ کو گیٹ سے پرے دھکیلا اور پتھروں کی دیوار کے ساتھ چلنے لگا۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک گڑھا نظر آیا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی جو درخت کی شاخوں، پتوں اور گھاس پھوس سے بھرا ہوا تھا۔ اچانک وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس کی نگاہ ایک انسانی پیر پر گئی جو اس ملبے میں سے جھانک رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور یوں لگا جیسے حلق میں کوئی گولہ پھنس گیا ہو۔ یہ منظر اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی، اس نے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ اٹھائی اور اس کو پاؤں سے لگایا۔ وہ واقعی کسی انسان کا پیر تھا اور ٹانگ سے جڑا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کے لیے یہاں سے جانا ممکن نہیں رہا تاہم وہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تاکہ دیکھ سکے کہ کیا وہ واقعی انسانی لاش تھی۔ اس نے شاخ کی نوک سے پتے اور گھاس ہٹائی تو ایک عورت کا سر نمودار ہوا۔ اس کے بال گھنے اور سینے پر پھیلے ہوئے تھے وہ اس کا پورا چہرہ نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس کا آدھا حصہ گھاس میں دبا ہوا تھا۔ البتہ اسے یہ نظر آگیا کہ اس کے منہ پر سیاہ ٹیپ لگایا گیا تھا



اور اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔

اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے اندر سے آواز آئی کہ وہ سب کچھ بھول کر کار میں بیٹھے اور اپنے کام پر روانہ ہو جائے جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہ اتنی بے ہودہ سوچ تھی کہ اسے اچانک ہی اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ لاش کو اس حال میں چھوڑ کر چلا جائے۔

اس نے ٹوٹی ہوئی شاخ زمین پر پھینکی اور درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کار تک پہنچ گیا پھر اس نے بریف کیس سے اپنا فون نکالا۔ پہلی کال اس نے پولیس اور دوسری ریٹ کلف کو کی۔ یہ بتانے کے لیے کہ آج کی میٹنگ ملتوی کر دی جائے۔ ریٹ کلف یہ سنتے ہی بھڑک اٹھا تاہم اس کے وضاحت کرنے پر وہ دوسرے روز میٹنگ کے لیے تیار ہوگیا۔

پولیس نے وہاں پہنچنے میں بہت تیزی دکھائی۔ جبکہ وہ انہیں اس جگہ کے محلِ وقوع کے بارے میں ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسا آلہ ہے جو ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سے جگہ اور سمت کا تعین بھی کر لیتا ہے۔ یقیناً ایسا ممکن ہے۔ تبھی تو وہ ناک کی سیدھ میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ پہلی گاڑی پٹرول کار تھی جس میں دو باوردی پولیس والے سوار تھے پسنجر سیٹ والا پولیس مین پہلے اترا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''تم نے ہی لاش کے بارے میں فون کیا تھا؟''

''ہاں، وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ وہاں پڑی ہے۔ چلو میں دکھاتا ہوں۔''

لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ پہلے اس سے نام و پتا پوچھا گیا اور اسے یہ وضاحت بھی کرنا پڑی کہ دن کے اس حصے میں وہ جنگل کے سرے پر کیا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بولنا شروع کیا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پولیس کو فون کر کے اس نے کوئی غلطی کی ہے۔ اس نے نوٹ کیا کہ اس دوران پولیس ڈرائیور نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کر کے ریڈیو پر کسی سے بات کی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں اور حلق خشک ہونے لگا۔

''ٹھیک ہے۔'' پہلے پولیس والے نے اس کے کوائف نوٹ کرنے کے بعد نوٹ بک اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بتا سکو گے کہ وہ لاش کہاں پر ہے؟''

وہ پولیس والے کو ساتھ لے کر درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا گڑھے تک گیا لیکن اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس میں دوبارہ یہ منظر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے گڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لاش وہاں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کسی چیز کو نہ چھیڑوں۔''

پولیس والے کے حلق سے ایک غراہٹ برآمد ہوئی جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھا اور گڑھے کے قریب جھک کر دیکھنے لگا پھر اس نے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی مدد سے پتے ہٹائے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوگیا پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تم اپنی کار میں بیٹھو۔ ابھی کچھ اور آفیسرز آنے والے ہیں۔ وہ بھی تم سے بات کرنا چاہیں گے۔''

کچھ ہی دیر بعد دوسری کار بھی آگئی جس میں سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد سوار تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ سراغ رساں ہوں گے پھر ایک وین آئی جس میں سفید کوٹ پہنے ہوئے لوگ موجود تھے۔ وہ اپنے ساتھ نیلے رنگ کی ترپال بھی لائے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ریڈیو پر پیغامات بھیجنے اور گفتگو کا سلسلہ تیز ہوگیا۔

اس نے دیکھا کہ ایک طویل قامت اور فربہ اندام شخص جو دیکھنے میں ان کا باس لگ رہا تھا۔ پہلے پولیس والے سے مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا۔ وہ دونوں وقفے وقفے سے اس پر بھی نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ پھر وہ بھاری بھر کم شخص اس کے پاس آکر بولا۔

''صبح بخیر جناب۔ میں سراغ رساں انسپکٹر اسٹیوارڈ ہوں اور اس کیس کی تحقیقات میرے ذمے ہے۔''

اس کا انداز دوستانہ تھا لیکن چہرے پر پھیلی ہوئی بے رخی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی کسی پر اعتبار کرنے کا قائل نہیں اور اپنی تحقیقات کی روشنی میں ہی نتائج اخذ کرتا ہے۔

''تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم بولنگ ووڈ کے پولیس اسٹیشن آجاؤ۔ وہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے اور ہم فی الحال وہیں اپنا پڑاؤ ڈالیں گے۔ میں تمہارا بیان لینا چاہتا ہوں۔ یقین کرو یہ محض ایک رسمی اور ضابطے کی کارروائی ہوگی۔''

''میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس میں کتنا وقت لگ جائے گا؟''

اسٹیورڈ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہ محض ایک رسمی کارروائی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی وجہ سے تمہیں زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ہمیں ایک عورت کی لاش ملی ہے اور ہم اس



www.digestpk.com

Asifzamil

کے قاتل تک پہنچنے کے لیے تیز اور فوری اقدام کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "خیر، مجھ سے جو ہو سکا وہ ضرور کروں گا۔"

اسٹیوارڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔" پھر وہ کچھ کہے بغیر مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دوسرے پولیس والوں کے پاس پہنچ گیا جو لاش کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

☆☆☆

بولنگ ووڈ کا پولیس اسٹیشن بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ ستر سال پہلے کے پولیس اسٹیشن ہوا کرتے تھے وہاں کی میزیں لکڑی کی تھیں اور ان پر سبز رنگ کا میز پوش بھی نہیں تھا جو بعد میں ہر پولیس اسٹیشن میں نظر آنے لگا تھا۔ ڈیسک سارجنٹ کو اسی کا انتظار تھا۔ غالباً اسے ریڈیو یا ٹیلی فون کے ذریعے اس کی آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ یہ سارا انتظام کس طرح کرتے ہیں۔ البتہ وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اگر وہ پولیس اسٹیشن نہ پہنچتا تو پھر کیا ہوتا۔

سارجنٹ اسے ایک کمرے میں لے گیا جس پر انٹرویو روم 4، لکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک میز اور دو تین پلاسٹک کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی دیواروں پر سبز رنگ کیا گیا تھا۔ اس کے سوا وہاں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ وہ سارجنٹ کے کہنے کا انتظار کیے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارجنٹ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اگر تم پسند کرو تو تمہارے لیے ایک کپ چائے کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ اس جگہ میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہاں قدم رکھتے ہی اس کا منہ خشک ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں اس وقت چائے یا کافی کی اشد ضرورت ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

سارجنٹ کے جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا لیکن اسے وہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ کوئی ایسی بات جس کی جانب اس کی توجہ جا سکتی۔ چھت میں کوئی دراڑ نہیں تھی اور نہ ہی کمرے کی دیواروں پر کوئی پوسٹر یا نوٹس آویزاں تھا۔ میز کی ٹاپ پر فارمیکا لگا ہوا تھا اور اس پر گول گول دھبے پڑے ہوئے تھے وہ سمجھ گیا کہ اس سے پہلے بھی یہاں بیٹھ کر چائے پی گئی تھی اور بعد میں کسی نے میز صاف کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

البتہ وہاں اسے ایک چیز کی کمی محسوس ہوئی۔ وہاں کوئی ایسا آئینہ نہیں تھا جس کے ذریعے پولیس والے اسے دیکھ سکتے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے آئینے ضروری ہیں تاکہ سینئر سراغ رساں غور سے تحقیقاتی کارروائی دیکھ سکیں۔ اس نے ٹیلی وژن پر یہ منظر کئی بار دیکھا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد سارجنٹ پلاسٹک کے کپ میں چائے لے کر آ گیا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"تم شروع کرو۔ میرا خیال ہے کہ اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس نے احتیاط سے چائے پینا شروع کی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لیکن وہ بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ مثلاً یہ اگر یہ جرم اس سے سرزد ہوا ہوتا اور وہ اس کمرے میں بیٹھا تفتیش شروع ہونے کا انتظار کر رہا ہوتا۔ اگر وہ لڑکی اس کے ہاتھوں ماری جاتی تو یہاں بیٹھ کر اسے وہ سب کچھ یاد آ رہا ہوتا۔ کس طرح اس نے لڑکی کا گلا دبوچا ہوگا۔ اس لڑکی نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کس طرح جدوجہد کی ہوگی۔ وہ چیخی چلائی ہوگی اور اس نے اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا ہوگا۔ پھر اس کی لاش کو گھاس سے ڈھانپ دیا ہوگا۔ اس وقت اس کمرے میں بیٹھ کر تفتیش شروع ہونے کا انتظار کیسا لگتا پھر وہ جب اس سے سوالات کرتے تو کس طرح وہ اپنی وحشت اور آنکھوں میں پھیلے ہوئے درد پر قابو پا سکتا، وہ اس کے بارے میں جو بھی اندازے لگاتے، اس سے انہیں کس طرح روک سکتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے اس کے ٹخنوں میں کھجلی ہونے لگی اور پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو چکی تھیں۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ہاتھ اور ماتھا صاف کیا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ کمرے میں دورخی آئینہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس کی یہ کیفیت نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ اب تک سراغ رساں سارجنٹ اس کے سر پر سوار ہو چکا ہوتا۔

ایک گھنٹا بعد اسٹیوارڈ نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ وہ صبح کے مقابلے میں بہت زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جو اس نے میز پر رکھی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اوکے۔" اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے صبر و سکون کے ساتھ میرا انتظار کیا لیکن تم تو جانتے ہی ہو کہ اس طرح کے معاملات میں بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے، ہر شخص کچھ نہ کچھ چاہتا ہے۔ کچھ جاننا چاہتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بہت سے کبوتر ٹھونگیں مار کر کسی کو ہلاک کر دیں۔"



یہ کہتے ہوئے وہ تھوڑا سا مسکرایا لیکن اس کی باتوں میں مزاح کا عنصر ناپید تھا۔ اسے بھی احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے لہٰذا موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایک کانسٹیبل کو بلاتا ہوں۔ وہ تمہارا بیان لے لے گی۔"

کانسٹیبل ایک خوش شکل سیاہ فام لڑکی تھی جو اپنے ہاتھ میں لیپ ٹاپ پکڑے اندر چلی آئی۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم شروع سے آخر تک سب بتا دو یعنی یہ کہ موٹروے کو چھوڑ کر اس سڑک پر کیوں گئے۔ پیشاب کے لیے ایک جگہ رکے اور وہاں تم نے گڑھے میں ایک نوجوان عورت کی لاش دیکھی وغیرہ وغیرہ۔"

اس نے بولنا شروع کر دیا۔ کانسٹیبل کی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ پر چل رہی تھیں۔ اس نے ایک ایک بات تفصیل سے بتائی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ کانسٹیبل نے بھی وقفہ لینے کے لیے اپنی انگلیاں کی بورڈ سے ہٹا لیں۔

اسٹیوارڈ بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے عام دنوں کے مقابلہ میں آج متبادل راستہ کیوں اختیار کیا؟"

اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ وہ کیا کہتا یہی کہ یہ محض اتفاقی امر تھا اور اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ وہ ہینڈل بری پہنچنے کے لیے مختلف راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔

"ہینڈل بری۔" اسٹیوارڈ نے کہا۔ "یہ وہی جگہ ہے جہاں ریٹ کلف کے ساتھ تمہاری میٹنگ ہونا تھی؟"

گویا انہوں نے اس دوران اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس لیے ان سے کچھ چھپانا ٹھیک نہیں تھا ورنہ حقیقت میں اسے ریٹ کلف سے اتنی نفرت تھی کہ وہ اس کا نام بھی اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں یہی شخص اس کی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ تھا۔

"ہاں، یہی بات تھی۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"پھر کیوں؟" اسٹیوارڈ نے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تم نے یہ راستہ اختیار کیوں کیا؟"

وہ اسے کس طرح سمجھاتا کہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہے۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ اس میٹنگ کو ملتوی کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ بے نتیجہ ثابت ہوگی اور اس کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ وہ ریٹ کلف سے نہیں ملنا چاہتا تھا بلکہ وہ سب کچھ ملتوی کرنا چاہتا ہے۔

اس نے اسٹیوارڈ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بظاہر یوں لگا جیسے وہ اس کی بات سمجھ گیا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سامنے میز پر پڑی فائل کھولتے ہوئے بولا۔

"ہم نے تمہارے بارے میں کچھ معلومات جمع کی ہیں۔ تمہارے پڑوسیوں کو کچھ شکایات ہیں۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ بیوی کے ساتھ تمہارے تعلقات کشیدہ چلے آ رہے ہیں۔"

وہ اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوراً اسے بولنا پڑا۔ اسے وضاحت سے بتانا پڑا کہ جب وہ برے دور سے گزر رہا تھا تو بینی کے ساتھ کچھ مسائل شروع ہو گئے تھے۔ یہ کہتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ برا دور تو اب بھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن وہ یوں ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مسئلہ حل ہو گیا اور اب سب کچھ ٹھیک ہے۔

"جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تو بینی کہاں ہے؟"

"وہ ان دنوں اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی ہے۔" اس نے اسٹیوارڈ کو بتایا۔

اسٹیوارڈ نے سر ہلایا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ اس بارے میں مکمل معلومات حاصل کر چکا ہے۔ اس نے نہ صرف اس کے دفتر بلکہ بینی اور غالباً اس کے والدین سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ ہر اس شخص سے گفتگو کر چکا ہے جس کے ساتھ اس کا ذرا سا بھی تعلق ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی کیا تصویر بنتی ہے۔ یہی کہ وہ ایک ناکام شخص ہے جو اپنی بیوی کو بھی قابو نہ کر سکا اور چالیس سال کی عمر میں بھی سڑکوں پر دھکے کھا رہا ہے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ انہوں نے اتنی سرعت کے ساتھ کارروائی کیوں کی اور اس کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے ایک ویران جگہ پر لاش کی موجودگی کی اطلاع پولیس کو دی تھی۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ انہیں اس پر شک ہو گیا ہے۔ اسی لیے وہ اتنی چھان بین کر رہے تھے۔ اسٹیوارڈ نے یقیناً اس کی آنکھوں یا بیٹھنے کے انداز سے کچھ مفروضے قائم کیے ہوں گے کیونکہ جب اس نے بولنا شروع کیا تو اس کا لہجہ غیر واضح تھا۔

"دیکھو مسٹر۔۔۔؟" اتنی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد اسے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا وہ نام لیے بغیر ہی بولا۔ "تمہیں اس واقعے کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس لڑکی کی موت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم محض وہاں سے گزر رہے تھے کہ اس کی لاش پر تمہاری نظر چلی گئی۔ میں چاہوں گا کہ تمہارا ڈی این اے



www.digestpk.com

Asifzamil

ٹیسٹ بھی ہو جائے تا کہ تم مکمل طور پر اس معاملے سے الگ ہو جاؤ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں مزید اس کیس میں لٹکا یا جائے۔''

اس نے ایک بار پھر کھلی ہوئی فائل پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''ہمارے پاس تمہارے بارے میں مکمل معلومات ہیں اور ضرورت پڑنے پر تم سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ عدالتی تفتیش یا گواہی کے لیے تمہیں طلب کیا جائے۔ اس بارے میں تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ فی الحال تم اس بیان پر دستخط کر دو۔ اس کے بعد تم گھر جاسکتے ہو۔''

''کیا واقعی، میں گھر جاسکتا ہوں۔'' اس نے حیرت اور مایوسی سے پوچھا۔

اس کے بعد سب کچھ آسانی سے ہوتا گیا۔ انہوں نے ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے اس کا سمپل لیا اور گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد اس نے اسٹیوارڈ کو نہیں دیکھا۔ جب وہ پولیس اسٹیشن سے باہر آرہا تھا تو کسی نے اس پر توجہ نہیں دی اور نہ ہی اس کی جانب دیکھنا گوارا کیا۔ شاید اس لیے کہ ان کی نظر میں وہ غیر اہم شخص تھا اور یہی بات اس کی ناراضی کا سبب بن گئی۔

☆☆☆

اس کا گھر خالی اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس صوفے پر رکھا اور ڈاک دیکھنے لگا۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی۔ چند غیر اہم خطوط تھے جنہیں اس نے کھولنا بھی گوارا نہیں کیا پھر اس نے فون چیک کیا۔ وہاں بھی اس کے لیے کوئی پیغام نہیں تھا۔

اس نے اسکاچ کی بوتل نکال کر اپنے لیے آدھا گلاس بنایا اور حیران رہ گیا۔ وہ بوتل عام دنوں کے مقابلے میں تیزی سے خالی ہو رہی تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''شاید اس بوتل میں سوراخ ہو گیا ہے۔ پھر اس نے اپنی بات پر خود ہی زوردار قہقہہ لگایا جس کی گونج کمرے میں دور تک سنی گئی۔ پھر اس نے فریج سے پیزا نکالا اور اسے گرم کر کے کھانے بیٹھ گیا۔ باورچی خانے کی دیوار پر نظریں جماتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''معاملہ اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتا تھا۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے خود سے ہی سوال کیا۔

''اگر تم پر قتل کا الزام ہوتا اور تم جیل کی کوٹھڑی میں بند کر دیے جاتے پھر تمہیں کیسا لگتا؟''

اس نے اپنے پیروں میں ہونے والی کھجلی اور پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ کے بارے میں سوچا جب وہ انٹرویو روم میں بیٹھا اسٹیوارڈ کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک بے گناہ شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر واقعی وہ مجرم ہوتا تو اس کی کیا حالت ہوتی۔ شاید اسے اس کے مقابلے میں دس گنا برے حالات کا سامنا کرنا پڑتا لیکن کم از کم اسے کچھ محسوس تو ہونا چاہیے وہ خوف یا جرم کا احساس ہی کیوں نہ ہو۔

وہ ایک گھنٹے تک ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھا رہا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہاں اس کے مطلب کی کوئی خبر نہیں تھی پھر وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا اور ایک گھنٹے تک چھت کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ گواہ کے بجائے مجرم ہوتا تو ٹیلی وژن پر اس وقت اسی کی خبر چل رہی ہوتی۔ اخبارات میں اس کی واردات کی تفصیلات شائع ہوتیں۔ کوئی منچلا رپورٹر اس کی اسٹوری چھاپ دیتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی کہانی پر کوئی ناول لکھ دیا جاتا یا کوئی پروڈیوسر فلم بنا لیتا۔ اسے ڈھیروں شہرت ملنے کے ساتھ ساتھ لاکھوں ڈالر رائلٹی بھی ملتی۔ اسے زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا ہوتی۔ جس میں مختلف مواقع پر تخفیف ہوتی رہتی اور وہ سات سال بعد پیرول پر رہا ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی اور وہ خواب میں بھی اسی انٹرویو روم کا نظارہ کرتا رہا جس کی دیواروں پر سبز رنگ ہوا تھا۔

دوسری صبح اس نے معمول کے مطابق تیاری کی اور کافی بنا کر ریٹ کلف کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں سوچنے لگا جس کی اسے کوئی خوشی نہیں تھی۔ نو بجے کے قریب وہ گیراج میں گیا اور اس نے اپنا بریف کیس کار میں رکھ دیا۔ ابھی دس بجنے میں ایک گھنٹا باقی تھا پھر اسے دوبارہ اسی سڑک کا خیال آیا جہاں سے وہ گزشتہ روز گزرا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے اندر چھپا ہوا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ اسے یوں لگا کہ ایک بار پھر اس کے ٹکووں میں کھجلی ہو رہی ہے۔

وہ گیرج کے عقبی حصے میں گیا اور پرانی چیزوں کے ڈھیر میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے مطلوبہ اشیا مل گئیں جنہیں اس نے بہت عرصہ پہلے وہاں پھینکا تھا۔ وہ کپڑے سکھانے کی رسی اور ٹیپ کا رول تھا۔ اس نے وہ دونوں چیزیں کار کی سیٹ پر بریف کیس کے ساتھ رکھ دیں۔ اب وہ ریٹ کلف کے ساتھ میٹنگ کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے متبادل راستہ کا انتخاب کرنا ہی ہوگا تا کہ اس کے چہرے سے ناکامی کا داغ مٹ سکے۔



رنگوں کا امتزاج ...اس کی شناخت انسانی ذہن پر خوشگواریت کا باعث بنتی ہے ... لیکن کبھی کبھی کوئی شخص رنگوں کی دنیا سے بیزار ہو کر کسی ایک ہی رنگ تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے ... ایسے ہی ایک بچے کے گرد گھومتی کہانی ... جو ہر قسم کے رنگوں سے دور تھا... اس کا محور و مرکز صرف ایک رنگ تھا...

**بے رنگ دنیا سے تعلق رکھنے والی مجرمانہ کارروائی کا احوال**

# زرد رنگ

محمد عفان آزاد

''تو اس نے اپنی جیب سے پستول نکالا۔'' میں نے یہ سُن کر براہِ راست خاتون کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کیا مگر وہاں پر غیر یقینی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ''پستول کا رخ جرمی کی طرف تھا۔'' وہ اس طرح بیان کر رہی تھی جیسے سارا واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا ہو۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔'' میں نے نرم لہجے میں قطع کلامی کی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، وہ بدستور بولے جا رہی تھی۔

''اور پھر اُس نے ٹریگر دبا دیا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے سانس لینے کو رُکی۔

''اُس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے اس مختصر سے وقفے کا فائدہ اٹھایا اور تجسس سے دریافت کیا۔ میرا لہجہ نہایت سنجیدہ

www.digestpk.com

Asifzamil

تھا۔

''وہ گیلا ہوگیا اور پھر اس نے چلّانا شروع کردیا۔'' نیو جرسی کے مڈلینڈ ہائٹس ضلع کے سڈنی پرائمری اسکول کی نائب پرنسپل اینا نے پستول نکالنے سے لے کر ٹریگر دبانے اور پھر اس کے نتیجے تک کا سارا ماجرا نہایت غصیلے لہجے میں اس طرح میرے سامنے بیان کیا جیسے فردِ جرم عائد کررہی ہو۔

''تو پھر...'' یہ سنتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر میں بھی احتراماً کھڑا ہوگیا۔

یہ سن کر اس کے چہرے پر ناگواری کے گہرے تاثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ''جرمی کو گیلا ہونا پسند نہیں۔'' اس نے میری طرف دیکھے بنا تیز آواز میں کہا۔

''لیکن یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔''

''کیا کہا تم نے؟'' یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی۔ ''تمہارا بچہ انتہائی بدتمیز اور جرائم کی طرف مائل ہے۔ اپنے بچے کو سدھارو، نہیں تو یہ مجرم بن جائے گا۔'' وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ چکی تھی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اتنی معمولی سی بات...''

''تمہیں یہ معمولی سی بات لگتی ہے۔'' وہ بدستور بھڑک رہی تھی۔ ''مسٹر! یہ 2011ء ہے۔'' نائب پرنسپل نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہ قطعاً برداشت نہیں کرسکتے کہ بچے کے ہاتھ میں پستول ہو اور اس سے وہ جسے چاہے، اپنا نشانہ بناتا پھرے۔ چاہے وہ کھلونا پستول ہی کیوں نہ ہو اور اس کی نال سے گولی کے بجائے پانی کی دھار نکلتی ہو۔''

''آپ تو خوا مخواہ...''

''خوا مخواہ...'' اس نے میری بات ہی کاٹ دی اور طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''یہ بہت بڑی بات ہے مسٹر۔ مڈلینڈ ہائٹس کے اس اسکول کے قواعد کے مطابق یہ جرم ہے اور اس جرم میں، میں آپ کے بیٹے کو دو دن کے لیے اسکول سے معطل کرتی ہوں۔''

''دو دن کے لیے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''چھٹی جماعت کے بچے کے لیے اسکول سے دو دن کی معطلی کی سزا بہت زیادہ ہے، پلیز...''

نہیں... سزا یہی رہے گی۔'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''اچھا... سزا پر عمل کرنے سے پہلے ذرا یہ بتایئے کہ آپ نے میرے بیٹے ایرن کو جرمی پر پانی کی پستول سے دھار مارتے ہوئے دیکھا تھا؟'' میں نے بیٹے کی معطلی کی سزا کا سن کر وائس پرنسپل سے بحث کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

''نہیں...''

''تو پھر کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟ ہوسکتا ہے کہ جرمی جھوٹ بول رہا ہو... اسے کسی اور نے گیلا کیا ہو۔'' میں نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے دلائل دینے شروع کردیے۔

''ثبوت ہے میرے پاس۔'' یہ کہتے ہوئے مس اینا جھک کر اپنی میز کی دراز کھولنے لگی۔ ''یہ دیکھو پانی کی پستول۔'' انہوں نے سفید پلاسٹک کی چھوٹی سی گیلی تھیلی کو میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''اوہ...'' پستول دیکھتے ہی میرے منہ سے نکلا۔ ''زرد رنگ... یہ نہیں ہوسکتا۔ جرمی کا الزام غلط ہے۔'' چند لمحے پہلے تک تو میں بھی دل ہی دل میں اپنے بیٹے کو قصوروار سمجھ رہا تھا لیکن اب زرد رنگ کی کھلونا پستول دیکھ کر مجھے یقین آگیا کہ وہ واقعی بے قصور ہے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میری بات سنتے ہی وہ بڑے بڑے دیدے گول گھماتے ہوئے غرائی۔

''میرا بیٹا نفسیاتی مریض ہے۔ ہم نے اسے کئی ماہرینِ نفسیات کو دکھایا۔ اُسے زرد رنگ سے نفرت ہے۔ وہ صرف نیلے رنگ کے شیڈ والے کھلونے ہی پسند کرتا ہے۔'' میں نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ ''ویسے جرمی اور پستول کو آپ کے پاس لے کر کون آیا تھا؟''

''کوئی نہیں۔'' اس بار اُس کا لہجہ کچھ نرم تھا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھنے لگی اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں خود ہی اس کے چلّانے کی آواز سُن کر اس طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اس وقت میں وہاں سے گزر رہی تھی۔ قریب پہنچی تو دیکھا کہ وہ گیلا ہو رہا تھا اور پستول وہیں پڑی ہوئی تھی اُس کے پاس۔ جرمی نے مجھے بتایا کہ جب اس نے چلّانا شروع کیا تو ایرن پستول پھینک کر بھاگ گیا۔'' اس نے جس انداز میں یہ بات پوچھی تھی، اس سے تعجب کا اظہار ہو رہا تھا۔

''بدقسمتی سے ایسا ہی ہے۔'' میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ ''جب وہ چھ سال کا تھا اور پہلی کلاس میں پڑھتا تھا، تب ہی سے اس میں زرد رنگ سے نفرت کے رجحانات سامنے آنے لگے تھے۔'' میں نے اسے تفصیل سے یہ بات بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ ایرن میں بچپن سے ہی رنگوں سے



متعلق ایسے رجحانات کا پتا چل گیا تھا، جسے ماہرینِ نفسیات نفسیاتی عوارض سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''بچپن سے ہی رنگوں سے متعلق اس میں خاص قسم کے جذبات ظاہر ہونا شروع ہوگئے۔ شروع شروع میں تو ہم نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا لیکن جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی، ویسے ویسے اُسے زرد رنگ سے نفرت ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف حیرت انگیز طور پر نیلے رنگ میں اس کی پسندیدگی بڑھتی چلی گئی۔'' میں کہہ رہا تھا اور وہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ ''یہ بات اس کی ماں نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ وکیل ہے اور اس طرح کے مسائل کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ لیتی ہے۔ اسی کے مشورے پر ہم اسے ماہرِ نفسیات کے پاس لے گئے تھے۔'' یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کو رکا۔

''اچھا.....'' اینا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اب پہلے کی طرح غصے میں نہیں ہے اور میری بات کو زیادہ سنجیدگی سے سن رہی ہے۔

''جیسے جیسے اس کی عمر بڑھ رہی تھی، رنگوں سے متعلق اس کے احساسات بھی واضح ہوتے جارہے تھے۔ ہم نے متعدد ماہرینِ نفسیات کو دکھایا۔ اس کے کئی سیشن ہوئے۔ رجحانات کے حوالے سے بھی کئی ٹیسٹ لیے گئے لیکن بدقسمتی سے یہ علامات نہ صرف برقرار رہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ بھی ہوتا چلا گیا۔ اس وقت جبکہ وہ گیارہ سال کا ہے، تب بھی رنگوں سے متعلق اس کے رجحانات برقرار ہیں۔ اس پس منظر کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ جرمی پر پانی کی پستول سے حملہ کرنے والی بات تو ٹھیک ہوسکتی ہے مگر یہ کھلونا پستول ایرن کی ہرگز نہیں ہوسکتی۔'' میں نے بات مکمل کی تو کمرے میں کچھ دیر کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ ''اس لیے وہ حملہ آور بھی نہیں ہوسکتا۔'' میں نے چند لمحے خاموش رہ کر اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی اور خاموش ہوگیا۔ مجھے اس کے جواب کا انتظار تھا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر چھت کو گھور رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری بات نے اس پر اثر کیا ہے اور اب وہ شاید اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کررہی ہے۔ ویسے میرے لیے یہ بڑی بات تھی کہ اتنی چھوٹی سی شرارت پر ایرن کو دو دن کے لیے اسکول سے باہر کرنے کی سزا کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

''تو تم کیا چاہتے ہو؟'' کچھ دیر تک وہ بدستور سوچ میں ڈوبی رہی اور پھر اس نے خاموشی توڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''مجھے تو تمہاری بات سُن کر حیرت ہو رہی ہے۔''

''مگر یہ حقیقت ہے جس کی تصدیق اس کا نفسیاتی علاج کرنے والے ڈاکٹر سے بھی کی جاسکتی ہے۔'' میں نے جلدی سے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ جس طرح اس نے اپنی بات شروع کی تھی، اس سے مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ اب بھی میری بات پر پوری طرح یقین نہیں کرپائی ہے۔

''آپ چاہتے کیا ہیں؟'' اس نے..... اپنی نظریں میرے چہرے پر گڑاتے ہوئے پوچھا۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایرن کو بے شک جو چاہے سزا دیں مگر...''

''مگر کیا؟'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے چبھتے لہجے میں سوال کیا۔

''پلیز... سزا پر عمل درآمد چند روز کے لیے روک دیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''مگر کیوں؟ فی الحال تو ایرن قصوروار ہے۔ اسے سزا ملنی ہی ہے پھر اس کی سزا پر عمل درآمد کیوں نہ کروں؟'' میری درخواست سن کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''عمل درآمد سے نہیں روک رہا...'' میں نے وضاحت پیش کی۔ ''صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ اگلے دو تین دن کے لیے اس سزا پر عمل کرنے کا فیصلہ مؤخر کردیں۔ اس دوران میں ایرن سے بھی اس معاملے پر بات کروں گا اور یہ پتا چلانے کی کوشش کروں گا کہ قصوروار کون ہے۔'' وہ خاموشی سے بات سُن رہی تھی۔ ''اگر پستول نیلے رنگ کی ہوتی تو میں یہ بات کبھی نہ کرتا لیکن زرد رنگ کے باعث اب مجھے شبہ ہو چلا ہے کہ کیا واقعی یہ حرکت ایرن نے کی ہے۔ جب تک یہ بات صاف نہیں ہوجاتی، اُس وقت تک سزا روک دی جائے۔'' میں نے اسے سزا پر عمل درآمد روکنے سے متعلق اپنے موقف کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ میرے دلائل سے کسی حد تک متاثر ہوچکی ہے۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر اس نے زرد رنگ کی پستول استعمال کی ہے تو اس میں بعض نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ آپ کے لیے یہ ڈسپلن کا معاملہ ہے لیکن میرے لیے اب یہ بات اس لیے زیادہ اہم بن چکی ہے کہ میرے بیٹے کی زندگی کا معاملہ ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ایرن کی زندگی میں ایک بڑی نفسیاتی تبدیلی آچکی ہے یا آرہی ہے مگر یہ تبدیلی آئی کیسے، مجھے اس بات کو جاننا ہوگا۔'' صورتِ حال کا منظر نامہ اب کافی وسیع ہوچکا تھا۔

''تو تمہارے خیال میں سزا کب سے شروع ہونی



www.digestpk.com

Asifzamil

چاہیے؟'' میرے دلائل رنگ لے آئے تھے مگر اس کی سوئی اب بھی سزا پر اٹکی ہوئی تھی۔

''آئندہ پیر سے۔'' میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نے جمعے کی سہ پہر تک مجھے تسلی بخش جواب نہ دیا تو پھر پلیز... ایرن کو پیر کی صبح سے دو دن کے لیے اسکول مت بھیجنا۔ ہمارے لیے اسکول کا ڈسپلن بہت اہم ہے۔'' اس نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔'' میں یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اسکول کی چھٹی ہو چکی تھی۔ ایرن کو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے اس کی پرنسپل نے بلوایا ہے۔ اس لیے وہ چھٹی کے بعد ان کے دفتر کے سامنے رُک کر میرا انتظار کرے۔ واپسی پر ہم دونوں اکٹھے گھر آئیں گے۔ جب میں باہر آیا تو ایرن برآمدے میں میرا منتظر تھا۔

''چلو۔'' میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں پیدل ہی گھر کی طرف چل دیے۔

''کیوں بلوایا تھا انہوں نے آپ کو؟'' ابھی ہم اسکول سے تھوڑا ہی آگے گئے تھے کہ ایرن نے پوچھا۔

''ویسے ہی...'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''کیا مطلب...'' اس نے کہا۔

''وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کے اسکول کے بارے میں کوئی تعریفی مضمون لکھ دوں تصویروں کے ساتھ۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کی خاطر فرضی جواب دیا۔ اس وقت میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے حقیقت بتاؤں۔

''اچھا...'' اس نے مطمئن لہجے میں جواب دیا اور پھر ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

میں فری لانس کام کرتا ہوں اور ایسے میں وقت کی پابندی نہایت ضروری ہوتی ہے۔ یہ باقاعدہ ملازمت تو نہیں کہ چاہے چھٹی لو یا چھٹی کرلو مگر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ہاتھ کی ہتھیلی پر ہوگی۔ فری لانسر کا کام تو روزانہ کنواں کھودنا اور پیاس بجھانے والی کہاوت جیسا ہوتا ہے۔ اسکول آنے جانے کے چکر میں پہلے ہی کافی وقت خرچ ہو گیا تھا۔ اس لیے میرا ذہن بیک وقت کئی چیزوں کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ اس وقت دو کام گھر پر میرے منتظر تھے۔

میں ایک صحافی ہوں۔ کچھ عرصے پہلے تک ایک اخبار سے بطور رپورٹر وابستہ تھا لیکن بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ فری لانس کے طور پر میں زیادہ کما سکتا ہوں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ میری بیوی دن بھر دفتر میں مصروف ہوتی ہے اور دوپہر کو ایرن بھی گھر آجاتا ہے۔ ہم دونوں یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسکول سے واپسی پر وہ گھر میں اکیلا رہے۔ اس لیے میں نے ملازمت چھوڑ دی اور اب گزشتہ کئی برسوں سے فری لانس رائٹر کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ اس وقت بھی مجھے گھر جا کر ایک کتاب کا پروپوزل بنانا تھا اور ایک ادھورا ڈراما مکمل کرنا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں تیز تیز چلتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایرن بھی میرے پیچھے پیچھے تقریباً دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

اگرچہ اسکول سے ملنے والی شکایت پریشان کن تھی لیکن بطور رائٹر میں سمجھتا تھا کہ اس کے پیچھے کچھ ایسے اسباب بھی ہو سکتے ہیں، جن کا مجھے علم نہیں۔ میں واپسی پر سارے راستے یہی سوچتا آیا تھا کہ جرمی کیوں جھوٹ بولے گا... اگر یہ بات درست ہے تو پھر اپنی عادت کے برخلاف ایرن نے ایسا کیوں کیا؟

گھر پہنچا تو میرے لیے کئی ٹیلی فون کالز آچکی تھیں اور آنسرنگ مشین کی جگمگ کرتی سرخ لائٹ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ سب سے پہلے مجھے یہی کام کرنا ہوگا۔ میں نے آنے والی فون کالز کی ریکارڈنگ سننا شروع کر دیں۔

پہلی کال ایک مقامی رسالے کی طرف سے تھی جو مجھ سے بیس بال پر ایک مضمون لکھوانا چاہتے تھے۔ دوسری کال ایک پبلشر کی طرف سے تھی جن کے لیے میں نے بچوں کی نفسیات پر ایک کتاب مرتب کی تھی۔ تیسری کال ایک دوست کی تھی جو یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس ویک اینڈ پر میں اس کے ساتھ مچھلی کے شکار پر جانا چاہوں گا۔

میں نے باری باری تینوں کو فون کیے تاہم الفریڈ سے معذرت کر لی کہ اس ہفتے میں شکار پر نہیں جا سکوں گا۔ اس کے لیے یہ بڑی انہونی بات تھی۔ مجھے مچھلی کے شکار کا جنون کی حد تک شوق تھا اور ہر ویک اینڈ پر میں اور الفریڈ اکٹھے شکار پر جایا کرتے تھے۔ وہ بے چارہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ ایسی کیا غیر معمولی بات ہوئی ہے جو میں شکار پر نہیں جا رہا لیکن میں نے اس سے ''ایسے ہی دل نہیں چاہ رہا'' کہہ کر بات بنا دی۔

شکار پر نہ جانے کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت میں ایرن کی وجہ سے کافی پریشان تھا۔ اگر ایرن کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ نہیں ہوتا تو بات تشویش کی نہیں تھی مگر مجھے یہ بات اس لیے زیادہ پریشان کر رہی تھی کہ اس نے زرد رنگ کی کھلونا پستول اگر استعمال کی تھی تو اصل سبب کیا تھا؟ یہ رنگ تو اسے



پسند ہی نہیں تھا تو پھر اس نے اس رنگ کے کھلونے کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیا؟ میں اگرچہ... اینا سے کہہ آیا تھا کہ ایرن قصوروار نہیں ہو سکتا لیکن جوں جوں اس مسئلے پر سوچتا گیا، مجھے یہ معاملہ گمبھیر لگنے لگا۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ میری بیوی کیرن سرکاری وکیل تھی اور اس وقت وہ اپنے دفتر میں تھی۔ اس کے لوٹنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ میں کچھ کام کرنا چاہتا تھا لیکن ایرن والے معاملے سے ذہن منتشر ہو گیا تھا۔ دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے کمپیوٹر آن کرنے کے بجائے وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول لیا تاکہ دھیان کچھ بٹ سکے اور یکسوئی میسر آئے تو میں کچھ لکھ سکوں۔ مختلف چینل بدلتے بدلتے میں ایک مقامی ٹی وی چینل پر رُک گیا۔ اس چینل پر مچھلیوں کے شکاریوں پر ایک دستاویزی فلم چل رہی تھی۔ میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے فلم دیکھنے میں مصروف تھا کہ اچانک فلم روک دی گئی اور اس کی جگہ پر چند لمحوں کے بعد بریکنگ نیوز لکھا ہوا نظر آیا۔ اگلے ہی لمحے نیوز ریڈر اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔

''مڈلینڈ کی سینٹرل جھیل سے ایک ادھیڑ عمر مرد کی لاش ملی ہے۔ پولیس اور غوطہ خور موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ لاش کو باہر نکالنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص جھیل میں ڈوبنے سے ہلاک ہوا ہے یا پھر اُسے قتل کر کے پانی میں پھینکا گیا تھا۔'' یہ خبر میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ لاش قابلِ شناخت ہے اور مرنے والے کی جیکٹ میں پانی بھر جانے کے سبب لاش جھیل کی تہ میں ڈوبنے کے بجائے سطحِ آب پر آ گئی تھی۔ اس بارے میں جیسے ہی مزید کوئی اطلاع سامنے آتی ہے، ہم آپ کو فوراً خبر دیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی بریکنگ نیوز ختم ہو گئی۔

یہ خبر میرے لیے پریشان کن تھی۔ یہ وہی جھیل ہے جس پر میں ہر ہفتے مچھلی کے شکار کے لیے جایا کرتا تھا۔ یہ جھیل میرے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ اکثر یہاں پر سیر و تفریح کرنے والے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ٹی وی پر جھیل کا وہ حصہ دکھایا گیا تھا، جہاں سے لاش ملی تھی۔ میں یہ جگہ پہچان گیا۔ یہ سڑک کے ساتھ کا حصہ تھا۔ سڑک کے برابر میں درختوں کا جھنڈ تھا جس سے گزر کر اس جگہ پر پہنچا جاتا تھا۔ یہ جھیل کے ساتھ گزرنے والی... دو میں سے ایک سڑک تھی، جس کے ذریعے میرے گھر تک پہنچا جا سکتا تھا۔ ایرن نے بھی جب سے سائیکل چلانا شروع کی تھی، وہ تقریباً ہر روز شام کو جھیل تک کا چکر لگا کر ہی گھر لوٹتا ہے۔ واپسی پر وہ اسی سڑک پر سائیکل دوڑاتا ہوا گھر آتا تھا۔

میں پچھلے بارہ سال سے مڈلینڈ کے اس علاقے میں رہ رہا تھا۔ یہ شہر کے مضافات میں واقع نہایت پُرسکون علاقہ ہے۔ اس سے پہلے یہاں قتل جیسے سنگین جرم کو تو چھوڑیے کسی معمولی سے جرم کی خبر بھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ جھیل کا یہ علاقہ ویک اینڈ پر تفریح کے لیے آنے والوں سے بھرا رہتا ہے لیکن عام دنوں میں شاید ہی کوئی یہاں چکر لگاتا ہو، ماسوائے ایک دو مچھلی کے بوڑھے شکاریوں کے یا پھر بچے سہ پہر میں سائیکل چلاتے ہوئے یہاں پہنچتے تھے اور پھر واپس پلٹ آتے تھے۔ سائیکل سواری کے شوقین بچوں کے لیے یہ اختتامی پوائنٹ تھا۔ اکثر والدین کا خیال تھا کہ اس جھیل کے بعد ویرانہ شروع ہو جاتا ہے اس لیے وہ بچوں کو سختی سے ہدایت کرتے تھے کہ اس سے آگے نہ جائیں۔

میں ٹی وی بند کر کے کچھ دیر تک اس خبر پر سوچتا رہا۔ میرے خوف کی ایک وجہ یہ تھی کہ معاملہ صرف میرا نہیں بلکہ علاقے کے دوسرے بچوں کا بھی تھا۔ اب اگر یہاں پر قتل جیسی سنگین واردات ہو گئی ہے تو اس کا مطلب تھا کہ یہ مقام جرائم پیشہ لوگوں کی نظروں میں آ گیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایرن کو روک دوں کہ وہ جھیل پر کبھی تنہا نہ جائے اور سائیکل صرف اِرد گرد کی سڑکوں پر ہی چلائے۔ میرے دل میں یہ سوال بھی اٹھ رہا تھا کہ وہ بدنصیب کون تھا جس کی لاش جھیل سے ملی ہے۔ اکثر لوگ وہاں پر تفریح کے لیے آتے ہیں۔ اب اگر ایک ایک مرتبہ یہاں جرم ہو گیا تو پھر ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں یہاں کئی لوٹ مار کے واقعات رونما ہونا شروع ہو جائیں۔

میں نے کچھ دیر بعد ایک بار پھر ٹی وی کھولا لیکن اس حوالے سے کوئی تازہ خبر نہیں تھی۔ میں کافی دیر تک چینل بدل بدل کر اس بارے میں تازہ ترین اطلاعات جاننے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہاں ایسی کوئی خاص بات موجود نہیں تھی۔ سوائے اس خبر کے کہ پولیس نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے... لیے مُردہ خانہ منتقل کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ شام تک پوسٹ مارٹم مکمل کر دیا جائے گا۔ میرے لیے اس خبر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ پوسٹ مارٹم سے دو میں سے ایک بات سچ ثابت ہوگی۔ وہ یہ کہ اس شخص کو یا تو پہلے سے مار کر جھیل میں پھینکا گیا تھا یا وہ جھیل میں پھینکے جانے کے بعد ڈوب کر مرا ہے۔ ان کے سوا کوئی تیسرا امکان موجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مڈلینڈ سینٹرل جھیل میں کشتی رانی



www.digestpk.com

Asifzamil

کی اجازت تھی لیکن وہاں نہ تو کرائے پر کشتیاں چلتی تھیں اور نہ ہی انہیں چلانے والے موجود تھے۔ جنہیں جھیل میں کشتی چلانے کا شوق ہوتا تھا تو وہ اپنے ساتھ پیڈل یا چپو والی چھوٹی کشتیاں گاڑی کے پیچھے رکھ کر لاتے تھے۔ اگر یہ شخص کشتی سے ڈوب کر ہلاک ہوا ہوتا تو کشتی تو ضرور ملتی لیکن خبر میں کسی بھی کشتی کا ذکر موجود نہیں تھا۔ اس لیے صرف قتل کا امکان باقی رہ جاتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ موت اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ کوئی سوچی سمجھی واردات تھی۔ 'یہی وہ بات ہے جو اس وقت مجھ سمیت علاقے کے کئی اور لوگوں کے لیے بھی پریشانی کا سبب بنی رہی ہوگی۔' میں نے اپنے دل میں سوچا اور ٹی وی بند کر کے صوفے پر لیٹ گیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ آج کا دن فضول گزر گیا۔ میں تھوڑا سا بھی کام نہیں کر سکا حالانکہ صبح نو بجے سے شام چار بجے تک میں روزانہ اچھا خاصا کام کر چکا ہوتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، سوا چار ہو رہے تھے۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ کیرن کے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ایرن لنچ کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو کچھ دیر میں بھی آرام کر لوں۔

شام ساڑھے چار بجے کا وقت ہوگا جب کیرن بھی گھر لوٹ آئی۔ میں بدستور صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ ''اسکول گئے تھے، کیا ہوا؟'' کیرن نے آتے ہی اپنا ہینڈ بیگ میز پر رکھا اور میری طرف دیکھے بنا سوال داغ دیا۔

''گیا تھا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پھر سوال جڑ دیا۔ لگتا ہے کہ اس بارے میں وہ سارا دن سوچتی رہی تھی اس لیے آتے ہی بے چینی سے اس بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''بتاتا ہوں۔ ذرا سکون سے بیٹھ جاؤ۔ دم لے لو، سب کچھ بتا دوں گا۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تھکی ہوئی گھر آئی ہے اور اسے مزید پریشان کر دوں۔

''جلدی بتاؤ...'' اس نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

''میں سارا دن ایرن کے بارے میں بہت پریشان رہی ہوں۔ کئی بار سوچا تمہیں فون کر کے معلوم کر لوں لیکن ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں مل سکی ...'' یہ کہتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''ایرن کہاں ہے؟'' اس نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہے۔ شاید سو رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوکے...'' یہ سن کر اس نے گہری سانس لی۔ ''اب بتاؤ کیا بات تھی، پرنسپل نے کیوں بلوایا تھا تمہیں؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا۔

''بات یہ ہے کہ وائس پرنسپل کا خیال ہے کہ ایرن نے اپنے ایک ساتھی کو مارا ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

''کیا...'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو آج تک کبھی کسی سے نہیں لڑا ہے۔'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے روایتی ماؤں کے انداز میں کہا تو میں ہنس دیا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر وہ بھڑک گئی۔ ''تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

''یہ میں نے کب کہا ہے۔''

''تو پھر تم ہنسے کیوں؟'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''تم نے پوری بات سنے بغیر ہی اپنی رائے دے دی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تم بھی روایتی ماں ہو جس کی نظر میں اس کا بچہ دنیا کا سب سے معصوم اور سیدھا سادہ بچہ ہوتا ہے اور بس... اسی لیے میں ہنس پڑا۔''

''اوکے...'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ''ادھر اُدھر کی سنانا بند کرو، کام کی بات بتاؤ۔''

''وہ کہہ رہی تھی کہ ایرن کا ایک ساتھی ہے جرمی...'' یہ کہہ کر میں..... اسے وائس پرنسپل کے ساتھ ہونے والی ملاقات کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا اور وہ قطع کلامی کیے بغیر نہایت غور سے میری بات سنتی رہی۔

''حیرت ہے۔'' میں خاموش ہوا تو کہنے لگی۔ ''زرد رنگ کی پستول... ضرور کوئی چکر ہے۔'' اس نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

''یہی بات تو میرے لیے پریشانی کا باعث بنی ہے ورنہ بچے تو اسکول میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں... یہ تو ہے۔''

''میں نے وائس پرنسپل سے وقت لے لیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔'' میں نے کیرن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے اس بارے میں ایرن سے کوئی بات کی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں... میرا خیال تھا کہ تم آ جاؤ تو پہلے تم سے بات کر لوں۔''

''ایرن کو معلوم ہے یہ بات۔''

''نہیں... ابھی میں نے اسے نہیں بتایا ہے۔''



''اسے پتا ہے کہ تم پرنسپل سے ملے ہو؟'' کیرن نے ایک بار پھر پوچھا۔

''ہاں... جب میں اسکول پہنچا تو وہاں وقفہ ہو چکا تھا۔ مجھے وہ پلے گراؤنڈ میں ہی مل گیا تھا۔''

''تو تم اسے ساتھ لیتے آئے؟'' کیرن نے پوچھا۔

''ہاں...''

''اسے بجس تو ہو رہا ہوگا تمہیں اسکول میں دیکھ کر۔''

''واپسی پر پوچھ رہا تھا لیکن میں نے بات بنا دی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا کیا تم نے...'' کیرن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تم ایرن سے بات کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے بات کرتے ہوئے زیادہ آسانی محسوس کرتا ہے۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''پتا تو چلے کہ معاملہ کیا ہے۔ مجھے تو رہ رہ کر یہی بات پریشان کر رہی ہے کہ اگر پرنسپل کی بات سچ ہے تو پھر یہ تبدیلی اس میں کیسے آئی۔ یہ بات مثبت بھی ہو سکتی ہے اور منفی بھی۔'' میں نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

''تمہاری بات درست ہے۔'' کیرن نے جواب دیا۔ ''میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ خبردار جو تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی اس سے کہا۔'' اس نے مجھے تنبیہہ کی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ وہ کچھ غلط سمجھے۔ اس طرح وہ پریشان بھی ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم ڈاکٹر آرتھر کو بھی اس بارے میں بتا دیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی مفید مشورہ دے سکے۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' کیرن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی تمہیں یاد ہی ہوگا کہ اس نے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ ہم جب بھی ایرن میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کریں، اسے فوراً آگاہ کر دیں۔'' کیرن نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یاد ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا تھا۔''

''تم شام کو باہر جاؤ تو ذرا ان کے کلینک سے بھی ہوتے آنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور مفید مشورہ بھی دے دیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ میں شام کو کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا۔ واپسی پر اُن سے ملتا ہوا آتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیر اب یہ بات چھوڑو۔ بتاؤ کوئی کام وام بھی کیا ہے سارا دن یا صوفے پر ہی پڑے رہے ہو؟'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ارے ہاں... یہ تو مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔'' کیرن کی بات سنتے ہی ... اچانک یاد آیا اور پھر میں نے اسے جھیل پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتانا شروع کر دیا۔

''یہ تو تشویش کی بات ہے۔'' اس نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ''ایرن بھی سائیکل چلاتا ہوا جھیل تک جاتا ہے۔''

''تم اسے منع کر دو کہ اب وہاں نہ جایا کرے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اب اسے وہاں نہیں جانے دوں گی۔'' جھیل سے ملنے والی لاش کا سن کر وہ خاصی پریشان ہو گئی تھی۔ ویسے تو اس میں ہمارے لیے بظاہر پریشانی کا کوئی پہلو نہیں تھا لیکن ایرن کی وجہ سے ہم دونوں پریشان تھے۔ اسی لیے میں نے ایرن کو وہاں جانے سے روکنے کے لیے کہا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی سوچتی رہی۔ میں بھی چپ بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایرن کے بارے میں ہی سوچ رہی ہوگی۔ کچھ دیر بعد میں نے خاموشی توڑی اور صوفے سے اٹھتے ہوئے اسے پیشکش کی۔ ''کیا خیال ہے... ایک اچھی سی کافی ہو جائے؟ چہرے سے تو تم خاصی تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔''

''ہاں، یہ بہت اچھا خیال ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

''جو حکم سرکار کا۔'' میں نے تابع دار شوہروں کے انداز میں جواب دیا اور کافی بنانے کے لیے کچن کی طرف چل دیا۔

## آزاد امیدوار

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ ''بتائیں وہ کون سی چیز ہے جو آسمان پر نہیں؟ وہ کون سی چیز ہے جو زمین پر نہیں؟ وہ کون سی چیز ہے جو زبان پر نہیں؟ اور وہ کون ہے جس کا کوئی ایمان نہیں؟'' دوست نے جواب دیا۔

''پہلی چیز جو آسمان پر نہیں ہے، وہ قبر ہے۔ دوسری چیز جو زمین پر نہیں ہے، وہ ہیں سورج، چاند، ستارے۔ تیسری چیز جو زبان میں نہیں وہ ہڈی ہے اور جس کا کوئی ایمان نہیں ہے وہ ہے آزاد امیدوار۔''

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی شوخی



www.digestpk.com

Asifzamil

☆☆☆

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں گھر سے ایک مقامی ہفت روزہ کے ایڈیٹر سے ملنے کے لیے نکلا۔ وہاں سے میں جلد ہی فارغ ہوگیا۔ میرے پاس کافی وقت تھا اس لیے سوچا کہ ڈاکٹر آرتھر سے بھی ملتا چلوں۔ ویسے ڈاکٹر خود بھی کھیلوں سے بہت شغف رکھتا تھا۔ چونکہ میں کھیلوں کے حوالے سے اخبارات ورسائل میں لکھتا ہوں، اس لیے ڈاکٹر کے ساتھ میرے تعلقات خاصے دوستانہ ہو چکے تھے۔

''ہیلو ڈاکٹر...'' جب میں کلینک پہنچا تو خلافِ معمول وہاں کوئی مریض نہیں تھا۔ میں سیدھا اس کے کمرے میں چلا آیا۔

''ارے واہ... بھئی کیا حال ہیں۔ اتنے دنوں کے بعد تمہاری شکل دکھائی دی ہے۔ کہاں غائب تھے تم؟'' مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''یہیں پر، بس... ذرا کام زیادہ ہے۔ اس لیے آج کل باہر نکلنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔'' رسمی سا جواب دیتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کہو... آج کیسے نکلنا ہوا؟''

''آج تو میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خیریت ہے؟''

''بس وہ ذرا ایرن کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

''کیوں... کیا ہوا اسے؟'' اس نے یہ سنتے ہی حیرت سے پوچھا۔

''ویسے تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے لیکن آج اس کی وائس پرنسپل نے مجھے بلوایا تھا اور جو کچھ اس نے بتایا ہے، اس کی وجہ سے میں اور کیرن، دونوں ہی خاصے پریشان ہو گئے ہیں۔''

''اصل بات بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟'' اس نے قطع کلامی کی۔ اس کے لہجے سے تشویش ظاہر تھی۔ وہ ایرن کا نفسیاتی معالج تھا۔ اس لیے یہ بات سن کر وہ خاصا پریشان نظر آنے لگا۔

''وہ کہہ رہی تھی کہ ایرن نے...'' میں نے سارا قصہ تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا۔

''معاملہ تو کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔'' ڈاکٹر آرتھر نے ساری بات سن کر تشویش بھرے لہجے میں سر ہلایا۔ ''اس سے پہلے تم نے رنگوں کے حوالے سے اس کے رویے میں کوئی تبدیلی محسوس کی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہم نے تو ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی۔''

''پچھلے چند روز کے دوران میں اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟'' اس نے پھر سوال کر ڈالا۔

''ایسی تو خاص بات میرے علم میں نہیں۔ وہ بالکل نارمل ہے جیسا کہ پہلے تھا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پچھلے چند روز کے دوران ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، جس کی بنا پر میں کہہ سکوں کہ ایرن کا رویہ کچھ بدلا بدلا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا...'' اس نے میری بات رد کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر وائس پرنسپل کی بات درست ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔''

''کیسی تبدیلی؟'' میں نے یہ سن کر حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں تو پچھلے چند روز کے دوران میں اس میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''ضروری نہیں کہ یہ بات تم محسوس کرو۔'' ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ اس کے نفسیاتی رویے میں یا تو کچھ تبدیلی آئی ہے یا پھر کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس سے اس کے احساسات کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اب اصل صورتِ حال کیا ہے، فی الوقت اس بارے میں کوئی ٹھوس بات کہنا مشکل ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''کچھ سمجھ نہیں سکا؟'' میں نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بچوں کی نفسیات کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔'' اس نے جواب دینا شروع کیا۔ میں پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''رنگوں کے اثرات انسانی ذہن کی اصل کیفیت کا پتا دیتے ہیں۔ ہر شخص رنگوں سے متاثر ہوتا ہے، جس کی مدد سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کا باطن کیا ہے اور وہ کس سوچ کا حامل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکا اور دو گھونٹ پانی پی کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''رنگوں کو پہچاننے کی صلاحیت ہر چھوٹے بڑے میں پیدائش کے ساتھ ہی پرورش پانا شروع ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے، رنگ اس کے مزاج کو ظاہر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سارے لوگ رنگوں کے معاملے میں بظاہر جذباتی نظر نہیں آتے اور نہ ہی وہ کسی خاص رنگ کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ لاشعوری طور پر ان کا دماغ بھی رنگوں کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا دماغ لاشعور سے شعور کی طرف اپنا سفر بہت جلد طے کر لیتا



ہے۔ وہ بچپن سے ہی رنگوں کی پسند یا ناپسند کے ذریعے اپنے مزاج کا اظہار شروع کر دیتے ہیں۔ ایرن بھی ایک ایسا ہی بچہ ہے جس کے دماغ پر رنگوں کے اثرات کو سمجھنے اور اظہار کی صلاحیت نے بہت جلد لاشعور سے شعور کی طرف اپنا سفر مکمل کر لیا ہے۔''

''تو اس سے کیا پتا چلتا ہے؟'' وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کر دیا۔

''وہ نیلا رنگ پسند کرتا ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' میں نے فوراً قطع کلامی کرتے ہوئے تائید کی۔

''نیلا رنگ سکون، امن، وسعتِ قلبی اور ٹھنڈک کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لیے وہ مزاجاً پُرسکون اور ملنسار طبیعت کا مالک ہے۔'' ڈاکٹر نے بات آگے بڑھائی۔ ''زرد رنگ بیماری، افسردگی، پژمردگی کی علامت ہے اور اس کے اندر باطن میں پنہاں چڑچڑاہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ اب اگر اس نے زرد رنگ کی پنسل استعمال کی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس سے اسے شدید ذہنی کوفت پہنچی ہے۔ یہ بات اس کے من کے پُرسکون سمندر میں ہلچل کا سبب بنی اور اسی وجہ سے اس نے یہ حرکت کی ہوگی۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسی کون سی غیر معمولی بات ہوئی کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوا۔'' ڈاکٹر نے اپنی بات ختم کر کے گہری سانس لی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس نے جرمی پر زرد رنگ کی پنسل ضرور تانی ہے۔ وائس پرنسپل ٹھیک کہہ رہی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہوسکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور پوشیدہ ہوگی۔''

''خاص بات؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''جی... کوئی خاص بات ہے جس کا پتا چلانا ہوگا ورنہ نیلے رنگ کو پسند کرنے والے بڑی حد تک پُرسکون مزاج کے حامل اور ٹھہرے ہوئے جذبات کے لوگ ہوتے ہیں مگر اس واقعے میں شدت پسندی ملتی ہے۔ اب یہ شدت پسندی کس وجہ سے ہوئی، ہمیں یہ بات معلوم کرنا ہوگی۔''

''میری کیرن سے بات ہوئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ایرن کو بہلا پھسلا کر پیار سے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ آخر کیا وجہ ہوئی کہ اس نے جرمی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔'' میں نے ڈاکٹر کو بتایا، تاکہ وہ جان لے کہ ہم بھی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''یہ بہت اچھا ہے۔'' ڈاکٹر آرتھر نے مسکرا کر کہا۔ ''کیرن سے کہنا کہ وہ اس کے معمولات کے بارے میں بھی پتا کرے۔ پھر وہ جو کچھ بتائے، کل آ کر مجھے بتاؤ۔'' اس نے مشورہ دیا۔ ''میرے لحاظ سے اگر ایسا ہوا ہے تو پھر کوئی خاص بات ضرور پوشیدہ ہے اس سارے واقعے کے پیچھے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں پھر کل اسی وقت ملاقات ہوتی ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ ہم جلد ڈنر کرنے کے عادی ہیں۔ مجھے یقین تھا کیرن بے چینی سے میری واپسی کی منتظر ہوگی۔

گھر پہنچا تو کیرن لیونگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایرن بھی اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر، لباس تبدیل کر کے باہر آیا تو میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم تینوں بیٹھے ہوئے ڈنر کر رہے تھے۔ کیرن نے دو تین مختلف کھانے بنائے ہوئے تھے۔ میٹھا بھی بنایا ہوا تھا۔ یہ ساری ڈشیں ایرن کی پسندیدہ تھیں۔ وہ بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا اور وقفے وقفے سے ستائشی نظروں سے ماں کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ گھر آنے سے لے کر کھانے تک، کیرن نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے ایرن کو کوئی شبہ ہوتا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کہاں کہاں گیا تھا۔

کھانے کے بعد ایرن اور میں لیونگ روم میں آ گئے۔ کچھ دیر تک میں اور ایرن ٹی وی دیکھتے رہے۔ اس کے بعد میں نے ٹی وی بند کیا اور ایرن سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اتنی دیر میں کیرن میرے اور اپنے لیے کافی جبکہ ..... ایرن کے لیے دودھ کا گلاس لے آئی۔ یہ ہمارا معمول تھا۔ ڈنر کے بعد کیرن کچن سنبھالنے میں لگ جاتی اور ہم دونوں باپ بیٹا لیونگ روم میں آ کر بیٹھ جاتے۔ ہم دونوں کافی دیر تک بیٹھ کر کھیلتے اور باتیں کیا کرتے تھے۔

''چلو اٹھو ایرن... نو بجنے والے ہیں۔'' کیرن نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بیڈ روم میں چلتے ہیں۔ میں تمہیں کہانی سناتی ہوں۔'' میں اور ایرن قالین پر ریل گاڑی سے کھیل رہے تھے کہ کیرن نے مداخلت کی اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''گڈ نائٹ پاپا۔'' ماں کی بات سن کر اس نے میرے دونوں گالوں پر پیار کیا اور اس کے آگے آگے چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''گڈ نائٹ بیٹا۔'' جب وہ آخری قدمچے کی طرف بڑھا تو میں نے کہا اور خود بھی سونے کے لیے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔



www.digestpk.com

Asifzamil

ساڑھے نو بج رہے تھے جب کیرن بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بیڈ پر آ گئی۔

''ہاں اب بتاؤ۔'' اس نے بیڈ پر بیٹھ کر تکیہ اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر سے ملے تھے، کیا کہا اُس نے؟'' یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''اس سے خاصی تفصیل سے بات چیت ہوئی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، اس میں تشویش کا پہلو موجود ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، ایرن سے کوئی بات ہوئی؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''پہلے اپنی بات مکمل کرو۔'' اس نے جواب دیا۔

''بہت بہتر... وہ کہہ رہا تھا کہ یہ تبدیلی...'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ڈاکٹر آرتھر کے ساتھ ہونے والی ملاقات کی تفصیل بتانا شروع کی۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی بات میں خاصا وزن ہے۔'' اس نے پورا احوال سن کر آہستہ سے کہا۔ ''خیر... میں نے بھی ایرن سے سچ اگلوانے کی کوشش کی ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کوئی خاص بات؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ...'' میں سچ جاننے کے لیے بے تاب تھا۔

''وہ تو بتاتی ہوں لیکن یہ زرد پستول والی بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی ہے اب تک۔'' کیرن نے کہنا شروع کیا۔ ''شام کو ایرن ہوم ورک کر رہا تھا۔ میں اپنی فائلیں لے کر اس کے برابر بیٹھ گئی اور زرد رنگ کے بال پین سے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ دیکھوں تو سہی وہ کیا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ اچانک اس کی نظر میرے ہاتھ پر پڑ گئی۔ زرد بال پین دیکھ کر اس نے بُرا سا منہ بنا لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے اپنا ایک بال پین دیا اور کہنے لگا مما یہ زرد پین رکھ دو، اس سے لکھو۔ اس سے لگتا ہے کہ زرد رنگ سے نفرت بدستور اس میں موجود ہے۔ ایسا ہے تو زرد پستول اسے کہاں سے ملی اور اس نے کیسے اس سے کھیلا۔ یہ بات مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ تو میرے ہاتھ میں زرد پین دیکھنے کا متحمل نہیں تھا پھر...'' یہ کہہ کر کیرن خاموش ہو گئی۔

''اچھا...'' میں نے ہنکارا بھرا۔ ''یہ تم نے اچھا تجربہ کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم یہ بات ڈاکٹر آرتھر کو بھی بتا دیں گے۔ تم نے کچھ اور معلوم کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''کھل کر تو اس نے کچھ نہیں بتایا لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ جرمی سے ناراض ہے۔ وہ اچھا بچہ نہیں۔ وہ مصیبت میں کسی کے کام نہیں آتا۔'' کیرن نے بات شروع کی۔ ''میں نے پوچھا کہ وہ اچھا بچہ کیوں نہیں ہے تو وہ چُپ ہو گیا۔''

''کوئی اور خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے ہاں... ایک خاص بات تو سنو۔'' کیرن نے اس طرح چونکتے ہوئے کہا جیسے اسے کوئی خاص بات اچانک یاد آ گئی ہو۔ ''میں شام کو لان میں گئی تھی۔ وہاں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اسٹینڈ پر کھڑا کیا تو میرے ہاتھوں میں کافی مٹی لگ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کئی روز سے اسے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ اچھی خاصی دھول جمی ہوئی تھی سائیکل پر۔ میں نے واپس آ کر ایرن سے کہا کہ تم سائیکل چلانے کیوں نہیں جاتے تو اس نے کہا کہ دل نہیں چاہتا۔ رات کو ہوم ورک کے بعد میں نے اس سے کہا تم اب سائیکل چلاتے ہوئے جھیل کی طرف نہیں جانا۔ یہ سن کر اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ وہ جھیل اچھی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کوئی خاص بات ہے جو وہ سائیکل بھی نہیں چلا رہا۔'' کیرن کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ''اب کیا کریں؟'' میں نے کچھ دیر بعد کیرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو جرمی اس کا قریبی دوست تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ سائیکل چلاتے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ جرمی سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔'' کیرن نے کہا۔

''یہ بات تو اس کی ماں کو بُری لگ سکتی ہے۔'' میرے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

''مسز شیلڈن میری بہت اچھی دوست ہیں۔'' کیرن نے کہنا شروع کیا۔ ''میں کل آدھے دن کی چھٹی لے کر گھر آتی ہوں اور پھر دوپہر کو جرمی کے واپس آنے سے پہلے ان سے جا کر ملتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پہلے انہیں تفصیل سے بات بتاتی ہوں اور انہیں کہتی ہوں کہ وہ جرمی سے معلوم کریں کہ اصل بات کیا ہے۔''

''یہ طریقہ زیادہ مناسب رہے گا۔'' مجھے کیرن کی بات پسند آئی۔ ''اگر کل شام تک کچھ بات معلوم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا تاکہ میں ڈاکٹر کو بتا سکوں۔ مجھے شام چھ بجے تک اس کے پاس پہنچنا ہوگا۔''

''اسے یہ بھی بتا دینا کہ چند روز سے وہ سائیکل چلانے بھی نہیں جا رہا ہے، حالانکہ اسے تو سائیکل ریس کا بہت شوق تھا۔'' کیرن نے مشورہ دیا۔



''ٹھیک ہے۔ اب سو جاؤ۔ کل دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔''

''ہاں وہ ڈاکٹر کو میرے زرد بال پین والی بات بتانا نہیں بھولنا۔'' اس نے تاکید کی۔

''میری یادداشت بہت اچھی ہے وکیل صاحبہ۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے، کل صبح اٹھنے کے لیے اب سونا چاہیے۔''

''گڈ نائٹ۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور لیمپ آف کر دیا۔

☆☆☆

''گڈ آفٹر نون۔'' دوپہر کے سوا بارہ بجے ہوں گے، میں کام کر رہا تھا جب کیرن گھر میں داخل ہوئی۔

''واہ... کتنے عرصے کے بعد آج تم لنچ بنانے کے لیے آئی ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''زیادہ خوش فہمی میں نہ رہو۔'' وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں لباس تبدیل کر کے مسز شیلڈن کی طرف جا رہی ہوں۔''

''ہاں بھئی... بیٹے کا چکر ہے ورنہ شوہر کو کون پوچھتا ہے۔'' میں نے لہجے کو نہایت افسردہ بنا کر کہا۔

''شادی کے تیرھویں برس ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہنستے ہوئے اوپر جانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیچے آئی۔ اس نے جینز اور نیوی بلیو ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ''میرا خیال ہے گھنٹا بھر میں لوٹ آؤں گی۔'' اس نے کارنس سے ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''بہت بہتر۔'' میری انگلیاں ایک بار پھر تیزی سے کی بورڈ پر چلنے لگیں۔

دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے حسبِ معمول کام کا وقفہ کیا اور دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں آ گیا۔ میں روزانہ اپنے اور ایرن کے لیے تازہ لنچ تیار کرتا تھا۔ اسے فریج میں رکھا یا گرم کیا ہوا کھانا پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں خود ہی کئی برسوں سے اپنے اور اس کے لیے لنچ تیار کر رہا تھا ماسوائے ہفتہ اور اتوار کے، جب چھٹی کے باعث کیرن گھر پر ہوتی تھی اور مزے مزے کے کھانے بنا کر ہفتے کے پانچ دنوں کی کسر نکال دیتی تھی۔ وہ بہت لذیذ کھانا بناتی تھی۔ ابھی میں لنچ بنا ہی رہا تھا کہ ایرن بھی اسکول سے واپس آ گیا اور کچھ ہی دیر میں کیرن بھی لوٹ آئی۔ ایرن خلافِ توقع ماں کو گھر پر دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ ہم سب نے اکٹھے لنچ کیا اور کچھ دیر بعد ایرن اپنے اور ہم اپنے بیڈ روم میں چلے آئے۔

''بتاؤ... کیا بات ہوئی ان سے؟'' میں نے اندر آتے ہی جھٹ سے سوال کر دیا۔ جب سے وہ مسز شیلڈن کے ہاں سے لوٹی تھی، میں بدستور اس کے چہرے کو وقفے وقفے سے دیکھتا ہوا یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہاں کیا کچھ ہوا ہوگا لیکن اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ اسی لیے بیڈ روم میں آتے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''بات تشویش کی ہے۔'' اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' یہ سنتے ہی میں چونک گیا۔

''مسز شیلڈن تو خود بہت پریشان ہیں۔'' کیرن نے بتانا شروع کیا۔ ''وہ کہہ رہی تھیں کہ کئی روز ہو گئے ہیں جرمی سہما سہما رہنے لگا ہے۔ وہ اسکول سے واپس آ کر بیڈ روم میں گھس جاتا ہے۔ ذرا سی بھی آہٹ ہو تو وہ چونک جاتا ہے اور ایسے دیکھنے لگتا ہے جیسے کسی نادیدہ ہستی کا خوف چھایا ہوا ہے۔''

''اوہ میرے خدا... اس کا مطلب ہے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے جلدی سے کہا۔

''وہ بے چاری تو مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں ایرن سے پوچھوں کہ بات کیا ہے لیکن جب میں نے انہیں ایرن اور پھر اسکول والا قصہ سنایا تو وہ اور پریشان ہو گئیں۔''

''اور کیا کہہ رہی تھیں وہ؟'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''میرا خیال کہ جرمی کی حالت کے پیشِ نظر یہ مناسب نہیں کہ اس سے کچھ بات کی جائے۔'' کیرن نے کہنا شروع کیا۔ ''میں اُن سے کہہ آئی ہوں کہ وہ زیادہ فکر نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ اپنے رویّے کو مزید دوستانہ کر دیں۔ ہم کچھ کرتے ہیں۔'' میں نے سر ہلا کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مسز شیلڈن گھریلو خاتون تھیں۔ کئی سال پہلے ان کے شوہر کا فضائی حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ جرمی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ ہمارے گھر سے پانچ گھر چھوڑ کر رہتی تھیں۔

''مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے؟'' کچھ دیر کے بعد میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ کیرن کافی دیر سے خاموش تھی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں نمایاں تھیں اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

''میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ساری باتیں ڈاکٹر



www.digestpk.com

Asifzamil

آرتھر کو بتائی جائیں۔'' کیرن نے کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد لب کشائی کی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس کا تعلق دونوں بچوں سے ہے اور اب کوئی شدید خوف انہیں زبان کھولنے سے روک رہا ہے۔''

''شدید خوف؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس طرف دیکھا۔

''ہاں... ایسا ہی ہے۔'' کیرن نے وثوق سے کہا۔ ''تم شام کو جا کر ساری باتیں ڈاکٹر کو بتاؤ۔ میں نے انہیں ڈاکٹر آرتھر والی بات بھی بتائی تھی۔ مسز شیلڈن کہہ رہی تھیں کہ اگر ضرورت پڑے تو ڈاکٹر ان سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ ہمیں اب اس بے چاری کو بھی اس پریشانی سے نجات دلانا ہوگی۔''

''یہ تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں شام کو جاتا ہوں ڈاکٹر کی طرف۔'' میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ اس بات نے تو ہم دونوں کا سکون لوٹ لیا تھا۔

''میں دیکھ کر آتی ہوں ایرن کیا کر رہا ہے۔'' کیرن نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں ڈاکٹر آرتھر کے پاس بیٹھا ہوا انہیں تمام تر حالات سے تفصیلی طور پر آگاہ کر چکا تھا۔ میری بات سن کر وہ بھی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''ایرن آخری بار سائیکل پر جرمی کے ساتھ کب باہر گیا تھا؟'' کچھ دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر مجھ سے سوال کیا۔

''صحیح طور پر تو یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ پانچ چھ دن تو ہو گئے ہوں گے۔'' میں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بات شروع کی۔

''معاملہ سنگین ہے اور اس کے پیچھے کوئی ایسا واقعہ ضرور ہے جس نے دونوں بچوں کے ذہن پر نہایت شدید اثر ڈالا ہے۔'' ڈاکٹر نے چھت کو گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میرے خیال میں اس وقت دونوں بچے شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہیں اور جب تک یہ بات سب کے سامنے نہیں آجاتی، تب تک وہ بدستور ذہنی تناؤ کا شکار رہیں گے۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی اور خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تو اب کیا کریں؟'' میں نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔

''ہمیں پولیس کی مدد لینا ہوگی۔ میرے خیال میں یہ واحد اور مناسب راستہ ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''لیکن...'' میں نے یہ سنتے ہی قطع کلامی کی۔

''مجھے معلوم ہے، تم فکر مت کرو۔'' اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ''شیرف میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ دونوں بچوں سے ملے گا اور علیحدگی میں ان سے بات کرے گا۔''

''اس سے بچے کیا سوچیں گے؟'' میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔'' میری بات سن کر اس نے کہنا شروع کیا۔ ''شیرف تم سے دوست کی حیثیت سے ملنے تمہارے گھر آئے گا۔ اس دوران میں تم بچے کو اس کے پاس تنہا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جانا۔ وہ بچے کو تنہا دیکھ کر اس سے باتیں شروع کر دے گا اور پھر پوچھے گا کہ وہ اپنے دوست سے کیوں ناراض ہے۔ وہ ان سے کہے گا کہ اسکول انتظامیہ نے اسے بتایا ہے کہ یہ دونوں بہت اچھے دوست ہیں لیکن کچھ دنوں سے ان میں بول چال بند ہے۔'' ڈاکٹر منصوبہ بیان کر رہا تھا اور میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''تم مسز شیلڈن کو بھی بتا دو۔ وہ اُن کے گھر جا کر بھی اسی طرح بچے سے بات کرے گا۔ تم ان سے بات کر لو۔ اگر وہ رضامند ہیں تو میں شیرف کو تیار کر لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بچے پولیس کے سامنے خود کو محفوظ خیال کرتے ہوئے وہ سب کچھ اسے بتا دیں گے جو وہ اپنے والدین سے کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے میری طرف ٹیلی فون بڑھایا۔

''ہائے مسز شیلڈن...'' میں نے فون اٹینڈ ہوتے ہی کہا۔ ''جیمز..... بول رہا ہوں۔'' اگلے ہی لمحے میں نے انہیں ڈاکٹر آرتھر کا بنایا ہوا منصوبہ بتانا شروع کر دیا۔

''اگر وہ سمجھتے ہیں تو پھر بہتر ہے۔'' انہوں نے میری بات سن کر کہا۔ ''میں تو خود جرمی کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں انہیں بتا دیتا ہوں۔ پھر جو بھی.... پروگرام طے ہوگا، وہ میں آپ کو بتا دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھا۔ ''وہ رضامند ہیں۔'' میں نے ڈاکٹر آرتھر سے کہا۔

''گڈ... میں ابھی شیرف کو بلواتا ہوں۔'' میری بات سن کر اس نے ٹیلی فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ پندرہ منٹ بعد شیرف ڈاکٹر آرتھر کے سامنے بیٹھا ہوا ساری بات تفصیل سے سن رہا تھا۔

سارا پروگرام طے ہو گیا تو میں نے مسز شیلڈن کو فون کر کے اطلاع دی کہ کسی بھی وقت شیرف ان کے گھر آئے



گا۔ پھر میں نے کیرن کو فون کر کے ساری بات سمجھائی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وقت بہت کم ہے اور گھر جا کر ایرن کی موجودگی میں اس سے بات کرنا ممکن نہیں ہوگی۔ اس لیے میں نے اسے فون پر ہی ساری بات بتانے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود وکیل تھی۔ اس نے بات کو فوراً سمجھ لیا۔ میں نے شیرف اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلا آیا۔

گھر پہنچا تو کیرن ڈنر تیار کر چکی تھی۔ دونوں ماں بیٹا میری واپسی کے منتظر تھے۔ آج بھی کیرن نے ایرن کی پسند کا کھانا بنایا تھا۔ وہ بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔

حسب معمول ڈنر کے بعد میں اور ایرن لیونگ روم میں کھیل رہے تھے کہ ڈور بیل بجی۔ شیرف پہنچ چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے مسز شیلڈن کے ہاں سے ہوتے ہوئے آنا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایرن میرے برابر ہی کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے اس طرح خوش آمدید کہا جیسے اس کی آمد سے بے خبر تھا اور پرانے دوست کی طرح اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بے پناہ خوش ہوا ہوں۔ ''آیئے آیئے۔'' میں نے دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کو کہا۔

''خیریت ہے۔'' جب وہ لیونگ روم میں پہنچ کر صوفے پر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ خلاف توقع وہ پریشان لگ رہا تھا۔

''نہیں...'' اس نے کہا۔ ''معاملہ گڑبڑ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ایرن کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا اپنا خراب کھلونا ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری بات سنے۔

''میں جرمی سے مل کر آرہا ہوں۔ اس بچے نے تو فوراً سچ اُگل دیا۔ یہ دونوں قتل کے عینی گواہ ہیں۔'' اس نے ایرن کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا...'' میرے منہ سے حیرت کے مارے نکلا۔ ''بیٹا! تم بیڈ روم میں جا کر کھیلو۔ میں ذرا یہاں مہمان کے ساتھ مصروف ہوں۔'' میں نے ایرن کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ ''ہاں سنو... ذرا مما کو یہاں بھیج دو۔'' وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ شیرف نے جو بات بتائی تھی، اسے سنتے ہی میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس وقت کیرن کا یہاں موجود ہونا زیادہ مناسب ہوگا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آگئی۔ میں نے مختصراً اسے ساری بات بتائی۔ یہ سن کر وہ بہت پریشان ہوگئی۔

''اصل صورتِ حال کیا ہے، کھل کر بتاؤ۔'' اس نے شیرف کو مخاطب کیا۔ وہ شیرف کو جانتی تھی اور وہ بھی اسے بطور سرکاری وکیل پہچانتا تھا۔

''بات یہ ہے کہ...'' شیرف نے کہنا شروع کیا۔ ''میں جرمی سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ شدید خوف زدہ ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ان دونوں میں کس بات پر ناراضی ہے تو بس... یہ سنتے ہی وہ رونے لگا اور پھر اس نے سارا قصہ بیان کر دیا۔''

''قصہ کیا ہے؟'' کیرن نے قطع کلامی کی۔

شیرف کے مطابق جرمی کا کہنا تھا کہ چار پانچ دن پہلے وہ دونوں سہ پہر کے وقت سائیکل دوڑاتے ہوئے جھیل کے کنارے پہنچے۔ جب وہ وہاں گئے تو اس وقت ایک لمبا چوڑا آدمی ایک کمزور سے آدمی کو بُری طرح پیٹ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ دونوں ڈر گئے اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ اس لمبے آدمی نے اس شخص کو بہت مارا۔ جب وہ زمین پر گر گیا تو اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اچانک وہ آدمی اٹھ بیٹھا اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن لمبے مارنے والے نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا پانی میں لے جانے لگا۔ جب وہ اسے پانی میں لے جا رہا تھا تو یہ دیکھ کر ایرن کو بہت غصہ آیا۔ اس نے جرمی سے کہا کہ وہ دونوں اس آدمی کو مل کر بچاتے ہیں لیکن جرمی اس لمبے آدمی اور پانی سے ڈر گیا۔ اسے بھیگنا پسند نہیں تھا۔ اس نے انکار کیا اور سائیکل موڑ کر واپس گھر کی طرف چل دیا۔ ایرن اس کے پیچھے پیچھے آیا لیکن وہ رکا نہیں اور تیز تیز پیڈل چلانے لگا۔ دوسرے دن وہ اسکول میں وقفے کے دوران میں گراؤنڈ میں کھیل رہا تھا کہ ایرن کو پانی کی ایک پستول وہاں پڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ اٹھا کر وہ اس کے پاس آیا اور یہ کہتے ہوئے اس پر پانی کی دھار ماری کہ وہ کسی کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے وہ اچھا بچہ نہیں ہے۔ اس کے بعد جو کہانی ہے وہ وائس پرنسپل پہلے ہی بیان کر چکی تھیں۔

''اوہ میرے خدا...'' سارا ماجرا سن کر اچانک مجھے خیال آیا۔ ''یہ کہیں جھیل سے ملنے والی لاش والا قصہ تو نہیں ہے۔'' میں نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' شیرف نے تائید کی۔ ''جرمی کہتا ہے کہ اس نے مارنے والے کو بہت اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ اس کا حلیہ بھی بیان کر رہا تھا۔ میں نے مسز شیلڈن سے بات کر لی ہے۔ ہم فوراً جرمی کی مدد سے ملزم کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے



www.digestpk.com

Asifzamil

کہا۔ ''ویسے بھی ہمیں اب تک اس کیس کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ میں اب چلتا ہوں، کئی کام کرنے ہیں... بائے۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑ گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن جمعہ تھا۔ سٹی گراؤنڈ میں بیس بال کا ایک میچ ہو رہا تھا۔ یہ دو اضلاع کی ٹیموں کے مابین تھا۔ مجھے بیس بال سے ویسے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ اس میچ پر مقامی اخبار کے لیے مجھے ایک مضمون بھی لکھنا تھا۔ اس لیے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ ایرن بھی میرے ساتھ تھا۔ ابھی میچ ختم ہوئے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

''شیرف بول رہا ہوں۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''کیا تم اپنے بیٹے کے ساتھ میرے دفتر آسکتے ہو، ابھی اسی وقت؟''

''کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کوشش نہیں، فوراً پہنچو۔'' اس نے تاکید کی اور فون بند کر دیا۔

''چلو چلتے ہیں۔'' میں نے ایرن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں شیرف کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''اسے پہچانتے ہو۔'' شیرف نے دس ضرب بارہ انچ کی ایک تصویر ایرن کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... یہ تو وہی ہے۔'' شیرف کی بات سن کر ایرن نے اس کے ہاتھ سے تصویر لی اور کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اچانک وہ چلایا۔ ''یہ تو اس دن جھیل پر ایک آدمی کو بُری طرح مار رہا تھا۔''

''کس دن...'' شیرف نے سوال کیا تو ایرن نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ یہ حرف بہ حرف وہی بیان تھا جو جرمی نے دیا تھا۔

''ہم نے اسے تمہارے دوست کی مدد سے پکڑ لیا ہے۔'' ساری بات سن کر شیرف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد کیرن، مسز شیلڈن اور جرمی بھی پہنچ گئے۔ شیرف نے جرمی کو بھی تصویر دکھائی، اس نے بھی پہچان لیا۔

''یہ ایک برا آدمی تھا لیکن جرمی نے مدد کی اور پھر ہم نے اسے پکڑ لیا۔'' شیرف نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اٹھو ایرن، اپنے دوست سے ہاتھ ملاؤ۔'' اس نے دونوں بچوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

''کل سائیکل پر چلیں گے وہاں۔'' جرمی نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ایرن نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔

اس کے بعد شیرف نے دونوں بچوں کو برابر والے کمرے میں بھیج دیا اور پھر ہمیں بتایا کہ یہ شخص جیل سے فرار ہونے والا ایک خطرناک اور اذیت پسند قاتل جمی ہے۔ اس نے راستے میں مقتول انتھونی سے پہلے تو لفٹ لی اور جب وہ جھیل کے قریب پہنچا تو اس پر قابو پا کر مارتا ہوا جھیل تک لایا اور لوٹنے کے بعد اسے ڈبو کر مار ڈالا اور گاڑی لے کر فرار ہو گیا۔ اسے آج دوپہر ایک ریستوران سے پکڑا گیا ہے۔ اس نے گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی جعلی لگا رکھی تھی تاکہ پکڑا نہ جائے مگر ان بچوں اور تمہاری تشویش نے قاتل اور مفرور مجرم کو گرفتار کروا دیا۔

''اور ڈاکٹر آرتھر کی تشویش نے بھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات میں اضافہ کیا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں کیرن اور ایرن کو لے کر مقامی مارکیٹ گیا۔ کیرن کو ہم سب کے لیے کچھ کپڑے خریدنے تھے۔ ایرن اسٹور میں گھوم پھر کر اپنے لیے پسند کی چیزیں اٹھا اٹھا کر ٹرالی میں رکھ رہا تھا۔

''یہ میرے ہیں۔'' کیرن اور میری چیزوں کا بل بن گیا تو ایرن اپنی ٹرالی میں سے کپڑے اور کھلونے نکال کر کاؤنٹر پر رکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر ہم میاں بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے دو زرد رنگ کی ٹی شرٹ پسند کی تھیں۔ کئی کھلونے بھی زرد رنگ کے شیڈ والے تھے۔

''یہ کیا...'' کیرن نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

''رنگ سب اچھے ہوتے ہیں جیسا کہ جرمی بھی اچھا بچہ ہے۔ میں خوا مخواہ اس سے ناراض تھا۔'' اس نے نہایت بھولپن سے کہا۔ ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ایرن صحت یاب ہو چکا تھا۔

''شام کو جا کر ڈاکٹر آرتھر کو ان کی فیس ادا کر دو۔ علاج کارگر ہو گیا۔'' کیرن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آج نہیں... کل میرا بیس بال پر مضمون شائع ہوگا۔ وہی اخبار لے جا کر انہیں دے دوں گا بطور فیس۔''

''بڑے کنجوس ہو تم۔'' کیرن نے میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور میں ایک بار پھر ہنس دیا۔ ایرن کاؤنٹر پر سے اپنے زرد رنگ کی ٹی شرٹس اور کھلونوں والا شاپنگ بیگ اٹھا رہا تھا۔

# دستِ قاتل

مختار آزاد

ماں اور محبوب جُدا ہو جائیں تو ان کی یادیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں... انسان زندگی بھر ان یادوں کی بازگشت سنتا رہتا ہے... وہ بھی اپنی ماں سے بچھڑ کر لمحہ بھر کے لیے بھی اسے بھول نہ پائی تھی۔ ماں سے زیادہ وہ اس قاتلہ کو یاد کرتی تھی جو ان کے بیچ جدائی کی وجہ بنی تھی۔ انتقام اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا، دل میں جوالہ مکھی روشن تھا اور ذہن پر مناسب وقت کا انتظار تھا...

**جذبۂ انتقام سے لبریز ایک محبت کرنے والی پرستار کا دل گداز ماجرا**

اسٹیسی جین کو ڈیزی کی ممی کا قتل کیے ہوئے کافی لمبا عرصہ بیت چکا تھا مگر اُسے اب تک سب کچھ یاد تھا۔ ڈیزی ویمنس اس وقت صرف چھ سال کی تھی جب اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پانچ سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی پورا واقعہ اس کی آنکھوں میں روز اول کی طرح جیتا جاگتا تھا۔

اس وقت وہ کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا سر ممی کی گود میں تھا۔ وہ اسے 'گڈ نائٹ مون' سے پریوں کی کہانی پڑھ کر سنا رہی تھی۔ یہ ڈیزی کی ممی کا معمول تھا۔ روزانہ اسے سلانے سے پہلے کہانی پڑھ کر سناتی۔ اس کے بعد دعا کرواتی اور پھر کچھ دیر تک اس کا سر سہلاتی رہتی۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈیزی پریوں کے دیس میں کھو جاتی تھی۔



www.digestpk.com

Asifzamil

اُس رات بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ڈیزی، مما کی آغوش میں سر رکھے کہانی سُن رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مما نے اسے کاؤچ پر لٹایا اور دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی۔ ڈیزی دروازے پر نظریں جمائے دیکھ رہی تھی کہ اس وقت کون آیا ہوگا۔ جیسے ہی اس کی ممی نے دروازہ کھولا، سامنے اسٹیسی جین کھڑی تھی۔ اس نے مما سے کچھ کہا۔ جواب میں مما نے بھی کچھ کہا مگر کیا کہا تھا۔۔۔ یہ بات وہ سن نہیں سکی تھی۔ اس کے بعد مما دو قدم پیچھے ہٹی لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ اچانک اس نے پستول نکال کر ہاتھ مما کے سینے کی طرف کیا اور اگلے ہی لمحے ایک کے بعد ایک، دو گولیاں چلیں۔ دونوں گولیاں اس کی مما کے سینے میں دھنس چکی تھیں۔ زخموں سے خون کا فوارہ اُبلا اور پھر اپنے ہی خون میں نہاتی ہوئی اس کی مما لڑکھڑاتی ہوئی پلٹی، نئے پالش شدہ فرش پر دو تین قدم آگے بڑھی اور نیچے گر گئی۔ اس کے جسم سے اُبلنے والا خون ہر طرف تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ فرش پر تڑپ رہی تھی اور خون زخموں سے بھل بھل کر کے نکلتا ہوا پورے فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

ڈیزی کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہ خون میں لت پت ماں کو فرش پر گرتا دیکھ کر اس کی طرف چلاتی ہوئی بھاگی تھی۔ مرتی ہوئی ماں نے اپنی بچی کو دیکھ کو دونوں بازو اٹھائے۔ وہ اسے آخری بار اپنی آغوش میں لینا چاہتی تھی لیکن اس کے بازو اٹھے تو سہی مگر اس سے قبل کہ ڈیزی ماں کی آغوش میں سماتی، دونوں بازو بے جان ہو کر فرش پر گر پڑے۔ اسے اب تک یاد ہے کہ وہ مما کے بازوؤں کو فرش پر گرتا دیکھ کر اس کے پاس فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ وہ چلا رہی تھی۔ ماں کو جھنجھوڑ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اچانک مما نے آنکھیں کھولیں اور اٹکتے ہوئے کہا۔ ”میری پیاری بچی۔“

”میری پیاری مما۔۔۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔“ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ مما جا رہی ہے، بہت دور، ہمیشہ کے لیے۔ وہ مما کی آواز آخری بار سن رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے اس کے سینے پر گر گئی لیکن چند سیکنڈ کے بعد اس نے دو تین ہچکیاں لیں۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ کھلی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ خون بدستور آہستہ آہستہ فرش پر پھیل رہا تھا۔

وہ کتنی دیر تک مُردہ ماں کے سینے پر سر رکھے روتی رہی، یہ بات اسے یاد نہیں۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ دو آدمیوں نے آ کر اسے مما کے سینے سے جُدا کیا تھا۔ اس وقت تک وہ بھی خون میں لت پت ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ڈیزی کی ماں کیرولین ٹی وی کی معروف اداکارہ تھی۔ اسے اداکاری کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کا روایت پسند خاندان ٹیکساس کے نواحی قصبے میں رہتا تھا۔ گھر کا ماحول اسے گھٹن زدہ لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن بھی اس کے جیسے خیالات رکھتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کیرولین اداکاری کرنا چاہتی تھی جبکہ وہ بے فکری کی زندگی بسر کرنے کی خواہش مند تھی۔ اسے آزاد رہنا پسند تھا اور کیرولین کی آنکھوں میں ہر وقت لاکھوں دلوں کو تڑپانے کا سپنا سجا رہتا۔ اپنی اپنی منزل کی تلاش میں آخر دونوں نے اپنے اپنے طور پر ایک فیصلہ کر لیا۔ پہلے چھوٹی بہن نے گھر چھوڑا۔ وہ کہاں گئی؟ یہ بات کوئی نہیں جانتا اور برسوں گزر جانے کے باوجود بھی یہ بات کیرولین تو کیا اس کے خاندان کا کوئی فرد نہیں جان سکا۔ چھوٹی بہن کے گھر چھوڑ دینے کے بعد اس کی باری تھی۔ ایک دن وہ بھی خاموشی سے گھر چھوڑ کر چل دی۔

کیرولین جانتی تھی کہ اس کی منزل ہالی ووڈ میں ہے۔ اس لیے وہ سیدھی لاس اینجلس پہنچی۔ وہ نام کمانا چاہتی تھی۔ پُرسکون زندگی اور عیش و عشرت میں شب و روز بسر کرنا اس کی دلی آرزو تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنی منزل کی جستجو میں لگ گئی۔ کئی ماہ بیت گئے۔ اس نے کئی دوست بنائے، بہت سوں سے منہ پھیرا اور پھر آخر کار ایک دوست اسے منزل کے قریب پہنچا گیا۔ اسے ایک ٹی وی ڈرامے میں چھوٹا سا کردار مل گیا تھا۔

کیرولین کی شخصیت میں کشش تھی۔ اس میں ناز نخرے، ادائیں اور جلوہ گری کے اوصاف تھے۔ یہ سب چیزیں ہالی ووڈ میں اس کے کام آئیں۔ بہت جلد اسے مختلف ٹی وی ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ملنے لگے۔ اس کے تمام کردار ہمیشہ منفی نوعیت کے ہوتے تھے۔ ہدایت کاروں کا خیال تھا کہ اس کی شخصیت، چہرے مہرے اور لب و لہجے کے باعث وہ منفی کرداروں میں زیادہ بہتر انداز میں انصاف کر سکتی تھی۔ ہالی ووڈ میں کام کرتے ہوئے اسے کئی سال گزر گئے لیکن اس کے باوجود وہ اب تک منزل کی جستجو میں بھٹک رہی تھی۔ وہ ایسا کردار ادا کرنا چاہتی تھی، جو اس کی پہچان بن جائے مگر اب تک اسے ایسا کوئی کردار نہیں مل سکا تھا۔ اب تک اس نے جتنے کردار ادا کیے، وہ ان سے مطمئن نہیں تھی۔ بس! پیٹ کی آنچ سرد کرنے اور منزل تک پہنچنے کے لیے بطور سیڑھی وہ ان سے نباہ کر رہی تھی۔ کئی سال تک وہ چھوٹے موٹے کردار ادا کرتی رہی لیکن ناامید نہ ہوئی۔ آخر اس کی جدوجہد رنگ لائی اور پھر اسے ایک بڑا کردار مل گیا۔

اُن دنوں ہالی ووڈ میں ایک سوپ ڈراما کے لیے اداکاروں



....کا انتخاب کیا جا رہا تھا۔ کیرولین نے بھی آڈیشن دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا جسمانی کشش کہ اسے مرکزی کردار کے لیے چُن لیا گیا۔ یہ کردار امیر طبقے کی ایک ایسی عیاش عورت کا تھا جو عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کر رہی تھی۔ مردوں کو لبھانا اور انہیں حسرتِ وصال میں تڑپا تڑپا کر خود لذتی حاصل کرنا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ اس دوران اس کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے، انہیں ڈرامے میں دکھایا جانا تھا۔

ڈراما نشر ہونا شروع ہوا تو یہ ناظرین کی توجہ اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے میں ڈراما شہرت کے آسمان کو چھونے لگا۔ لوگوں نے کیرولین کے کردار کو بہت پسند کیا تھا۔ اس کے ناز و انداز نے جنسِ مخالف کے لاکھوں شائقین کے دلوں کو گرما دیا تھا۔ اب اس کا شمار ہالی ووڈ کے ٹی وی ڈراموں کی دنیا کے معروف فنکاروں میں کیا جانے لگا۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس ڈرامے میں کام کرتی رہی۔ اس نے اپنی جان دار اداکاری سے کردار کو حقیقت کا روپ دے دیا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے یہ کردار اور کیرولین لازم و ملزوم ہیں۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب ہالی ووڈ میں اسٹار کہلوانے کی اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس کی دوستی ایک شخص سے ہو گئی۔ وہ ڈرامے کا میک اپ مین تھا۔ ان دونوں کے تعلقات بہت بڑھ چکے تھے۔ اس تعلق کے نتیجے میں ایک بچی پیدا ہوئی مگر وہ شخص بچی کی پیدائش سے کئی ماہ پہلے ہی اچانک اسے چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا اور پھر زندگی کی آخری سانس تک کیرولین نے اسے نہیں دیکھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

ڈراما بدستور جاری تھا۔ اس کی بدولت اسے پیسا، شہرت اور عیش و آرام... غرضیکہ وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کا خواب اس نے کبھی دیکھا تھا۔ بچی چھ سال کی ہو چکی تھی اور جس رات کیرولین کا قتل ہوا، وہ کاؤچ پر لیٹی ہوئی جرم کو سرزد ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس جرم کی عینی شاہد تھی لیکن اس وقت تک اسے جرم و سزا کے معنی معلوم نہیں تھے۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مما نے دروازہ کھولا اور پھر ایک شناسا سا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے بعد ڈز ڈز کی آواز دو بار سنائی دی... مما کے جسم سے خون بہنے لگا اور وہ مر گئیں۔ اس کے سوا اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔

کیرولین ہالی ووڈ کی معروف اداکارہ تھی۔ اس کا قتل اخبارات، ٹی وی، ریڈیو اور انٹرنیٹ پر چٹ پٹی خبر بن گیا۔ اسے لاس اینجلس کے ایک قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ کیرولین کے جنازے میں کئی نمایاں فنکاروں نے شرکت کی۔ اس کے پرستاروں کی بھی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ شام کا وقت تھا جب تدفین کی جا رہی تھی۔ ننھی ڈیزی بھی قبر کے قریب کھڑی تھی۔ وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔ اس کے قریب موجود سب لوگوں کا یہ خیال تھا کہ معصوم بچی کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز اور غیر متوقع ہے لیکن حقیقت صرف ڈیزی جانتی تھی۔ اس کی پلکیں نم تھیں اور وہ ہجوم میں اس چہرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، جس نے اُس رات مما پر گولیاں چلائی تھیں۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سرمئی اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس مرد اور عورتیں اس کے اِرد گرد موجود تھے اور وہ لاکھ کوشش کے باوجود ان میں وہ چہرہ دیکھنے میں ناکام رہی جس کی اسے شدت سے تلاش تھی۔

کیرولین کے قتل کو ایک ماہ گزر چکا تھا لیکن پولیس قاتل کا سراغ نہیں لگا پائی تھی۔ انہوں نے ڈیزی سے بھی کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس ننھی بچی نے جو کچھ بتایا، وہ پولیس کے لیے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ ڈیزی پولیس کو اسٹیسی جین کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتا سکی۔ اس نے پولیس کو صرف اتنا بتایا کہ مما نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک آنٹی کھڑی تھیں۔ انہوں نے مما سے کچھ بات کی اور پھر گولی چلا دی۔ اس کے بعد وہ مما کی طرف لپکی تو انہوں نے آخری بار اسے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر ان کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ پولیس نے اس سے اُس عورت کے حلیے کے بارے میں معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ جب بھی اسے بہلا پھسلا کر واردات کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرتے، وہ مما مما پکارتے ہوئے زور زور سے رونے لگتی اور پھر اچانک خاموش ہو جاتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اتنے دن گزر جانے کے باوجود اب تک بدستور خوف زدہ ہے۔

بچی سے خاص معلومات حاصل نہ ہونے کے بعد پولیس نے کیرولین کی قریبی دوستوں، جاننے والوں، ساتھی فنکاروں اور 'ویمپ' ڈرامے میں کام کرنے والے کئی دوسرے متعلقہ لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی مگر ایک ماہ کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود انہیں ایسی کوئی کارآمد معلومات حاصل نہ ہو سکیں جس سے مجرم کا کوئی سراغ مل پاتا۔ پولیس بدستور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ انہیں نہ تو جائے واردات سے کوئی سراغ ملا تھا اور نہ ہی تفتیش سے کوئی اہم بات سامنے آ سکی تھی۔

کیرولین عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ اس نے اپنی



www.digestpk.com

Asifzamil

فنی ..... زندگی میں لاکھوں کمائے تھے لیکن جو کچھ کمایا، خرچ کر دیا۔ شاید اسے اتنی جلدی اس دنیا سے چلے جانے کا یقین نہیں تھا۔ ممکن ہے اسی لیے اس نے اپنے پیچھے ایسا کچھ نہیں چھوڑا، جس کے سہارے ٹمسن ڈیزی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک زندگی بسر کر سکتی۔ اس کے مرنے کے بعد بینک نے وہ گھر قرق کر لیا جہاں وہ رہتی تھی۔ کیرولین نے مرنے سے چند ماہ قبل ہی بینک سے قرض لے کر وہ گھر خریدا تھا اور اب تک اس کی صرف تین چار قسطیں ہی ادا ہوئی تھیں۔ گھر چلے جانے کے بعد پولیس نے ڈیزی کو یتیم بچوں کی نگہداشت کرنے والے ایک سرکاری ادارے کے سپرد کر کے ورثا کی تلاش شروع کر دی۔ پولیس کو حیرت تھی کہ اتنی معروف اداکارہ کے مرنے کے بعد کوئی بھی ایسا شخص سامنے نہیں آیا جو اس کا رشتے دار ہونے کا دعویٰ کرتا۔ اسی بنا پر انہیں یقین تھا کہ شاید کیرولین کا اس دنیا میں یا تو کوئی نہیں تھا یا سب اس سے اپنا ناتا توڑ چکے تھے۔ اس کے باوجود پولیس قانونی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے ورثا کی تلاش بدستور جاری رکھے ہوئے تھی۔

پولیس نے ڈیزی کی تصویر کے ساتھ اخبارات میں ایک اشتہار شائع کروایا۔ جس کے مطابق اگر کیرولین کا کوئی رشتے دار زندہ ہے تو پولیس سے رابطہ کرے ورنہ بچی کو مستقل طور پر یتیم خانے کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اشتہار شائع ہونے کے دو دن بعد پولیس کو کسی نامعلوم شخص کی طرف سے ایک خط ملا۔ خط لکھنے والے نے اپنا کوئی اتا پتا نہیں لکھا تھا۔ خط میں صرف چند الفاظ اور ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ خط بھیجنے والے نے نہایت احتیاط برتی تھی۔ ہاتھ سے لکھنے کے بجائے اس نے کمپیوٹر استعمال کیا تھا۔

''نیچے لکھا ہوا پتا کیرولین کی بڑی بہن ہیلن کا ہے جو اس کی واحد زندہ رشتے دار ہے۔ اس سے رابطہ کیا جائے۔ وہ ٹیکساس کے نواحی قصبے فورٹ ورتھ میں رہتی ہے۔'' اس کے بعد ہیلن کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔

پولیس نے ہیلن سے رابطہ کیا اور اگلے دو روز بعد وہ اسے لینے کے لیے لاس اینجلس پہنچ گئی۔ ہیلن کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ چہرے مہرے سے وہ نہایت ہمدرد، مشفق، مخلص اور روایت پسند لگتی تھی۔ وہ فورٹ ورتھ کے ایک بڑے ہوٹل میں قائم بیوٹی پارلر میں کام کرتی تھی۔ وہ بے اولاد تھی۔ والدین کی موت کے بعد اس نے شادی کر لی تھی لیکن کئی سال پہلے اس کے شوہر کا ایک ٹریفک حادثے میں انتقال ہو گیا، جس کے بعد سے وہ تنہائی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسے پولیس کی طرف سے رابطہ کیے جانے سے پہلے یہ علم ہی نہیں تھا کہ جس بہن نے کئی برس پہلے اپنا گھر چھوڑا تھا، وہ اس دنیا کو ہی چھوڑ کر جا چکی ہے۔ بہن کی موت کی خبر سے اس کو جو صدمہ پہنچا، شاید وہ ڈیزی کو دیکھ کر کچھ کم ہو گیا تھا۔ آخر کو یہ اس کی مرحوم بہن کی اولاد تھی۔ ہیلن نے قانونی کارروائی پوری ہونے کے بعد ڈیزی کو ساتھ لیا اور ٹیکساس واپس آ گئی۔

ماں کی موت کے بعد ڈیزی بالکل بے سہارا ہو چکی تھی۔ اس کے ننھے سے دماغ نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا اس لیے ماں کی موت کے بعد سے وہ گم صم رہنے لگی۔ اس کی ولدیت کے خانے میں باپ کے نام کی جگہ 'نامعلوم' لکھا ہوا تھا۔ یوں لے دے کر اس بھری پُری دنیا میں اب اس کا واحد سہارا یہی آنٹی تھی جس نے اس کی پرورش کی ذمے داری قانونی طور پر اپنے سر لے لی تھی۔

ڈیزی یہ بات تو جانتی تھی کہ اس کی ماں ٹی وی کی معروف اداکارہ تھی لیکن اس نے ماں کی زندگی میں کبھی بھی اس کا وہ ڈراما ٹی وی پر نہیں دیکھا تھا جس میں وہ اداکاری کرتی تھی۔ اس نے کئی بار اُس وقت وہاں بیٹھے رہنے کی ضد کی، جب اس کی ماں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنا ڈراما دیکھ رہی ہوتی تھی لیکن اس نے کبھی اپنی بیٹی کو ساتھ بیٹھ کر ڈراما دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ڈیزی کو بیڈ روم میں بھیج دیتی تھی ..... ''چھوٹی بچیاں ایسے ڈرامے نہیں دیکھتی ہیں۔''

''دی ویمپ'' امریکا کا مشہور طویل سلسلۂ ڈراما تھا۔ کیرولین کی موت کے بعد اس کے شائقین نے سوال اٹھایا کہ کیا اب یہ ڈراما بند ہو جائے گا؟ پروڈیوسر اور ہدایت کار بھی اس سوال سے پریشان تھے۔ ڈرامے کی کئی اقساط کیرولین کی بے وقت موت سے قبل ہی ایڈوانس میں تیار کی جا چکی تھیں اس لیے ڈراما پروڈیوسر مطمئن تھا کہ انہیں کم سے کم تین ماہ کا وقت مل گیا ہے۔ اس دوران میں وہ ایسی کسی نئی اداکارہ کو لے سکتے ہیں جو نہ صرف کیرولین کی جگہ لے سکے بلکہ اپنی دلربا اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ لوگ اُسے بھول جائیں۔ ڈراما بہت مقبول تھا اور پروڈیوسر کے لیے نہایت نفع بخش بھی۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کیرولین کے ختم ہونے سے یہ ڈراما ختم نہ ہونے پائے۔ بالآخران کی کوششیں رنگ لائیں۔

کیرولین کا کردار مرکزی تھا۔ اس ڈرامے میں اسٹیسی جین بھی ایک چھوٹا کردار ادا کر رہی تھی۔ جب پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے کیرولین کی جگہ پر نئی اداکارہ کے انتخاب کے لیے آڈیشن کیے تو اسٹیسی نے بھی آڈیشن دیا۔ اسٹیسی کو اس



کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا اور پھر واقعی اس نے اتنا ڈوب کر یہ کردار ادا کیا کہ لوگ کیرولین کو بھول گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ڈراما ایک بار پھر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ وہ ناظرین جو یہ کہتے ہوئے اسکرین کے سامنے سے ہٹ گئے تھے کہ اب ڈرامے میں وہ بات کہاں، ایک بار پھر خود کو اسکرین کے سامنے بیٹھا رہنے سے روک نہ پائے۔ ڈرامے کا پروڈیوسر کیرولین کی موت کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ اب شاید اس کے منافع کا گراف نیچے جانے لگے گا۔ ایک دن وہ ڈائریکٹر سے کیرولین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگا ''یاد رکھو جو کچھ ہوتا ہے، وہ بھلے کے لیے ہوتا ہے۔'' واقعی یہ بات تو سچ ہے لیکن ضروری نہیں کہ جو بھلا ہوا ہو، وہ سب کے لیے ہو۔ کسی کا بھلا کسی کا بُرا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اسٹیسی، پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ناظرین کا بھلا ڈیزی کے لیے بُرا ثابت ہوا تھا۔ اس بھلے کی قیمت اس کی ماں سے جدائی تھی پھر بھی وہ کسی حد تک خوش قسمت تھی۔ ماں کے بعد اسے ماں سے بڑھ کر پیار کرنے والی آنٹی مل گئی تھی جو اس کی خوشی کے لیے اپنی جان نچھاور کرنے پر بھی تیار تھی۔

ڈیزی نے اپنی ماں کو اس کی زندگی میں ٹی وی پر کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی موت کے بعد اس نے ''ویمپ'' کی کوئی قسط دیکھی تھی۔ پہلی بار اس نے یہ ڈراما اتفاقی طور پر دیکھا اور پھر وہ اس کے رگ و پے میں بستا چلا گیا۔

اس روز سنیچر تھا۔ شام کو وہ اپنی آنٹی کے ساتھ حسب معمول تفریح کے لیے باہر نکلی۔ ہفتہ بھر ہیلن دن بھر اپنے کام کاج میں مصروف رہتی لیکن ویک اینڈ کی شام کو ڈیزی کے ہمراہ باہر نکلتی اور پھر ڈنر کے بعد وہ گھر لوٹ آتے تھے۔ اس دن بھی وہ ایک پارک میں تھے۔ ڈیزی جھولا جھول رہی تھی۔ ہیلن سامنے کھڑی تھی۔ اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہائے...'' اس نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

''ہائے ہیلن... تھامس بول رہا ہوں تمہارا اوور ٹائم کا چیک تیار ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔ ویسے مجھے آج پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔'' اس نے یہ سن کر جواب دیا۔

''جانتا ہوں۔'' تھامس نے جواب دیا۔ ''ویسے تم چاہو تو چیک کے بجائے کیش بھی لے سکتی ہو۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔''

''تو پھر جتنا جلد ہو سکے، ہوٹل پہنچ جاؤ۔'' تھامس نے جواب دیا۔ ''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں... بائے۔'' ہیلن

## سکھ مت

آزادی سے پیشتر سکھ نوجوانوں کا ایک گروہ امرتسر سے ٹرین کے ذریعے لاہور آیا تاکہ فلم دیکھی جا سکے۔ تمام سردار صاحبان بغیر ٹکٹ تھے۔ لاہور اسٹیشن پر اتر کر انہوں نے حکمت طے کی کہ ایک ایک سکھ ٹکٹ چیکر کو جل دے کر نکلا جائے۔ سب کے سب اکٹھے نکلیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ یہ منصوبہ بندی کامیاب رہی اور ایک کے سوا سب سکھ ٹکٹ چیکر سے نظریں بچا کر اسٹیشن سے باہر پہنچ گئے۔ بدقسمتی سے آخری نوجوان کو ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا۔ اس پر سکھ نے اسٹیشن کے باہر منتظر اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ ''اوئے واپس آجاؤ۔ ہم سب پکڑے گئے ہیں۔''

کنڑی یونس کی ظرافت کراچی سے

نے گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ اس نے ڈیزی کو جھولے سے اترنے کا اشارہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کمرشل ایونیو کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر ہیلن نے گھر کے لیے کچھ ضروری سامان خریدا۔ اس کے بعد ان کی کار ہوٹل کی طرف بڑھنے لگی۔ آٹھ بجنے والے تھے جب وہ دونوں اسٹاک یارڈ ہوٹل پہنچے۔ ہیلن اسی ہوٹل کے بیوٹی پارلر میں ہیئر ڈریسر کے طور پر کام کرتی تھی۔ ہوٹل میں خاصی رونق تھی۔

''تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کے آنٹی نے اسے لابی میں ایک صوفے پر بٹھا دیا جہاں سے سامنے لگا ہوا بڑی سی اسکرین کا ٹی وی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نیا ڈراما شروع ہو گیا۔ وہ بے دلی سے ٹی وی دیکھے جا رہی تھی۔ اس وقت ''ویمپ'' ڈراما چل رہا تھا۔ اچانک اسکرین پر اسٹیسی جین نمودار ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ڈیزی حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے زور زور سے اپنی آنکھیں ملیں اور پھر اسکرین پر نظریں گڑا دیں اور نہایت انہماک سے اسے دیکھنے لگی۔ اگرچہ اس وقت اسٹیسی میک اپ میں تھی لیکن اس نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا۔ یہ چہرہ تو اس کے دماغ میں نقش ہو چکا تھا۔ اس کی مما کی موت کو کئی ماہ گزر چکے تھے، اس کے باوجود یہ چہرہ اس کی نگاہوں میں ہر وقت گھومتا رہتا تھا۔ اسٹیسی کو دیکھتے ہی اس کے جسم میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس کے دماغ میں جھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ بدستور اسی کیفیت میں رہی پھر اس نے آہستہ آہستہ خود کو نارمل کیا۔ وہ اس عورت کو پہچان گئی تھی۔ وہ



www.digestpk.com

Asifzamil

اس آواز کو سیکڑوں آوازوں میں شناخت کر سکتی تھی۔ یہی وہ آواز تھی، جس نے اس کی مما پر گولی چلانے سے پہلے کچھ کہا تھا۔ کیا کہا تھا، الفاظ تو اسے یاد نہیں البتہ لہجہ یاد تھا۔ اس وقت اسٹیسی جین کلوز اپ میں نظر آ رہی تھی۔ ڈیزی نے داہنا ہاتھ اسکرین کی طرف کیا اور تین انگلیاں کلائی کی طرف موڑ کر شہادت کی اُنگلی سے دو دفعہ خیالی طور پر گولیاں چلائیں۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے دو بار ہلکی سی آواز نکلی ڈز، ڈز۔

جب ہیلن واپس آئی، اس وقت ڈرامے کا وقفہ ہو چکا تھا اور اسکرین پر اشتہار چل رہے تھے۔ ڈیزی صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔

''ڈیزی...'' ہیلن نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ''لگتا ہے بہت تھک گئی ہو۔''

''ہاں... کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' ڈیزی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو... پہلے ڈنر کرتے ہیں، پھر گھر چل کر آرام کریں گے۔'' لابی سے باہر نکلتے ہوئے ہیلن نے اس سے کہا۔ اس نے نہایت پیار سے ڈیزی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خوف زدہ ہے کہ اگر ایک بار ڈیزی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹا تو پھر شاید وہ بھیڑ میں کم ہو جائے گی۔ دو بہنوں کو کھو دینے کے بعد اب وہ بیٹی جیسی بھانجی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ڈیزی بدستور خاموش تھی۔ وہ اب بھی اسٹیسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسٹیسی اس کی ماں کی قاتل تھی۔ یہ بات صرف وہی جانتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی اس بارے میں اپنی زبان نہیں کھولے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسٹیسی پولیس کی گرفت میں آئے۔ کیرولین اس کی ماں تھی۔ اس کی موت سے جو صدمہ اسے پہنچا تھا، اسے صرف وہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس وقت بھی کار کی پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی وہ دل ہی دل میں شدت سے اپنی مما کو یاد کر رہی تھی۔ ہیلن کار چلا رہی تھی۔ وہ بالکل بے خبر تھی کہ ڈیزی کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ وہ بے چاری سمجھ رہی تھی کہ بچی کھیل کود کر تھک گئی ہے اور اسے بھوک لگ رہی ہے جس کی وجہ سے وہ خاموش ہے۔ وہ خاصی رفتار سے گاڑی چلاتی ہوئی ڈیزی کے پسندیدہ ریستوران کی طرف گامزن تھی۔

دوسری طرف کیرولین قتل کیس کی تفتیش بدستور جاری تھی۔ پولیس کو اب تک قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ہیلن وقتاً فوقتاً لاس اینجلس پولیس سے رابطہ کر کے تفتیش میں پیش رفت کا معلوم کرتی رہتی تھی اور پولیس والے جو کچھ اسے بتاتے تھے، اس سے وہ ڈیزی کو بھی آگاہ کر دیتی تھی۔

''خدا کرے پولیس والوں کو قاتل کا کبھی پتا نہ چلے۔'' کافی دیر تک اسٹیسی کے بارے میں سوچتے رہنے کے بعد اس نے دل ہی دل میں کہا اور نشست سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک چکا تھا۔ اعصاب تناؤ کا شکار تھے اور جسم ایسا نڈھال تھا جیسے وہ میلوں دور سے دوڑتی چلی آ رہی ہو۔

ہیلن کی آمدنی محدود تھی، اس کے باوجود وہ ڈیزی کا ہر ممکن خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے ڈیزی کو قصبے کے سب سے اچھے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کے آرام کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ کبھی کوئی ایسی بات نہ ہو جس کی وجہ سے وہ ماں کی کمی کو محسوس کرے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر کے سب سے مہنگے ریستوران کے سامنے گاڑی روک کر باہر نکل رہی تھی۔ ڈیزی کو یہاں کا پیزا اور برگر بہت پسند تھا۔ ہیلن کفایت شعار عورت تھی۔ اگر بات اس کی ہوتی تو وہ کبھی یہاں کا رُخ نہیں کرتی لیکن اس کے لیے ڈیزی اہم تھی، پیسے نہیں۔ اسی لیے وہ ہر سنیچر کی شام اسے یہاں ڈنر کروانے کے لیے لے کر آتی تھی۔ ڈیزی بدستور خاموش تھی۔ ہیلن دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ خوامخواہ اس نے اوور ٹائم وصول کرنے کے چکر میں بچی کو تھکا دیا۔ دوسری طرف اسٹیسی، ڈیزی کے دل و دماغ پر بُری طرح چھا چکی تھی۔

☆☆☆

جس روز ڈیزی نے اسٹاک یارڈ ہوٹل کی لابی میں لگے ٹی وی پر پہلی بار اسٹیسی کو دیکھا تھا، اُس کے بعد سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے بھلا نہ سکی تھی۔ یہ ڈراما اس کا پسندیدہ ٹی وی ڈراما بن گیا۔ وہ آنٹی سے نظریں بچا بچا کر باقاعدگی سے اسے دیکھنے لگی۔ اُس روز کے بعد سے اس نے ڈرامے کی ایک بھی قسط نہیں چھوڑی تھی۔

دن آتے اور جاتے رہے۔ کب تک یہ بات اس کی آنٹی کی نگاہوں سے اوجھل رہتی۔ ایک دن اسے بھی پتا چل ہی گیا کہ وہ سرِ شام ٹی وی کے سامنے آ کر کیوں بیٹھ جاتی ہے لیکن ماں کے برعکس اس نے ایک بار بھی اسے ڈراما دیکھنے سے نہ روکا۔ ہیلن روایت پسند عورت تھی۔ اسے ڈرامے میں استعمال کیے گئے مکالمے نہایت فضول محسوس ہوتے تھے۔ اس لیے جب بھی ڈراما شروع ہونے لگتا، وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اِدھر اُدھر ہو جاتی اور ڈیزی بڑے مزے سے ٹکٹکی باندھے ٹی وی دیکھتی رہتی۔ اصل میں اسے ڈرامے سے کوئی



غرض نہیں تھی۔ وہ تو صرف اسٹیسی کی وجہ سے اسے دیکھتی تھی۔ مکالمے اور کہانی تو اس کے سر پر سے گزر جاتے تھے۔ دوسری طرف ہیلن کا خیال تھا کہ شاید ڈیزی اپنی ماں کی وجہ سے یہ ڈراما دیکھتی ہے۔ ہیلن جان چکی تھی کہ اس کی ساری دلچسپی کا محور ڈراما نہیں بلکہ اسٹیسی جین ہے۔

''سنو...'' ایک شام دونوں آتش دان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جب ہیلن نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی کہیے۔'' ڈیزی نے نہایت فرماں برداری سے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم صرف اسٹیسی کی وجہ سے ڈراما دیکھتی ہو۔'' اس نے ڈیزی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''سچ کہہ رہی ہوں نا؟'' اس نے بڑے پیار سے اپنی بات مکمل کی۔

''جی... یہی بات ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے سنا تھا کہ پہلے مما یہ کردار ادا کرتی تھیں، شاید اسی لیے۔''

''تو تم اسے ایک خط لکھو اور بتاؤ کہ تم اس کی کتنی بڑی پرستار ہو۔ وہ اپنی اس ننھی سی پرستار سے مل کر بہت خوش ہوگی۔'' ہیلن نے بچی کی ہمت بڑھاتے ہوئے ایک نئی راہ دکھائی۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری مما سے بھی واقف ہو۔ تم خط لکھ کر اس سے اپنا تعارف تو کرواؤ۔''

''نہیں نہیں...''

''کیوں؟'' جس طرح ڈیزی نے چونک کر کہا، اس سے ہیلن فکرمند ہوگئی۔ اس نے ڈیزی کی نہیں نہیں میں پوشیدہ پریشانی کو بھی بھانپ لیا تھا۔

''وہ وہ...'' ڈیزی کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

''کیا بات ہے، کھل کر کہو۔'' آنٹی نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''وہ مما کو یقیناً جانتی ہوگی۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے یہ بات پتا چلے۔''

''اس میں آخر حرج ہی کیا ہے؟'' ہیلن نے سوال کیا۔

''بس... مجھے اچھا نہیں لگے گا۔'' ڈیزی نے اس طرح جواب دیا کہ جیسے وجہ وہ بھی نہ جانتی ہو۔

''چلو... تم اسے یہ بات نہیں لکھنا۔'' ہیلن نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد مسئلے کا حل پیش کیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈیزی کاغذ قلم تھامے اسٹیسی کو بطور پرستار اپنا پہلا خط لکھ رہی تھی۔

''پیاری آنٹی اسٹیسی...

میری عمر سات سال ہے اور میں آپ کا ڈراما باقاعدگی سے دیکھتی ہوں۔ پورے ڈرامے میں مجھے صرف آپ اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی وجہ سے ہی میں یہ ڈراما دیکھتی ہوں۔ آپ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں بالکل میری مما کی طرح جو گاڈ.... کے ہاں رہتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی چھوٹی سی پرستار کو ضرور جواب دیں گی... بائے۔

فقط آپ کی پرستار... ڈیزی۔''

اسٹیسی کو خط لکھنے اور پوسٹ کیے جانے کے بعد اب ڈیزی کو بے چینی سے جواب کا انتظار تھا۔ کافی دن ہو چکے تھے لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، ڈیزی مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ البتہ اس کے دل میں ایک موہوم سی امید ضرور باقی تھی۔ اسے نجانے کیوں یہ امید تھی کہ اسٹیسی اسے ضرور جواب دے گی۔ اسی طرح کئی دن مزید گزر گئے۔

ایک دن جب ڈیزی اسکول سے لوٹی تو گھر کے گیٹ پر لگے میل باکس میں ایک خط پڑا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے خط نکالا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لفافے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ کئی ہفتوں کے بعد بالآخر اسٹیسی کو لکھے گئے خط کا جواب اسے مل ہی گیا۔ یہ خط اسٹیسی نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا:

''پیاری سی ننھی پری...

تمہارا خط ملا۔ میں سب سے پہلے دلی طور پر معذرت خواہ ہوں کہ جواب دینے میں تاخیر ہوگئی۔ اس کا سبب میرا شہر سے باہر ہونا تھا۔ ابھی ابھی میں نے تمہارا خط پڑھا اور فوراً جواب لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ ملک بھر میں جہاں میرے لاکھوں بالغ پرستار موجود ہیں، وہیں ایک چھوٹی سی ڈیزی بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے۔ لاکھوں پرستار ایک طرف اور تم ایک طرف۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے درمیان قلمی دوستی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ آئندہ تم مجھے اس پتے پر خط لکھنا جو میں خط کے آخر میں لکھوں گی۔ یہ میرا ذاتی پتا ہے۔ مجھے جیسے ہی تمہارا خط ملا کرے گا، میں پہلی فرصت میں تمہیں جواب دوں گی۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ تمہاری مما تمہارے ساتھ نہیں بلکہ گاڈ..... کے ہاں رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں سے تمہیں دیکھتی ہوں گی اور بہت پیار کرتی ہوں گی۔

تمہاری دوست... اسٹیسی جین۔''

خط ملنے پر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ شام کو جب ہیلن گھر لوٹی تو وہ دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی



www.digestpk.com

Asifzamil

تھی۔ جیسے ہی وہ گاڑی روک کر باہر نکلی، وہ دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اور اپنا وہ ہاتھ لہرایا جس میں نیلے رنگ کا لفافہ دبا ہوا تھا۔

اس کے بعد ڈیزی نے اسٹیسی کو کئی ... خط لکھے۔ خط لکھنے میں پہلے کی طرح اب بھی ہیلن اس کی مدد کیا کرتی تھی۔ جب سے ڈیزی کی اسٹیسی کے ساتھ خط و کتابت شروع ہوئی تھی، وہ بہت خوش دکھائی دینے لگی تھی۔ ماں کی موت کے بعد اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ڈیزی سہم سی گئی ہو لیکن اب ایک بار پھر اس میں زندگی کی اُمنگ نظر آنے لگی تھی۔ اس کا بچپن ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔ اب وہ ہنسنے کھیلنے بھی لگی تھی۔ ہیلن اس تبدیلی پر بہت خوش تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسٹیسی کو خط لکھتے ہوئے شاید اس کے لاشعور میں ماں کا تصور ہوتا ہے، اسی لیے وہ اسٹیسی کو خط لکھ کر یا اس کا جواب ملنے پر بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس بات سے قطعی لاعلم تھی کہ اس خط و کتابت کے پیچھے ننھی سی ڈیزی کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ اپنی آنکھوں کے سامنے ماں کو قتل ہوتا دیکھ کر اس کا ننھا سا دماغ وقت سے پہلے شعور کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسٹیسی سے اپنی ماں کے خون کا بدلہ لینے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کسی بھی طور اپنی ماں کی قاتل کو نہیں بخشے گی۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔

ڈیزی اور اسٹیسی کے درمیان خط و کتابت کو تین سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے اور نہ ہی ان دونوں میں سے کسی ایک نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس دوران میں اسٹیسی کا ڈراما پورے امریکا میں تمام ٹی وی ڈراموں سے زیادہ مشہور ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اسٹیسی بھی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ وہ اپنے کردار کے باعث پورے امریکا میں مشہور ہو چکی تھی۔ اس کے بے شمار پرستاروں نے ملک بھر میں 'اسٹیسی پرستار کلب' قائم کر لیے تھے۔ ٹیکساس کے سوا ہر جگہ یہ کلب قائم ہو چکے تھے۔ ایک دن اخبار میں اسٹیسی کے بارے میں ایک مضمون پڑھتے ہوئے ڈیزی کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے اپنی آنٹی سے مشورہ کیا اور پھر ان کی مدد سے اس نے انٹرنیٹ کے ذریعے چند ہفتوں تک مہم چلائی اور پھر بہت جلد اس نے ٹیکساس میں یہ کلب قائم کر لیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں انٹرنیٹ پر اس کلب کے اراکین کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی۔ اس نے اپنے گھر کے ایک کمرے کو 'اسٹیسی پرستار کلب' کا درجہ دے دیا تھا۔ ہیلن نے بھی اس بات کا بُرا نہ منایا بلکہ کلب کے لیے مخصوص کمرے کی سجاوٹ میں بھرپور کردار ادا کیا۔

وہ سنیچر کی ایک شام تھی، جب فورٹ ورتھ میں رہنے والے اسٹیسی کے پرستاروں کے لیے ڈیزی نے ایک چھوٹی سی پارٹی منعقد کی۔ اس پارٹی میں ہیلن نے ایک جاننے والے رپورٹر کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ اس رپورٹر نے پارٹی کی کئی تصویریں بنائیں۔ ڈیزی سے بات چیت کی اور پھر دو روز بعد ''فورٹ سٹی نیوز'' میں ڈیزی کے حوالے سے ایک بڑا باتصویر فیچر شائع ہوا۔

اس فیچر کا شائع ہونا تھا کہ ڈیزی کے بارے میں جاننے کے لیے اخباری رپورٹرز کی لائن لگ گئی۔ 'اسٹیسی پرستار کلب' سے زیادہ ان کی دلچسپی یہ بات جاننے میں تھی کہ بالغوں کے حوالے سے مشہور ڈرامے کی ہیروئن میں ایسی کیا خاص بات ہے جو ایک کمسن بچی اس کی اتنی گرویدہ ہو چکی ہے۔ سب اس سے یہی سوال کرتے تھے اور وہ ہمیشہ یہی جواب دیتی تھی کہ بس! اسے اسٹیسی پسند ہے لیکن کیوں... وہ یہ بات نہیں جانتی۔

بہت جلد یہ بات ٹیکساس کے اخبارات سے نکل کر ٹی وی چینلز اور ریڈیو تک پہنچ گئی۔ سب کے لیے یہ حیرت انگیز خبر تھی کہ آٹھ سال کی بچی بالغوں کے ایک سوپ ڈرامے کی ہیروئن سے اتنا متاثر ہے۔ بہت جلد ٹیکساس ہی نہیں، اردگرد کی کئی ریاستوں میں بھی اس بات کا چرچا ہونے لگا۔ ڈیزی پر کئی فیچر شائع ہوئے۔ مختلف ٹی وی چینلز نے اس پر مختصر دستاویزی فلمیں نشر کیں، انٹرنیٹ پر اس کے حوالے سے لکھا جانے لگا، ریڈیو کے کئی ٹاک شوز میں اس نے شرکت کی لیکن کہیں بھی اس نے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ جس کی پرستار ہے، اُسے اس نے اپنی ماں کو گولیاں مار کر ہلاک کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

کلب کے قیام کو تین ماہ گزر چکے تھے جب اسے اسٹیسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط ملا۔ ڈیزی کے قائم کیے گئے کلب کا چرچا لاس اینجلس تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے شائع ہونے والے اخبارات کے ذریعے ہی اسٹیسی کو اس بات کا علم ہوا۔ اس نے اپنے خط میں ڈیزی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

''دنیا بھر میں میرے پرستار صرف بالغ افراد ہیں اور انہوں نے ہی میرے نام پر کلب قائم کیے ہیں۔ میرے لیے یہ بات غیر اہم ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پہلی بار ایک کمسن بچی نے میرے نام پر پرستار کلب قائم کیا ہے۔



جس کا مطلب ہے کہ میرے فن کو سمجھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ میں تمہاری بہت مشکور ہوں، میری ننھی پری۔''

اسٹیسی نے خط کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی دستخط کر کے اسے بھیجی تھی۔ جس میں وہ مسکراتی ہوئی فتح کا نشان بنا رہی تھی۔

اسٹیسی ہو یا ہیلن یا پھر میڈیا، کوئی یہ بات نہیں جان سکا تھا کہ اسکول میں پڑھنے والی ایک بچی کے لیے اسٹیسی میں ایسی کون سی کشش موجود ہے جو وہ اس کی اتنی گرویدہ ہو چکی ہے۔ سب اس خیال کی اپنے اپنے طور پر تشریح کرتے رہے لیکن اصل حقیقت صرف وہ خود جانتی تھی لیکن وہ اس بات کو اپنے دل میں ایک راز کی طرح دفن کر چکی تھی اور لوگوں کے لاکھ پوچھنے کے باوجود وہ کبھی حقیقت کو اپنی زبان پر نہ لائی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اس کی ماں کا قتل کیس۔ کئی برس کی تفتیش کے باوجود پولیس قاتل ..... کے بارے میں کوئی سراغ نہ لگا سکی لیکن اس کے باوجود کیس داخلِ دفتر نہیں کیا گیا۔ یہ اور بات کہ اب تفتیش میں کسی کی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی .... حتیٰ کہ اب تو ہیلن نے بھی اس بات کو بھلا دیا تھا۔ دو سال سے زیادہ ہونے کو آئے تھے لیکن ہیلن نے ایک بار بھی لاس اینجلس پولیس کو فون کر کے تفتیش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس بات پر شاکر و صابر تھی کہ ڈیزی زندگی کی رونقوں کی طرف واپس لوٹ آئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ڈیزی کے ذہن نے ماں سے جدائی کے صدمے کو بھلا دیا ہے۔ بے چاری یہ بات نہیں جانتی تھی کہ ہر رات سونے سے پہلے، بستر پر لیٹ کر وہ 'گڈ نائٹ مون' کتاب سینے پر رکھ کر پڑھتی نہیں تھی بلکہ اپنی ماں کو یاد کیا کرتی تھی۔ وہ ہر رات کتاب کے اس صفحے کو کھول کر اپنی نظریں اس پر گڑا دیتی تھی جہاں اُس رات مما کہانی سناتے ہوئے ورق موڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی تھیں۔

☆☆☆

ڈیزی گیارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کی سالگرہ قریب آنے والی تھی۔ ایک دن جب وہ آنٹی کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی تو انہوں نے اچانک پوچھا۔ ''ہاں ڈیزی بیٹا... اس سالگرہ پر کیا تحفہ لو گی؟''

''جو مانگوں گی، وہ مجھے دو گی؟'' یہ سن کر اس نے بڑے پیار سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں...'' وہ جلدی سے بول اٹھی۔ ''آج تک ایسی کون سی بات ہے جو تم نے کہی اور میں نے پوری نہ کی ہو۔ پھر بھی تم اس طرح کی بات کر رہی ہو؟'' ہیلن نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 6,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 5,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 3589531? فیکس: 35802551



www.digestpk.com

Asifzamil

''وہ سب چھوڑو۔ یہ بتاؤ میں سالگرہ کا جو تحفہ مانگوں گی، وہ دو گی نا۔''

''ہاں دوں گی... بولو کیا چاہیے تمہیں۔'' ہیلن نے قطعی لہجے میں جواب دیا اور خاموش ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''وہ بات یہ ہے کہ...'' ڈیزی نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میں ہالی ووڈ جا کر اسٹیسی سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ اس سالگرہ پر مجھے یہ تحفہ دے دیں۔'' ہیلن ہر سالگرہ سے کئی ہفتے پہلے یہ سوال کیا کرتی تھی۔ ڈیزی کو یقین تھا کہ وہ اس بار بھی یہی پوچھیں گی، اس لیے اس نے جواب بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

''کیا...'' یہ مطالبہ سن کر تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ایک غریب عورت تھی۔ ٹیکساس سے ہالی ووڈ جانا اور پھر وہاں اسٹیسی سے ملنے تک کسی ہوٹل میں رہنا، کھانا پینا... یہ سب اس کی مالی حیثیت سے باہر تھا۔ ''یہ تو بہت مشکل تحفہ مانگ لیا ہے تم نے۔'' کافی دیر بعد اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے پتا ہے۔'' ڈیزی کا لہجہ روہانسا ہو چکا تھا۔ ''اگر ممما...''

''اچھا چپ کرو۔'' یہ سنتے ہی اس نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ کرتی ہوں۔ لے چلتی ہوں تمہیں اس سے ملوانے۔'' ہیلن کے لبوں پر یکدم ہی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''اوہ میری اچھی آنٹی...'' یہ سنتے ہی ڈیزی اٹھی اور جا کر ان کے گلے لگ گئی۔ ''تم اس دنیا میں سب سے اچھی آنٹی ہو۔''

''بس بس... اب زیادہ مکھن نہ لگاؤ۔ تمہاری سالگرہ ہو اور من پسند تحفہ نہ ملے، یہ تو نہیں ہو سکتا۔'' ہیلن نے اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پوری دنیا میں آخر ایک تم ہی تو میری ہو۔'' ہیلن نے جذباتی انداز میں کہا۔

''مجھے پتا ہے...'' ہیلن نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو اٹھو، کھانا کھاتے ہیں۔'' ہیلن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور سنو... اب کبھی اپنی ماں کو اس طرح اُداس ہو کر یاد نہ کرنا۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''اب میں تمہاری ماں ہوں اور تم میری پیاری سی گڑیا۔'' یہ سن کر ڈیزی ایک بار پھر ان کے گلے لگ گئی۔

ڈیزی کو یقین تھا کہ سالگرہ پر آنٹی اسے من پسند تحفہ ضرور دیں گی۔ جب سے انہوں نے ڈیزی کو ہالی ووڈ لے جا کر اسٹیسی سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا، تب سے وہ نہایت بے چینی سے ایک ایک دن گنتے ہوئے کاٹ رہی تھی۔ اسے اپنی سالگرہ کا نہیں بلکہ اسٹیسی سے ملنے کا انتظار تھا۔ وہ دن رات بے چینی سے پندرہ اپریل کی منتظر تھی۔ تقریباً گیارہ برس پہلے اسی تاریخ کو پہلی بار اس کی ماں نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔

ہیلن ہر بار اس کی سالگرہ گھر پر مناتی تھی، جس میں اس کے دوست احباب کے علاوہ ڈیزی کے اسکول کے کئی قریبی ساتھی بھی شرکت کرتے تھے۔ سالگرہ کا دن آنے سے کئی روز پہلے سے ہی ہیلن تیاریاں شروع کر دیتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار ایسا لگ رہا تھا..... کہ یا تو وہ سالگرہ کی تاریخ بھول گئی ہے یا پھر وہ بہت مصروف ہے جو اسے تیاریوں کا موقع ہی نہیں مل پا رہا۔ یہ بات ڈیزی نے شدت سے محسوس کی تھی۔ اپریل کی بارہ تاریخ تھی لیکن گھر پر ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے لگے کہ صرف تین دن بعد یہاں پر کوئی تقریب منعقد ہونے والی ہے۔ اس دن ڈیزی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آج رات آنٹی سے یہ بات ضرور پوچھے گی کہ کیا وہ اس بار اس کی سالگرہ منائیں گی بھی یا نہیں۔

ڈنر کرنے کے بعد ہیلن نے اپنے لیے کافی بنائی اور ایک ٹرے میں مگ اور دودھ کا گلاس رکھ کر لیونگ روم میں آ گئی۔ اس وقت ڈیزی ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو... چلو اِدھر آؤ۔'' اس نے ٹرے تپائی پر رکھ کر..... کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اگلے ہی لمحے ڈیزی نے ٹی وی بند کیا اور ان کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

''یہ دودھ لے لو۔'' ہیلن نے اسے بیٹھتے... دیکھ کر کہا۔

''ایک بات پوچھنی ہے آپ سے...'' ڈیزی نے دودھ کا گلاس اٹھاتے ہوئے روٹھے لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے۔ تم آج بہت اداس لگ رہی ہو؟'' ہیلن نے سوال کیا۔

''میں آپ سے ناراض ہوں۔''

''کیوں بھئی، کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' ہیلن نے یہ سن کر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آج تاریخ کیا ہے؟'' ڈیزی نے سوال کیا۔

''بارہ اپریل۔'' ہیلن نے سادگی سے جواب دیا۔

''اور میری سالگرہ کب ہوتی ہے؟''

''پندرہ اپریل کو۔''

''تو پھر اس بار آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی کیا؟'' یہ کہتے ہوئے ڈیزی کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔

''نہیں...'' ڈیزی کی بات سن کر ہیلن نے ترت جواب دیا۔



''کیا مطلب...'' اس کے لہجے سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔

''مطلب یہ کہ اس بار میں تمہاری سالگرہ اس گھر میں نہیں مناؤں گی۔''

''تو پھر کہاں منائیں گی؟'' ڈیزی نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس بار میں تمہاری سالگرہ بہت زیادہ دھوم دھام سے، گھر سے باہر کسی اور جگہ پر مناؤں گی اور وہ تحفہ بھی دوں گی جس کا تم سے وعدہ کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ہیلن کے لہجے سے ممتا چھلک رہی تھی۔

''کہاں منائیں گی؟'' یہ سنتے ہی ڈیزی کی ساری خفگی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آنٹی کہاں پر اس کی سالگرہ منانے والی ہیں۔

''تمہاری سالگرہ کے بیچ ابھی کتنے دن باقی ہیں؟'' ہیلن نے سالگرہ کا مقام بتانے کے بجائے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

''دو دن۔'' ڈیزی نے جھٹ سے جواب دیا۔

''تم ان دو دنوں تک اس بات پر غور کرو۔ بوجھ لیا تو تم جیتیں ورنہ سرپرائز۔'' ہیلن کے لہجے سے شرارت جھلک رہی تھی۔

''آپ بھی نا.....'' ڈیزی نے روٹھے لہجے میں کہا۔

''یہ باتیں چھوڑو اور دودھ پی لو۔''

''ویسے تھوڑا سا تو بتائیں۔'' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''کہا تو ہے، بوجھ سکتی ہو تو بوجھ لو، ورنہ... سرپرائز۔'' ہیلن کے لہجے سے نہیں لگتا تھا کہ وہ پندرہ اپریل سے پہلے اسے یہ بات بتائے گی۔

''چلو شاباش... جلدی سے دودھ پی لو۔'' ہیلن نے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بدستور ڈیزی کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ سنتے ہی اس نے گلاس سے منہ لگایا اور غٹا غٹ دودھ پینے لگی۔

☆☆☆

پندرہ اپریل کو بدھ کا دن تھا۔ اُس دن اسکول میں موسمِ بہار کی تعطیل تھی۔ ڈیزی دیر تک سوتی رہی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سینے پر گلاب کے مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کا بڑا سا گلدستہ اور ایک کارڈ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ کھول کر دیکھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیزی...''

وہ مسکرا اٹھی۔ جب سے وہ یہاں رہ رہی تھی، ہر سالگرہ کے دن صبح آنکھ کھلنے پر اسے ہمیشہ اسی طرح مہکتے گلابوں اور خوبصورت برتھ ڈے کارڈ اپنے سینے پر رکھا ہوا ملتا تھا۔ ابھی وہ ان گلابوں کی مہک کو محسوس کر رہی تھی کہ ہیلن کمرے میں ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' گاتی ہوئی داخل ہوئی۔ ڈیزی بستر سے چھلانگ مار کر اٹھی اور اس کے سینے سے جا کر لگ گئی۔ ہیلن نے بھی اسے ممتا کی شفقت سے مغلوب ہو کر گلے سے چمٹا لیا۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکل آئے تھے۔ اس لمحے شدت سے اس کے دل میں خواہش جاگی کہ کاش... اس لمحے اُس کی مرحومہ بہن بھی ساتھ ہوتی۔ وہ کافی دیر تک ایک دوسرے سے گلے لگی رہیں۔

''سنو... جلدی سے تیاری کر لو۔ آج بہت کام کرنے ہیں۔'' ہیلن نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہمیں ٹیلر کے پاس چل کر تمہارا برتھ ڈے سوٹ بھی لینا ہے۔''

''واہ واہ...'' یہ سنتے ہی ڈیزی خوشی سے چلّا اٹھی۔ ''میں ابھی ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ واش روم میں گھس گئی اور ہیلن اس کے لیے ناشتا بنانے کے لیے کچن کی طرف چل دی۔

''یہ تو بالکل پریوں جیسا سوٹ ہے۔'' دوپہر کے قریب جب وہ ٹیلر کے پاس پہنچے تو اس نے سوٹ اسے پہنا کر فٹنگ کا جائزہ لیا۔ ڈیزی نے خود کو سامنے لگے قد آدم آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو آپ نے مجھے بتائی ہی نہیں تھی۔'' اس نے ہیلن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج کے اس خاص دن کا پہلا سرپرائز۔'' ہیلن نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا...'' ڈیزی نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔ ''پہلا سرپرائز؟''

''جی ہاں... آج تمہیں کئی سرپرائز ملیں گے۔'' ہیلن کے لہجے سے شرارت جھلک رہی تھی۔

''واقعی...'' ڈیزی بدستور حیرت میں تھی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ یہ خاص سالگرہ ہے۔''

''اب تو لگ رہا ہے۔'' ڈیزی نے کہا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ تھی کہ وہ آنٹی کے متعلق نہ جانے کیا کچھ سوچتی رہی تھی۔

شام کے چار بجے تھے جب ہیلن نے اسے ساتھ لیا اور کار میں آ بیٹھی۔ ڈیزی بہت متجسس تھی کہ آخر وہ کہاں جا رہے ہیں لیکن وہ کچھ بتانے پر تیار نہیں تھی۔ ''اب تو بتا دیں، آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار



www.digestpk.com

Asifzamil

پھر پوچھا لیکن اس بار بھی وہ صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

ڈیزی نے اس وقت وہ سوٹ پہنا ہوا تھا جو ہیلن نے اس کی سالگرہ پارٹی کے لیے خصوصی طور پر تیار کروایا تھا۔ ٹیکساس کاؤ بوائے ریاست کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس وقت وہ اس ڈیزائن کے روایتی لباس میں ملبوس تھی جنہیں کاؤ بوائے دور کے خوش حال طبقے کی عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ آدھا گھنٹے بعد ان کی کار اسٹاک یارڈ ہوٹل کے مرکزی دروازے کے سامنے جا کر رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی کاؤ بوائے لباس میں ملبوس دو بچے دائیں اور بائیں دروازے کی طرف لپکے۔ جیسے ہی ڈیزی گاڑی سے باہر آئی اسے ٹیکساس کے روایتی لباس میں ملبوس درجن بھر بچے بچیوں نے گھیر لیا۔ یہ سب اسکول کے دوست تھے۔ انہوں نے اس کا ایسا شاندار استقبال کیا جیسے وہ اس ریاست کی شہزادی ہو۔ ڈیزی یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہو رہی تھی اور خوش بھی۔ اسے یقین آ گیا کہ آنٹی واقعی اسے ماں کی طرح چاہتی ہیں۔

بچوں کا ہجوم اسے ساتھ لے کر ہوٹل کے بونی پارکر ہال میں پہنچا۔ یہ ہال ٹیکساس کے سب سے مشہور بینک ڈکیتی کرنے والے کاؤ بوائے کے نام پر تھا، جو اب ریاست کی تاریخ کا ایک مشہور کردار بن چکا ہے۔ ہال نہایت خوبصورت انداز میں سجایا گیا تھا۔ یہاں مہمان بچوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ وہ کھٹا کھٹ ڈیزی اور اس کے دوستوں کی تصاویر اتار رہے تھے۔ تقریب شروع کرنے سے قبل مہمانوں کی تواضع کے لیے نہایت عمدہ انتظام کیا گیا تھا۔ ڈیزی نے اب تک جتنی سالگرہ منائی تھی، یہ ان سب میں منفرد اور یادگار تھی۔ وہ تتلی کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔ آج واقعی اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

''میں آپ کی توجہ چاہتی ہوں۔'' کچھ دیر بعد ہال میں ہیلن کی آواز گونجی۔ سب بچے اور بڑے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''تھوڑی دیر بعد سالگرہ کا کیک پہنچنے والا ہے اور ڈیزی کا تحفہ بھی۔ میری درخواست ہے کہ ہم سب دروازے کے قریب جمع ہو جائیں.... بہت بہت شکریہ۔''

ڈیزی بہت حیران تھی کہ آنٹی نے چھپانے کس طرح کا کیک اور تحفے کا انتظام کیا ہے جو وہ سب کو متوجہ کرنے کے لیے یہ اعلان کر رہی ہیں حالانکہ انہوں نے تو اسٹیسی سے ملاقات کا تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

کچھ دیر بعد کاؤ بوائے لباس میں ملبوس دو کم عمر لڑکے ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پستول نکالی اور ہوا میں دو فائر کیے۔ ہلکی سے ڈز کی آواز آئی اور کمرے میں رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی کترنیں اُڑنے لگیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے مہمانوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جا رہی ہیں۔ جیسے ہی یہ ہنگامہ ذرا سا تھما، وہ دونوں لڑکے ہال کے داخلی دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور پھر ہیلن کی آواز گونجی۔

''ڈیزی! دروازے کی طرف دیکھو، تمہارا تحفہ اور آج کے خاص دن کا سب سے بڑا سرپرائز۔''

یہ سن کر ڈیزی نے دروازے کی سمت نظر کی اور پھر حیران رہ گئی۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ اسٹیسی دونوں ہاتھوں میں تین منزلہ بڑا سا چاکلیٹ کیک اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں ملیں۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی، خواب نہیں حقیقت تھا۔ ڈیزی نے اس کی سالگرہ کا کیک درمیان میں موجود بڑی سی میز پر رکھا اور پھر دونوں بانہیں پھیلائے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ وہ دم بخود تھی۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسٹیسی نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ ''میری ننھی پری۔'' اسٹیسی نے اسے گلے سے لگائے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔ فوٹو گرافر دھڑا دھڑ ان دونوں کی تصویریں اتار رہے تھے۔

''کیسی رہی سالگرہ؟'' ہیلن نے ڈیزی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بہت یادگار۔'' اس کے بجائے اسٹیسی نے جواب دیا۔ ''آج تو مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی بچی کی سالگرہ منا رہی ہوں۔'' تقریب ختم ہو چکی تھی اور اس وقت وہ تینوں ہوٹل کے کمرا نمبر 305 میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔

''آپ نے یہ سب کچھ کیسے ارینج کیا؟'' ڈیزی نے ہیلن کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اگرچہ وہ تقریب کا اہتمام دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی لیکن حیرت زدہ تھی کہ اسٹیسی یہاں کیسے پہنچی۔

''یہ میں بتاتی ہوں۔'' یہ سنتے ہی اسٹیسی نے کہا۔ ''تقریباً دو ہفتے پہلے میں نے تمہیں فون کیا۔ اس وقت تک تم سو چکی تھیں۔ باتوں باتوں میں ہیلن کے منہ سے نکل گیا کہ اس کی سالگرہ آنے والی ہے اور وہ ضد کر رہی ہے کہ تحفے کے طور میں تم سے اس کی ملاقات کرا دوں۔ بس یہ سنتے ہی مجھے فوراً ایک آئیڈیا سوجھا اور میں نے تمہاری آنٹی کو بڑی مشکل سے اس بات پر رضامند کیا۔ یوں آج کی تقریب ہوئی اور تحفہ خود چل کر تمہارے پاس پہنچ گیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے برابر بیٹھی ڈیزی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔



ماں کی موت کے بعد آج اس نے پہلی بار اسٹیسی کو اپنے سامنے دیکھا تھا۔ وہ ان ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر رہی تھی، جس نے اس کی مما پر گولی چلا کر اس کی زندگی چھین لی تھی۔ بظاہر ڈیزی نہایت پُرسکون نظر آ رہی تھی لیکن اس کے دل میں لاوا اُبل رہا تھا۔ ایسا لاوا جو جوالا مکھی بن کر پھوٹنے کے لیے بے قرار تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ ابھی وہ وقت خاصا دور تھا۔

اسٹیسی دوپہر کی فلائٹ سے ٹیکساس پہنچی تھی۔ تقریب کا تمام اہتمام اس کی ہدایات پر ہوٹل انتظامیہ نے کیا تھا۔ تینوں نے اکٹھے ڈنر کیا۔ اس کے بعد وہ اسٹیسی کو ائرپورٹ چھوڑنے کے لیے چل دیے۔

☆☆☆

ڈیزی کا قد کاٹھ بھی بہت اچھا تھا اور جسمانی صحت بھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی، اس کا رجحان ان کھیلوں کی طرف ہو رہا تھا جس میں جسمانی چستی اور پھرتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیراکی، میراتھن ریس، سائیکل سواری... غرضیکہ ڈیزی اس طرح کے ہر کھیل میں بھرپور حصہ لیتی تھی لیکن اس کا سب سے پسندیدہ شوق نشانے بازی تھا۔ بہت جلد اس نے نشانے بازی کے کھیل میں مہارت حاصل کر لی اور ٹیکساس انٹر اسکول مقابلوں میں اس نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اس یادگار سالگرہ کے بعد اس نے ہر سالگرہ اپنے گھر میں منائی۔ ہیلن اب بھی اس کا چھوٹی بچی کی طرح خیال رکھا کرتی تھی۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب اس کی پندرھویں سالگرہ کے دن قریب آنے لگے۔

موسم بہار کے ابتدائی دن تھے۔ اس کی سالگرہ قریب تھی جب حسب معمول اس بار بھی ہیلن نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا تحفہ لے گی۔ یہ سن کر اس نے جو کچھ کہا، وہ اس کی توقع کے برعکس تھا۔

''کچھ نہیں۔'' ڈیزی نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیوں... کیا بات ہے؟'' ہیلن نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بار سالگرہ نہایت سادگی سے منانی چاہیے۔ بس ہم دونوں اُس شام خاموشی سے کیک کاٹ لیں گے۔''

''لیکن کیوں؟'' ہیلن نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

''اسٹیسی سے پہلی ملاقات کو پانچ سال ہونے والے ہیں۔'' ڈیزی نے کہنا شروع کیا۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ اس بار ہم سالگرہ نہ منائیں بلکہ ان پیسوں کو جمع کر لیں۔ کچھ پیسے میں نے اپنے جیب خرچ سے بچائے ہیں، کیوں نہ اس بار ہم اسٹیسی کی سالگرہ میں شرکت کریں۔''

''ارے واہ! یہ تو بہت عمدہ خیال ہے۔'' ہیلن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسٹیسی کی سالگرہ میں شرکت کے لیے ضروری تو نہیں کہ تمہاری سالگرہ قربان کر دی جائے؟'' ہیلن نے ڈیزی کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ ''جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ تم اپنی سالگرہ کی تیاریوں کے بارے میں سوچو۔'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے کب ہوتی ہے اس کی سالگرہ؟''

''گیارہ جون کو۔'' ڈیزی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے... ہم اس تقریب میں ضرور شرکت کریں گے۔'' ہیلن نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ان کی رضامندی جان کر ڈیزی مسکرا دی۔

اسٹیسی اور ڈیزی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کئی سال گزر جانے کے باوجود بدستور جاری تھا۔ ان دونوں کے تعلقات خاصے ذاتی نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ اس کا ٹی وی ڈراما کئی مہینے پہلے بند ہو گیا تھا۔ اسٹیسی اب فلموں میں بھی کام کرنے لگی تھی۔ اس نے پچھلے سال آسکر ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ ڈیزی چاہتی تھی کہ وہ اس کی سالگرہ میں بنا بتائے پہنچ کر اسے سرپرائز دے۔ اس نے یہ بات آنٹی کو بھی بتا دی تھی۔ وہ بھی اس بات پر متفق تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ڈیزی کو اپنے سامنے پا کر اسٹیسی بہت حیران ہو گی۔ یہی حیرانی ڈیزی کی طرف سے اس کی سالگرہ کا تحفہ ہو گی۔

جون کا مہینا شروع ہو چکا تھا۔ ڈیزی نے ہالی ووڈ جانے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اس بار سالگرہ تو اسٹیسی کی ہو گی مگر تحفہ اُسے ملے گا۔ اس نے دل ہی دل میں ساری منصوبہ بندی کر لی تھی۔ وہ اب بڑی ہو چکی تھی۔ پولیس ریکارڈ میں اس کی ماں کیرولین کا کیس داخلِ دفتر کیا جا چکا تھا لیکن نو سال پہلے ہونے والے قتل کا فیصلہ اس نے از خود کر لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی قاتلہ کو بالکل اسی انداز میں گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی تھی، جیسے اس نے اس کی ماں کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے ایک پستول بھی حاصل کر لیا تھا۔ ویسے بھی ٹیکساس میں اسلحہ لائسنس کی پابندی نہیں ہے۔ اس لیے اسے بہ آسانی پستول اور گولیاں مل گئیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے پستول چھپا کر رکھ دیا تھا۔

اُن دنوں بظاہر ڈیزی نہایت پُرسکون نظر آنے لگی تھی۔ ہیلن نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بے چاری



www.digestpk.com

Asifzamil

سیدھی سادی عورت تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ بچی نئی جگہ جانے اور اپنی دوست سے ملاقات کرنے کا سوچ سوچ کر خوش رہنے لگی ہے۔ خوشی کی اصل وجہ تو صرف ڈیزی کا دل ہی جانتا تھا۔ یہ بات تو صرف وہی جانتی تھی کہ پچھلے نو سال اس نے کتنے کرب میں گزارے ہیں۔ گزشتہ نو سال کے دوران اس کی زندگی میں ایک رات بھی ایسی نہیں آئی تھی جب اس نے سونے سے پہلے، اپنے خیالوں میں ماں کی قاتلہ کو انجام تک نہیں پہنچایا ہو۔ جوں جوں اسٹیسی کی سالگرہ قریب آرہی تھی، اس کی خوشی بڑھتی جارہی تھی۔ ہیلن نے دس جون کے لیے ٹکٹ بھی بک کروالیے تھے۔

اس دن جون کی پانچ تاریخ تھی۔ ڈیزی اسکول سے گھر لوٹی تو سامنے ہی اسے آنٹی بے چینی سے ٹہلتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ خلافِ توقع تھا۔ ڈیزی کا ماتھا ٹھنکا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس تک پہنچی۔ ہیلن اسے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور اسے گلے سے لگا کر رونے لگی۔

''کیا ہوا ہے؟'' ڈیزی یہ دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ اس نے تقریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔

''کل رات اسٹیسی کا انتقال ہوگیا ہے۔''

ہیلن نے جواب دیا تو ڈیزی پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔ ''کیا؟''

''میں بیوٹی پارلر میں کام کررہی تھی، جب مجھے اسٹیسی کے سیکریٹری کا فون ملا۔ اس نے ہی مجھے اس واقعے کی اطلاع دی۔'' کافی دیر بعد لیونگ روم میں بیٹھی ہوئی ہیلن ڈیزی کو سارا ماجرا سنا رہی تھی۔ ''وہ بتا رہا تھا کہ گزشتہ سال اسے کینسر تشخیص ہوا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق علاج میں کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی مگر پھر بھی وہ دوا سے اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہفتہ بھر پہلے انہوں نے جواب دے دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب وہ صرف چند روز کی مہمان ہے۔ اسٹیسی نے اپنے سیکریٹری کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ ڈیزی اس کی تدفین میں ضرور شرکت کرے۔ وہ بتا رہا تھا کہ اسٹیسی نے کہا تھا کہ یہ اس کی آخری خواہش ہے۔''

''ہم کب جارہے ہیں؟'' یہ سن کر ڈیزی نے آہستہ سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔

''اس نے آج سہ پہر کی فلائٹ کے ٹکٹ بھجوادیے ہیں۔ کل صبح نو بجے تدفین ہوگی۔ سیکریٹری کا کہنا ہے کہ اسٹیسی کے مطابق ہم اس کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔'' ہیلن نے تفصیل سے جواب دیا۔ ''تم تیاری کرلو۔ ہم تھوڑی دیر بعد ائرپورٹ کے لیے نکلیں گے۔'' یہ کہہ کر ہیلن اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے کافی دیر بعد ڈیزی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ماں کو یاد کرتی ہوئی ان سے معافی مانگ رہی تھی کہ وہ اس کی قاتلہ کو انجام تک نہ پہنچا سکی۔

☆☆☆

تدفین سے فارغ ہوکر جب وہ واپس لوٹے تو اس وقت دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ ڈیزی اور ہیلن دونوں سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس تھے۔ ڈیزی کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ دیکھنے والے سب یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اسٹیسی کے غم میں نڈھال ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ آج پہلی بار وہ اپنی ماں کی یاد میں اس شدت سے آنسو بہا رہی تھی۔ اسے اسٹیسی کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ حسرت یہ تھی کہ وہ اس کے ہاتھوں یوں نہ مری جیسا کہ وہ چاہتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جو کام اسے بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا، اس کے کرنے میں اس نے سستی برتی اور اسٹیسی انجام سے بچ گئی... وہ انجام جس سے ڈیزی اسے ہمکنار کرنا چاہتی تھی مگر قدرت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔

سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ ڈیزی اور ہیلن نہا دھو کر آرام کررہی تھیں جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ہیلن نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے اسٹیسی کا سیکریٹری کھڑا ہوا تھا۔ ''تکلیف کی معذرت چاہتا ہوں مگر ہمیں اسی وقت چلنا ہوگا۔''

''کہاں؟''

''اسٹیسی کے وکیل نے ڈیزی کو اپنے دفتر میں بلوایا ہے۔ امید ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گی۔''

''اوکے...'' ہیلن نے جواب دیا اور اندر آکر ڈیزی کو بتانے لگیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''اس کے وکیل کا ہم سے کیا کام؟'' یہ سُن کر ڈیزی نے پریشانی سے جواب دیا۔

''یہ تو وہاں پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔'' ہیلن نے بال بناتے ہوئے جواب دیا۔ آدھا گھنٹے بعد وہ وکیل کے دفتر میں بیٹھے تھے۔

وکیل نے رسمی کلمات کے بعد ایک فائل ڈیزی کی طرف بڑھائی۔ ''اسٹیسی نے مرنے سے قبل تمہیں اپنی تمام تر جائداد کا وارث بنادیا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ تم اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں رہو، تعلیم مکمل کرو اور سکون سے اپنی زندگی بسر کرو۔''



''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' یہ سنتے ہی ڈیزی نے حیرت سے کہا۔

''یہیں سچ ہے۔'' وکیل نے ہمدردی سے کہا۔ وہ بدستور فائل ڈیزی کی طرف بڑھائے ہوئے تھا لیکن اس نے اس کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھائے تھے۔ ''یہ آپ لے لیں۔ یہ جائداد کے تمام تر کاغذات ہیں۔ وصیت بھی اسی میں ہی رکھی ہوئی ہے۔ ہاں... پرسوں رات انہوں نے تمہارے لیے ایک خط بھی دیا تھا۔ وہ بھی اس فائل میں رکھا ہوا ہے۔'' یہ سنتے ہی ڈیزی نے ہاتھ بڑھائے اور فائل لے کر بے تابی سے لفافہ نکال لیا۔ یہ سفید رنگ کا ایک عام سا لفافہ تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''میری ننھی پری کے لیے۔'' وہ اس اندازِ تحریر کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ لفافہ لے کر فوراً اٹھی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ اندر پہنچ کر اس نے کنڈی لگائی اور بے تابی سے لفافہ چاک کرکے خط نکالا۔ یہ اسٹیسی کے رائٹنگ پیڈ کا صفحہ تھا اور تحریر اس نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔

''میری اور کیرولین کی ننھی سی پری۔'' یہ پڑھتے ہی وہ چونک اٹھی۔ اسے حیرت سے جھٹکا لگا۔ وہ اب تک یہی سمجھتی تھی کہ اسٹیسی اسے نہیں پہچانتی لیکن مما کا نام پڑھ کر اسے لگا کہ اسٹیسی جانتی تھی کہ وہ کیرولین کی بیٹی ہے۔ اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

''میں اور تمہاری ماں بہت اچھی دوست تھیں۔ ہم دونوں بُرے دنوں کے ساتھی تھے۔ تمہاری ماں کے میرے اوپر کئی احسان تھے۔ اس کی کوششوں سے ہی مجھے پہلی بار 'ویمپ' میں کردار ملا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اب تک اپنی ماں کا قاتل سمجھتی ہو۔ میں تمہیں غلط نہیں کہوں گی۔ جو کچھ ہوا، اس کی بنا پر میں قانون اور تمہاری نظروں میں یقیناً قاتل ہوں مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اُس رات جو کچھ ہوا وہ تمہاری ماں کی مرضی کے عین مطابق ہوا تھا۔ میرا اس میں کوئی دوش نہیں۔ تمہاری ماں عیش و آرام کی دلدادہ تھی۔ وہ کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی عورت تھی۔ اس نے کبھی آنے والے کل کا نہیں سوچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ ایک ایسے مہلک کینسر میں مبتلا ہوچکی ہے جس کا کوئی علاج نہیں اور یہ کہ تکلیف اگلے چند ماہ میں شدت سے نمودار ہو... تو وہ بہت پریشان ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہوا تو پھر وہ فاقہ کشی اور غربت کا شکار ہوجائے گی۔ وہ درد کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں مرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی واحد دوست تھی جو سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے بڑی منت سماجت کرکے مجھے اس بات پر رضامند کیا کہ میں اسے ذلت کی موت مرنے سے بچالوں۔ وہ ایک کمزور عورت تھی۔ اپنے ہاتھوں اپنی ہی جان لینے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔ اسی لیے اس نے مجھے یہ فرض سونپا۔ کئی ہفتوں کے بعد آخر میں قائل ہو ہی گئی۔ منصوبے کے مطابق مجھے گھر میں داخل ہوکر اسے گولیاں مارنا تھیں۔ اس مقصد کے لیے پستول بھی اس نے ہی مجھے خرید کر دیا تھا۔ جس رات میں اسے قتل کرنے کے لیے گھر میں داخل ہوئی تو میں نے فوراً گولیاں نہیں چلائیں بلکہ اس سے کہا تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہوسکتا ہے اس نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا ہو مگر میری بات سن کر اس نے کہا تم مجھ پر یہ احسان کردو۔ اس کے بعد کا سارا واقعہ تم جانتی ہی ہو۔ ہاں ایک اور بات۔ ہیلن کا پتا اسی نے مجھے دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی موت کے بعد تمہیں ہیلن کے حوالے کردیا جائے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ تمہیں گود لے لوں لیکن اس رات تم کاؤچ پر لیٹی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے میں ڈر گئی اور جب پولیس نے اشتہار شائع کروایا تو میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد انہیں ہیلن کا پتا بھجوادیا۔ بعد میں، میں نے ہیلن کو بھی سارے واقعات کے بارے میں سچ سچ بتادیا تھا۔ وہ سمجھدار عورت ہے۔ میری بات سمجھ گئی۔ اسی لیے اس نے پھر کبھی پولیس سے تفتیش کے بارے میں جاننے کے لیے رابطہ نہیں کیا۔ اس وقت میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ تم مرنے والے کی بات پر اعتبار کروگی۔ میں کسی بھی طرح تمہاری ماں کی قاتل نہیں مگر پھر بھی تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اپنی ماں کا خون مجھے معاف کردینا۔

تمہاری ماں جیسی اسٹیسی۔''

ڈیزی دم بخود فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکلے۔ ''آنٹی اسٹیسی... خدا تمہاری روح کو سکون بخشے۔'' خط پڑھ کر اسے ایسا لگا جیسے اس کے سینے پر رکھا ہوا بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔

کافی دیر گزر چکی تھی۔ وہ بدستور فرش پر سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ آخر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ڈیزی لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ دروازے پر ہیلن کھڑی تھی۔ ڈیزی نے خط اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خط لے کر پڑھے بغیر اسے پُرزہ پُرزہ کردیا اور ٹکڑے فلش میں بہادیے۔ ''چلو باہر چلتے ہیں۔'' ہیلن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ڈیزی، آنٹی کا سہارا لے کر تھکے تھکے قدموں سے باہر جانے لگی۔



www.digestpk.com

Asifzamil

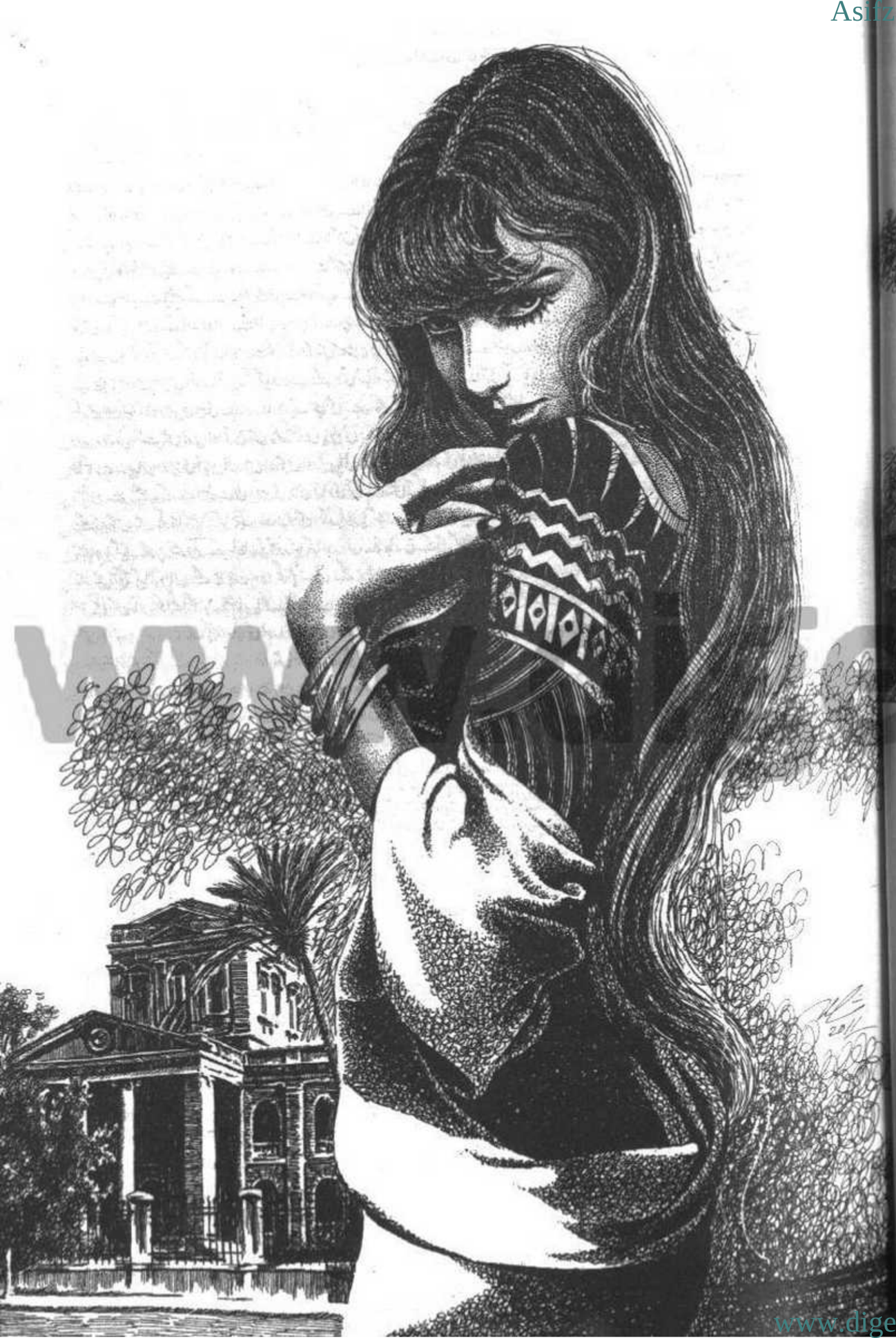

بیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کردار وں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ..... ایک للکار ہے۔

للکار

طاہر جاوید مغل

**ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے**



www.digestpk.com

Asifzamil

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ نادیہ نے عمران کی سردمہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عمران نے نادیہ کو گولی ماردی۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہلِ خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور نل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی نل پانی میں آ گئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعدازاں مجھے زرگاں میں بگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے بگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعدازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگا لیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور نمیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور بارود جیکی تک جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا گیا۔ مجھے اور جیکی کو نل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ نل پانی پہنچنے والوں میں شگفتا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شگفتا تک پہنچ گئے۔ شگفتا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شگفتا کو جیکی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات شگفتا جیکی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک روز اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میرے ہاتھ میں مشعل نما لکڑی تھمادی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل ڈالنے آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو میں ساکت رہ گیا۔ وہ عمران تھا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ گرو نے سلطانہ کی سزا تین دن کے لیے ملتوی کر دی۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم ایک سکھ سردار کی گھوڑا گاڑی میں وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ گرو سوبھاش وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہم نے تاؤ افضل کا گھر چھوڑ دیا اور جنگل میں سفر کرنے لگے۔ ہم واپس بستی میں آئے مگر ہم نے ایک مندر کے تہ خانے میں قیام کیا۔ وہاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ وہاں کافی ہندو جمع تھے۔ ہم نے ہوادان سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنونی ہندوؤں نے گرو سوبھاش کا سر کاٹ دیا تھا اور پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ گرو سوبھاش کی موت کے بعد جنونی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں لڑائی چھڑ گئی۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے لڑتا رہا۔ عمران ڈاکٹر لی وان کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا تھا۔ میں اور عمران راج بھون پہنچ گئے۔ ہم وہاں پہرے داروں کو پچھاڑ کر اندر داخل ہوئے۔ وہاں حکم جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ہم نے فائرنگ کر دی۔ ڈاکٹر اسٹیل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو بندے زخمی ہوئے۔ پھر میں عمران کو ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر میڈم صفورا کے پاس چلا گیا۔ اس کی سزا معاف ہو گئی تھی اور وہ لال بھون پہنچ گئی تھی۔ پھر عمران بھی وہاں پہنچ گیا مگر میڈم نے ہمیں دھوکا دیا اور کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے گارڈ اور اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تاہم اس دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم صفورا کی جان بچائی۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں



ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم صفورا کے پاس بھیج دیا گیا۔ ادھر اسٹیل نے مجھے بتایا کہ جارج نے سامبر کا چیلنج قبول کرلیا ہے۔ راج بھون سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ وہاں رام پرشاد کی ماں موجود تھی۔ اس نے حکم سے کہا کہ سامبر کا چیلنج ختم کر کے مجھے سزا دی جائے تاہم عمران کے دلائل نے سب کو خاموش کرا دیا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ ہمیں مارنے کے منصوبے بنائے گئے مگر وہ ناکام رہے۔ میں اور عمران بیٹھے تھے کہ باتوں باتوں میں، میں نے اسے اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ پہلے تو وہ منع کرتا رہا پھر اپنی کہانی سنانے لگا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چودھری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عمران وہاں جا کر بہت روتا ہے تاہم اسے ایک سال تک وہاں رہنا تھا۔ عمو وہاں صبح سویرے سے رات تک صفائی کرتا۔ ایک روز عمو پیر صادق شاہ کے حجرے سے دسترخوان اٹھانے گیا۔ وہاں کچھ مہمان تھے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ عمو کو نہیں پتا تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ ایک روز اس نے عمو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر اس نے عمو کو خوب مارا۔ ایک روز عمو ماجھاں کے پاس تھا کہ باہر احاطے میں ہلچل محسوس ہوئی۔ ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رکاب میں کسی شخص کا پاؤں پھنسا تھا اور وہ اس کے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی اور ماجھاں وغیرہ نے گھوڑے پر قابو پالیا۔ گھوڑے سے گر کر مرنے والا شخص وہاں کام کرنے والی لڑکی شبانہ کا باپ تھا۔ ماجھاں نے عمو کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی اور ناکامی پر عمو کو سزا کے طور پر کتوں کی کوٹھری میں بند کروادیا۔ شبانہ وہاں چوری چھپے عمو کو کھانا دینے لگی۔ عمو شبانہ سے محبت کرنے لگا اور ایک روز موقع پا کر عمو اور شبانہ نے فرار کی کوشش کی مگر وہ پکڑے گئے۔ ماجھاں نے عمو اور شبانہ پر تشدد کیا۔ اب عمو وہاں کے عام ملازموں کی طرح تھا اور اس کے پاؤں میں زنگ آلود بیڑی ڈلی رہتی تھی۔ ایک روز اچانک ماجھاں کے اسی سرکش گھوڑے نے خوب اودھم مچایا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا مگر حیران کن طور پر عمو نے گھوڑے پر قابو پالیا اور اس پر سواری بھی کی۔ وہاں ماجھاں کا مہمان راجا نامی شخص بھی موجود تھا۔ اس نے عمو کو گھوڑے کو قابو کرتے دیکھا تو اسے بہت حیرت ہوئی اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ عمو میں قدرتی صلاحیت موجود ہے اور جانور اس سے جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔ راجا اور عمو کی دوستی ہو گئی پھر راجا نے عمو اور شبانہ کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور وہ لوگ بھاگ نکلے۔ راستے میں ماجھاں سے ٹکراؤ ہو گیا مگر اس ٹکراؤ میں ماجھاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ماجھاں کی موت کے بعد وہ لوگ شاد پورہ میں روپوش ہو گئے اور 45 سالہ کبیر احمد کے گھر رہنے لگے۔ کبیر احمد کا بہت بڑا باغ تھا۔ وہ جانوروں کو بھی سدھاتے۔ سدھانے کا کام عمو کے ذمے ہی تھا۔ نام راجا کا ہوتا اور پیسے بھی وہی لیتا۔ عمو کی والدہ اچانک اپنے گاؤں سے غائب ہو گئی تھی۔ عمو اپنی ماں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر راجا نے کہا کہ ان کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ ایک روز راجا بنگال ٹائیگر لے کر آ گیا اور عمو کو مجبور کیا کہ وہ اسے سدھانے میں مدد دے۔ حیران کن طور پر عمو نے یہ کام بھی کر لیا۔ بنگال ٹائیگر سرکس کے مالک جان محمد کا تھا۔ ایک روز ٹائیگر بپھر گیا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا۔ راجا عمو کو اپنے ساتھ لے گیا اور عمو نے ٹائیگر کو رام کر لیا۔ اس طرح راجا کی اصلیت کھل گئی۔ جان محمد نے عمو کو اصل حقیقت بتا دی اور کہا کہ راجا عمو کو دھوکا دے رہا تھا۔ اس طرح عمو راجا کو چھوڑ کر جان محمد کے پاس آ گیا اور ان کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ عمو رات کو سونے کے لیے لیٹا تو اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک ایک آواز نے اسے چونکایا۔ وہ اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں سے آواز آئی تھی۔ عمو نے دیکھا کہ کمرے میں صادق شاہ موجود ہے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس شخص سے اتنی جلدی مل پائے گا۔ اس کے اندر وہی سفاک تدبر سر اٹھانے لگی جو ماجھاں کی موت کے وقت اس کے ذہن میں نمودار ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کمرے کے اندر صادق اور نیلم میں گفتگو جاری تھی۔ صادق نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ کل ظفر پھر یہاں آرہا ہے۔ جب تم دونوں میں طلاق مکمل ہو چکی ہے تو پھر وہ یہاں کیا لینے آتا ہے؟ اس کا کیا کام ہے یہاں؟“

”مجھے تو یہ خود اچھا نہیں لگتا شاہ جی۔“ نیلم کے چہرے پر نفرت نظر آئی۔

”تم خود جان صاحب سے کہو کہ وہ یہاں نظر نہ آیا کرے۔ تمہیں یاد ہے کہ پچھلی دفعہ جب یہاں آیا تھا تو میرے ساتھ کتنی بدتمیزی سے بولا تھا وہ؟ اس خبیث کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اسے تم سے دور کرنے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ یہ اس کے کرتوت ہیں جنہوں نے اسے ذلیل کیا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں... یہ تمہاری ہمت ہے کہ تم اس جیسے گندے بندے کے ساتھ دو تین سال گزار گئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے دنوں وہ کسی تھیٹر کے گانے والے کے ہاتھوں بھی ذلیل و خوار ہوا ہے۔“

”ہاں جی، اس گوئیے کے ساتھ مل کر وہ کوئی نیا تھیٹر بنا رہا تھا۔ وہ بندہ اس سے بھی بڑا فریبی نکلا۔ اس کا پانچ چھ لاکھ روپیا کھا گیا۔ اب اس کا ہاتھ کافی تنگ ہے۔ اسی لیے یہاں کے چکر لگا رہا ہے اور بچا سے جھگڑ رہا ہے۔“

عمران یعنی عمو کھڑکی میں سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس بندے کا نام ظفر لیا جا رہا ہے، یہ وہی ہے جس سے نیلم کی طلاق ہوئی ہے۔

”اب کیا جھگڑا ہے؟“ صادق شاہ نے نیلم سے پوچھا۔

”جھگڑا تو کوئی خاص نہیں ہے جی۔ بس وہ خوامخواہ اس کو بڑھا رہا ہے۔ جہیز کا سامان ہم نے واپس لینا ہے اور شادی کے موقع پر جو زیور وغیرہ ان لوگوں نے مجھے پہنایا تھا، وہ ہم نے واپس دینا ہے۔ وہ زیور کو بڑھا چڑھا کر بتا رہا



www.digestpk.com

Asifzamil

ہے...''

صادق شاہ نے اپنے تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کی لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ خبیث تمہیں ملنے اور پھر سے اپنے جال میں پھنسانے کے ارادے سے یہاں آتا ہے، حالانکہ اس گدھے کو پتا ہونا چاہیے کہ طلاق مکمل ہو چکی ہے اور اب اس کا تمہاری طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے جی کہ وہ مجھ سے بات وغیرہ کرنا چاہتا ہے لیکن اب مجھے تو اس کی صورت سے ہی ڈر لگنے لگا ہے۔''

صادق شاہ نے اپنی ٹانگیں پساریں اور نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کی پائنتی بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''اور مجھے تو وہ دوسرا لڑکا راجا بھی ایک دم فراڈیا لگتا ہے۔ وہ تمہیں بس شادی کا جھانسا دے رہا ہے۔ بُری عورتوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہاری دوسری شادی تمہاری برادری ہی کے کسی لڑکے سے ہوگی اور بڑی جلدی ہوگی۔''

نیلم اور زور زور سے اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل فکر نہیں کرنا۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ فقیروں کی دعا ہے تیرے ساتھ۔ بس اپنے چچا سے کہو کہ اس ظفر سے فوراً جان چھڑا لیں۔''

کچھ دیر بعد نیلم نے صادق شاہ کو ادب سے سلام کیا اور اجازت لے کر کمرے سے چلی گئی۔ وہ بھینسے کا بھینسا کچھ دیر تک بستر پر پڑا اپنی ٹانگیں کھجاتا رہا پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ عمو کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلے روز عمو نے نیلم کے سابقہ شوہر کو دیکھا۔ اس وقت عمو گھر کے وسیع صحن میں جان محمد صاحب کے ساتھ سرکس کے بے زبان فن کاروں یعنی جانوروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختلف جانوروں ریچھ، بندر، بارہ سنگھے وغیرہ کے پنجرے ایک قطار میں رکھے تھے۔ جان محمد صاحب کا سلوک اپنے ملازموں کے ساتھ ساتھ اپنے جانوروں سے بھی بہت اچھا تھا۔ وہ ان کی بہترین نگہداشت کے قائل تھے۔ مکمل تربیت سے پہلے ان کے سرکس کے جانور اسی جگہ رہتے تھے اور بہترین مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس وقت بھی جان محمد صاحب ایک نیم تربیت یافتہ بندر کو اپنے ہاتھ سے ڈبل روٹی مکھن کھلا رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور نیلم کا سابقہ شوہر ظفر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے کلف دار کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس کی پھولی ہوئی ناک سے اس کی کرخت طبع کا اندازہ ہوتا تھا۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص خوشاب شہر میں ایک پیٹرول پمپ چلاتا ہے۔ تاہم شکل سے وہ کاروباری شخص کے بجائے ایک اجڈ زمیندار نظر آتا تھا۔

اس کے ساتھ ایک ملازم نما شخص بھی تھا۔ جان صاحب سے بے دلی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد ظفر ان کے ساتھ بیٹھک میں چلا گیا۔

پانچ دس منٹ کے بعد بیٹھک کے اندر سے تیز لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں... جان محمد صاحب اور ظفر کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ غالباً وہی زیورات والا معاملہ تھا۔ کبھی جان صاحب کی آواز بلند ہو جاتی تھی، کبھی ظفر کی۔ ظفر کی بوجھل آواز میں کبھی کبھی شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ بھی آ جاتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں دیکھتے ہی بندے کے ذہن میں ناپسندیدگی کی لہر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو میں ایک دو بار صادق شاہ کا نام بھی آیا۔ شاید صادق شاہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ ظفر نامی شخص اپنی اور نیلم کی طلاق میں صادق شاہ کو قصوروار سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صادق شاہ نے نیلم کو الٹے سیدھے تعویذ پلائے ہیں... جب یہ بحث چل رہی تھی، صادق شاہ مہمان خانے میں سویا ہوا تھا۔ اس نے بھنگ پی رکھی تھی۔ امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی جاگے گا۔

عمو (عمران) کل رات سے بہت محتاط تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ صادق شاہ کی نظروں میں نہ آ جائے۔ کل جان محمد صاحب نے جس طرح عمو کا تعارف اپنے پارٹنر حاجی احمد اشفاق سے کروایا تھا، اسی طرح صادق شاہ سے بھی کرا سکتے تھے۔ بہرحال خیریت ہی گزری۔ ایک تو صادق شاہ سہ پہر سے پہلے جاگا ہی نہیں۔ دوسرے جاگتے ساتھ ہی وہ مصروف ہو گیا۔ گاؤں کا چودھری اور دو تین دیگر معزز افراد اس سے ملنے چلے آئے۔ وہ اس کے لیے نذرانے وغیرہ بھی لائے تھے جن میں دیسی گھی، سوہن حلوہ اور گرم چادریں وغیرہ شامل تھیں... یہ محفل رات تک چلتی رہی۔ نیلم کا سابقہ شوہر ظفر بھی ابھی تک حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے کل صبح جان محمد صاحب سے حتمی بات کرنی تھی اور زیورات والا معاملہ طے کر کے واپس جانا تھا۔ عمو نے محسوس کیا تھا کہ صادق شاہ اور ظفر ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے۔

عمو کے ذہن میں جس منصوبے نے پرورش پائی تھی، اس کے لیے حالات مزید سازگار ہو گئے تھے۔ شام کو عمو نے شبانہ کے ہاتھ کے تلے ہوئے بینگن پکوڑے کھائے اور دیر



تک اس سے باتیں کیں۔ جان محمد صاحب کی خوش خلق بیوی صدیقہ بی بی بھی وہیں موجود تھی۔ عمو اور شبانہ اسے خالہ کہنے لگے تھے۔ وہ بھی ان دونوں کا اپنے بچوں ہی کی طرح خیال رکھنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے ان دونوں کے لیے ملاقات کا موقع فراہم کر دیتی تھی۔

رات گہری ہوئی تو عمو کے سینے میں سلگتے ہوئے انگارے آگ کا روپ دھارنے لگے۔ وہ صادق شاہ کو یادگار سبق سکھانا چاہتا تھا۔ وہ بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ آخر اسے اندازہ ہوا کہ جان محمد کے اس حویلی نما گھر میں سب لوگ سو چکے ہیں۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا اور محتاط قدموں سے جانوروں کے پنجروں تک پہنچ گیا۔ جانوروں کو سردی سے بچانے کے لیے پنجروں پر ترپالیں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ رائل بنگلہ ٹائیگر کے پنجرے پر بھی ترپال تھی۔

بنگلہ ٹائیگر یوں تو تربیت پا چکا تھا اور جان محمد نے اس کی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی راجا کو ادائیگی کی تھی، تاہم بعد میں صورتِ حال بدل گئی تھی۔ اپنے مزاج کے کسی اندرونی اشتعال کی وجہ سے بنگلہ ٹائیگر نہ صرف بپھر گیا تھا بلکہ اس نے ایک ملازم کا پیٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اب عمو یہاں موجود تھا اور اسے اندازہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اسے ٹائیگر کے ساتھ مزید محنت کرنا پڑے گی۔

عمو نے ٹائیگر کے پنجرے کی ترپال اوپر اٹھائی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور تیزی سے دُم ہلانے لگا۔ عمو کو پہچاننے کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ٹائیگر کے پنجرے کے دروازے کو یوں کھولنے کی ہمت یہاں عمو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا... بلکہ عام ملازم تو اس کے پنجرے کے پاس بھی نہیں جاتے تھے۔ عمو نے دروازہ کھولا۔ ٹائیگر تیزی سے باہر آیا۔ یوں لگا جیسے وہ حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ دوستانہ جھپٹ تھی۔ عمو نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کی پشت سہلا سہلا کر اسے پچکارنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کے جادو نے کام کر دکھایا۔ ٹائیگر کا پارے کی طرح مچلتا ہوا جسم پُرسکون ہونے لگا۔ عمو نے اسے پوری طرح اپنے نکاوے میں لیا پھر اسے اس کے کالر سے پکڑ کر دھیرے دھیرے اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں صادق شاہ سو رہا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ جس وقت عمو ٹائیگر کے ساتھ صادق شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے پاؤں میں اپنی جوتی نہیں تھی۔ یہ ظفر کی جوتی تھی جو اس نے اس کے کمرے کے سامنے سے اٹھائی تھی۔ یہ براؤن رنگ کی گرگابی عمو کے پاؤں میں ذرا سی کھلی تھی تاہم کام چل رہا تھا۔

عمو بڑی احتیاط سے تقریباً چار سو دس پونڈ وزنی اس ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے تک لایا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازہ بند ہے لیکن اسے اندر سے کنڈی نہیں چڑھائی گئی۔ عمو نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ ٹائیگر کے جسم میں ایک بار پھر ہلکا سا اضطراب پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی دھاری دار دُم کو تیزی سے حرکت دے رہا تھا اور گردن معمول سے لمبی نظر آ رہی تھی۔ عمو نے اسے کمرے میں دھکیلا اور دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹا۔ ظفر کی جوتی اس کے کمرے کے سامنے اتاری اور پھر بڑی احتیاط سے گھاس والی جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ بہت جلد یہاں قیامت کا شور بلند ہونے والا ہے۔ اسے پتا تھا کہ ٹائیگر کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر صادق شاہ زبردست واویلا کرے گا۔ اس کا یہ واویلا اور اضطراب ہی اس کی بدقسمتی کا سبب بننے والا تھا۔ ٹائیگر کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔

...اور پھر یہی کچھ ہوا۔ صادق شاہ کے کمرے سے تھلکہ خیز آوازیں بلند ہوئیں۔ صادق شاہ دہشت ناک انداز میں چلا رہا تھا اور کمرے کے بند دروازے کو دھڑا دھڑ کوٹ رہا تھا۔

''بچاؤ... بچاؤ... دروازہ کھولو۔'' صادق شاہ کی کرب ناک آواز اتنی زوردار تھی کہ بند کمرے سے بلند ہونے کے باوجود پوری حویلی میں پھیل رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جان صاحب کے ایک ملازم نے چلا کر کہا۔ ''مالک... ٹائیگر پنجرے میں نہیں ہے... مالک۔''

عمو نے دروازے کی جھری سے دیکھا۔ جان محمد صاحب ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں ٹارچ لیے بھاگتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ فوری طور پر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے بس صادق کی دہشت زدہ پکار سنی۔ ''بچاؤ... بچاؤ... دروازہ کھولو۔''

جان صاحب بے ساختہ صادق کے کمرے کی طرف لپکے۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر ان پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ٹائیگر بھی کمرے کے اندر ہے۔ ٹائیگر کی گرجدار خیز آواز کو پہچاننا ان کے لیے ہرگز مشکل نہیں تھا۔

چند لمحوں کے لیے جان صاحب حواس باختہ نظر آئے۔ تب وہ پیچھے ہٹے اور انہوں نے عمران کو پکارنا شروع کیا۔



www.digestpk.com

Asifzamil

''عمو... عمو!''

عمران کمرے کے اندر بے حس بنا کھڑا رہا۔ یہ وہی سفاک بے حسی تھی جو اس پر ماجھاں کی موت کے وقت طاری ہوئی تھی۔ اس بے حسی کا تعلق یقیناً ان بے رحم حالات سے تھا جن سے وہ گزرا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تو کتابوں، پھولوں اور موسموں سے پیار کرنے والا لڑکا تھا۔ اسے وہ سب کچھ اچھا لگتا تھا جو اس کی من موہنی ماں کو اچھا لگتا تھا اور وہ سب کچھ بُرا لگتا تھا جو اس کی ماں کے نزدیک بُرا تھا۔ اس کی خوب صورت دنیا اس کی ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اب ظالم لوگوں نے اس سے اس کی ماں چھین لی تھی۔ اس طویل جدائی نے عمران کے دل میں جو زہر بھرا تھا، اس کا تریاق ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ حویلی میں برپا ہونے والا شورِ محشر سن رہا تھا مگر بہرا بنا کمرے کی تاریکی میں کھڑا تھا۔ اب کئی ملازم صحن میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ تب عمران نے دیکھا کہ جان صاحب بھاگتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ اب وہ مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی چپل پہنی اور خود ہی کمرے سے نکل آیا۔

جان صاحب اسے دیکھ کر چلائے۔ ''عمو! ٹائیگر... پیر جی کے کمرے میں گھس گیا ہے۔'' دکھ اور دہشت کی شدت سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

عمران ان کے ساتھ لپکتا ہوا صادق شاہ کے کمرے تک پہنچا۔ صادق شاہ کی زخمی آواز مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غالباً مشتعل درندے کے سامنے اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

عمران نے اپنے ہاتھ بند دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھائے تو جان صاحب کے دو ملازموں نے رائفلیں سونت لیں۔ عمران نے دروازہ کھولا۔ ٹارچوں کی روشنی کمرے میں گئی۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ صادق شاہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم خونچکاں تھا۔ مشتعل درندے نے پلٹ کر عمران کی طرف دیکھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دکھائی دیں۔ اس کے منہ پر تازہ خون کے نشان تھے۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ عمران پر بھی جھپٹ پڑے گا...

عمران کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ پکارا۔ ''ٹائیگر... ٹائیگر۔'' اس کا خیال تھا کہ ٹائیگر اس کی سمت آئے گا مگر وہ بے مہار ہو رہا تھا۔

وہ واپس پلٹا۔ اس نے طیش کے عالم میں مخملی لحاف پر پنجہ مارا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ عمران ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کی وہ خداداد صلاحیت کام آئی جو اسے جانوروں سے قریب تر کر کے اسے ان کی فطرت پر اختیار دے دیتی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر عمران نے مشتعل درندے کو سنبھال لیا اور پھر اسے اپنے کلاوے میں لیتا ہوا آہنی پنجرے کی سمت لے گیا۔ پوری حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں اور ملازم بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عمران نے اپنے عقب میں جان صاحب کی وحشت زدہ آواز سنی۔ وہ ملازموں سے کہہ رہے تھے۔ ''اٹھاؤ... جلدی کرو۔ اسپتال لے جاؤ۔ ابھی یہ زندہ ہے۔''

تب عمران نے دیکھا کہ چند ملازم فربہ اندام صادق شاہ کو ہاتھوں میں اٹھائے جیپ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ صادق شاہ کی ادھڑی ہوئی خونچکاں شلوار زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ آندھی طوفان کی طرح حویلی کے پھاٹک سے نکلی اور خوشاب کے سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

جان صاحب دہاڑے۔ ''یہ سب کیسے ہوا؟ ٹائیگر کس طرح نکلا ہے پنجرے سے؟ کیسے پہنچا ہے پیر صاحب کے کمرے میں؟'' یقیناً یہی سوال سب لوگوں کے دماغوں میں بھی گھوم رہا تھا۔

حاجی احمد اشفاق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ حادثہ نہیں ہے۔ یہ کوئی چکر لگتا ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر جانور کو کھولا ہے۔ وہ پنجرے سے باہر آیا ہے اور سب سے نزدیک پیر صادق کا کمرا ہی پڑتا تھا، وہ اس میں گھس گیا ہے۔''

''ایسا کون کر سکتا ہے؟ کس کو ہو سکتی ہے اتنی ہمت؟'' جان صاحب شدید الجھن کے عالم میں بولے۔

یکا یک ایک ملازم حسن دین، پکارا۔ ''مالک! یہ دیکھیں... یہ پنجرے کے پاس تازہ قدموں کے نشان ہیں۔''

حسن دین اپنی طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ کچی زمین پر پھینک رہا تھا۔ یہاں دو طرح کے تازہ نشان تھے۔ ایک عمران کی چپل کا تھا۔ یہ نشان تھوڑی ہی دیر پہلے بنا تھا جب عمران ٹائیگر کو کنٹرول کرنے کے بعد پنجرے کی طرف لایا تھا۔ دوسرا نشان گرگابی کا تھا۔ یہ نشان پنجرے کے سامنے سے شروع ہو کر نیم پختہ برآمدے کی طرف گیا تھا۔ ملازم حسن دین کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر اس نے جان صاحب



کے کان میں کچھ کہا... جان صاحب کے چہرے پر بھی ہلچل نظر آنے لگی۔ تاہم انہوں نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپایا اور نارمل لہجے میں حسن دین سے پوچھا کہ ظفر کہاں ہے؟

اسی دوران میں ظفر بھی شراب کے نشے میں ڈگمگاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کیسا شور ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پیر صادق صاحب سخت زخمی ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔'' جان صاحب نے ظفر کو بتایا۔

ظفر نشیلے انداز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''وہ کیسے زخمی ہو سکتا ہے؟ وہ تو دوسروں کو زخمی کرتا ہے۔ اس کی راکھی (حفاظت) تو اس کے دو درجن موکل کرتے ہیں۔''

جان صاحب غصے سے بولے۔ ''یہ مذاق ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب کو پتا تھا، ٹائیگر خطرناک ہو رہا ہے۔ پھر اس کا پنجرہ کس نے کھولا؟''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ صادق کو شیر نے زخمی کیا ہے؟'' ظفر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

جان صاحب نے ظفر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ظفری! تم کہاں تھے؟''

''ظاہر ہے مردانے میں ہی تھا۔ زیبا نے میں تو اب جا نہیں سکتا کیونکہ آپ جناب کی منہ بولی بھتیجی مجھ سے طلاق لے چکی ہے۔'' وہ بدستور نشیلی آواز میں بولا۔ ''لیکن... لیکن آپ جناب مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی۔'' جان صاحب نے مختصر جواب دیا اور ایک بار پھر غور سے پنجرے کے اردگرد کی کچی زمین پر قدموں کے نشانات کو دیکھنے لگے۔ ان کے پریشان چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا عمران نے چاہا تھا۔ کسی کا دھیان عمران کی طرف گیا ہی نہیں۔ صادق شاہ اور نیلم کے سابق شوہر ظفر میں رنجش چلی آ رہی تھی۔ ظفر ایک دو بار صادق شاہ کو دھمکی بھی دے چکا تھا۔ پھر پنجرے کے آس پاس ظفر کے قدموں کے تازہ نشان بھی ملے۔ ہر کسی نے یہی نتیجہ نکالا کہ ظفر نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر صادق شاہ سے خوفناک بدلہ لیا ہے۔ اس نے پنجرہ کھولا ہے۔ اسے پتا تھا کہ شیر جب پنجرے سے نکلے گا تو سب سے پہلے وہ جس دروازے تک جائے گا، وہ صادق شاہ کے کمرے کا ہی ہو گا۔

صادق شاہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ ہنسلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ بپھرے جانور نے اس کا ایک کندھا تقریباً چبا ڈالا تھا۔ پتا چلا کہ اسپتال میں اس کی ذہنی کیفیت بھی ابتر ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چلا اٹھتا ہے اور ''بچاؤ جان صاحب... بچاؤ جان صاحب'' کی دہائی دینے لگتا ہے۔ خوشاب سے اسے لاہور کے اسپتال لے جایا گیا۔ جیسے تیسے اس کی جان تو بچ گئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کئی ماہ اسپتال میں گزارنے پڑیں گے۔

واقعے کے اگلے دن ہی ظفر عرف ظفری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ''شک'' اس کی طرف جا رہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ صادق شاہ کے سیکڑوں مرید آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ وہ جان صاحب کی حویلی سے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کے خلاف کچی رپورٹ بھی درج ہو گئی تھی۔

جان صاحب نے ایک بار تو ٹائیگر کو اونے پونے بیچنے کا ارادہ کر لیا مگر پھر عمران آڑے آیا۔ اس نے جان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ٹائیگر کو ٹھیک کر لے گا اور ایسا ٹھیک کرے گا کہ وہ بکری کی طرح اشاروں پر چلے گا۔ جان صاحب کو بھی عمران کی حیرت انگیز صلاحیتوں پر یقین تھا۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

آٹھ دس ہفتے میں حالات معمول پر آ گئے... اب ایک بار پھر جان صاحب کی حویلی میں پکوان پکتے تھے، شطرنج ہوتی تھی۔ ملازمین جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آتے تھے اور کبھی کبھار جب خوشاب شہر سے سرکس کا کوئی مزاحیہ فن کار آ جاتا تھا تو قہقہے بکھرتے تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں صادق شاہ کے ساتھ جو ہوا، وہ کس نے کیا اور اس کے پیچھے کتنی پرانی کہانی تھی۔

عمران اور شبانہ بتدریج جان صاحب کے گھرانے کے فرد بنتے جا رہے تھے۔ جان صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی گھر والی صدیقہ بی بی بڑی محبت کرنے والی اور دانا عورت تھی۔ عمران اور شبانہ اسے خالہ کہتے تھے، وہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ خصوصاً وہ شبانہ سے بہت پیار کرنے لگی تھی۔ اسے شبانہ کی یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ اس نے پورا پورا موقع ہونے کے باوجود عمران سے صرف اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ اس شادی میں اپنے گھر والوں کی مرضی شامل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے شبانہ کو یقین



www.digestpk.com

Asifzamil

''عمو... عمو!''

عمران کمرے کے اندر بے حس بنا کھڑا رہا۔ یہ وہی سفاک بے حسی تھی جو اس پر ماجھاں کی موت کے وقت طاری ہوئی تھی۔ اس بے حسی کا تعلق یقیناً ان بے رحم حالات سے تھا جن سے وہ گزرا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تو کتابوں، پھولوں اور موسموں سے پیار کرنے والا لڑکا تھا۔ اسے وہ سب کچھ اچھا لگتا تھا جو اس کی من موہنی ماں کو اچھا لگتا تھا اور وہ سب کچھ بُرا لگتا تھا جو اس کی ماں کے نزدیک بُرا تھا۔ اس کی خوب صورت دنیا اس کی ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اب ظالم لوگوں نے اس سے اس کی ماں چھین لی تھی۔ اس طویل جدائی نے عمران کے دل میں جو زہر بھرا تھا، اس کا تریاق ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ حویلی میں برپا ہونے والا شورِ محشر سن رہا تھا مگر بہرا بنا کمرے کی تاریکی میں کھڑا تھا۔ اب کئی ملازم صحن میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ تب عمران نے دیکھا کہ جان صاحب بھاگتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ اب وہ مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی چپل پہنی اور خود ہی کمرے سے نکل آیا۔

جان صاحب اسے دیکھ کر چلائے۔ ''عمو! ٹائیگر... پیر جی کے کمرے میں گھس گیا ہے۔'' دکھ اور دہشت کی شدت سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

عمران ان کے ساتھ لپکتا ہوا صادق شاہ کے کمرے تک پہنچا۔ صادق شاہ کی زخمی آواز مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غالباً مشتعل درندے کے سامنے اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

عمران نے اپنے ہاتھ بند دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھائے تو جان صاحب کے دو ملازموں نے رائفلیں سونت لیں۔ عمران نے دروازہ کھولا۔ ٹارچوں کی روشنی کمرے میں گئی۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ صادق شاہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم خونچکاں تھا۔ مشتعل درندے نے پلٹ کر عمران کی طرف دیکھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دکھائی دیں۔ اس کے منہ پر تازہ خون کے نشان تھے۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ عمران پر بھی جھپٹ پڑے گا...

عمران کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ پکارا۔ ''ٹائیگر... ٹائیگر۔'' اس کا خیال تھا کہ ٹائیگر اس کی سمت آئے گا مگر وہ بے مہار ہو رہا تھا۔

وہ واپس پلٹا۔ اس نے طیش کے عالم میں مخملی لحاف پر پنجہ مارا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ عمران ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کی وہ خداداد صلاحیت کام آئی جو اسے جانوروں سے قریب تر کر کے اسے ان کی فطرت پر اختیار دے دیتی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر عمران نے مشتعل درندے کو سنبھال لیا اور پھر اسے اپنے کلاوے میں لیتا ہوا آہنی پنجرے کی سمت لے گیا۔ پوری حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں اور ملازم بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عمران نے اپنے عقب میں جان صاحب کی وحشت زدہ آواز سنی۔ وہ ملازموں سے کہہ رہے تھے۔ ''اٹھاؤ... جلدی کرو۔ اسپتال لے جاؤ۔ ابھی یہ زندہ ہے۔''

تب عمران نے دیکھا کہ چند ملازم فربہ اندام صادق شاہ کو ہاتھوں میں اٹھائے جیپ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ صادق شاہ کی ادھڑی ہوئی خونچکاں شلوار زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ آندھی طوفان کی طرح حویلی کے پھاٹک سے نکلی اور خوشاب کے سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

جان صاحب دہاڑے۔ ''یہ سب کیسے ہوا؟ ٹائیگر کس طرح نکلا ہے پنجرے سے؟ کیسے پہنچا ہے پیر صاحب کے کمرے میں؟'' یقیناً یہی سوال سب لوگوں کے دماغوں میں بھی گھوم رہا تھا۔

حاجی احمد اشفاق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ حادثہ نہیں ہے۔ یہ کوئی چکر لگتا ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر جانور کو کھولا ہے۔ وہ پنجرے سے باہر آیا ہے اور سب سے نزدیک پیر صادق کا کمرا ہی پڑتا تھا، وہ اس میں گھس گیا ہے۔''

''ایسا کون کر سکتا ہے؟ کس کو ہو سکتی ہے اتنی ہمت؟'' جان صاحب شدید الجھن کے عالم میں بولے۔

یکا یک ایک ملازم حسن دین، پکارا۔ ''مالک! یہ دیکھیں... یہ پنجرے کے پاس تازہ قدموں کے نشان ہیں۔''

حسن دین اپنی طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ کچی زمین پر پھینک رہا تھا۔ یہاں دو طرح کے تازہ نشان تھے۔ ایک عمران کی چپل کا تھا۔ یہ نشان تھوڑی ہی دیر پہلے بنا تھا جب عمران ٹائیگر کو کنٹرول کرنے کے بعد پنجرے کی طرف لایا تھا۔ دوسرا نشان گرگابی کا تھا۔ یہ نشان پنجرے کے سامنے سے شروع ہو کر نیم پختہ برآمدے کی طرف گیا تھا۔ ملازم حسن دین کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر اس نے جان صاحب



کے کان میں کچھ کہا... جان صاحب کے چہرے پر بھی ہلچل نظر آنے لگی۔ تاہم انہوں نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپایا اور نارمل لہجے میں حسن دین سے پوچھا کہ ظفر کہاں ہے؟

اسی دوران میں ظفر بھی شراب کے نشے میں ڈگمگاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کیسا شور ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پیر صادق صاحب سخت زخمی ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔'' جان صاحب نے ظفر کو بتایا۔

ظفر نشیلے انداز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''وہ کیسے زخمی ہو سکتا ہے؟ وہ تو دوسروں کو زخمی کرتا ہے۔ اس کی راکھی (حفاظت) تو اس کے دو درجن مؤکل کرتے ہیں۔''

جان صاحب غصے سے بولے۔ ''یہ مذاق ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب کو پتا تھا، ٹائیگر خطرناک ہو رہا ہے۔ پھر اس کا پنجرہ کس نے کھولا؟''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ صادق کو شیر نے زخمی کیا ہے؟'' ظفر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

جان صاحب نے ظفر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ظفری! تم کہاں تھے؟''

''ظاہر ہے مردانے میں ہی تھا۔ زنانے میں تو اب جا نہیں سکتا کیونکہ آپ جناب کی منہ بولی بھتیجی مجھ سے طلاق لے چکی ہے۔'' وہ بدستور نشیلی آواز میں بولا۔ ''لیکن... لیکن آپ جناب مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی۔'' جان صاحب نے مختصر جواب دیا اور ایک بار پھر غور سے پنجرے کے اردگرد کی کچی زمین پر قدموں کے نشانات کو دیکھنے لگے۔ ان کے پریشان چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا عمران نے چاہا تھا۔ کسی کا دھیان عمران کی طرف گیا ہی نہیں۔ صادق شاہ اور نیلم کے سابق شوہر ظفر میں رنجش چلی آ رہی تھی۔ ظفر ایک دو بار صادق شاہ کو دھمکی بھی دے چکا تھا۔ پھر پنجرے کے آس پاس ظفر کے قدموں کے تازہ نشان بھی ملے۔ ہر کسی نے یہی نتیجہ نکالا کہ ظفر نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر صادق شاہ سے خوفناک بدلہ لیا ہے۔ اس نے پنجرہ کھولا ہے۔ اسے پتا تھا کہ شیر جب پنجرے سے نکلے گا تو سب سے پہلے وہ جس دروازے تک جائے گا، وہ صادق شاہ کے کمرے کا ہی ہو گا۔

صادق شاہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ ہنسلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ پھر ے جانور نے اس کا ایک کندھا تقریباً چبا ڈالا تھا۔ پتا چلا کہ اسپتال میں اس کی ذہنی کیفیت بھی ابتر ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چلا اٹھتا ہے اور ''بچاؤ جان صاحب... بچاؤ جان صاحب'' کی دہائی دینے لگتا ہے۔ خوشاب سے اسے لاہور کے اسپتال لے جایا گیا۔ جیسے تیسے اس کی جان تو بچ گئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کئی ماہ اسپتال میں گزارنے پڑیں گے۔

واقعے کے اگلے دن ہی ظفر عرف ظفری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ''شک'' اس کی طرف جا رہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ صادق شاہ کے سیکڑوں مرید آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ وہ جان صاحب کی حویلی سے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کے خلاف کچی رپورٹ بھی درج ہو گئی تھی۔

جان صاحب نے ایک بار تو ٹائیگر کو اونے پونے بیچنے کا ارادہ کر لیا مگر پھر عمران آڑے آیا۔ اس نے جان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ٹائیگر کو ٹھیک کر لے گا اور ایسا ٹھیک کرے گا کہ وہ بکری کی طرح اشاروں پر چلے گا۔ جان صاحب کو بھی عمران کی حیرت انگیز صلاحیتوں پر یقین تھا۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

آٹھ دس ہفتے میں حالات معمول پر آ گئے... اب ایک بار پھر جان صاحب کی حویلی میں پکوان پکتے تھے، شطرنج ہوتی تھی۔ ملازمین جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آتے تھے اور کبھی کبھار جب خوشاب شہر سے سرکس کا کوئی مزاحیہ فن کار آ جاتا تھا تو قہقہے بکھرتے تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں صادق شاہ کے ساتھ جو ہوا، وہ کس نے کیا اور اس کے پیچھے کتنی پرانی کہانی تھی۔

عمران اور شبانہ بتدریج جان صاحب کے گھرانے کے فرد بنتے جا رہے تھے۔ جان صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی گھر والی صدیقہ بی بی بڑی محبت کرنے والی اور دانا عورت تھی۔ عمران اور شبانہ اسے خالہ کہتے تھے، وہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ خصوصاً وہ شبانہ سے بہت پیار کرنے لگی تھی۔ اسے شبانہ کی یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ اس نے پورا پورا موقع ہونے کے باوجود عمران سے صرف اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ اس شادی میں اپنے گھر والوں کی مرضی شامل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے شبانہ کو یقین



www.digestpk.com

Asifzamil

دلایا کہ وہی کچھ ہوگا جو وہ چاہتی ہے اور جو عمران چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ''شبانہ! اس شادی کے سارے انتظام میں خود کراؤں گی۔ دیکھنا ہم اس کو ایک یادگار شادی بنا دیں گے۔''

خالہ صدیقہ نے جان صاحب سے کہہ کر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا۔ شبانہ کی والدہ اور ماموں وغیرہ ابھی تک گجرات کے اس گھوکی نامی گاؤں میں ہی مقیم تھے۔ آخر ایک دن جان صاحب کا خاص ملازم حسن دین خود گھوکی گاؤں گیا تاکہ شبانہ کے گھر والوں کو شبانہ کے بارے میں خوش خبری سنائے اور انہیں لے کر خوشاب آئے۔

اب شبانہ کے جانے کا وقت تھا۔ عمران کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا، کیا وہ دونوں ایک ہو پائیں گے؟ کہیں ان کے درمیان کوئی دیوار تو کھڑی نہیں ہو جائے گی؟ اگلے روز شبانہ کے گھر والوں کو خوشاب پہنچ جانا تھا اور شبانہ کو واپس اپنے گاؤں لے جانا تھا۔ اس دن عمران بہت اداس تھا۔ شبانہ بھی چپ چپ تھی۔ خالہ صدیقہ نے رنگین پیڑھی پر شبانہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے لمبے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے بولیں۔ ''شبو! تو ذرا فکر نہ کر۔ ہم بڑی جلدی تجھے پھر واپس یہیں پر لے آئیں گے۔ تیری اور عمو کی شادی کے سارے انتظام ہم خود کریں گے۔ دیکھنا یہ بڑی دھوم دھام والی شادی ہوگی۔''

''لیکن خالہ! ابھی عمران کی امی جی کا تو کچھ پتا نہیں چلا ہے۔''

''وہ بھی جلد ہی چل جائے گا۔ تمہارے خالو پوری کوشش کر رہے ہیں اور اگر فرض محال ابھی کوئی کھوج کھرا نہ بھی ملا تو بھی یہ شادی تو اب ہونی ہی ہے۔ ہم سب مل کر عمران کو راضی کر لیں گے۔ کیوں عمو؟'' خالہ صدیقہ نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

عمران خاموش رہا۔ خالہ نے عمران کو بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔ پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ''عمو! مجھے پتا ہے تم نے اپنی والدہ کو ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی ہے... ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ جو کچھ ہو سکا کریں گے لیکن اگر خدانخواستہ... تمہاری امی کا پتا نہ بھی چلا تو بھی ہم تم دونوں کا نکاح کر دیں گے۔ سیانے کہتے ہیں کہ نیک کام میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے اور اس کام میں تو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ وہ ''ہاں'' میں جواب کیسے دے سکتا تھا۔ اس کی تو زندگی کا دوسرا نام ہی ماں تھا۔ وہ ابھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ماں کے بغیر وہ یہ شادی کر سکے گا یا نہیں۔

رات کو شبانہ اور عمران تنہائی میں ملے۔ حویلی کی چھت پر ہلکی سی سردی تھی۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ بستی سو رہی تھی لیکن دو پیار کرنے والے دل دھڑک رہے تھے اور ان میں نم ناک کسک جاگی ہوئی تھی۔

عمران نے شبانہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''کل تمہارے گھر والے تمہیں لے جائیں گے شبو! میں بہت اکیلا رہ جاؤں گا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''ہم بڑی جلدی پھر ملیں گے عمران۔ اس بات کا یقین رکھنا۔ میں اب تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔''

''اس طرح کے وعدے کبھی کبھی ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں شبو۔''

''میری طرف سے نہیں ٹوٹیں گے عمران! میں... مرتے دم تک تمہاری ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

عمران نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''تم مجھے بھول جاؤ تو بھول جاؤ۔ میں نہیں بھول سکتی عمران... تمہیں بھول کر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔''

''اور میں کیا زندہ رہ سکتا ہوں؟ تمہیں کیا پتا تمہارے بغیر ایک ایک دن کس طرح گزاروں گا۔''

اس نے اپنی پیاری سی ناک عمران کی گردن میں گھسا دی۔ عمران نے اسے پوری طرح اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ فلک دیکھ رہا تھا... وہ ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے۔ پیار کرنے والوں کو... بچھڑنے والوں کو... وعدے کرنے والوں کو اور پیمان باندھنے والوں کو... وہ سب جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ صدیاں اس کے نیچے سے دبے پاؤں گزرتی چلی جاتی ہیں اور وہ محبت و نفرت کی ہزار ہا داستانوں کا شاہد بنتا ہے۔

اگلے روز شبانہ کی والدہ اور دو ماموں گجرات کے اس دور دراز گاؤں سے خوشاب کی اس نواحی بستی میں پہنچے۔ اپنی والدہ سے شبانہ کے ملنے کا منظر دیدنی تھا۔ دونوں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ شبانہ کے دونوں ماموں بھی بھانجی کو دیر تک گلے سے لگائے رہے۔ سہ پہر کو وہ لوگ واپس گجرات کے گاؤں گھوکی روانہ ہو گئے۔

اس کے تیسرے دن عمران ایک بار پھر حسن دین کے ساتھ اپنی والدہ کی تلاش میں شیخوپورہ اور لاہور روانہ ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کسر بھی اٹھا نہیں رکھنا



چاہتا تھا۔ شیخوپورہ روانگی سے اسے ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ شبانہ کی جدائی سے وقتی طور پر اس کا دھیان ہٹ گیا۔ حسن دین کے ساتھ اس نے کئی جگہوں کی خاک چھانی، کئی لوگوں سے ملا۔ اس کی ملاقات اس کہانی کے ایک اور ناپسندیدہ کردار چودھری سجاول سے بھی ہوئی۔ چودھری سجاول کو شوگر کا مرض لاحق ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ چودھری سجاول نے عمران سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ اس نے قسمیں کھا کر عمران کو یقین دلایا کہ اس کی طرف سے اس کی والدہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس نے اپنی زمین مرضی سے بیچی تھی اور اپنی مرضی سے ہی گاؤں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ شریفاں بی بی کی تلاش میں ہر طرح اس کی مدد کرنے کو تیار ہے اور اس سلسلے میں پولیس میں بھی اپنا اثر رسوخ استعمال کر سکتا ہے۔ اس نے عمران کو یقین دلایا کہ شہنشاہ کے مزار سے اس کے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن مزار والوں کی طرف سے انہیں یہی بتایا گیا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

چودھری سجاول ان لوگوں میں سے تھا جن پر پیاز کی طرح تہ در تہ چھلکے ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ چودھری سجاول کے علاوہ وہ اپنے آبائی گاؤں کے کچھ اور لوگوں سے بھی ملا۔ ان میں ماسٹر عطا صاحب اور قاری سلیم وغیرہ شامل تھے... ماسٹر عطا صاحب کی تو خیر اور بات تھی مگر باقی کسی شخص میں بھی اسے گرم جوشی یا ہمدردی نظر نہیں آئی۔ وہ لوگ اس سے لیے دیے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر لوگوں کے نزدیک وہ شہنشاہ کے مزار کا بھگوڑا تھا۔ بہرحال قاری سلیم کے گھر میں اسے بہ وجوہ دو تین گھنٹے رکنا پڑا کیونکہ تیز بارش ہونے لگی تھی۔ اس نے وہاں کھانا کھایا اور حسن دین کے ساتھ تھوڑی دیر آرام بھی کیا۔

... قریباً دو ہفتے کی بھاگ دوڑ کے بعد عمران اور حسن دین ایک بار پھر ناکام ہو کر خوشاب کی اس نواحی بستی چک میں جان صاحب کے پاس واپس آ گئے۔

ہر طرف ناکامی نظر آتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں عمران کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی تھی کہ اس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ وہ جو اسے ''گھر'' میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتی تھی، دنیا میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟ ابھی اس نے ماں کے ہاتھ سے بہت سے محبت بھرے لقمے کھانے ہیں۔ ابھی اس کی گود میں بڑے دنوں تک سر رکھ کر لیٹنا ہے اور ابھی اس کی شفقت کی بہت سی بارشوں میں بھیگنا ہے۔

ٹائیگر کے حوالے سے عمران نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس نے آٹھ دس ہفتوں میں ہی کر دکھایا۔ یہ تیز طرار جانور ایک دم شانت ہو گیا اور اشاروں پر چلنے لگا۔ جان محمد اور حاجی احمد اشفاق عمران سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے سرکس میں ملازمت دے دی اور عمران ''چک'' کی حویلی چھوڑ کر خوشاب آ گیا۔

جان محمد اور حاجی اشفاق کا سرکس وسطی پنجاب کا جانا پہچانا سرکس تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اس کا نام ''اسٹار سرکس'' تھا۔ ابھی یہ لوگ چھوٹے شہروں کے میلوں ٹھیلوں اور عرسوں وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس سرکس کے مختلف شعبے تھے۔ مثلاً جسمانی کرتب... رقص و موسیقی، جوکرز اور پھر وہ کرتب جن میں مختلف جانور، ہاتھی، گھوڑے، کتے، شیر اور پرندے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ عمران کو اس آخری شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہاں آ کر عمران کو ایسے ہی لگا جیسے مچھلی پانی میں آ گئی ہے۔ وہ جیسے مدتوں سے یہ کام کر رہا تھا اور اس کی ہر ہر باریکی سے آگاہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب کچھ کمال مہارت سے سنبھال لیا۔ اب وہ ایک جگہ مقیم نہیں تھا۔ سرکس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں اور شہروں میں اس کی حرکت جاری رہتی تھی۔

انہی دنوں میں جان محمد صاحب اور خالہ صدیقہ نے گھوکی گاؤں میں عمران کے رشتے کی بات چلا دی۔ اس رشتے میں سب سے زیادہ اہمیت شبانہ کی والدہ اور اس کے ماموؤں کی تھی۔ ان سب نے دو چار دن کی سوچ بچار کے بعد رضامندی ظاہر کر دی۔ ظاہر تھا کہ ان کے نزدیک اپنی بیٹی کی مرضی اہم تھی۔ خوشاب میں ہونے والی ملاقات میں بھی شبانہ کی والدہ نے عمران کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان دنوں عمران کی زندگی میں خوشی کی ایک لہر آئی اور اس لہر نے وقتی طور پر ماں کی جدائی کا غم ہلکا کر دیا۔ یہ وہ دن تھے جب اس کی آنکھوں میں شبانہ کی سادہ مسکراہٹ چمکتی رہتی۔ اس کی ہنسی کے مدھر سُر عمران کے کانوں میں گونجتے اور اس کے جسم کی خوشبو اس کے حواس کو معطر کرتی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ گھوڑوں پر سواری کرتا۔ خطرناک جانوروں کی ٹریننگ میں شریک ہوتا اور ٹرینڈ جانوروں کی دیکھ بھال انجام دیتا۔ تاہم ان سارے کاموں کے دوران میں اس کا دھیان شبانہ کی طرف ہی رہتا۔ ایک روز جب ان کا سرکس میانوالی میں تھا اور وہ پنڈال کے پچھواڑے رائل بنگلہ ٹائیگر کے پنجرے کی صفائی کروا رہا تھا، جان صاحب وہاں پہنچے۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم



www.digestpk.com

Asifzamil

ضرورت سے زیادہ کام کررہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تین چار روز کی چھٹی کرلو اور خوشاب جا کر اپنی خالہ سے مل آؤ۔''

وہ بولا۔ ''لیکن انکل! شادی پر بھی تو چھٹیاں ہونی ہی ہیں۔ ابھی مجھے کام کرنے دیجیے۔''

''جب شادی کا وقت آئے گا، تب شادی کی چھٹیاں بھی کرلینا۔ ابھی منگنی کی دو چار چھٹیاں کرلو۔'' وہ مسکرائے۔

''منگنی؟''

''ہاں، اسے منگنی بھی کہا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل یا پرسوں وہ لوگ کوئی نشانی وغیرہ کرنے آئیں۔ ابھی تو شبانہ کے ماموں شیخوپورہ گئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کس لیے؟''

''بھئی آخر وہ لڑکی والے ہیں۔ لڑکی والوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور یہ ان کا حق بھی ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں چھان بین کریں۔''

''سب کچھ تو ہم بتا چکے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''پھر بھی وہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہوں گے۔''

''تو ٹھیک ہے، جان لیں۔ ہم نے کیا چھپایا ہے۔''

''ارے ہاں، یاد آیا۔ یہ دیکھو، یہ چھوٹی سی انگوٹھی ہے۔ تمہاری خالہ نے کہا تھا کہ جب عمران آئے تو یہ انگوٹھی لیتا آئے۔ تمہاری ہونے والی بیوی کے لیے ہے۔'' جان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ ڈبیا میں بند خوب صورت طلائی انگوٹھی عمران کو دے دی۔

اگلا دن کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ عمران نے شام کو خوشاب جانا تھا مگر دوپہر کو جب جان صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بجھے ہوئے نظر آئے۔ وہ پریشان ہوتے تھے تو اس کی نشانی یہ ہوتی کہ وہ سگریٹ کو مسلسل ہونٹوں میں دبائے رکھتے اور اسی طرح گفتگو بھی کرتے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ''شامیانہ دفتر'' میں بیٹھے یہی کچھ کررہے تھے۔

عمران نے ان کے سامنے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے انکل!''

وہ کچھ دیر خاموشی سے عمران کو دیکھتے رہے پھر گمبھیر انداز میں بولے۔ ''تمہارے گاؤں جھنڈ وال سے شبو کے دونوں ماموں کوئی اچھی رائے لے کر نہیں لوٹے۔ مجھے لگتا ہے کہ چودھری وغیرہ نے انہیں الٹا سیدھا بتایا ہے۔''

عمران کے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل؟''

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''...تم نے وہ جو آسمانی بجلی والی بات بتائی تھی نا، وہ ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے نکلی نہیں ہے۔ خاص طور سے چودھری گھرانا تو وہ بات بڑے یقین سے کہتا ہے۔''

''کیا کہتا ہے؟''

''یہی کہ تم مقررہ میعاد یعنی سترہ چاندوں تک شہنشاہ کے مزار پر رہنے کے بجائے دو تین مہینے بعد ہی وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس لیے آسمانی بجلی والی نحوست تم پر آگئی ہے۔ مطلب ہے کہ جو کچھ پہلے چودھری کے پتر کے ساتھ ہوتا تھا، وہ اب تمہارے ساتھ ہوگا بلکہ ہورہا ہے۔''

''کک... کیا ہورہا ہے؟''

''آسمانی بجلی تمہارے پیچھے رہتی ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' عمران کا خون کھول اٹھا۔

جان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائے دبائے ایک گہرا کش لیا اور بولے۔ ''میں بھی جانتا ہوں، یہ سب بکواس ہے لیکن ایسی بکواس جب دلوں کے اندر گھر کرلیتی ہے اور بندے کا یقین بن جاتی ہے تو پھر اسے کھرچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے مہینے تم پھر شیخوپورہ گئے تھے اور چودھری سجاول، ماسٹر اور قاری سلیم وغیرہ سے بھی ملے تھے؟''

''ہاں۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

جان صاحب بولے۔ ''اس دن بہت تیز بارش ہورہی تھی۔ تم بارش میں ہی واپس آئے تھے۔ تمہاری واپسی کے دس پندرہ منٹ بعد ہی قاری سلیم کے ٹیوب ویل پر آسمانی بجلی گری۔ ایک بھینس مرگئی اور ایک لڑکے کے دونوں بازو جل گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل ایک اتفاق ہے۔ ایسے واقعے پچھلے مہینے کی بارشوں میں کئی جگہ ہوئے ہوں گے۔ کہیں کہیں جانی نقصان بھی ہوا ہوگا مگر میں نے کہا ہے نا کہ جب وہم ہمارا یقین اور عقیدہ بن جاتا ہے تو پھر اس سے چھٹکارا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس واقعے کو بھی تمہاری آمد کے ساتھ نتھی کرکے بتارہے ہیں۔''

عمران کے اندر آگ سی دہکنے لگی تھی۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے جان انکل سے پوچھا۔ ''شبو کے ماموں کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ ذرا توقف سے بولے۔ ''یہاں بدقسمتی یہ ہے عمران... کہ... شبانہ کے گھر اور برادری والے بھی ان باتوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس کے ماموں اور دوسرے ننھیال والے۔ ان میں سے ایک دو گھرانے تو خاصے پیر پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لڑکے کی زندگی کو اتنا بڑا روگ چمٹا ہوا ہے اور کسی بھی وقت اس کے ساتھ کچھ ہوسکتا ہے، اسے اپنی لڑکی نہیں دینی چاہیے۔''

''یعنی وہ انکار کررہے ہیں؟''

''فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' جان انکل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

عمران اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اس دقیانوسیت اور توہم پرستی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اسی دقیانوسیت نے اس سے اس کی ماں چھینی تھی اور اب یہی اس کی زندگی کی ایک اہم ترین خوشی کے راستے میں حائل ہوگئی تھی۔

''کہاں جارہے ہو؟'' جان انکل نے بے تاب ہوکر پوچھا۔

''گجرات۔ میں خود بات کروں گا شبانہ سے اور اس کے گھر والوں سے۔''

''نہیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس سے بات اور بگڑ جائے گی۔ ہم جو ہیں تمہاری طرف سے بات کرنے کے لیے۔'' جان انکل نے اس کے کندھے تھام کر اسے نیچے بٹھادیا۔

اگلے چار پانچ روز بے حد تناؤ میں گزرے۔ جان صاحب سب کام چھوڑ کر خود خوشاب گئے اور پھر خالہ صدیقہ کے ساتھ گھونگی پہنچے۔ عمران کی اطلاع کے مطابق انہوں نے گھونگی کے دو چکر لگائے... لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ عمران کو معلوم ہوا کہ اس معاملے پر گھونگی گاؤں کی پوری برادری ایک ہوگئی ہے اور انہوں نے رشتہ دینے سے معذرت کرلی ہے۔

اب عمران کی برداشت ختم ہوچکی تھی۔ ایک دوپہر وہ میانوالی سے روانہ ہوا اور رات تک شبانہ کے پنڈ جا پہنچا۔ اس کے سینے میں آگ سلگ رہی تھی اور آنکھوں میں گمبھیر دکھ کی نمی تھی۔ کوئی اس سے اس کی زندگی کیسے چھین سکتا تھا... وہ اور شبانہ محبت کی ناقابلِ شکست ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بے شمار شب و روز ایک دوسرے کے قریب گزارے تھے لیکن پھر بھی بہت دور رہ کر۔ انہیں اپنی محبت پر بھروسا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنے بڑوں کی رضامندی اور خوشنودی کے ساتھ ایک ہوں گے۔ لیکن اب یقین ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اور عمران نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اسے بکھرنے نہیں دے گا۔ وہ سب سے پہلے شبانہ سے ملنا چاہتا تھا۔

اس رات اس نے سیدھا جا کر شبانہ کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا شبانہ کا بڑا


خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہ ستمبر 2011ء
یادگار مہینا
یادگار شمارہ

**ٹارگٹ کلنگ**
قدم قدم پر خطرات، پل پل خوف و ہراس کے درمیان گھری ایک حسینہ کی وحشت و دہشت کا ماجرا...... آخری صفحات پر
**احمد اقبال** کے قلم سے ایک لازوال تحریر

**عشق پیچاں**
باپ بیٹے کی محبت کی شاندار مثال...... اکبر بادشاہ کا نیا دین...... شہزادہ سلیم کی محبت اور نور جہاں کی ذہانت کی بے مثال داستان...... ابتدائی صفحات کی زینت......
**ڈاکٹر ساجد امجد** کا ایک اور شاہکار

**شناسا چہرہ**
جب عزت اور محبت کے درمیان معرکہ آرائی ہو تو فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے لیکن کمرائے عدالت میں فیصلہ تو ہوکر رہتا ہے۔ ایک دلچسپ کیس کی سماعت

**حضرت یرمیاہ** علیہ السلام
بت پرستی کے اندھیروں میں گم بنی اسرائیل کی سرکشی اور انبیا کی جہد مسلسل کا احوال

اس کے علاوہ

واپسی، اناڑی، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

مزید
ابھرا ئے راحت، ناہید سلطانہ اختر، کاشف زبیر، منظر امام، مختار آزاد اور سلیم انور کے دلکش شاہکار آپ کے منتظر۔




www.digestpk.com

Asifzamil

ماموں نیاز احمد تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک چھوٹا سا کاشت کار تھا لیکن اپنے اندر زمینداروں کی سی اکڑفوں رکھتا تھا۔ اس نے عمران کو پہچان لیا اور فوراً ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''کیا بات ہے عمو؟'' اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سے؟''

''آپ سے اور شبانہ سے بھی۔''

''خبردار! اگر ہماری لڑکی کا نام لیا تو... بہت بُرا ہو گا۔'' نیاز احمد پھنکارا۔

''وہ میری منگ ہے۔ میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔'' عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوئے کون منگ؟ کس کی منگ؟'' نیاز کا انداز مزید بگڑ گیا۔

اسی دوران میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف بھی باہر آ گیا۔ وہ بڑے ماموں سے زیادہ سمجھ دار تھا۔ اس نے لڑائی کو بڑھنے سے روکا اور عمران کو ایک طرف لے جا کر بولا۔

''تم شبانہ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری بات کراؤں گا۔ پر ابھی نہیں۔ کل سویرے۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں مگر ایک بات آپ لوگ ذہن میں رکھیں۔ اگر شبانہ کو کسی طرح مجبور کیا گیا یا اسے کوئی ڈراوا دیا گیا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''جب تم خود بات کرو گے تو پھر سب کچھ تم پر کھل جائے گا۔'' شبانہ کے چھوٹے ماموں نے کہا۔

یہ اجنبی گاؤں تھا۔ عمران نے جیسے تیسے گاؤں کے ''دائرے'' میں رات گزاری۔ وہ یہاں اکیلا چلا آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ڈر نہیں تھا۔ اب اسے اپنے ڈر کو دبانا اور خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا آ چکا تھا۔ اب وہ نمایاں قد کاٹھ اور مضبوط جسم کا مالک نوجوان تھا۔ اس کی پیشانی روشن اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

شبانہ کے چھوٹے ماموں نے اگلے روز علی الصباح شبانہ اور عمران کی ملاقات کرا دی۔ مگر یہ ملاقات شبانہ کے گھر میں نہیں بلکہ گھر سے باہر ایک کنوئیں پر ہوئی۔ کنوئیں کے ساتھ دو تین کچے کوٹھے سے تھے۔ ایک کوٹھے میں شبانہ موجود تھی۔ اس بات کا پتا عمران کو بعد میں چلا کہ عمران کی ملاقات گھر میں اس لیے نہیں کرائی گئی کہ کہیں اس کی نحوست گھر پر اثر انداز نہ ہو جائے اور کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔

عمران اس کچے کوٹھے کے اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے مزید حیرانی ہوئی کہ کمرے کے درمیان کپڑے کا ایک پردہ تھا اور شبانہ اس پردے کی دوسری جانب تھی۔ یعنی وہ اس سے بات تو کر سکتا تھا مگر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ جو خوش رنگ سویروں اور چاندنی راتوں میں ہر وقت اس کے قریب رہتی تھی، آج اس کمرے میں اسے اپنی صورت بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہ کیسا دل فگار انقلاب تھا۔ شبانہ کے ماموں وغیرہ آس پاس ہی موجود تھے۔ ایک ماموں زاد کے ہاتھ میں باقاعدہ رائفل نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود ہوں گے۔

عمران نے کہا۔ ''شبانہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہارے گھر والے انکار کر رہے ہیں اور میں جانتا ہوں، ایسا صرف اس چودھری سجاول کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے بالکل بیکار کی باتیں کر کے تمہارے ماموؤں کو گمراہ کیا ہے۔ یہ پرانے زمانے کے جاہلوں والے خیال ہیں۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ان جعلی پیروں کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یہ بڑی بوجھل خاموشی تھی۔ آخر اس خاموشی کی دیوار ٹوٹی اور شبانہ کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ ''جو کچھ بھی ہے عمران... ہم... میرا فیصلہ وہی ہے جو میرے بڑوں کا ہے۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں... شبانہ کیوں...؟'' عمران تڑپ کر بولا۔

''بس میں نے کہا ہے نا۔ میں اپنے بڑوں کے خلاف نہیں جا سکتی... وہ میرے لیے جو سوچیں گے، ٹھیک ہی سوچیں گے۔'' شبانہ کی آواز کی تہ میں اشکوں کا بہاؤ تھا لیکن اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

''شبانہ! یہ گھسی پٹی باتیں ہیں... تم اندر کی بات نہیں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجبور کیا جا رہا ہے شبانہ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔'' شبانہ کے لہجے میں اشکوں کا بہاؤ کم ہو گیا اور مضبوطی کچھ بڑھ گئی۔ وہ جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں پہلے دن سے کہا تھا عمران! میں اپنی ماں اور اپنے بڑوں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ راضی ہو جاتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اب یہ نہیں ہو سکتا عمران۔ تمہیں میری اور اپنی عزت کے لیے خود کو سنبھالنا ہوگا... سب کچھ بھولنا ہوگا... اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے... اگلے مہینے میری شادی ہو رہی ہے۔ میں



نہیں چاہتی کہ اب تم دوبارہ یہاں ہمارے پنڈ آؤ... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا کہ کسی کھوہ میں چھال مار دوں۔ میں سچ کہتی ہوں... میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا...'' اس کی آواز بھرا گئی۔

دکھ کی شدت نے عمران کو بے بس کر دیا۔ وہ پردہ ہٹا کر شبو کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ ''خدا کے لیے شبو! ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں سب کچھ ختم کر دوں گا۔ تمہیں کسی اور کی نہیں بننے دوں گا۔ شبو... خدا کے لیے شبو۔''

اس نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ فرطِ غم میں اس نے اسے اپنے گلے لگانے کی کوشش کی، اپنے اندر چھپانا چاہا۔ وہ ایک دم غیر ہو گئی۔ اس نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ ''چھوڑ دو مجھے... چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ کراہی۔

عمران نے اسے چھوڑ دیا... وہ ایک گوشے میں سمٹ گئی... وہ اپنے چہرے پر دنیا جہان کی التجا سمیٹ کر بولا۔ ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا شبو۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو... میں نے...''

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ شبانہ کے رشتے دار آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے شبانہ کی احتجاجی آوازیں سن لی تھیں۔ شبانہ کے بڑے ماموں نے گھما کر پستول کا دستہ عمران کے سر پر مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ چھوٹا ماموں ان کے درمیان آ گیا۔ اس نے عمران پر حملہ آور ہونے والوں کو روکا اور گرجا۔ ''اس کو مار دو گے... تو اپنی بدنامی کا اشتہار لگاؤ گے۔ اس کو ایک موقع دو دفع ہو جانے کے لیے۔ اگر یہ دوبارہ یہاں آیا تو میں تمہارے ساتھ مل کر اس کے ٹوٹے کروں گا...''

حملہ آور بہت بپھرے ہوئے تھے لیکن شبانہ کے چھوٹے ماموں کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔

شبانہ کا چھوٹا ماموں عمران کو کھینچ گھسیٹ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اپنے ایک ساتھی سے کہہ کر اس نے عمران کے سر پر پٹی بندھوائی۔ پھر اسے سمجھایا کہ اس کے لیے اب یہاں سے چپ چاپ چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ اسے ابھی کاٹ کر یہیں کھیتوں میں دبا دیں گے۔

عمران نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''چاچا! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرا۔ لیکن... میں تیرے کہنے پر چلا جاتا ہوں۔ ہاں، یہ بات تو بھی اچھی طرح سن لے اور دوسروں کو بھی سمجھا دے، میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگوں نے ہاں کی ہوئی ہے۔ اب اس ہاں کو نہ میں نہیں بدلنے دوں گا۔ تم لوگ شبانہ پر زبردستی کر سکتے ہو، مجھ پر نہیں۔ میں ہر حد تک جاؤں گا۔''

شبانہ کے ماموں نے بے رخی سے کہا۔ ''میں بھی تجھے بتا دوں۔ اگلی دفعہ میں کسی کا ہتھ نہیں روکوں گا۔ اگر تو اس پنڈ کی جو میں داخل ہوا تو تیرے ٹوٹے ہو جائیں گے۔''

''جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں مجھے ہزار دفعہ مرنا بھی قبول ہے۔'' عمران نے بھی آتشیں لہجے میں کہا۔

پھر وہ گھونگی گاؤں سے چلا آیا۔

صورتِ حال بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ جہاں جاہلیت اور ناخواندگی کا اندھیرا ہو، وہاں توہم پرستی کا آسیب بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔ گھونگی گاؤں میں رہنے والی برادری کے لوگوں کو بھی پورا یقین ہو گیا کہ آسمانی بجلی کی نحوست والی بات درست ہے اور اگر اس نوجوان کی شادی برادری میں ہو گئی تو یہ نحوست برادری میں آ جائے گی۔ برادری میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ویسے بھی برادری کے باہر شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

ایک روز جان محمد صاحب نے عمران کو بتایا۔ ''مجھے پتا لگا ہے کہ شبانہ کے ماموؤں نے کسی نام نہاد مولوی سے فتویٰ بھی لیا ہے۔ اس نے بھی یہی کہا ہے کہ آسمانی بجلی والی نحوست پہلوٹی کے بعض بچوں میں ہوتی ہے اور یہ نحوست ایک بچے سے دوسرے بچے اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں جا سکتی ہے... یہ لوگ تمہارے گاؤں والے واقعے کو بھی بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قاری سلیم کے گھر پر صرف اس لیے بجلی کی آفت آئی کہ تم وہاں رکے تھے اور تم نے کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد بجلی گاؤں کے پاس بیلے کے درختوں پر کوندتی رہی... جیسے تمہیں ڈھونڈ رہی ہو۔''

''آپ کو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے یا رونا آتا ہے؟'' عمران نے جان صاحب سے پوچھا۔

''دونوں... لیکن بات وہی جاہلیت کے قصوں کی ہے... اور واہموں کی ہے۔ تم نے ناگ اور ناگن والی بات تو سنی ہوگی۔ لوگوں کو یقین ہے کہ اگر کوئی ناگ کو مار دے تو ناگن اس کا بدلہ لیتی ہے اور ہر سال ایک خاص وقت میں مارنے والے کو ڈسنے کے لیے آتی ہے... اور ایسی بے شمار



www.digestpk.com

Asifzamil

اسے دور سے دیکھوں گا اور پھر واپس خوشاب آجاؤں گا۔ بس ایک بار۔''

''کیسی جھلوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔'' راجا نے اسے ڈانٹا۔ ''اس طرح جائے گا تو وہ تیرا قیمہ کر کے کتوں کو ڈال دیں گے۔''

''تو ڈال دیں۔ میں پہلے کون سا زندہ ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے ہاتھ لہرائے۔

راجا نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ''چل... چل گڈی کے اندر بیٹھ۔''

''یار! ایسے کیوں کرتے ہو۔ میں کچھ مانگ تو نہیں رہا۔ کچھ چھین تو نہیں رہا۔ میں ایک بار اسے لال کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یار! اب میرا اتنا حق بھی نہیں ہے؟ تم مجھے اتنا بھی نہیں کرنے دیتے۔ یار تم کیسے یار ہو؟'' وہ سسک اٹھا۔

راجا نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور خود بھی اشک بار ہو گیا۔ وہ اسے کھینچ کھینچ کر لوڈر تک لایا۔

عمران لوڈر میں بیٹھ گیا لیکن جب راجا نے لوڈر اسٹارٹ کیا تو وہ دروازہ کھول کر پھر باہر نکل آیا۔

''اب کیا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''یار! مجھے ایک بار جانے دو۔ بس ایک بار... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا... کسی کے سامنے نہیں آؤں گا۔ اپنا منہ چھپا کر رکھوں گا۔ بس دور سے اس کو دیکھوں گا۔''

راجا پھر اس پر جھپٹا۔ ''تجھے چڑھ گئی ہے۔ چل بیٹھ گڈی میں۔ اور اگر نہیں تو پھر آ میرے ساتھ... آ میرے ساتھ... اٹھا لیتے ہیں اس کو۔ لے جاتے ہیں کہیں دور۔ دیکھتے ہیں ان میں سے کون بائی کا لال روکتا ہے ہمیں۔'' اس نے رائفل پھر عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران نے رائفل تھام لی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت رائفل پر بے ساختہ سخت ہوتی چلی گئی۔ چہرہ، انگارہ نظر آنے لگا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ اس کی نگاہ دور گھونگی کی مدھم روشنیوں پر تھی۔ وہ روشنیاں جہاں ایک گھر کے اندر مہندی کے گیت گائے جا رہے تھے، ایک ماں اپنی بیٹی کی بلائیں لے رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ تب عجیب ہیجانی انداز میں اس نے رائفل کا رخ کئی... کلومیٹر دور نظر آنے والی ان روشنیوں کی طرف کیا اور ٹریگر دبا تا چلا گیا۔ بیرل سے شعلے نکلے اور دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ تاریک سناٹا لرز گیا۔ گولیاں لامتناہی اندھیرے میں کہیں گم ہو گئیں۔ تب اس نے وحشت بھرے انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ سرخ ڈبیا نکالی جو اسے جان صاحب نے دی تھی۔ اس میں خوب صورت انگوٹھی تھی۔ اس نے ڈبیا زمین پر پھینکی اور ایک پورے برسٹ سے اسے اڑا کر رکھ دیا۔ تب اس نے رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر اندھا دھند ایک درخت کے تنے پر مارا۔ وہ شاید اسے مزید مارتا اور برباد کر کے رکھ دیتا مگر راجا نے اسے سنبھال لیا۔ رائفل اس سے کھینچی اور اسے کھینچتا ہوا لوڈر تک لے آیا۔ عمران کی آنکھوں سے آتشیں آنسو تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر لوڈر کے ڈیش بورڈ پر ٹیک دیا۔ راجا نے لوڈر کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

... صبح ہونے تک وہ لوگ واپس خوشاب پہنچ گئے۔ لیکن عمران جیسے واپس آ کر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا صرف بت باقی ہے، روح وہیں گھونگی گاؤں کے آس پاس کہیں رہ گئی ہے۔ ڈھولک کی تھاپ میں گم ہو گئی ہے، یا لڑکیوں کے گیتوں میں، یا مہندی کی خوشبو میں۔

وہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی بوجھ بن گئی تھی اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ماں تو بہت پہلے ہی اس سے بچھڑ گئی تھی، اب وہ ہستی بھی بچھڑ گئی تھی جس نے اس میں پھر سے زندہ رہنے کی امنگ جگائی تھی۔ اب کیا کرنا تھا جی کر... وہ ہر وقت یہی سوچ رہا تھا۔ راجا کی تسلیاں، جان صاحب کی محبت اور خالہ صدیقہ کی شفقت کچھ بھی اس کے دکھ کا مداوا نہیں تھا۔ ہاں، اب وہ اور جینا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اب سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ شبانہ کو اس شادی کے لیے اس طرح مجبور کیا گیا تھا کہ بالآخر اس کے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ خاندان، برادری کا زور چل گیا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک روز خود پر مٹی کا بہت سا تیل چھڑک کر ماچس ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اگر شبانہ نے شادی کے لیے ہاں نہیں کی تو وہ ابھی اسی وقت خود کو جلا کر کوئلہ کر لے گی۔ شبانہ نے اس سے ماچس لے لی تھی اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

بہر حال اب یہ سب کچھ ماضی بن چکا تھا۔ حال یہ تھا کہ عمران زندگی اور موت کے درمیان لٹک گیا تھا۔ سانس ایک تیز زہریلی کٹار تھی جو ہر پل اس کے سینے کو چیر رہی تھی۔ پھر بھی شاید بہت دور، دل کی اتھاہ گہرائی میں کہیں آس کا دیا ٹمٹماتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تک سانس تب تک آس۔ کرب کے بے رحم پنجوں میں تڑپتے ہوئے وہ کبھی کبھی سوچتا تھا... کیا کوئی انہونی ہو سکتی ہے؟ کیا کسی وقت شبو اس کی طرف پلٹ



سکتی ہے؟ انہونیوں کی خواہش پالنا شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

شبانہ کی شادی کو تین چار ہفتے گزر گئے تھے جب ایک اور اندوہناک سانحہ ہوا اور ہر امید ختم ہو گئی۔ اس سانحے نے عمران کی زندگی یکسر اندھیر کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب زندگی کا زہر مزید پینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔ ایک دن صبح سویرے جان انکل کے ملازم حسن دین نے عمران کو روتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ شبانہ اور اس کا شوہر حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

عمران کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کی زندگی کے لیے تو اس نے اتنا بڑا جہنم اپنے سینے میں اتارا تھا۔ وہ کیسے چلی گئی؟ وہ کیسے مر گئی؟ شروع میں پتا چلا کہ رائفل صاف کرتے ہوئے رائفل کا برسٹ چلا اور دونوں میاں بیوی موقع پر ہی دم توڑ گئے لیکن پھر رات کے وقت اصل تفصیل سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ شبانہ کے سخت گیر شوہر نے اس سے جھگڑا کیا تھا۔ اس نے بے قصور شبانہ پر بدچلنی کا الزام لگایا اور پھر اسے بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شعلہ مزاج بھتیجے کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ اسی بات پر چچا بھتیجا میں شدید جھگڑا ہو گیا۔ شبانہ کے شوہر سجاد نے پستول نکال لیا۔ اپنا جان خطرے میں دیکھ کر اشرف نے دیوار سے آٹھ ایم ایم رائفل اتار لی۔ روتی بلکتی شبانہ، شوہر اور ماموں کے بیچ آ گئی۔ سخت کھینچا تانی کے دوران میں آٹھ ایم ایم رائفل چل گئی۔ اس کی ایک ہی گولی شبانہ اور سجاد دونوں کے جسم سے پار ہو گئی۔ شبانہ نے تو وہیں اپنے کمرے میں دم توڑ دیا... سجاد گجرات کے سرکاری اسپتال میں پہنچ کر ختم ہو گیا۔

عمران دو تین دن تک اپنے ہوش میں ہی نہیں رہا۔ وہ نشے میں غرق تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نے یہ دو تین دن کہاں اور کس حال میں گزارے ہیں۔ آہ... یہ کیا انجام تھا اس کی محبت بھری داستان کا۔ وہ داستان جو دریائے چناب کے کنارے کی ہواؤں میں پُور پُور بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اپنے شباب کو پہنچی تھی۔ سب کچھ کس طرح اور کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا۔ عمران نے وہ فیصلہ کر لیا جو کئی ہفتے سے اس کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی شبانہ کے پاس پہنچ جائے گا۔ وہ اس دنیا میں نہیں مل سکے شاید اس دنیا میں قدرت کو ان پر رحم آ جائے۔

☆☆☆

یہ دو دن تھے جب وہ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اپنی جان لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنے حوالے سے ایک عجیب سی بے حسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ لباس کے علاوہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے جانوروں کی طرف سے بھی وہ بالکل غافل ہو چکا تھا۔ اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی کسی کام میں۔ وہ ہر چیز کو اوپری اور الوداعی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ان کا سرکس سرگودھا میں تھا۔ ایک روز وہ اپنے شامیانے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ سرکس میں کام کرنے والی نئی لڑکی شاہین اس کے پاس آئی۔ وہ چند ہفتے پہلے جمناسٹک کے شعبے میں بھرتی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

''عمران! تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ دفتر میں کیا ہوا ہے؟''

عمران اپنی سوجی سوجی آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔ ''گولڈن سرکس کے لوگوں نے جان صاحب سے جھگڑا کیا ہے۔ گالی گلوچ تک نوبت آئی ہے۔ وہ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں؟''

''وہی پرانی بات۔ ان علاقوں میں ہمیں کام نہیں کرنے دیں گے۔ اگر ہم کریں گے تو پچھتائیں گے۔''

''جان انکل ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔'' عمران نے آنکھیں بند کر کے گہرا کش لیا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا۔

... مگر دو دن بعد وہ لاتعلق نہیں رہ سکا۔ شام کا وقت تھا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ اتوار کی وجہ سے کافی رش بھی تھا۔ عمران کے کانوں میں یہ اڑتی اڑتی سی خبر پہنچی کہ گولڈن سرکس والوں نے اپنے کچھ لوگ تماشائیوں کے روپ میں اس شو میں بھیج دیے ہیں اور وہ ہنگامہ کریں گے۔ بہر حال ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والا ہر دلعزیز فن کار ''بادشاہ'' موجود نہیں ہے۔ اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔ موت کے کنویں پر موجود سیکڑوں تماشائی ہلڑ بازی کے موڈ میں ہیں۔ اس بات کا پتا اگلے روز چلا کہ بادشاہ کو گراں معاوضہ دے کر گولڈن سرکس والوں نے بھرتی کر لیا تھا اور یہ کام اس طرح کیا گیا تھا کہ جان صاحب کے اسٹار سرکس میں زوردار ہنگامے کا ماحول بن سکے۔

جان صاحب مصیبت میں تھے اور ان کے عمران پر بہت سے احسان تھے۔ عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ کبھی کبھی بادشاہ کی بھاری بھرکم موٹر سائیکل چھپا کر کنویں کے اندر نیچے ہی نیچے ایک دو چکر لگانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج وہ بادشاہ کی جگہ لے اور



www.digestpk.com

Asifzamil

کنوئیں کے اندر موٹر سائیکل چلائے۔ یہ بڑا سنسنی خیز خیال تھا۔ شاید ایک دو ماہ پہلے تک وہ ایسی خطرناک حرکت کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اب اس کی ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ وہ خود کو زندگی سے دور اور موت کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ مرنا چاہ رہا تھا اور جب مرنا تھا تو پھر زندگی جانے کا خوف کیا...؟

اس نے ڈریسنگ روم میں جاکر کاسٹیوم پہنا اور کنوئیں میں آگیا۔ تب تک ہلچل واضح نظر آنے لگی تھی۔ تماشائی شور مچا رہے تھے۔ کنوئیں کے اندر سگریٹوں کے خالی پیکٹ، پھلوں کے چھلکے اور جوس کے ڈبے وغیرہ پھینکے جا رہے تھے۔ جان صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے نوآموز شاگرد انور کو ہلکے پھلکے تماشے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں مگر وہ سخت خوف زدہ ہے۔

عمران نے عجیب ہیجانی انداز میں کہا۔ ''عباس بھائی! یہ کام میں کروں گا۔''

عباس حیرت سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔ عمران نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو عباس سامنے آگیا۔ ''نہیں عمران! میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر جان صاحب کو آجانے دو۔''

عمران نے اس بات کا جواب یوں دیا کہ ریس گھما کر ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل کا کلچ چھوڑا اور اسے لہراتا ہوا، عباس کے پہلو سے نکال لے گیا۔ اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اردگرد کی ہر شے اسے بے معنی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی موت بھی اور یہ خیال بھی کہ وہ شدید زخمی ہوجائے گا۔ اسے اس کھیل کی بنیادی تکنیک کا پتا تھا۔ جتنی زیادہ رفتار، اتنی زیادہ بلندی اور اتنی ہی زیادہ کنوئیں کی دیواروں پر پہیوں کی ''گرپ''۔ وہ بے خوف ہو کر رفتار بڑھاتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک عجیب تجربہ تھا، وہ ایک دیوانی کوشش تھی۔ اس نے سنا تھا کہ ڈر سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔ آج یہ کہاوت عملی شکل میں اس کے سامنے تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنی پوزیشن کو دیکھا تو خود ہی حیران رہ گیا۔ اس کی برق رفتار موٹر سائیکل کنوئیں کے بالائی کنارے سے بس چار یا پانچ فٹ ہی نیچے رہ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کے زبردست ''مومینٹم'' سے چوبی کنوئیں کی دیواریں ہل رہی تھیں۔ تماشائی دم بخود تھے۔ عمران اندھا دھند رفتار بڑھاتا ہوا موٹر سائیکل کو آخری حد تک لے گیا۔ اب وہ بالائی کنارے کے بالکل ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ تماشائی تالیاں پیٹنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے گرا تو سیدھا کنوئیں کی تہ میں گرے گا اور پھر شاید اٹھ نہ سکے۔ لیکن یہ متوقع سانحہ بھی اسے خوف زدہ کرنے میں ناکام تھا۔ اس نے ''ریس'' کے گھماؤ کو ایک جگہ ایڈجسٹ کرنے کے بعد ''بادشاہ'' کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلا دیے۔ موٹر سائیکل اسی طرح آندھی کی رفتار سے دوڑتی رہی... عمران اس ایکشن کو بہت مشکل سمجھا کرتا تھا مگر یہ اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا... یا شاید عمران کی بے خوفی نے اسے آسان بنا دیا تھا۔ بادشاہ اس اسٹیج پر کچھ اور پوز بھی بناتا تھا لیکن وہ عمران کے بس میں نہیں تھے۔ عمران جو کچھ کرچکا تھا، وہ تماشائیوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ رفتار کم کی اور پھر موٹر سائیکل کو تہ میں لے آیا۔

جان محمد صاحب، عباس اور دیگر لوگ ہکا بکا تھے۔ جان صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا تاہم اس غصے کی تہ میں محبت بھی شامل تھی۔ ان کا سگریٹ مسلسل ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

تماشائیوں کی ساری توقعات تو پوری نہیں ہوئی تھیں۔ بہرحال وہ منتشر ہونے لگے۔ یقیناً یہ ساری صورتِ حال ان لوگوں کے مفاد میں نہیں تھی جو تماشائیوں کو توڑ پھوڑ پر اکسانا چاہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ سنبھل گیا ہے تو انہوں نے اپنے طور پر گڑبڑ کردی۔ سرکس کا ایک سینئر فنکار ''سینڈو'' بھاگتا ہوا آیا اور اس نے جان صاحب کو بتایا۔ ''سر! ایک بندے نے پنڈال کے پیچھے خیمے میں آگ لگا دی ہے۔ چوکیداروں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ کچھ لوگ اسے چھڑانے کے لیے جھگڑا کر رہے ہیں۔''

یہی وقت تھا جب اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔

''یہ وہی لوگ ہیں جی۔'' سینڈو نے اڑی اڑی رنگت کے ساتھ کہا۔

جان صاحب اور دیگر لوگ موقع کی طرف لپکے۔ عمران بھی ان کے ساتھ تھا۔ پنڈال کے عقب میں آگ بھڑک رہی تھی اور کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ان میں گولڈن سرکس والوں کے غنڈے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس دن عمران پر عجیب سی وحشت طاری ہوگئی۔ وہ کم ہمت تو پہلے بھی نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کرنا اور خم ٹھونک کر میدان میں آنا جانتا تھا... لیکن اس روز وہ اس انداز سے لڑا کہ سب دنگ رہ گئے۔ وہ دیوانہ وار گولڈن سرکس کے غنڈوں میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے کئی افراد کے سر پھٹے اور دو تین کی ہڈیاں



بھی ٹوٹیں۔ پھر ہاکی ٹوٹ گئی اور عمران کے ہاتھ میں ایک چاقو آگیا۔ یہ چاقو بھی ہاکی ہی کی طرح مخالفین کے لیے مہلک رہا۔ عمران کے بازو پر ایک گہرا زخم آیا۔ اس زخم کے بدلے اس نے کم از کم تین افراد کو زخمی کیا۔ اسی دوران میں پولیس کود پڑی۔ پولیس اہل کاروں نے اندھا دھند ہوائی فائرنگ کر کے متحارب گروہوں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کیا۔

بعدازاں عمران کو بھی دیگر زخمیوں کی طرح مرہم پٹی کے لیے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں سے پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ جان صاحب نے اسے دو دن سے زیادہ تھانے میں نہیں رہنے دیا اور پرچے سے اس کا نام خارج کرا کے واپس لے آئے۔

دو دن بعد عمران نے ایک اور حیران کن کام کیا۔ وہ کسی کو بھی بتائے بغیر خاموشی سے گولڈن سرکس والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی شلوار کے نیفے میں بھرا ہوا بریٹا پسٹل تھا اور کمر سے گولیوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دندناتا ہوا گولڈن سرکس کے مالک کے دفتر میں جا گھسا۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا اور جب بندہ ایسا چاہتا ہے تو پھر دیواریں گرتی ہیں۔ بند گلیوں سے رستے نکلتے ہیں اور لوہا ہاتھوں میں موم ہوتا ہے۔ عمران کی اس آمد نے گولڈن سرکس والوں کو ہکا بکا کردیا۔ عمران نے سرکس کے مالک ''چودھری جی'' سے کہا۔

''بادشاہ نے جان محمد صاحب سے ستر ہزار روپیا ایڈوانس لیا ہوا ہے اور اپریل تک کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔ اگر آپ اس کو اپنے پاس رکھو گے تو پھر کام بگڑ جائے گا۔''

جو کام شاید بہت سی گفتگو اور میٹنگز وغیرہ کے بعد بھی نہیں ہوسکتا تھا، وہ صرف دس منٹ میں ہوگیا۔ عمران، جان صاحب کے پرانے ملازم بادشاہ کو اپنے سرکس واپس لے آیا۔

عمران کی اس جرأت اور دلیری نے جان صاحب اور حاجی اشفاق کو ششدر کردیا... جان صاحب کے نزدیک پہلے بھی عمران کی بہت اہمیت تھی، اب یہ اہمیت اور بڑھ گئی۔ وہ اسے مزید ذمے داریاں سونپنا چاہتے تھے لیکن عمران جانتا تھا کہ وہ تو پہلی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ جانوروں سے اس کی رغبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اپنے اردگرد کے لوگوں سے وہ بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ وہ تو مرنے کی جگہ ڈھونڈتا پھرتا تھا...

اگلے چند دن میں اس نے کئی ایسے کام کیے جن میں مرنے کا خطرہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سرگودھا کے ایک پوش علاقے میں بگڑے تگڑے امیرزادے، موٹر سائیکلوں کی ایک خوفناک ''ریس'' لگاتے تھے۔ عمران نے اس ریس میں حصہ لیا اور حیران کن طور پر نہ صرف محفوظ رہا بلکہ دوسرا انعام بھی جیت گیا۔

پھر اس نے جان صاحب کے ایک اور پرانے حریف استاد چھیمے تھیٹر والے کو للکارا اور اس کے دو غنڈوں کو بُری طرح مار پیٹ کر اسپتال پہنچا دیا۔ اس پھڈے کا نتیجہ بھی فوری اور مفید نکلا۔ استاد چھیمے کی طرف ڈوبا ہوا جان صاحب کا ایک لاکھ روپیا نکلنے کی قوی امید پیدا ہوگئی... اور اس رقم کی پہلی قسط تقریباً تیس ہزار روپے جان صاحب کے ہاتھوں میں بھی پہنچ گئے۔

...اس کے بعد ایک روز عمران نے راجا کو ساتھ لیا اور دندناتا ہوا شیخوپورہ میں اپنے گاؤں جھنڈ وال پہنچ گیا۔ اس کی قمیص کے نیچے بریٹا پستول لگا ہوا تھا اور تیز دھار چاقو تھا جبکہ راجا کی گرم چادر کے نیچے چھوٹی نال کی رائفل چھپی ہوئی تھی۔ نومبر کی وہ سرد ابر آلود رات گاؤں کے چودھری سجاول پر بہت بھاری گزری۔ عمران اور راجا حویلی کی پچھلی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگئے۔ کچھ دیر تک پرالی کے ڈھیر میں دبکے رہے پھر ایک پہرے دار کے سر پر بندوق کا وزنی دستہ مار کر اسے نیم جان کیا اور اس کی مشکیں کسنے کے بعد سیدھے اس کمرے میں جا پہنچے جہاں چودھری سجاول اپنی فربہ اندام بیوی کے ساتھ سو رہا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر اس کی ماں کو بھی سب کچھ چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہوجانے پر مجبور کردیا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کو ایک بے حقیقت نحوست سے بچانے کے لیے ان میاں بیوی نے عمران کی ہنستی بستی زندگی کو زہرناک حقیقتوں کے حوالے کیا تھا اور آج وہ خود عمران کے حوالے تھا۔

راجا نے وسیع کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا اور عمران نے پستول کی نال چودھری سجاول کی پیشانی سے لگا دی۔ شوگر کے مرض نے ہٹے کٹے چودھری سجاول کو خزاں رسیدہ پتے جیسا کر رکھا تھا۔ وہ لرزنے لگا۔ اس کی فربہ اندام بیوی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بولی۔ ''یہاں سے جو کچھ لے کر جانا ہے لے جاؤ، پر ہمیں کچھ نہ کہو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنے طلائی کڑے اتارنے لگی۔

عمران نے چہرے سے مفلر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہچان چودھرائن! میں یہاں کچھ لوٹنے نہیں آیا۔ اس کا حساب لینے آیا ہوں جو تم لوگوں نے لوٹا ہے۔ بتاؤ کیا کیا تھا تم لوگوں نے میری مسکین ماں کے ساتھ؟ بتاؤ کس طرح انگوٹھے



www.digestpk.com

Asifzamil

لگوائے تھے اس سے زمین کے کاغذوں پر... اور مجھے بتاؤ کہاں پھینکا تھا اسے؟''

چودھرائن ہکی بکی عمران کو دیکھ رہی تھی۔ چودھری نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک ہی زوردار جھانپڑ نے اس کے سارے کس بل نکال دیے۔ وہ پختہ دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ عمران کے قدموں میں گر کر کراہنے لگا۔ عمران نے اسے سیدھا کر کے بٹھایا اور اپنے سوال دہرائے۔ یہ گفتگو تقریباً پندرہ منٹ جاری رہی... اس دوران میں حویلی کے اندر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ چودھری کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ چودھری سجاول اور اس کی بیوی نے رو رو کر عمران کو یقین دلایا کہ انہیں اس کی والدہ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہاں... چودھری سجاول نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اپنے ایک ملازم کے ذریعے اس نے شریفاں بی بی کی زمین خود ہی خریدی تھی۔ وہ اسی وقت زمین کی رجسٹری ایک آہنی الماری میں سے نکال کر لایا اور عمران کے حوالے کر دی۔ عمران اپنے ساتھ کچھ اسٹامپ پیپر لے کر آیا تھا۔ اس نے اسی وقت ان اسٹامپ پیپرز پر چودھری سجاول کے سائن انگوٹھے کروا لیے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد چودھری کو امید پیدا ہونے لگی کہ اس کی جان بخشی ہو جائے گی مگر عمران کے دل و دماغ میں چودھری کے لیے زہر کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ آج اس کی دو چار ہڈیاں توڑے بغیر یہاں سے جانے والا نہیں تھا۔

چودھری نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بیمار ہوں۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا... یہ سب کچھ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

عمران نے کہا۔ ''جو کچھ پچھلے ایک گھنٹے سے تم پر بیت رہی ہے، وہ مجھ پر کئی سال سے بیت رہی ہے۔ مجھے بھی ہر گھڑی یہی لگتا رہا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔''

چودھری بولا۔ ''میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ ہم نے اپنے بچے کی محبت میں تمہیں تمہاری ماں سے وکھرا کر دیا۔ شاید اسی کی سزا مجھے اس ظالم بیماری کی شکل میں ملی ہے۔ میری ہڈیاں کھُر کھُر کر میرے پیشاب کے ساتھ نکلتی جاتی ہیں۔ میں نے اب زیادہ وقت نہیں جینا۔ تم میرا خون اپنے سر نہ لو۔''

عمران بولا۔ ''ابھی تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہارے جیسے شیطان کی ٹانگیں قبر میں چلی جائیں تو بھی وہ اپنی آخری شیطانیوں سے باز نہیں آتا... گجرات سے کچھ لوگ میرے بارے میں سن گن لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہ مجھے اپنی دھی کا رشتہ دینا چاہتے تھے۔ تم نے اور تمہاری اس ''بھینس بیوی'' نے بڑی اچھی طرح ان کو اطمینان دلایا... میری تعریفوں کے پل باندھے اور میرے رستے کے سارے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چن لیے۔ یہی کیا نا تم دونوں نے؟'' اس کے لہجے میں طنز کی تیز کاٹ تھی۔

چودھری کا رنگ جو تھوڑی دیر کے لیے نارمل ہوا تھا پھر ہلدی ہو گیا۔ اس کی بیوی چاپلوسی کے انداز میں عمران کو ''عمو پتر'' کہنے لگی اور منت ترلے میں مصروف ہو گئی۔

تب اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ چودھری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا۔ پھر وہ یکا یک ایک طرف کو جھکتا چلا گیا۔ ''ہائے میں مری۔'' اس کی بیوی پکاری اور دوڑ کر الماری کی طرف گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چودھری کی زبان کے نیچے گولی رکھی۔ تب تک چودھری تقریباً بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ کراہی۔ ''اسے دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔ اسے اسپتال لے جاؤ۔''

عمران نے پستول چودھرائن کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسے ماریں گے نہیں تو بچائیں گے بھی نہیں۔ اپنے پتر کو بلاؤ، وہی اس کا کچھ کرے گا۔ اور ایک اور بات پورے دھیان سے سن لو اگر یہاں ہمارے بارے میں کسی کو پتا چلا تو تیری اور تیرے پتر کی خیر نہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو، ہم تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔''

''نہیں... میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' چودھرائن نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے، بلاؤ جس کو بلانا ہے۔'' راجا نے کہا۔

عمران اور راجا دونوں نے اپنے ہتھیار چھپا لیے۔ عمران نے پہلے کی طرح مفلر میں اپنا منہ سر لپیٹ لیا۔ چودھرائن نے اپنے پتر کا نام لے کر دہائی دی۔ ''نیازے... نیازے جلدی آؤ۔ تمہارے پیو کو کچھ ہو گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی چوپٹ کھول دیا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ نیازے کا کمرا کہیں پاس ہی ہے۔ چودھرائن کی دوسری آواز پر ہی نیازا ہکا بکا وہاں پہنچ گیا۔ وہ عمران ہی کا ہم عمر تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ یقیناً بستر سے نکلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی جواں سال بیوی بھی تھی۔ وہ بھی سر پاؤں سے ننگی تھی۔ جب اس نے کمرے میں دو غیر مردوں کو دیکھا تو جلدی سے اپنا سر ڈھانپنے کی کوشش کی۔

چودھری کو بے ہوشی کے عالم میں پڑے دیکھ کر ہی نیازے اور اس کی بیوی کو اندازہ ہو گیا کہ ابا جی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک دم کھلبلی سی مچ گئی۔ ملازموں کو آوازیں دی گئیں اور بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ اس افراتفری میں کسی کو عمران اور راجا کی طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ جب بے ہوش چودھری سجاول کو ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی، عمران اور راجا وہاں سے کھسک آئے... اور پھر اگلے چند گھنٹوں میں واپس خوشاب پہنچ گئے۔

چوتھے دن راجا ہی کی زبانی عمران کو یہ اطلاع ملی کہ چودھری سجاول دل کے اس شدید دورے سے جانبر نہیں ہو سکا... اور انجام کو پہنچ گیا ہے۔

ان دنوں عمران کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی اس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا تھا۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ اپنی زندگی تو ختم کر لے لیکن اس طریقے سے کہ کوئی اسے حرام موت قرار نہ دے۔ یہی پراگندہ خیالات تھے جن کے زیر اثر وہ اپنی صحت و سلامتی کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گیا تھا اور خطرناک ترین کام بھی کر گزرتا تھا۔ ایک روز وہ موت کے کنوئیں میں اندھا دھند موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گر کر سخت زخمی بھی ہوا اور اسے دس بارہ روز اسپتال میں گزارنا پڑے لیکن اس کے طرز زندگی پر کوئی اثر پڑا... اور نہ اس کی سوچوں میں کوئی فرق آیا۔ اسپتال میں قیام کے دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں آیا کہ شاید چودھرائن اور اس کے پتر نیازے کی طرف سے کسی طرح کا کوئی ردعمل ظاہر ہو لیکن حیران کن طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یوں لگا کہ وہاں چودھری سجاول کی حویلی میں کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ غالباً چودھرائن نے بھانپ لیا تھا کہ عمران نے جو کچھ کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔ وہ خاوند سے تو محروم ہو ہی چکی تھی، اب بیٹے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے دم سادھ لیا تھا۔

عمران کو اسپتال سے آئے ہوئے پانچ چھ روز ہوئے تھے، جب ایک انگریز پروفیسر صاحب، جان محمد صاحب کے ہاں آئے۔ وہ پچاس پچپن برس کے صحت مند شخص تھے... فرنچ کٹ داڑھی اور عینک ان کے چہرے کا حصہ تھی۔ ان کا پورا نام تو کچھ اور تھا مگر جان صاحب انہیں مسٹر رچی یا رچی صاحب کہتے تھے۔ رچی صاحب اپنے ساتھ ایک خوفناک سینٹ برنارڈ کتا بھی لائے تھے۔ اس کا وزن سو کلو کے لگ بھگ ہو گا۔ اس کے پورے جسم پر بال اور آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔

جان صاحب نے عمران کو حیران کرتے ہوئے بتایا۔ ''رچی صاحب تمہارے لیے ہی یہاں آئے ہیں۔''

''میرے لیے؟''

''ہاں... یہ تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے جب تم ٹائیگر کو ''ٹرینڈ'' کر رہے تھے، عباس نے تمہاری ویڈیو فلم بنائی تھی... یہ فلم کسی طرح اسلام آباد ... میں مسٹر رچی تک پہنچی۔ اس کے بعد اور بھی کچھ لوگوں نے یہ فلم دیکھی۔ پچھلے مہینے مسٹر رچی نے اسلام آباد سے عباس سے رابطہ کیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کام کے سلسلے میں عباس راولپنڈی تو جا ہی رہا تھا، اس نے رچی صاحب سے ملاقات کا پروگرام بھی بنا لیا۔ وہاں رچی صاحب اور ان کے دو دوستوں نے عباس سے تمہارے بارے میں بہت سی معلومات لیں۔ یہ لوگ جانوروں کے ساتھ تمہارے رویے اور تمہارے ساتھ جانوروں کے رویے سے بہت زیادہ حیران ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب رچی صاحب خود یہاں موجود ہیں۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''بس تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں کوئی عجوبہ ہوں؟'' عمران کا لہجہ روکھا تھا۔

''نہیں... لیکن جو کچھ تمہارے اندر ہے، وہ ضرور عجوبہ ہے۔ جس طرح یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، اسی طرح رچی صاحب اور ان کے دوستوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔''

رات کو ایک پُرتکلف کھانے پر رچی صاحب سے عمران کی ملاقات ہوئی۔ عمران اس صورت حال سے بیزار تھا مگر جان صاحب کے کہنے پر اس نے رچی صاحب کو تفصیلی انٹرویو دیا۔ رچی صاحب کافی عرصے سے پاکستان میں مقیم تھے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتے تھے... ان کے کچھ سوالوں کے جواب عمران نے تفصیل سے دیے، کچھ کو وہ گول کر گیا۔

رچی صاحب نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ''عمران! تمہیں اپنے ساتھ جانوروں کے خاص رویے کا پتا پہلی بار کب چلا؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں جی۔ میں نے آپ سے ماجھاں نامی عورت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا سرکش گھوڑا ''ہیرا'' تھا۔ کوئی اسے سنبھال نہیں پاتا تھا مگر میں نے تھوڑی سی کوشش سے اسے سنبھال لیا۔ اس وقت مجھے

www.digestpk.com

Asifzamil




تھوڑا بہت اندازہ ہوا۔"

"کیا تمہیں اپنے بچپن کی کوئی ایسی بات یاد ہے جب کسی جانور نے تمہارے ساتھ خاص رویّے کا مظاہرہ کیا ہو؟"

عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ رچی صاحب نے اس طرز کے اور کئی سوال عمران سے پوچھے۔ پھر ٹی وی اسکرین پر وہ ویڈیو دیکھی گئی جس میں عمران، ٹائیگر اور چند دوسرے جانوروں کو تربیت دیتے ہوئے نظر آتا تھا۔ اس ویڈیو کو دیکھنے کے دوران میں رچی صاحب نے کئی بار "ونڈرفل اور امیزنگ" کے الفاظ استعمال کیے۔

اگلے روز عمران کا عملی امتحان تھا۔ پنجرے میں بند خوفناک سینٹ برنارڈ کتے کو ٹریننگ والے احاطے میں چھوڑا گیا۔ اب عمران کو اس احاطے میں داخل ہونا تھا۔ عمران کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور صورتِ حال میں کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا لیکن اس کا ہلکا سا احساس عمران کی چھٹی حس کو ضرور ہو رہا تھا... وہ مختصر احاطے میں داخل ہوا۔ اس کے چاروں طرف دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگائے گئے تھے۔

سینٹ برنارڈ کا انداز خطرناک تھا۔ وہ اپنی دُم کو تیزی سے گردش دے رہا تھا اور اس کے چوڑے جبڑے میں سے نکیلے دانتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ عمران نے اسے پچکارا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کتا چند قدم آگے بڑھا۔ عمران نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور اسے شانت رہنے کا اشارہ دیا۔

وہ ذرا سا جھجکا لیکن اگلے ہی لمحے بھیانک انداز میں عمران پر جھپٹا۔ عمران کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لحظے کی دیر ہوتی تو اس کا نرخرہ ادھڑ چکا ہوتا۔ جانور کے بالوں کا لمس اُس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اس کی حیوانی بو اس کے نتھنوں میں گھسی۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ بڑے تہلکہ خیز تھے۔ بپھرا ہوا کتا عمران کو ذرا خاطر میں نہیں لایا۔ یہ صرف عمران کی غیر معمولی پھرتی تھی جس نے اسے کتّے کے تند و تیز حملوں سے بچایا... جان صاحب کے گارڈز نے رائفلیں تان لی تھیں۔ جان صاحب چلّا رہے تھے۔ "باہر آ جاؤ... جلدی کرو۔"

رچی صاحب بھی کچھ اسی طرح کا واویلا کر رہے تھے۔ عمران نے ہنگامی راستہ استعمال کیا اور ٹریننگ والے احاطے سے باہر آ گیا۔ عمران حیران تھا اور اس سے بھی زیادہ دیگر لوگ حیران تھے۔ اسی احاطے میں انہوں نے ٹائیگر جیسے خطرناک جانوروں کو عمران کے اشارے پر چلتے اور اس کی گود میں سر رکھتے دیکھا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں عمران پر یہ انوکھا انکشاف ہوا کہ اس کے اور جانوروں کے درمیان جو ایک غیر معمولی و خصوصی تعلق تھا، وہ ختم ہو چکا ہے یا بہت ماند پڑ چکا ہے۔ وہ ٹائیگر کے پاس گیا، سفید ریچھ کے پاس گیا، اسٹار سرکس کی معروف ہتھنی نازو کے پاس گیا، ہر جگہ اس کا یہ احساس قوی تر ہوا کہ صورتِ حال بدل چکی ہے۔

دوسرے روز رچی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے عمران سے تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے بارے میں جو اندازے لگائے تھے، وہ درست ثابت ہوئے ہیں۔ بے شک کل تم کسی بھی طرح کی کارکردگی دکھانے میں ناکام ہوئے ہو... لیکن تمہاری یہ غیر متوقع ناکامی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے اندر وہ خاص صلاحیت موجود ہے جس کے بارے میں، میں اور میرے ساتھی غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس صلاحیت کا کچھ عرصے کے لیے اوجھل ہو جانا ہی اس کی موجودگی کا ثبوت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں جی۔" عمران نے کہا۔

پروفیسر رچی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ "جانوروں کے ماہر اور نفسیات دان بڑے عرصے سے یہ بات مانتے ہیں کہ کچھ انسانوں اور جانوروں میں ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی ایک طرح کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کی مقناطیسیت حیوانوں کی مقناطیسیت سے ایک جدا "لنک" بنا لیتی ہے۔ عام طور پر یہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے مگر اپنی کوشش اور محنت سے اسے بہت بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس صلاحیت کو ANIMAL MASTERY کہا جاتا ہے۔ مسمریزم سمجھتے ہو تم؟" رچی صاحب نے آخر میں عمران سے پوچھا۔

"جی... جسے ہپناٹزم کہتے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ عرصہ پہلے فرانز مسمر نام کا شخص ہوا کرتا تھا۔ اسی کے نام سے مسمریزم کا لفظ نکلا۔ فرانز مسمر نے بھی اسی خاص قسم کی کشش کی بات کی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کشش سے حیران کن نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جدید دور میں بھی جانوروں کو ہپناٹائز کرنا ایک ٹھوس حقیقت کی طرح جانا جاتا ہے۔" اس کے بعد پروفیسر رچی نے اس


www.digestpk.com

Asifzamil

حوالے سے چند ایک مثالیں دیں۔

پروفیسر رچی کی کہی ہوئی باتیں بہت اہم اور توجہ طلب تھیں لیکن عمران کو اس ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی رہی ہی نہیں تھی۔ کسی صلاحیت کا حاصل ہو جانا... کھو جانا... اور پھر دوبارہ ملنے کی امید ہونا... یہ سب اس کے لیے بے معنی باتیں تھیں۔ وہ تو کسی اور ہی آگ میں جل رہا تھا، کسی اور ہی اذیت سے گزر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سچ مچ چلی گئی ہے... ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ گئی ہے۔ امید آس کی ہلکی سی کرن بھی نہیں چھوڑ گئی جس میں اسے اپنی زندگی کی شکل نظر آسکے۔ اس نے بارہا سوچا تھا کہ وہ کیسے گئی ہوگی۔ جب وہ اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر گری ہوگی تو اس نے کیا سوچا ہوگا؟ کیا آخری بار اس نے اسے یاد کیا ہوگا؟ اس کے دل نے اسے آواز دی ہوگی؟ آہ... برسوں کی پیار کہانی کتنی جلدی ختم ہوئی تھی۔ بس دو چار ماہ کے اندر ہی ان کی جدائی ہوئی۔ وہ دلہن بنی اور پھر قبر میں جا سوئی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ عمران کی آنکھوں میں چمکتی رہتی۔ اس کے سادہ فقرے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے اور اس کی دلکش ہنسی عمران کی روح کو چرکے لگاتی رہتی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھی، کتنے سہانے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں... اور ایک آٹھ ایم ایم کی گولی نے وہ سب کچھ ختم کر ڈالا تھا۔

عمران اسے بھولنا چاہتا تھا مگر بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ راتوں کو دیوانہ وار خوشاب شہر کی گلیوں میں پھرتا، شراب پیتا، جھگڑے کرتا اور پھر نڈھال ہو کر سو جاتا۔ اس کی دلیری اور بے خوفی کے چرچے ہونے لگے۔ یہ چرچے دو طرح کے تھے۔ ایک تو وہ پھڈے اور جھگڑے تھے جن میں وہ بے دریغ ''انوالو'' ہو جاتا تھا۔ دوسرے سرکس میں اس کی خطرناک پرفارمنس تھی... جانوروں سے دور ہونے کے بعد اس نے دیگر شعبوں کی طرف خطرناک تیزی کے ساتھ غیر معمولی توجہ دی اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔ ''موٹر سائیکلسٹ بادشاہ'' کا سرکس سے معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی عمران نے اس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے بھی خاطر خواہ مدد کی۔ اب وہ موت کے کنوئیں میں شان دار پرفارمنس دینے کے قابل ہو گیا تھا... بلکہ کچھ آئٹمز میں بادشاہ سے دو ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔

اس کے لیے بدترین خطرات کے لیے ایک بھوک سی پیدا ہو چکی تھی۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ وغیرہ کے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے جھولوں پر بازی گری بھی شروع کر دی... اس کی غیر معمولی دلیری و بے خوفی اسے ہر دلعزیز بنا رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں کسی ناتواں لاچار شخص پر زیادتی ہوتے دیکھتا، سینہ تان کر اس کے دفاع میں کھڑا ہو جاتا اور اس حوالے سے اپنی جان کی بھی پروا نہ کرتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ احسان مند شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسے اپنے اردگرد سے محبتیں ملنے لگیں۔ لوگ اس سے اپنایت محسوس کرنے لگے اور مشکل وقت میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی طرف اٹھنے والی التفت بھری نظریں اس کے اندر دھیرے دھیرے ایک تبدیلی کو راہ دینے لگیں۔ اسے اپنی بیکار زندگی کا موہوم سا مقصد نظر آنے لگا۔ وہ اپنے اردگرد ایسے آنسو تلاش کرنے لگا جنہیں پونچھ سکے... ایسے بے وسیلہ لوگ ڈھونڈنے لگا جن کا وسیلہ بن سکے۔ اس کی تباہ حال زندگی غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ اختیار کرنے لگی۔ اب اس کے لباس میں ہر وقت بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا لیکن یہ ریوالور زیردستوں کے لیے نہیں، ان زبردستوں کے لیے تھا جو محبت کی زبان نہیں سمجھتے۔ عام لوگوں کے لیے تو وہ سراپا مہر تھا۔ وہ بڑی اپنایت سے اسے عمران بھائی اور ہیرو بھائی جیسے القابات سے نوازتے تھے۔

جان صاحب کے اسٹار سرکس میں کئی خوبرو لڑکیاں تھیں۔ عمران کی مردانہ وجاہت اور اس کی غیر معمولی دلیری صنفِ مخالف کو بڑی شدت سے اپنی طرف کشش کرتی تھی۔ دو تین لڑکیاں ہر وقت عمران کی قربت کی خواہش مند رہتی تھیں... مگر وہ تو یہ باب اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند کر چکا تھا... ان میں سے صرف ایک لڑکی تھی جسے وہ کسی حد تک قابلِ توجہ سمجھتا تھا لیکن وہ بھی ایک عورت کی حیثیت سے نہیں، صرف ایک ''مصیبت زدہ'' کی حیثیت سے۔ اس کا نام شاہین تھا۔ شاہین اور اس کے اہلِ خانہ ایک شاطر عامل کے چکروں میں پھنسے ہوئے تھے... وہ شخص نہ صرف ان سفید پوش لوگوں سے ہزاروں روپے بٹور چکا تھا بلکہ اپنی عیاریوں کے ذریعے اس نے ان کا مکان بھی اپنے ایک چہیتے مرید کے پاس گروی رکھوا دیا تھا۔ شاہین، عمران کے ساتھی فن کاروں میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس لیے بھی شاہین کی مدد ضروری سمجھتا تھا کہ اسے ان نام نہاد عاملوں اور جعلی پیروں، فقیروں سے خدا واسطے کا بیر پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آتشیں اسلحہ لے کر نکلتا اور جہاں کہیں اسے ایسی جاہلیت کا کوئی علم بردار نظر آتا، اسے بھون کر رکھ دیتا۔ جو کام شاہین اور اس کے سفید پوش گھر والے پچھلے تین برسوں سے نہیں کر سکے تھے، وہ عمران نے صرف دو روز میں



کر دیا۔ عامل کے چیلے نے نہ صرف مکان کا قبضہ چھوڑا بلکہ عامل نے اس رقم کا کافی حصہ بھی واپس کیا جو اس نے عملیات کے نام پر سادہ لوح گھرانے سے ہتھیایا تھا۔

شاہین، عمران کو کسی اور نظر سے دیکھنے لگی تھی لیکن عمران نے اس پر بالکل واضح کر دیا کہ اس کی زندگی میں اب عورت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہاں، اس کی دل جوئی کے لیے وہ اس سے ملتا بھی تھا اور ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتا تھا۔ کسی وقت اسے ڈر بھی لگتا کہ کہیں آگے جا کر ان کا تعلق کوئی اور رخ اختیار نہ کر لے لیکن پھر شبانہ کا غم بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے سینے کو بھر دیتا اور اسے یقین ہونے لگتا کہ اس مختصر سی زندگی میں تو یہ غم اسے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت نہیں دے گا۔ اسے شبانہ کے ساتھ اپنی ''وفا'' بالکل محفوظ نظر آنے لگتی اور یہی اس کی آخری خواہش تھی۔ وہ اس وفا کو آخری دم تک محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کی زندگی تبدیل ہونے لگی۔ اس نے خود کو دوسروں کی آسانیوں اور خوشیوں میں گم کر دیا۔ اپنے اردگرد کے نچلے طبقے سے اسے خاص طور پر وابستگی پیدا ہونے لگی۔ جاہلیت و توہم پرستی کے مسائل کا شکار لوگ اس کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرے۔

وہ اندر سے جھلس رہا تھا مگر اس کو اپنے ہونٹوں پر ہنسی سجانا آ گیا۔ اس کا کلیجا چھلنی تھا مگر اس نے خوش خلقی کو اپنے اشکوں کا پردہ بنا لیا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اور چہرے پر مسکان سجا کر ایک اور ڈھنگ سے جینے لگا۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ کے لیے وہ سگی اولاد کی طرح تھا۔ وہ اسے اپنے کاروبار میں کوئی انتظامی حیثیت دینا چاہتے تھے مگر عمران اپنے ڈھب سے جینے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ اب جان صاحب کے سرکس کا سب سے مقبول فن کار تھا... خطروں سے کھیلنا اس کی فطرتِ ثانیہ ہو گیا تھا۔ وہ ہیرو کہلاتا تھا اور شاید ایسا کہلانے کا حق دار بھی تھا۔ اپنی ماں کی یاد اور اپنی شبانہ کی تصویر کو سینے سے لگائے وہ اپنے ڈھنگ سے جیتا رہا... اور جیتا رہا۔

☆☆☆

... اب میں اسی جگہ واپس آتا ہوں جہاں سے عمران کی طویل کہانی شروع ہوئی تھی... ہاں، یہ زرگاں کی وہی پُرفسوں رات تھی۔ ساتویں کے جشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہو گیا تھا مگر آسمان پر ابھی تک گاہے بگاہے آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور قرب و جوار کو منور کر جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں آج سونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ موسیقی کی لہریں، نعروں کا شور، ہاتھیوں کی آوازیں، آتش بازی کی تڑتڑاہٹ یہ سب کچھ ایک دل نواز ارتعاش پیدا کرتا تھا اور ہر جان دار و بے جان شے ایک سرمستی میں ڈوب جاتی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے کئی خالی مگ رکھے تھے۔ عمران کے اردگرد سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ اس کی کہانی نے میرے دل میں عجیب سا گداز بھر دیا تھا۔ میں نے اس کے خوبرو چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک یادوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''ماں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا؟''

''نہیں۔'' اس نے نیا سگریٹ سلگا کر مختصر جواب دیا۔

''تم نے تلاش ختم کر دی؟''

''نہیں جگر! وہ تو زندگی کی آخری سانس تک ختم نہیں ہو سکتی۔ لیکن پتا نہیں کیوں، اب کبھی کبھی آس ٹوٹ جاتی ہے۔''

''تمہارا شیخوپورہ والا آبائی گھر تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں، کئی بار سوچا کہ اسے بیچ ڈالوں لیکن نہیں بیچا۔ پتا نہیں کیوں دل کہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اس گھر میں، میں اور ماں اکٹھے ہوں گے۔ اس کے صحن میں بیری کے نیچے بیٹھیں گے۔ اس کے کمروں میں ہماری آوازیں گونجیں گی۔ بڑی یادیں ہیں اس گھر کے ساتھ۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے کبھی بیچ سکوں گا۔''

''اور چودھری سجاول وغیرہ؟ چودھری کے وارثوں نے کبھی تم سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی؟''

عمران نے کہا۔ ''چودھرائن ڈیڑھ دو سال تو خاموش رہی۔ پھر اس نے پتا نہیں کس موڈ میں اپنے پتر نیاز اور داماد شیر افگن کے سامنے سب کچھ بک دیا۔ ان لوگوں نے مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی...''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا ہونا تھا۔'' وہ مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''تیرا یار اب ترنوالہ نہیں، لوہے کا چنا بن چکا ہے۔ تیری دعا سے نیازے اور افگن جیسے لوگ اب یہاں اس جیب میں رہتے ہیں۔'' اس نے اپنی جیب تھپتھپائی جیسے واقعی وہاں نیازا اور افگن موجود ہوں اور وہ انہیں تھپک رہا ہو۔

''اور... وہ تمہارا یار راجا؟''

عمران نے گہرا کش لیا۔ ''راجا، اپنی طرز کا وکھرا کریکٹر تھا۔ میں نے بہت روکا لیکن وہ اپنے شغلوں سے باز



www.digestpk.com

Asifzamil

نہیں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کی ہیرا منڈی کے قریب ایلیٹ فورس کے ہتھے چڑھ گیا۔ منشیات اور فراڈ کے تین سنگین کیسوں میں اسے سات سال قید کی سزا ہوئی۔ اب وہ پنجاب ہی کی کسی جیل میں ہے۔ کافی عرصے سے اس کی کچھ خبر نہیں...''

''اور شاہین؟''

عمران کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اور اقبال قریباً ایک سال پہلے پاکستان سے تمہارے کھوج میں روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ بقیدِ حیات تھی۔ میں اس پر زور دے کر آیا تھا کہ وہ منگنی شنگنی کرالے بلکہ میری واپسی تک اس کی شادی اور ایک آدھ بچہ بھی ہو جانا چاہیے۔ وہ خوب ہنسی تھی۔''

''کیوں؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ تین چار مہینوں میں واپس آجاؤں گا۔ اسے یقین تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں وہ بچہ پیدا نہیں کرسکتی۔ لیکن اب تو سال سے اوپر ہوگیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میری فرمائش پوری کردے۔''

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی تم... میرا مطلب ہے تمہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں؟''

''نہیں تابی!'' وہ پورے یقین سے بولا۔ ''میں اسے صاف بتا چکا ہوں کہ مجھ پر یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہے، ہنسی مذاق بھی ہے اور ایسا دیگر لڑکیوں کے ساتھ بھی ہے لیکن... میرے دل میں جو کچھ مر چکا ہے، وہ پھر زندہ نہیں ہوسکتا۔ شاید میں چاہوں بھی تو نہیں ہوسکتا۔ اِٹ از آل اوور۔ اور اب ان باتوں کو چھوڑو یار۔ تم ماضی میں بہت غوطے دے چکے ہو مجھے۔ اب میرا سانس ٹوٹنے لگا ہے۔ اب مجھے باہر نکالو ورنہ ساتویں کا جشن دیکھنے سے پہلے ہی میرا اپنا ساتواں اور دسواں ہو جائے گا۔''

وہ دھیرے دھیرے پھر اپنی مخصوص خوش گفتاری کی طرف پلٹ رہا تھا لیکن میرا دل اس کے لیے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہی لگ رہا تھا کہ معصوم صورت شبانہ کی ناگہانی موت میرے سامنے واقع ہوئی ہے اور میں اس سارے درد و کرب کا چشم دید گواہ ہوں جو چناب کے کنارے پیار کرنے والے دو دلوں کے حصے میں آیا اور جسے انہوں نے آنسوؤں کے دریا میں تیر کر جھیلا۔

میرا یہ قیافہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کا ڈسا ہوا ہے جو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں کسی عفریت کی طرح پنجے گاڑے ہوئے ہے۔

سادہ لوحی اور توہم پرستی کی کوکھ سے جنم لینے والی یہ دقیانوسیت عمران کی ہنستی بستی زندگی کو چاٹ گئی تھی اور ایسی نہ جانے کتنی زندگیاں قرنوں سے اس کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں۔ میں گہری نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''جب تم ایسے دیکھتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ ہپناٹزم سیکھ رہے ہو اور اس کا پہلا پہلا تجربہ مجھ پر کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو جگر! اناڑی جادوگر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ بندے کو غائب کر دیتا ہے اور پھر واپس نہیں لاسکتا... بعد ازاں ایسے جادوگر متاثرین کے ڈر سے قبائلی علاقے میں فرار ہو جاتے ہیں۔''

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ایک بات کہوں؟ تمہیں عجیب تو لگے گی لیکن ہے حقیقت۔''

''ہاں ہاں کہو۔ عجیب باتیں سننے کے لیے میں ہی تو رہ گیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ابنِ صفی مرحوم کا ایک کردار ہوا کرتا تھا علی عمران... کالج کے دور تک ہم نے اسے خوب پڑھا ہے۔ بڑی دلچسپ جاسوسی کہانیاں ہوتی تھیں اور کہانیوں سے زیادہ دلچسپی ہمیں اس اوٹ پٹانگ کردار میں ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے تمہارا نام بھی عمران ہے، صرف اس میں دانش کا اضافہ ہے۔ مجھے تمہارے اندر اس کردار کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں تم اس کردار کا دوسرا جنم تو نہیں ہو؟''

''دیکھو، اب تم نے ہندوؤں میں رہ کر ہندوؤں جیسی باتیں شروع کر دی ہیں۔ کل تم یہ بھی کہو گے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں بلکہ دھرم پتنی ہے اور تم اسے پیار نہیں کرتے بلکہ پریم کرتے ہو اور تمہارا بچہ دراصل ''پوشل'' کے بغیر ہنومان کا چالیسواں جنم ہے۔''

''ہاں ہاں، وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''فرق صرف یہ ہے کہ ابنِ صفی کے مطابق وہ تم سے ذرا کم خوب صورت اور تم سے ذرا زیادہ عقلمند تھا اور اس کی کرسچین محبوبہ ابھی زندہ تھی اور وہ درِ پردہ ایک بڑا سرکاری عہدیدار تھا... سیکرٹ سروس کا چیف وغیرہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ادیبوں اور دیگر فن کاروں کا ذہن تخلیق کرتا ہے، وہ سراسر خیالی نہیں ہوتا۔ چاہے اس میں کتنی بھی فینٹسی ہو، اس جیسی یا اس سے ملتی جلتی چیزیں اس دنیا میں فی الواقع موجود ہوتی ہیں۔ شاید تم بھی ایک ایسی ہی ملتی جلتی چیز ہو۔''

اچانک ایک دھماکا ہوا اور ہماری گفتگو کو بریک لگ



گئے۔ یہ دھماکا عمارت کی بیرونی دیوار کے اندر ہوا تھا۔ یہ زیادہ زوردار نہیں تھا۔ کسی کریکر یا آتش بازی والے بم کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ عمارت سے باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور نعرہ زنی کر رہے ہیں۔

رات کے اس پہر یہ صورتِ حال تعجب خیز تھی مگر آج تو یہ شاید رات ہوئی ہی نہیں تھی۔ زرگاں کی بیشتر آبادی ناچ گانے اور عیش عشرت میں مصروف تھی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

''لگتا ہے کہ کچھ لوگ شاید تم پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔ آوازیں غور سے سنو۔''

مدھم آوازیں اب ہمارے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ انہیں زیادہ وضاحت سے سننے کے لیے عمران نے ایک کھڑکی وا کردی۔

''قاتل ہے... پھانسی دو... زندہ جلاؤ۔'' اس طرح کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر کسی نے نعرہ مارا۔ ''سامبر مقابلہ۔''

جواب میں بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔ ''نامنظور۔''

یہ نعرہ کئی مرتبہ دہرایا گیا اور مظاہرین میں ہلچل نظر آنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عمارت کے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوائی فائرنگ شروع ہوگئی۔ یقیناً یہ فائرنگ اسپیشل گارڈز کر رہے تھے جو ہماری حفاظت پر یہاں مامور تھے۔

کچھ ہی دیر بعد یہ ہنگامہ سرد ہوگیا اور مظاہرین جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی، منتشر ہوگئے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے نئی نہیں تھی، ہمیں معلوم تھا کہ زرگاں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو جارج گورا جیسے ''مہمان شخص'' سے میرے دوبدو مقابلے کا مخالف ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ میں ایک معمولی شخص ہونے کے ساتھ ساتھ اسٹیٹ کا مجرم بھی ہوں۔ جارج کے ساتھ دوبدو مقابلے کے پروگرام نے مجھے جارج کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم دونوں کے حقوق برابر ہوگئے ہیں اور یہ کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

علی الصباح میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا۔ ''وہ مٹھی بھر لوگ تھے۔ گارڈز کی ہوائی فائرنگ سے منتشر ہوگئے۔'' پھر وہ دھیمی آواز میں رازداری کے لہجے میں بولی۔

''میرے خیال میں یہ بھی تم پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ مقابلے سے پہلے یہ لوگ تمہیں زیادہ سے زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انتظامیہ چاہتی تو یہ مٹھی بھر لوگ یہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں کہیں دور ہی روک لیا جاتا۔ جیسے دوسرے لوگوں کو روکا گیا...''

''دوسرے لوگ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''کل رات تمہارے حق میں بھی بہت سے لوگ نکلے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کا جلوس تو ہوگا۔ یہ لوگ تمہاری جیت کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں غصہ بھی تھا۔ کسی طرح یہ خبر نکل ہی گئی ہے کہ کل تم پر پھر حملہ ہوا ہے۔ غسل خانے کے نلکے میں کرنٹ چھوڑ کر تمہاری جان لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ لوگ احتجاج کرتے ہوئے یہاں تک آنا چاہتے تھے اور شاید اس سے آگے راج بھون بھی جانا چاہتے ہوں لیکن گارڈز نے انہیں روک لیا اور مار پیٹ کر منتشر کر دیا۔''

وہ جشن کا دن تھا۔ اس روز میں نے اور عمران نے زرگاں میں حیرت انگیز نظارے دیکھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں کے بیشتر باشندے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں اور انہوں نے خود کو مستیوں میں غرق کرلیا ہے۔ جشن کا ایک اہم نظارہ ہاتھیوں کا جلوس تھا۔ یہ جلوس دوپہر کے فوراً بعد راج بھون سے روانہ ہوا۔ اسے شہر کے اہم راستوں سے گزر کر شام کے بعد واپس راج بھون پہنچنا تھا۔ ہماری قیام گاہ کے سامنے سے یہ شان دار جلوس سہ پہر کے وقت گزرا۔ یہ درجنوں سجے سجائے ہاتھی تھے۔ ان پر خوب صورت ہودے تھے اور ہودوں میں زرگاں کے معزز مرد و زن تھے۔ جلوس کے راستے کی دونوں جانب سیکڑوں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کھڑکیوں، چوباروں اور چھتوں پر بھی اہلِ زرگاں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ جلوس میں سب سے آگے جو دیوہیکل ہاتھی تھا، وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔ اس کی سجاوٹ بھی دیدنی تھی۔ اس کے ہودے میں حکم جی اپنی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کے ساتھ موجود تھا۔ رتنا کو بچہ تولد ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے پھر بھی وہ تمام مصروفیات میں حصہ لے رہی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ وہ پیچھے رہی تو کوئی دوسری رانی اس کی جگہ لے لے گی۔

دور و یہ کھڑے لوگ جلوس پر گل پاشی کر رہے تھے۔ جواباً شاہی ہاتھیوں پر سے عوام الناس پر سکوں کی بارش کی جارہی تھی۔ ہم یہ سب کچھ لال بھون کی چھت کے اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ نعروں اور باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔



www.digestpk.com

Asifzamil

''کاش میں بھی ایک ہاتھی ہوتا۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''کیوں، ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دیکھو۔'' عمران نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، ایک ہاتھی کی سونڈ میں ایک خوبرو نیم برہنہ لڑکی بیٹھی تھی اور تماشائیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو یہ ہتھنی ہے۔ کیا تم ایک لڑکی کو اپنی سونڈ پر بٹھانے کے لیے ہتھنی بننا پسند کرو گے؟''

''یہ ہتھنی ہو ہی نہیں سکتی۔'' عمران نے وثوق سے کہا۔ ''تم دیکھ نہیں رہے ہو، وہ کتنا خوش ہے۔ کتنی طاقت آ گئی ہے اس کی سونڈ میں۔ یہ محاورہ بالکل درست ہے کہ ہاتھی اور مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

''یہ محاورہ گھوڑے اور مرد کے بارے میں کہا گیا ہے۔'' میرے اور عمران کے عین پیچھے کھڑی گیتا مکھی نے کہا۔

ہم نے مڑ کر اسے دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں کی یہ بے باک استاد ہمیشہ کی طرح ہوشربا لباس میں تھی۔ اپنی عادت کے مطابق وہ گفتگو کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''لگتا ہے گیتا دیوی تمہیں ایسے ''محاوروں'' میں خاصی دلچسپی ہے۔''

''تمہیں نا ہیں ہے؟'' وہ نیم باز آنکھوں سے بولی۔

''ہوتی تو غلط محاورہ نہ بولتا۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسا گیتا دیوی، تمہیں آج کے دن تو کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنے کپڑوں پر بالکل بھی پیسے خرچ نہیں کیے۔ اتنا تھوڑا سا لباس۔ یہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔''

وہ بے باکی سے مسکرائی۔ ''اور تم اسے کنجوسی کہہ رہے ہو؟ یہ تو فراخ دلی ہے... زرگاں کی بیشتر عورتیں آج کے دن ایسی ہی فراخ دل ہو جاتی ہیں۔''

''کیا تم بھی ''بیشتر'' عورتوں میں شامل ہو؟''

''ہاں... لیکن ہر کسی کے لیے نا ہیں۔'' وہ عمران کو خاص نظروں سے دیکھ کر بولی اور تھوڑا سا اس کی طرف کھسک آئی۔

عمران نے جلدی سے موضوع بدلا اور گیتا سے پوچھا کہ یہ جلوس یہاں سے گزر کر کس طرف جائے گا۔ گیتا نے بتایا کہ یہاں پاس ہی ایک اسٹیڈیم نما جگہ ہے جہاں بہت سے کھیل تماشے ہو رہے ہیں۔ جلوس کے شرکا کچھ دیر تک وہاں رکیں گے پھر راج بھون روانہ ہو جائیں گے۔ راج بھون میں آج جشن کی رات ہے۔ کل چونکہ زرگاں میں عام چھٹی ہے، اس لیے یہ جشن رات گئے تک جاری رہے گا۔ سات پریوں کا انتخاب اور اس کے علاوہ بھی بہت سی تقریبات ہوں گی۔

زرگاں کی وہ رات قابلِ دید تھی۔ گھروں پر چراغاں کیا گیا۔ دیسی گھی کے دیے روشن ہوئے۔ انواع واقسام کے پکوان بنائے گئے اور لوگوں نے زرق برق لباس پہنے۔ مجھے اور عمران کو علم نہیں تھا کہ ہم بھی راج بھون جا سکیں گے یا نہیں؟ تاہم شام سے تھوڑی دیر پہلے میڈم صفورا نے مجھ سے کہا۔ ''حکم جی نے تمہیں راج بھون آنے کی اجازت دی ہے لیکن یہ اجازت مشروط ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے کہ جارج صاحب بھی وہیں موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر طیش میں آ سکتے ہیں یا تمہاری طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس لیے تم عام حاضرین میں نہیں بیٹھو گے بلکہ ایک گیلری تک محدود رہو گے اور وہیں سے جو کچھ دیکھ سکو، دیکھو گے۔ ہاں، عمران میرے گارڈز میں شامل ہو کر میرے ساتھ رہے گا اور ہر جگہ جا سکے گا۔''

شام سے کچھ دیر پہلے ہی مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ میڈم صفورا اور منیجر مدن وغیرہ بھی میرے ساتھ موجود تھے۔ نہایت سخت حفاظتی انتظامات میں ہم راج بھون کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے جشن کے پُرجوش مناظر دیکھے۔ جگہ جگہ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نوجوان رقص کر رہے تھے۔ راستوں پر شراب کی خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ ہیجڑے بھی رنگین کپڑوں میں ملبوس، اس گہما گہمی کا حصہ تھے۔ وہ نہر جو راج بھون کی عظیم الشان سیڑھیوں کے پاس سے گزرتی تھی، کشتیوں اور رنگ برنگے تفریحی بجروں سے بھری ہوئی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں بادبان چمک رہے تھے اور موسیقی کی لہریں پھیل رہی تھیں۔

ہم راج بھون کے سامنے پہنچے تو روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ سارا بھون دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ خوب صورت فواروں سے ہفت رنگ پانی کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں... رنگین آنچل لہراتے تھے اور قہقہے بکھرتے تھے۔ گارڈز کے کڑے نرغے میں مجھے راج بھون کے اندر پہنچایا



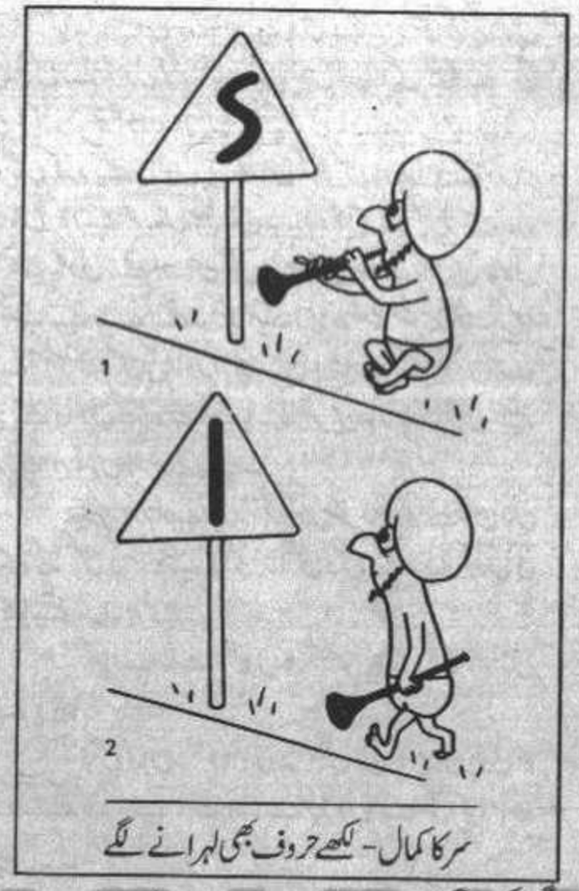


سرکا کمال - لکھے حروف بھی لہرانے لگے

گیا اور مختلف راہداریوں سے گزار کر ایک گیلری میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی اور نشستیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک بہت بڑا مخملی پردہ کھچا تھا۔ اس پردے کی دوسری جانب سے خوشبوؤں کی لپٹیں آتی تھیں اور سریلے قہقہے سنائی دیتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پردے کی دوسری جانب بہت سے لوگ موجود ہیں۔

میڈم صفورا اور منیجر مدن کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی اس گیلری میں موجود تھے۔ یہ بھی زرگاں کے معزز باشندوں میں سے تھے۔ ان سب کی نظروں میں میرے لیے بے پناہ دلچسپی موجود تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے اور پھر چور نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ میں ان کے لیے بے حد توجہ کی چیز تھا۔ صرف دو دن بعد راج بھون کے سامنے جارج گورا سے میرا دوبدو مقابلہ ہونے والا تھا... فائٹ ٹل ڈیتھ۔ میں نے ایک ایسے شخص کو للکارا تھا جس کے مقابلے میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ غالباً یہ لوگ مجھے ایک چلتی پھرتی لاش کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ یہی حال ان گارڈز کا بھی تھا جو اس بالکونی نما گیلری میں میری حفاظت پر مامور تھے۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے تاکتے تھے جیسے نگاہوں نگاہوں میں مجھے تولتے ہوں اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوں کہ میں جارج گورا جیسے فائٹر کے سامنے کتنی دیر تک کھڑا رہ سکوں گا۔

میری تیاریوں اور رہن سہن کے حوالے سے بھی بہت سی سچی جھوٹی باتیں پھیل چکی تھیں۔ ان باتوں کا علم ہمیں زیادہ تر گیتا مکھی اور میڈم صفورا سے ہی ہوتا تھا۔ مثلاً یہ بات پتا نہیں کیسے پھیل گئی تھی کہ میں گھنٹوں برف کی سل پر لیٹا رہتا ہوں اور اپنے جسم کو زہریلے کیڑوں سے ڈسواتا ہوں جس سے میرے جسم کی کھال بالکل بے حس ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، یہ بے بنیاد بات تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد نیم تاریک گیلری کا مخملی پردہ ہٹایا گیا۔ سامنے کا منظر ہوش ربا تھا۔ یہ وہی وسیع و عریض بغیر ستون کا ہال تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ آج یہ ہال پہلے سے زیادہ مرصع و مزین نظر آتا تھا۔ ہال کی گنبد نما چھت پر مصنوعی ستاروں کی برات تھی اور چاند دلہا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ تین آبشاروں کا پانی وسیع تالاب میں گرتا تھا۔ اس تالاب میں چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ راجواڑے کے اُمراء خوش پوش نازنینوں کے ساتھ مصروفِ سیر تھے۔ تالاب کے کنارے ناچنے والیوں نے مختصر ترین لباس پہن رکھے تھے۔ سخت سردی میں وہ یہ مظاہرہ کرنے میں اس لیے کامیاب ہوئی تھیں کہ اس سارے چیمبر کو مصنوعی طریقے سے گرم کر دیا گیا تھا۔

میڈم صفورا نے ٹھیک کہا تھا۔ اس وسیع ہال کے بیچوں بیچ نصب فوارے میں سے آج پانی کی جگہ شراب پھوٹ رہی تھی اور فوارے کے گرد بنے ہوئے بلوری حوض میں جمع ہو رہی تھی۔ اس حوض سے جام بھر بھر کر پیئے جا رہے تھے اور ''پینے والے'' اپنی ساتھی حسیناؤں کے ساتھ بے تکلف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آج کی شب کے لیے سارے قانونی و اخلاقی قاعدے ضابطے معطل ہو چکے ہیں... اور یہاں کی جلوت... خلوت بن گئی ہے۔

ایک طرف ڈانسنگ فلور بنا ہوا تھا۔ یہاں موسیقی کی دھنا دھن پیر جوڑے محوِ رقص تھے۔ انہی جوڑوں میں ایک بلند قامت شخص نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ میرا مدمقابل جارج گورا تھا۔ ایک مقامی حسینہ کو اپنے ساتھ پیوست کیے وہ محوِ رقص تھا۔ پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میری نگاہ حکم جی پر پڑی۔ وہ ایک بلند مرمریں چبوترے پر اپنی تینوں رانیوں کے ساتھ تشریف فرما تھا۔ اس کے گرد بھی جام گردش کر رہے تھے اور خوش بدن شاہی خادمائیں چکرا رہی تھیں۔ کئی دیگر مصاحبین بھی اس چبوترے پر حکم کے عقب میں موجود تھے۔

کچھ دیر بعد اس وسیع ہال میں جیسے رنگ و نور کا سیلاب



www.digestpk.com

Asifzamil

سا آ گیا۔ روشنیوں کے زاویے بدل گئے۔ موسیقی کی پُرجوش تانوں نے ماحول کو گرمایا۔ وہ چالیس حسینائیں جگمگاتے اسٹیج پر ایک ساتھ نمودار ہوئیں جو پچھلے کئی ماہ سے اس تیاری میں تھیں کہ دیکھنے والوں پر بجلیاں گرائیں اور ان کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں جکڑ لیں۔ یہ زرگاں کے گلشنِ حسن کے منتخب پھول تھے اور ان میں سے آج سات بہترین پھول منتخب کیے جانے تھے۔ اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا حشر خیز تھا۔ لڑکیوں نے مشترکہ رقص کیا اور اپنے حسن و شباب کے جلووں سے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا۔ حاضرین بار بار تالیاں پیٹتے رہے اور آہیں بھرتے رہے۔

میڈم صفورا نے کہا۔ ''لڑکیوں کا کمال تو ہے لیکن اس میں گیتا بکھی کی ٹریننگ کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ یہ لڑکیوں کی کایا پلٹنے میں ماہر ہے۔''

''کیا اب سات لڑکیوں کا سلیکشن ہو جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کہاں۔'' وہ بولی۔ ''ابھی ان کا ایڑی چوٹی کا زور لگے گا۔ اپنے بہت سارے کپڑوں سے بھی محروم ہو جائیں گی۔''

اس کے بعد اگلا دور شروع ہوا۔ لڑکیوں نے لباس تبدیل کیے اور کیٹ واک کے انداز میں ایک ایک کر کے اسٹیج پر آنا شروع کیا۔ ان کی چال، مسکراہٹ، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، خوش لباسی، سب کچھ نوٹ کیا جا رہا تھا۔ منصف خواتین و حضرات کی تعداد دس کے قریب تھی۔ وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ حاضرین خاموش رہ کر یا تالیاں بجا کر ان کی مدد کر رہے تھے۔

اس کے بعد آخری مرحلے کا آغاز ہوا۔ یہ بھی بڑا سنسنی خیز تھا۔ دوشیزائیں مختصر لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ وہ پانچ پانچ کی ٹولیوں میں آئیں۔ انہوں نے رقص کے مختلف انداز اپنائے اور داد وصول کی۔ بعد ازاں چالیس کی چالیس لڑکیاں اکٹھی نمودار ہوئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز سے رقص کیا۔ پھر وہ اسٹیج سے اتر کر وسیع ہال میں چلی گئیں۔ انہوں نے حاضرین کے درمیان پرفارمنس دی۔ آخر یہ طویل کارروائی ختم ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ان لڑکیوں میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چن لی گئیں۔ یہ سات لڑکیاں تالیوں کی گونج اور پھولوں کی بارش میں چبوترے پر آئیں۔ انہوں نے باری باری حکم اور اس کی تینوں بیویوں کے چرن چھوئے۔ تب وہ حکم، جارج، اسٹیل اور دیگر حکام کے قدموں میں فرش پر بیٹھیں اور تصویریں بنوائیں۔

اس اہم مرحلے کے بعد شراب نوشی کا دور شروع ہوا۔ ساتوں پریاں حکم اور اس کے مصاحبین و بیگمات کے لیے ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔ اس پُرشکوہ و شان دار شاہی ضیافت کے بعد حاضرین ہاتھوں میں قہوے کی پیالیاں اور جام وغیرہ لیے پھر سے اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔ ایک عجیب سی سرمستی نے ہر ذی نفس کو گھیرا ہوا تھا۔ اب زیادہ تر بیگمات یہاں سے جا چکی تھیں۔ مرد حضرات رہ گئے تھے یا وہ حسینائیں جو آج کے دن اپنے حسن و شباب کا سارا سرمایہ اپنے پرستاروں پر لٹانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ ان میں سے کچھ خود بھی ''شیری'' طرز کا مشروب پی رہی تھیں اور اپنے ساتھی مردوں کی بے باکی کو خوش دلی سے قبول کر رہی تھیں۔ ان میں مجھے جارج گورا اور اسٹیل وغیرہ بھی نظر آئے۔ جارج گورا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ایک مقامی حسینہ کو اپنی بغل میں لیے وہ اس نہایت مضبوط بلوری شوکیس کے پاس بیٹھا تھا، جس میں پگھلا ہوا سونا ہلکورے لیتا تھا اور لڑکی کی برہنہ مورتی اس میں ڈوبتی ابھرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ پرسوں کا انتظار نہ کروں۔ آج ہی سارے بندھن توڑ کر اس گورے عیاش پر جا پڑوں اور اسے اس پگھلے ہوئے سونے میں ایک مکمل غوطہ دے دوں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ میں صرف سوچ سکتا ہوں۔ عمران بھی اسی نیم تاریک گیلری میں میڈم صفورا کے سیکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے موجود تھا۔ میری اور اس کی نظر گاہے بگاہے ملتی تھی۔ اچانک عمران مجھے چونکا ہوا نظر آیا۔ میں نے دیکھا، وسیع و عریض حال میں ایک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ایک شخص نے رم کی ایک خالی بوتل کے اوپر لکڑی کا ایک مستطیل ٹکڑا رکھا اور اس پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے لکڑی کے ٹکڑے پر ایک اور خالی بوتل رکھی اور اس پر لکڑی کا ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر بھی اپنا توازن برقرار کیا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا مگر چوتھی بوتل پر کھڑا ہونے کی کوشش میں وہ گر گیا اور بوتلیں لڑھک گئیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے میڈم سے پوچھا۔

''یہاں کا بہت پرانا کھیل۔ رم کی خالی بوتلوں کو اوپر نیچے رکھ کر ان پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے، ایک جشن کے موقع پر رتنا دیوی نے ترنگ میں آ کر یہ آفر کر دی تھی کہ جو شخص اس طرح آٹھ بوتلوں کے اوپر کھڑا ہو جائے گا وہ اسے شاہی اصطبل کے



بہترین آٹھ گھوڑے انعام میں دے گی۔ اس کے علاوہ وہ طلائی زیورات کا بھی حق دار ہو گا۔''

''کون سے زیورات؟'' میں نے پوچھا۔

''رتنا دیوی کی جیولری۔ یعنی وہ جیولری جو ان کی ملکیت ہے۔ حکم جی کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی ہونے کی حیثیت سے رتنا دیوی کے پاس سب سے زیادہ جیولری ہے۔ قریباً تین باکس بھرے ہوئے ہیں جن کے کل وزن کا شاید رتنا دیوی کو بھی نہیں پتا۔ رتنا دیوی نے کہا ہوا ہے کہ جو اس شرط کو پورا کرے گا، وہ جیولری باکس میں سے دو مٹھی بھر کر زیورات لے سکتا ہے۔ اب اس کی قسمت کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔ دو مٹھیوں میں کچھ نہیں تو لاکھوں کے زیورات تو آ ہی سکتے ہیں۔ یہ جڑاؤ زیورات معمولی قیمت کے تو نہیں ہوں گے۔''

''عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''ان راجوں مہاراجوں کی تفریحات اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ دینے پر آئیں تو بے وجہ لاکھوں کروڑوں لٹا دیں، نہ دیں تو پھوٹی کوڑی کے بدلے جان لے لیں۔ اب پچھلے تین چار سال سے شغل بنا ہوا ہے کہ کھانے کے بعد جب لوگ گپ شپ کے لیے بیٹھتے ہیں تو یہ کھیل شروع کر دیتے ہیں۔ اچھا، وہ دیکھو... آج وہ بھی قسمت آزمانے آئی ہے۔''

''کون؟''

''اووہی مس انڈیا... وہ دیکھو ننگی ٹانگیں چلاتی آ رہی ہے۔'' میڈم صفورا نے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہاں، یہ وہی سولہ سترہ سالہ تیز طرار لڑکی تھی جس نے لال بھون میں ریہرسل کے دوران میں جمناسٹک کا شان دار مظاہرہ کیا تھا۔ بعد ازاں اس نے عمران سے بحث بحثی شروع کر دی تھی۔ اس تکرار کا انجام یہ ہوا تھا کہ عمران نے اس لٹل مس انڈیا سے مقابلہ کیا تھا اور بعد ازاں جان بوجھ کر ہار گیا تھا۔ اس ہار کے اندر جو جیت چھپی ہوئی تھی، اس کا پتا ہمیں بعد میں چلا تھا۔

آج یہ لٹل مس انڈیا پھر میدان میں تھی۔ کھیل تماشوں میں حصہ لینے والے دو اور نوجوانوں نے آٹھ بوتلوں والی شرط پوری کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک نوجوان باقاعدہ ''جگر'' تھا۔ وہ بھی پانچویں بوتل کے بعد توازن برقرار نہ رکھ سکا اور قہقہوں کے درمیان قالین پر گر گیا۔ گرنے والوں کو ہلکی پھلکی خراشیں بھی آ رہی تھیں۔ تاہم موج مستی کے اس ماحول میں چھوٹی موٹی چوٹوں کی پروا نہیں کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لٹل مس انڈیا کی باری آ گئی۔ وہ زیادہ بااعتماد نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ اس کی ٹریننگ کا حصہ نہیں تھا۔ بہرحال انعام کے لالچ میں وہ قسمت آزمائی کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے کھیل کا آغاز کیا۔

وہ رم کی بوتل رکھتی پھر اس پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھتی اور کھڑی ہو جاتی۔ بہتر توازن حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی۔ معاون لڑکی رم کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتی۔ لٹل مس انڈیا بوتل کو بڑے دھیان سے لکڑی کے ٹکڑے پر جماتی۔ جس مستطیل ٹکڑے پر وہ کھڑی ہوتی تھی، وہ شمالاً جنوباً ہوتا تو وہ اوپر والا ٹکڑا شرقاً غرباً رکھتی تاکہ نچلے والے ٹکڑے پر پاؤں جمے رہیں۔

اسی طریقے سے وہ ساتویں بوتل تک پہنچ گئی۔ حاضرین نے سانسیں روک لیں۔ میڈم نے کہا۔ ''یہ ہائیسٹ اسکور ہے بھئی... اگر...''

ابھی میڈم کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ بوتلوں کا مینار ٹوٹا اور وہ دھڑام سے نیچے گری۔ کچھ قہقہے ابھرے لیکن زیادہ تر لوگوں نے تالیاں بجا کر لڑکی کی ہمت کو داد دی۔ حکم جی کے پہلو میں بیٹھی رتنا دیوی نے لڑکی کو اپنے پاس بلایا اور اس کی اشک شوئی کے لیے اسے کوئی تحفہ دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ اور ادب سے جھک کر قبول کیا۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! یہ کھلا مقابلہ ہے نا؟ میرا مطلب ہے ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے؟''

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! ایک مزے کی بات بتاؤں آپ کو۔ آپ عمران کو کہیں کہ وہ یہ کھیل کھیلے۔''

میڈم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات کو وزن دے رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عمران ایک پروفیشنل فن کار ہے... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ لاہور میں اسٹار سرکس کے شوز کے دوران میں کبھی کبھی خاص شوز بھی ہوتے تھے جن کو خاص لوگ دیکھتے تھے اور نڈر فن کار اس میں نہایت خطرناک ''پرفارمنز'' دیتے تھے۔ تو جو شخص پنڈال کی خطرناک بلندی پر بغیر کسی حفاظتی انتظام کے شان دار مہارتوں کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ یہ رم کی خالی بوتلوں والا کھیل بھی کھیل سکتا تھا۔

میں نے عمران کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میڈم صفورا اس سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ عمران کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ یہ کام کر



www.digestpk.com

Asifzamil

لے گا۔

چند منٹ بعد میڈم صفورا گیلری سے نکل کر نیچے ہال میں پہنچی۔ منیجر مدن بھی اس کے ساتھ تھا۔ منیجر مدن نے ادب سے جھک کر رتنا دیوی سے کچھ کہا۔ رتنا دیوی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا... پھر میڈم صفورا کی طرف دیکھ کر بھی سر کو اثباتی حرکت دی۔

کچھ ہی دیر بعد عمران وسیع و عریض ہال میں حاضرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس کے جسم پر سیکیورٹی گارڈز والا مخصوص لباس تھا... تاہم بہتر کارکردگی کے لیے اس نے اپنے جوتے اور موزے اتار لیے تھے۔ اب یہاں کافی لوگ عمران کو پہچاننے لگے تھے۔ عمران کی پہچان دراصل صرف ڈیڑھ دن پہلے راج بھون کے بھرے پُرے دربار میں ہوئی تھی جب عمران نے حکم کے سوالوں کے مدلل جواب دیے تھے اور ثابت کیا تھا کہ انتہا پسندی اور کٹرپن کا الزام صرف مسلمانوں پر لگانا کسی طور درست نہیں۔ اس کی باتوں نے جہاں کھوسٹ بڑھیا کی بولتی بند کی تھی، وہاں حکم کے مصاحبین کو بھی کچھ دیر کے لیے سانپ سونگھ گیا تھا۔

آج عمران ان معززین کے سامنے ایک دوسری طرح کے چیلنج کے لیے موجود تھا۔ چار بوتلوں تک تو عمران بہ آسانی پہنچ گیا۔ پانچویں اور چھٹی بوتل پر اسے دقت ہوئی۔ ساتویں بوتل کی باری آئی تو وسیع ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس سنسنی خیز خاموشی میں بس فواروں اور آبشاروں میں حرکت کرتے پانی کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ سازندوں نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے تھے اور ان کی نگاہیں تماشے پر جمی تھیں۔ ''کیا وہ کر لے گا؟'' میڈم نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

ہاں، مجھے یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی شخصیت میں کرامات ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس نے ساتویں بوتل پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر اپنے پاؤں جمائے اور مکمل توازن حاصل کیا تو سازندوں نے سازوں کو زور سے چھیڑا اور وسیع و عریض ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اب عمران کو آخری بوتل پر چڑھنا تھا۔ وہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ بلند ہو چکا تھا۔

آخری مرحلہ شروع اور ختم ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔ دھڑکنیں تھم گئی تھیں اور نگاہیں جامد ہو گئی تھیں۔ خواتین نے ہاتھ سینوں پر رکھے ہوئے تھے۔ عمران نے وہ کر دکھایا جس کی میں اس سے توقع کر رہا تھا۔ جب وہ آٹھویں بوتل پر کھڑا ہوا اور اس نے فاتحانہ انداز میں اپنے دونوں بازو دونوں طرف پھیلائے تو لٹل مس انڈیا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ چند روز پہلے کی جھوٹی فتح کا خمار، زبردست کھسیانے پن میں بدل چکا تھا۔ ان لوگوں نے خود ہی اسے لٹل مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے مقابلے کا نام دیا تھا۔ اب یہ ''نام'' اس کے لیے اضافی ہزیمت کا باعث تھا۔

عمران نے اس پر بس نہیں کیا۔ اس نے اپنی جیت کو مزید واضح اور مستحکم کرنے کے لیے ایک اور بوتل طلب کی۔ ہال تالیوں سے گونجا۔ مختصر لباس والی معاون لڑکی نے ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر بوتل اور لکڑی کا ٹکڑا عمران کو تھمایا... عمران نے بے پناہ داد کے شور میں یہ آخری STEP بھی کر دکھایا...

☆☆☆

یہ نئے دن کی صبح تھی۔ گیارہ بج چکے تھے... لیکن راج بھون میں بیشتر لوگ سوئے پڑے تھے۔ ساتویں کا جشن کل رات آخری پہر تک جاری رہا تھا۔ اس کے اختتام پر شراب پانی کی طرح استعمال ہوئی۔ رقص و موسیقی نے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کیا اور آخر بدمست جوڑے خلوت گاہوں میں جا گھسے۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ وہ تمام تینتیس لڑکیاں بھی ان خلوت گاہوں کا حصہ بنی تھیں جنہوں نے پریوں کے انتخاب میں حصہ تو لیا تھا مگر چنی نہیں جا سکی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کل رات راج بھون کے اعلیٰ ترین افراد کی تنہائیوں کو رنگین کیا تھا۔ انہیں چند دن یہیں رہنا تھا۔ پھر تحائف سے لد پھند کر گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں معمول کے مطابق تھا۔ گیتا کھمی نے بتایا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی بعد ازاں باقاعدہ شادیاں ہوتی ہیں اور وہ نارمل زندگی گزارتی ہیں۔ راج بھون میں گزری ہوئی دو چار راتوں کے لیے انہیں کبھی مطعون نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے تو ذمے دار شخص حکم کے عتاب کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ پریوں کو یہاں ایک خاص الخاص درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ وہ مستقل طور پر راج بھون کے ساتھ منسلک ہو جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ سات پریاں پاکیزگی اور تقدس کا نشان ہوتی تھیں مگر گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ روایتیں تبدیل ہوئی تھیں۔ اور اب یہ پریاں چند ماہ، بلکہ ہفتوں کے اندر ہی اعلیٰ سطح پر ''رکھیلوں'' کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ حرص و ہوس نے اپنی بقا کے راستے ڈھونڈ لیے تھے۔



غالباً دھرم کے ٹھیکیداروں نے ہی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے اس رسم میں کچھ ایسی شقیں ڈھونڈ نکالی تھیں جن کی رُو سے حکم اور اس کے نہایت قریبی ساتھی ان پریوں سے جسمانی ربط قائم کر سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال باروندا جیکی کی محبوبہ شکنتلا تھی جسے پتنی بنانے میں ناکام ہو جانے پر حکم نے اسے پری کا درجہ دیا اور اپنے حرم میں شامل کیا۔

میں اور عمران ابھی تک راج بھون میں ہی تھے۔ دوپہر کے بعد خمار زدہ لوگوں نے جاگنا اور چلنا پھرنا شروع کیا۔ سہ پہر کے وقت میڈم صفورا کے ذریعے عمران کو رتنا دیوی کا بلاوا آیا۔ یقیناً یہ بلاوا اسے وعدے کے مطابق انعام سے نوازنے کے لیے تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے میں بھی میڈم صفورا، منیجر مدن اور عمران وغیرہ کے ساتھ شاہی اصطبل میں چلا گیا۔ میری وجہ سے درجن بھر مسلح گارڈز کو بھی میرے ساتھ حرکت کرنا پڑی۔ ہم شان دار اصطبل میں پہنچے۔ یہاں بیش قیمت گھوڑے گھوڑیوں اور ان کے بچوں کی طویل قطاریں موجود تھیں۔ طویل اصطبل کے ایک حصے میں پارٹیشن کر کے اسے گیراج کی حیثیت دی گئی تھی اور یہاں شاہی استعمال کی چند گاڑیاں موجود تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد رتنا دیوی اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں آن موجود ہوئی۔ اس نے عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اپنے گارڈ سے کہو کہ یہ بلا جھجک اپنی پسند کے آٹھ بہترین گھوڑے یہاں سے چن لے۔ ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ بے شک ہمیں یہ جانکاری بھی ہوئی ہے کہ یہ شخص شوقیہ کھلاڑی نا ہیں تھا۔ یہ کسی سرکس میں کام کرتا رہا ہے اور جسمانی کمالات دکھاتا رہا ہے۔ لیکن ہمیں پتا ہے کہ پچھلے تین چار سالوں میں اس شرط کو پورا کرنے کے لیے کھلاڑی لوگن بھی آتے رہے ہیں۔ جیسے کل رات وہ مس انڈیا نام کی لڑکی آئی تھی مگر اس کے سوا کوئی بھی پیل (کامیاب) نا ہیں ہوا ہے۔ ہم اس کو انعام دیتے ہوئے من سے خوش ہیں۔ یہ گھوڑے چن سکتا ہے اور یہ رہا اس کا دوسرا انعام۔ رتنا دیوی نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا اور اس نے ایک مخملی پوٹلی عمران کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے رانی؟'' عمران نے ادب سے پوچھا۔

''طلائی زیور... تمہاری دو مٹھیاں کتنی بھی بڑی ہوتیں یہ ان سے زیادہ ہی ہے۔'' رتنا نے جواب دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ یہ زیادہ زیور تھا۔

عمران نے پوٹلی لے تو لی مگر اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اسے لینا نہیں چاہتا۔ عمران کی اکثر باتیں سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھیں۔ رتنا دیوی نے ایک بار پھر عمران سے کہا کہ وہ اپنی مرضی کے آٹھ گھوڑے شاہی اصطبل میں سے چن لے۔

عمران نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''رانی صاحبہ! میں آپ کی ان نوازشوں کے قابل نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت مہنگے گھوڑے ہیں... لیکن میں انہیں کہاں رکھوں گا اور سچ یہ ہے کہ مجھے گھڑسواری کا شوق بھی نہیں ہے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چاہوں گا کہ یہ گھوڑے شاہی اصطبل میں ہی رہیں اور ان لوگوں کے استعمال میں آئیں جو ان کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

رتنا دیوی سمیت کئی افراد نے عمران کو حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ وہ عجب سیر چشمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رتنا دیوی نے کہا۔ ''ایسا نا ہیں ہو سکتا۔ ہم نے جو وچن دے رکھا ہے اسے پورا کریں گے۔ اگر تم گھوڑے لینا نا ہیں چاہت ہو تو اس کی قیمت لے لو۔ یہاں کوئی بھی گھوڑا، ایک لاکھ سے کم قیمت کا نہیں ہے۔ یہ کافی بڑی رقم بن جاوے گی۔''

''لیکن رانی صاحبہ! میں یہ رقم لینا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ نہیں چاہیے۔ میرے لیے آپ کی توجہ اور مہربانی ہی بڑا انعام ہے۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے کسی قابل جانا اور میری ستائش کی۔ میں بصد احترام اور خوشی یہ زیورات بھی واپس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں جی کہ ان کا بوجھ اٹھا سکوں۔ آپ کے قدموں میں جگہ مل جائے، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔'' عمران کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

وہ زبردست اداکار تھا۔ بظاہر سادہ مگر اندر سے پیچیدہ۔

رتنا دیوی کا تنا ہوا چہرہ قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''صفورا! تمہارا یہ سیکیورٹی گارڈ خاصے کی چیز ہے۔ جو کچھ اسے مل رہا ہے، اس سے اس کے اگلے دس بیس سال بڑے آرام سے گزر سکت ہیں لیکن یہ لینے سے انکار کرت ہے۔''

''جی رتنا دیوی! یہ ایسا ہی ہے۔ بس اپنے آپ میں خوش اور مست رہنے والا۔''

رتنا دیوی نے بھرپور نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس کے جبڑے کا تھوڑا سا ٹیڑھا پن ظاہر ہوتا تھا۔ یہ دراصل اس پرانے حادثے کی نشانی تھا جب سلطانہ اور رتنا کا جھگڑا ہوا تھا۔ شاہی پن گھٹ کی سیڑھیوں پر رتنا شاید اپنے ہی زور میں گری



www.digestpk.com

Asifzamil

تھی اور اس کا جبڑا ابل گیا تھا۔ اس معمولی سے نقص کے سوا رتنا دیوی ایک نہایت پُرکشش عورت تھی۔

اس نے عمران کا نام پوچھا اور پھر اسے نام سے مخاطب کر کے بولی۔ ”تمہیں کچھ نہ کچھ تو لینا پڑے گا۔ ورنہ ہمیں نراشا ہوگی۔“

عمران نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”محترمہ رانی صاحبہ! یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں کہ میں خود کو جس کے قابل سمجھ سکوں۔“

”تم نراش کر رہے ہو۔“ رتنا دیوی کے ماتھے پر ہلکی سی سلوٹ نظر آئی۔

عمران نے گیراج کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”پاکستان میں کچھ عرصہ میں نے گاڑیوں کا کام کیا ہے جی۔ مجھے اچھی گاڑیوں کا شوق ہے اور ڈرائیونگ بھی اچھی کر لیتا ہوں... اگر آپ کا اصرار ہے تو مجھے ان گاڑیوں میں سے کوئی عنایت کر دیجیے۔“

رتنا دیوی بولی۔ ”تو پھر تم خود چن لو... وہ تمہارے سامنے کھڑی ہیں۔“

عمران گاڑیوں کے پاس گیا۔ کچھ دیر گھوم پھر کر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک فور وھیل ڈرائیو، چھوٹی جیپ کا انتخاب کیا۔ یہ اسپیشل ماڈل کی شان دار جرمن گاڑی تھی۔ حالت بھی اچھی تھی۔ رتنا دیوی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تردد نظر آیا۔ شاید یہ اس کی پسندیدہ گاڑی تھی۔ ویسے بھی اس بھانڈیل اسٹیٹ میں گنتی کی گاڑیاں ہی تھیں اور ان میں سے اکثر فاضل پرزوں کی عدم دستیابی کے سبب کھڑی رہتی تھیں۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد رتنا دیوی کے چہرے سے تردد کے آثار اوجھل ہو گئے۔ یقیناً اس نے حساب کتاب لگایا تھا۔ جو کچھ عمران اپنی منشا سے چھوڑ رہا تھا، وہ اس جیپ کی قیمت سے، کچھ نہیں تو بیس پچیس گنا زیادہ تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بس یا کچھ اور؟“

”بس رانی صاحبہ۔“

”ٹھیک ہے، یہ تمہاری ہوئی۔“ رتنا دیوی نے کہا۔

میں نے عمران کی دلکش آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں ایک چمک سی تھی۔

☆☆☆

سنسنی خیز گھڑیاں قریب پہنچ رہی تھیں۔ پورے زرگاں میں اس مقابلے کی دھوم تھی جو کل میرے اور جارج گورا کے درمیان ہونا تھا۔ وہ کشتی دیوتا تھا۔ وہ شکست کھانا نہیں جانتا تھا اور میں اسے شکست دینے کا دعویٰ کر چکا تھا۔

اس شام ہم لال بھون میں واپس آ گئے۔ ہم ”جم“ میں پہنچے اور قریباً تین گھنٹے تک اندھا دھند پریکٹس کی۔ یہ درد اور برداشت کا مقابلہ تھا۔ عمران بیٹھ گیا مگر میں لگا رہا۔ آخر میں بھی تھک کر چور ہوا اور گدے پر گر گیا۔ عمران نے مجھے پانی پلایا اور پھر کیلوں کا ایک گچھا لے آیا۔ اس نے ایک کیلا چھیل کر بڑی محبت سے میری طرف بڑھایا۔ ”لو، منہ میٹھا کر لو اور اس میں توانائی بھی بہت ہوتی ہے۔“

”منہ میٹھا کس خوشی میں؟“ میں نے پوچھا۔

”میری ترقی کی خوشی میں۔ سہ پہر کو رتنا دیوی کی ہدایت پر میڈم صفورا نے مجھے سیکیورٹی گارڈ سے پروموشن دے کر اسسٹنٹ انچارج بنا ڈالا ہے۔“

”بھئی واہ۔ رتنا، میڈم نادیہ اور گیتا مکھی جیسی عورتوں کو شیشے میں اتارنا تمہیں خوب آتا ہے۔“

”تم بھی تو کچھ کم نہیں ہو۔ تم نے بھی تو یہاں آ کر سلطانہ جیسی منہ زور لڑکی کو شیشے میں اتارا ہے۔“

سلطانہ کے ذکر نے ایک دم مجھے اداس کر دیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”عمران! کل کچھ بھی ہو سکتا ہے... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو تم کیا کرو گے؟“

”میں گانا گاؤں گا۔ ساتھی رے... تیرے بنا بھی کیا جینا... جب دودھ میں بس پانی رہ گیا تو دودھ کا کیا پینا... اس کے بعد میں گیتا مکھی کی آخری خواہش پوری کر کے آتما ہتھیا کر لوں گا۔ ویسے خودکشی کے مقابلے میں آتما ہتھیا قدرے بہتر چیز ہے۔ اس میں دوسرے جنم کی امید تو رہتی ہے نا۔“

”گیتا مکھی کی آخری خواہش؟ کیا مطلب؟“

”یار، وہ سونا چاہتی ہے میرے ساتھ۔ اور تمہیں پتا ہے کہ وہ سوئے گی ہرگز نہیں۔“

”میں بہت سنجیدہ ہوں عمران۔“

”تو پہلے جتاتا تھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی لطیفہ سنا رہے ہو۔ دیکھو جگر! ہم وصیتوں وغیرہ کی باتیں تو تب کریں جب ہمیں ہارنا ہو۔ ہمیں ہارنا ہے ہی نہیں۔ بس جیتنا ہے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ مڑ کر دیکھنے والے پتھر ہو جاتے ہیں اور ویسے بھی پیچھے کچھ نہیں۔ کل تم کشتیاں جلا کر میدان میں اترو گے اور جیت کر باہر نکلو گے۔“

”لیکن عمران! غیب کا علم تو قدرت کے سوا کسی کو نہیں۔ اور جب ہم غیب نہیں جانتے تو پھر ہمیں صرف ایک ہی رخ پر تو نہیں سوچنا چاہیے۔ کچھ پلاننگ تو ہونی چاہیے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“



www.digestpk.com

Asifzamil

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”اگر کل مجھے کچھ ہو گیا تو تم تین کام ضرور کرو گے۔ پہلا یہ کہ سلطانہ اور بالو کو سنبھالنا اور انہیں اسٹیٹ کے اندر یا باہر کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا... دوسرا پاکستان جا کر فرح اور عاطف کا خیال رکھنا اور تیسرا...“

میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ آواز بیٹھ سی گئی۔

”ہاں... ہاں۔ اب بولنا شروع کیا ہے تو بول دو۔“

”ہو سکے تو ثروت کا کھوج لگانا۔ اور اگر کبھی اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہنا، میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے... اور آخری سانس تک کیا ہے۔“

”یہ سب باتیں تم اس سے خود ہی کہو گے... اگر سلطانہ نے کہنے کی اجازت دی تو۔ باقی جگر! دلیپ کمار وغیرہ تو خوامخواہ مشہور ہو گئے ہیں، اگر تم فلموں میں روندو ہیرو کے روپ میں آجاؤ تو سب کی چھٹی کرا دو۔“

وہ ایسے ہی باتوں کو ہوا میں اڑاتا تھا اور نہایت گمبھیر و کشیدہ ماحول کو بھی کسی دوسرے رخ پر دھکیل دیتا تھا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ امکانات پر غور کرتے رہے اور آمدہ گھڑیوں کی حشر خیز چاپ سنتے رہے۔

میں نے کہا۔ ”تمہاری کہانی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے کہ میں سارے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔ ویسے مجھے ایک بات بتاؤ... مجھے ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ جانوروں سے اپنے حیران کن تعلق کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے یہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ خصوصی تعلق ایک دم ختم کیسے ہو گیا؟ کیا اس میں تمہاری کوئی کوتاہی تھی یا اسے ہونا ہی تھا۔ اور پھر پروفیسر رچی صاحب کی پیشین گوئی کہ یہ خاص صلاحیت پھر سے تمہارے اندر آسکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ شدت سے آئے۔ کیا یہ سب درست ہے؟“

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے سچ سمجھوں۔ ہو سکتا ہے کہ جیسے اچانک ہی یہ سب کچھ میرے پاس سے چلا گیا، ایسے ہی واپس آجائے۔ اور ہو سکتا ہے نہ بھی آئے۔“

”کیا اب بھی تم جانوروں سے اسی طرح لگاؤ محسوس کرتے ہو؟“

”سچی بات یہ ہے جگر کہ زیادہ لگاؤ تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ جو کچھ تھا، دوسری طرف سے ہی تھا جواب نہیں ہے۔ ابھی دو تین دن پہلے ہی میں غلطی سے شیڈ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں بندھے ہوئے، منیجر مدن کے کتے نے مجھ پر جھپٹا مارا اور ٹانگ زخمی ہوتے ہوتے رہ گئی۔“

”اچھا اور ایک بات مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے۔ تم اندر کی بات نہیں بتا رہے ہو۔ آج تم نے رتنا دیوی کی اتنی بڑی آفر ٹھکرا کر وہ جیپ کیوں چنی ہے۔ کیا اس سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہو؟“

”یار! اب تم میرے سیدھے سادے کاموں میں بھی ”پلاننگ“ ڈھونڈنے لگتے ہو۔ بس وہ گاڑی مجھے اچھی لگی اور میں نے لے لی۔ دوسری طرف میں نے رتنا کی آفر کو ٹھکرا کر اس کی انا کو ٹھیس بھی پہنچائی۔ وہ آج جتنی بھی میٹھی بنی ہوئی تھی مگر ہے تو تمہاری اور سلطانہ کی دشمن نا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا، کل بھی تم پر کیسی قہر بھری نظر ڈالتی تھی خانہ خراب۔“

”اس گاڑی کا کیا کرو گے؟“

”کل تمہاری جیت کے بعد تمہیں اس میں بٹھاؤں گا اور فاتحانہ پورے زرگاں کا چکر لگاؤں گا...“

”اور اگر معاملہ الٹ ہوا تو؟“

”اب آگے بولو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“ اس نے گل دان اٹھا لیا۔

میں خاموش ہو گیا تو اس نے ایک کتاب اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔ ”اس میں ٹائم لگاؤ، فائدہ ہو گا۔“

یہ وہی مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی باتصویر کتاب تھی جو چند روز پہلے میڈم صفورا نے ہمیں دکھائی تھی۔ اس کا عنوان ”سویمبر اور سامبر“ تھا۔ آج میں نے میڈم سے فرمائش کر کے یہ کتاب منگوائی تھی اور کافی دیر تک اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ میں باقی ماندہ کتاب پر نگاہ دوڑانے لگا۔ ساتھ ساتھ ہم دونوں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ہم قریباً نصف شب تک اپنی آخری تیاریوں میں مصروف رہے... پھر فرش کے بستر پر پہلو بہ پہلو لیٹے اور سو گئے۔ کتنا حوصلہ بخش ساتھ تھا عمران کا۔

☆☆☆

راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے، جہاں تک نظر جاتی تھی لوگوں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک اسٹیڈیم نما جگہ تھی۔ بیٹھنے کے لیے پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی مقابلے ہو چکے تھے لیکن آج کے مقابلے نے بے نظیر شہرت پائی تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ایسے پوسٹرز اور بینرز نظر آرہے تھے جن پر جارج گورا کی تصویر تھی اور اسے شکتی دیوتا کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور ہزاروں کی



تعداد میں رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ لڑائی کا اکھاڑا تھا۔ اس کی چاروں طرف آہنی جنگلا تھا جس میں بس ایک داخلی دروازہ تھا۔ وسیع گول اکھاڑا قریباً بیس میٹر قطر کا ہو گا۔ اس اکھاڑے کے درمیانی حصے کو لکڑی کے ایک گول سائبان کے ذریعے ڈھانپا گیا تھا۔ سائبان کم و بیش بارہ فٹ اونچا تھا۔ اکھاڑے سے باہر حکم اور شاہی خاندان کے افراد کے بیٹھنے کے لیے ایک شان دار گیلری تھی۔ یہاں نہایت شان دار نشستیں تھیں اور سردی سے بچانے کے لیے انگیٹھیاں وغیرہ دہکائی گئی تھیں۔ بالکونی نما گیلری کی دائیں جانب وہ منحوس سولی کھڑی تھی جس کا نظارہ میں نے اور عمران نے چند دن قبل کیا تھا۔ میرے دیرینہ ساتھی اسحاق کو یہاں بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی آخری دردناک آوازیں ابھی تک میرے کانوں میں زہر گھولتی تھیں۔ دائیں جانب ایک چھوٹا سا احاطہ اور بھی تھا۔ اسے بھی آہنی جنگلے اور خاردار تاروں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ جگہ بھی خاص لوگوں کے بیٹھنے کے لیے تھی۔ یہاں شامیانے وغیرہ تنے ہوئے تھے۔

”بڑے خونی مقابلے“ سے پہلے یہاں تین چار چھوٹے مقابلے بھی ہوئے تھے۔ ان سامبر مقابلوں میں حصہ لینے والے افراد ایک چھوٹے سے احاطے میں موجود تھے اور خود کو وارم اَپ کر رہے تھے۔ شاہی مہمانوں کی گیلری کے ساتھ ہی میں ایک پختہ کمرے میں موجود تھا۔ میرے اردگرد گارڈز کا سخت پہرا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میرے جسم پر فقط ایک کاٹرائے پتلون تھی۔ بے شمار لوگ میری جھلک دیکھنے کے خواہش مند تھے تاہم سخت سیکیورٹی کے سبب وہ نزدیک نہیں آسکتے تھے۔ جارج کہاں تھا، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ عمران میرے ساتھ ہی تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ میڈم صفورا کا پاکستانی گارڈ (عمران) ٹریننگ میں میری معاونت کرتا رہا ہے۔ لہٰذا میرے ساتھ اس کی موجودگی پر کسی کو تعجب نہیں تھا۔ عمران کی موجودگی مجھے بے پناہ حوصلہ دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مجھے دو تین تجربہ کار معاون فراہم کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا پارسی تھا۔ اس نے اکھاڑے کے اندر لڑائی کے دوران میں میری دیکھ بھال کرنا تھی۔

اب تک ہم نے جارج گورا کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق لڑائی میں جارج کا اہم ترین ہتھیار اس کی ”بدزبانی“ تھی۔ وہ اپنے حریف کو تاؤ دلاتا تھا اور غلطی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ جوڈو کی ایک تکنیک

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ ستمبر 2011ء کی جھلک
مہاراجا
ایک یک چشم شخص کی داستان جس نے زور بازو سے پورے پنجاب کو مطیع بنایا تھا
وادی مرگ
اس وادی کا تذکرہ جو صدیوں سے انسانی قدم کو ترس رہی تھی
فیلڈ مارشل
پاکستان کی ایک باکمال شخصیت کا مختصر سا ذکر جس نے دلوں پر راج کیا
انتقابی قزاق
تہلکہ مچا دینے والے شخص کی روداد ایک وقت کے کھانے کو ترسنے والا ارب پتی کیسے بنا؟
خونی انھونی
دل میں طوفان اٹھا دینے والی آپ بیتی
اس کے علاوہ
دلچسپ سفرنامہ، تاریخی عمارت سندھ اسمبلی کا تذکرہ، فلمی الف لیلہ، طویل آپ بیتی ”سراب“ اور مزید دسیوں آپ بیتیاں جگ بیتاں سچے واقعات
بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،
آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے،
خاص شمارہ ہر شمارہ، خاص شمارہ ہر شمارہ، خاص شمارہ



www.digestpk.com

Asifzamil

''نیک لاک'' اس کا پسندیدہ ترین داؤ تھا۔ اپنے بیشتر حریفوں کو اس نے اسی طرح پچھاڑا تھا کہ ان کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کسی لی تھی اور انہیں بے بس کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں جارج کے حریف کے پاس دو ہی راستے ہوتے تھے کہ وہ اپنی گردن تڑوالے یا پھر ہار مان لے۔

عمران نے مجھ سے کہا تھا۔ ''جگر! جس طرح اپنے حریف کے خطرناک ہتھیار کا پتا ہونا چاہیے، اسی طرح اپنے بہترین ہتھیار کا بھی علم ہونا چاہیے۔ تمہیں پتا ہے تمہارا بہترین ہتھیار کیا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''تمہاری برداشت، تمہاری درد سہنے کی گنجائش۔ تم نے مہینوں تک اپنی جان کو جس طرح رولا ہے، اس نے تمہارے اندر درد سہنے کی زبردست صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ تمہاری یہ صلاحیت تمہارے مدمقابل کو کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہے۔ وہ جس وقت تمہیں تکلیف کے شکنجے میں سمجھ رہا ہوگا اور یہ سمجھ رہا ہوگا کہ تم مزید وار نہیں کر سکتے، تم وار کرنے کی پوزیشن میں ہو گے اگر تم کسی ایسے موقع سے فائدہ اٹھا سکو تو... تمہارے لیے بہت اچھا رہے گا۔''

بات کرتے کرتے اس نے تیزی سے مکا چلایا۔ میں نے بے ساختہ ایک طرف جھک کر اس کا وار بچایا اور جوابی مکا مارا۔ یہ مکا عمران نے اپنی ہتھیلی پر روکا۔ ''ہاں، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔ ''تمہارے دائیں مکے کی طاقت سے مجھے بڑی امیدیں ہیں، چند روز پہلے تم نے فصیل پر جس طرح پہرے دار کی کھوپڑی توڑی تھی... ایسے ہی ایک بدبودار ناریل ادھر بھی توڑ ڈالو تو مزہ آجائے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی چھوٹے مقابلے شروع ہو چکے تھے۔ ایک مقابلہ زرہ بکتر جیسا لباس پہن کر کیا گیا اور اس میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئیں۔ ایک شخص کے زوردار وار سے اس کے حریف کا آہنی خود پچک گیا۔ منصف نے مقابلہ وہیں روک دیا اور زوردار وار کرنے والے کو فاتح قرار دیا۔

دوسرا مقابلہ خاصا یک طرفہ تھا۔ صرف تین چار منٹ میں ختم ہو گیا۔ جیتنے والے نے سر کی ایک زوردار ٹکر سے اپنے کمزور مدمقابل کو لمبا لٹا دیا۔ وہ نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے اٹھا کر باہر لے جانا پڑا۔ اس کے فوراً بعد تیسرے مقابلے کی شروعات ہو گئی۔

آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا انتظار بے پناہ شدت سے کیا جا رہا تھا۔ جس کے لیے لوگوں کا چین سکون حرام ہوا تھا۔ وہ مقابلہ جس پر بیش بہا شرطیں لگ چکی تھیں اور جس کے نتیجے کے بارے میں ہزارہا قیاس آرائیاں فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔ رنجیت پانڈے جیسے ''جن'' کو چند منٹ میں پسپا کر دینے والا شخص... شکتی دیوتا کے مدمقابل تھا۔

عمران جیسا ''لکی'' شخص میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدترین رسک لیتا تھا اور کامیاب ہوتا تھا۔ خطرات اس سے آنکھیں چرا کر گزرتے تھے... اور ''بازیاں'' اس کے حق میں پلٹنے کو تیار رہتی تھیں۔ اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر میرے ذہن میں آیا... کہیں عمران کے ہوتے ہوئے میں جارج کے مقابل جانے میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو رد کیا۔ عمران کی ساری آشیرباد میرے ساتھ تھی۔ وہ اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ مجھے اکھاڑے میں داخل کر رہا تھا۔ میں اس سے بغل گیر ہوا۔ میں نے اس کا شانہ چوما، اس نے میرا اور پھر میں اکھاڑے میں آ گیا۔

ہوا یخ تھی۔ میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔ اس نے پتلون اور بغیر آستین کی بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کا فولادی جسم ڈھلتے سورج کی کرنوں میں دمک رہا تھا۔ میں پاؤں سے ننگا تھا جبکہ جارج نے جوگرز پہن رکھے تھے۔ ہماری بائیں جانب لوہے کی ایک مستطیل میز تھی۔ اس پر تین تیز دھار آلے رکھے تھے۔ چھوٹے دستے کی دو کلہاڑیاں، دو رام پوری چاقو اور دو چھوٹی تلواریں یعنی کٹاریاں۔ ہم ان میں سے کوئی سے بھی ایک جیسے دو ہتھیار چن سکتے تھے۔

دو فربہ اندام شخص میدان میں آئے۔ ان میں سے ایک نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں چند کاغذ تھے۔ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج بھی عقب میں موجود تھا۔

''ان کاغذوں پر تمہارے دستخط ہوں گے۔'' عینک والے نے فائل میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

میں نے سرسری نظر ڈالی۔ اردو میں وہی تحریر لکھی گئی تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ یعنی یہ سامبر مقابلہ میری مرضی و رضامندی سے ہو رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لڑائی ہم دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کی موت تک جاری رہے گی... میری موت کی صورت میں میرے وارثوں کو کسی طرح کا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا... اور یہ کہ میں اپنی تحریری یا زبانی وصیت کر چکا ہوں اور مجھے اس حوالے سے مزید کچھ نہیں کہنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بلاتردد ان کاغذوں پر دستخط کر دیے۔ جارج گورا نے فقرہ کسا۔ ''اس پر یہ نوٹ بھی



لکھ دو کہ میرے بعد میری بیوی کو اجازت ہے کہ وہ شادی کے بغیر جارج کے ساتھ رہ سکے۔''

میرے بدن میں انگارے دہک گئے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ تو شروعات ہے۔ مجھے آخر تک اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ہے۔

میرے بعد جارج گورا نے کاغذات پر دستخط کیے۔ اب بے پناہ شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ یہ امر میری حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہجوم میں میرے حمایتی بھی کم نہیں ہیں۔ جارج نے اپنی زہریلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب ان ہتھیاروں کی طرف آؤ اور دیکھو کہ تم کس ہتھیار سے مرنا پسند کرو گے۔''

سرجن اسٹیل نے مجھے بتا رکھا تھا کہ جارج مجھے ہتھیار چننے کی پیشکش کرے گا۔ یہ ایک طرح سے زبردست نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ غالباً اس طرح وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ لڑائی کے ہر طریقے پر عبور رکھتا ہے۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے رام پوری چاقو اٹھا لیا۔ یہ مضبوط دستے کا وزنی چاقو تھا۔ اس کی دھار اور لوہا دونوں شان دار تھے۔ درمیان میں خم سا تھا۔

''گڈ چوائس۔'' جارج نے کہا۔ پھر انگلش میں ہی بولا۔ ''لگتا ہے، یہ لڑائی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔'' اس کے بعد اس نے بھی چاقو اٹھا لیا۔

ایک ہٹا کٹا معاون آگے بڑھا اور آہنی میز اوزاروں سمیت اٹھا کر میدان سے باہر لے گیا۔ منصف کے فرائض انجام دینے والے سفید فام شخص نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر ہم دونوں کا لباس چیک کیا اور آخری ہدایات دینے کے بعد ہمارے درمیان سے ہٹ گیا۔ یہ آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی۔ اب میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہزاروں تماشائیوں کے ساتھ ساتھ جیسے نیلگوں آسمان بھی تماشائی تھا۔ یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے ہوا بھی ساکن ہو گئی ہے اور ڈھلتا ہوا سورج بھی اپنی حرکت بھول کر اس منظر میں کھو گیا ہے۔

ہم ایک دوسرے پر گہری نظر رکھے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرتے رہے۔ جارج نے زہرافشانی کی۔ ''تمہارا باپ ضرور ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنی والدہ کا شوہر نہ سمجھو... بس حریف سمجھو، حملہ کرو۔''

ایک بار پھر تن بدن میں آگ بھڑکی لیکن میں نے خود کو ٹھنڈا رکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک مناسب موقع نظر آیا۔ جارج گورے کا ایک پاؤں ہوا میں تھا۔ دوسرے پر ابھی پورا وزن نہیں پڑا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وار کیا۔ جارج نے خود کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔ میرا چاقو اس کے پیٹ میں لگا۔ چاقو کی نوک نے اس کے جسم پر ایک سرخ لکیر سی کھینچ دی۔ لیکن یہ معمولی نقصان تھا۔ لکیر گہری نہیں تھی۔ اس حملے کے جواب میں جارج گورا مغلظات بکتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے چاقو کے کم از کم چھ وار کیے۔ ان میں سے ایک وار نے میرے کندھے پر کھرونچ ڈالی۔ باقی وار میں نے کامیابی سے بچائے۔ اسی دوران میں میرا داؤ چل گیا۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے۔ ایک بھرپور لات گورا کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ مجھے اٹھنے کا موقع ملا اور میں پھر بازو کھول کر اس کے سامنے آ گیا۔

میرے دوبارہ کھڑے ہو جانے پر میرے خیر خواہوں نے شور بلند کیا اور جوش کے عالم میں پگڑیاں ہوا میں لہرائیں۔ جارج آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ماہر چاقو زنوں کے انداز میں وہ چاقو کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جس کی توقع گورا کو ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ شاید مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ وار اتنی کامیابی سے کر سکوں گا۔ اس وار کے لیے بے حد پھرتی اور ٹائمنگ درکار تھی جو میرے اندر کی آگ نے مجھے فراہم کی۔ میں نے اپنی ٹانگ چلائی۔ جارج گورا کا چاقو اس وقت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا رہا تھا۔ وہ کسی ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔ میرے پاؤں کی ضرب نے اسے ہوا میں اچھالا اور وہ اڑتا ہوا سا اکھاڑے کے آخری کنارے تک چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ جارج سنبھلتا، میں نے زوردار حملہ کیا۔ رام پوری چاقو کی نوک گورا کے عین دل کے مقام پر لگتی مگر اس نے بروقت پینترا بدلا اور چاقو اس کے بازو میں پیوست ہوا۔ میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی گورا نے اس میدان نما اکھاڑے کے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اپنے چاقو تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ نصف راستے میں تھا کہ میں نے جست لگا کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ تاہم اس کوشش میں چاقو میرے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے ہم پھر میدان کے وسط میں پہنچ گئے۔ دونوں چاقو ہماری پہنچ سے دور رہ گئے۔ میں جارج گورا کے منحوس بوجھ تلے دب گیا۔ جارج نے پھر زہرافشانی کی۔ ''اپنی پتنی سے بس تھوڑا ہی زیادہ زور ہے تمہارے اندر۔''

میں نے اس کا جواب ایک بھرپور مکے سے دیا۔ یہ مکا



www.digestpk.com

Asifzamil

جارج کے چوڑے تھوبڑے پر لگا۔ چند لمحوں کے لیے وہ تیورا گیا۔ میں اس کے اوپر آ گیا اور یہیں پر مجھ سے وہ غلطی ہوئی جو نہیں ہونی چاہیے تھی... اور جس کے حوالے سے میں الرٹ بھی تھا۔ پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اچانک میں نے اپنی گردن کو ایک آہنی شکنجے میں محسوس کیا۔ میں نے تڑپ کر نکلنا چاہا مگر دیر ہو چکی تھی۔ جارج مجھے اپنے بدنامِ زمانہ داؤ میں لے چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں اب یہاں سے زندہ نہیں نکلوں گا۔ میں نے دوبارہ بھرپور کوشش کی مگر گردن پر اس کے فولادی بازو کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ کوشش ناکام ہوئی۔ بے پناہ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یقیناً یہ جارج گورا اور حکم کے حمایتی ہی تھے۔ میری نگاہ شاہی بالکونی میں گئی۔ وہاں بھی تماشائی جوش کے عالم میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں جارج کی بہن ماریا اور بہنوئی سرجن اسٹیل پیش پیش تھے۔ ان کے سرخ چہرے تمتما رہے تھے۔

اگلے قریباً بیس منٹ کا وقت میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں موت و حیات کے درمیان لٹک گیا تھا... میں گردن چھڑانے کے لیے بس ایک خاص حد تک زور لگاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھتا تھا تو لگتا تھا کہ گردن ٹوٹ جائے گی اور ذہن تاریکیوں میں ڈوب جائے گا۔ میں نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں جارج گورا کے سر کے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرا ہاتھ اس کے آہنی شکنجے میں اس طرح گھسا دیا تھا کہ وہ میری گردن پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے۔ یہ ایک طرح کا ڈیڈ لاک بن گیا تھا۔ جارج اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ زور لگا کر میری گردن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکے۔ دوسری طرف میں بھی اس کے بازو کا شکنجہ کھولنے میں ناکام تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اگر میں اندھا زور لگا کر گردن چھڑانے کی کوشش کرتا تو جارج کو اپنے بازو کے لیے اضافی توانائی مل جاتی اور وہ اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے میں کامیاب ہو جاتا... یا پھر مجھے بے ہوش ہی کر دیتا۔

وہ ناقابلِ فراموش گھڑیاں تھیں۔ میری سانس رک رہی تھی، آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ لگتا تھا پھیپھڑے پھٹ جائیں گے... یہ درد سہنے کی خُو ہی تھی جو مجھے ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑا رکھے ہوئے تھی اور یہ جاں گسل اذیتوں سے میرا ناتا ہی تھا جو مجھے مزاحمت کا حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے میدان میں اِدھر اُدھر گھما رہا تھا اور جنونی لہجے میں بک رہا تھا۔ ''تمہاری پتنی کا جسم بڑا کومل ہے۔ کیا ایسے جسم والی تمہاری کوئی اور قریبی رشتے دار بھی ہے؟''

اسی قسم کے زہریلے فقرے تھے جو وہ بار بار میرے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔

میں اسے دھکیلتا ہوا کئی قدم پیچھے لے جاتا تھا پھر آگے لاتا تھا، پھر اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے بالوں سے ہٹا کر اس کی جانگ تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ بڑا عیار تھا۔ اس نے معقول انتظام کر رکھا تھا کہ میں اپنا ہاتھ اس کی ناف تک نہ پہنچا سکوں۔ جونہی میں اپنا ہاتھ نیچے لاتا، وہ اپنا آزاد ہاتھ میری بغل میں حائل کر دیتا اور یوں میری حرکت رک جاتی۔

میرے حمایتیوں کو چپ لگ چکی تھی۔ کان پھاڑ دینے والا شور جارج کے پرستاروں کا تھا۔ میری سانس ٹوٹنے لگی۔ جارج کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ مجھے یہ آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ ''...تم حاملہ بکری ہو۔ تمہاری گردن نرشیر کے پنجوں میں ہے۔ اگر تم اپنی گردن نکال لو تو میں ابھی سب لوگوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں کاٹ لوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے کسی قصاب کی طرح نیچے کو زور لگایا۔ میری پیشانی زمین سے جا لگی۔ وہ حیوانی قوت سے میرا چہرہ زمین سے رگڑنے لگا۔ میرا باقی جسم آزاد تھا لیکن وہ عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سلطانہ کا چہرہ میرے ڈوبتے ذہن میں چمکا... اس کے بعد بارو ندا جیکی کی شبیہہ نمودار ہوئی... پھر اسحاق کی زندگی کے آخری دردناک مناظر نگاہوں میں گھومے۔ میں نے اپنے جسم کی رہی سہی قوت جمع کی، ایک حتمی اور آخری کوشش کی۔ بے پناہ زور لگایا اور اپنا بایاں ہاتھ جارج کے مڑے ہوئے بازو میں گھسا کر اس کی بندش توڑنا چاہی۔ میری جنونی مزاحمت نے چند لمحوں کے لیے جارج کو ہلا دیا۔ یوں لگا کہ اس مرتبہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرے حمایتیوں میں جان پیدا ہوئی... مگر پھر اچانک ہی جارج نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور اپنی اس وحشیانہ طاقت کا مظاہرہ کیا جس کے لیے وہ مشہور تھا۔ مجھے لگا کہ میری گردن پیچھے سے ادھڑ گئی ہے۔ یہ وہی کچا پکا زخم تھا جو میں فتح پور کے تہ خانے سے لے کر آیا تھا۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا اور میرا چہرہ ایک بار پھر بے بسی کی مٹی میں لتھڑا گیا۔ میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن کا دخول اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اگلے دو تین منٹ میں، میں ختم ہونے والا ہوں۔ تو یہ تھا انجام... اس خونی مقابلے کا؟

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی کی ڈور کو تھامنے کی کمزور کوشش کرنے لگا۔



دفعتاً مجھے لگا کہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انہونا تھا۔ ہماری لڑائی میں کسی کو بھی مداخلت نہیں کرنا تھی لیکن کوئی کر رہا تھا۔ کوئی جارج کو میری جان لینے سے روک رہا تھا۔ کون تھا؟ کون ہو سکتا تھا؟ میں اوپر دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری دھندلائی نگاہوں کو صرف پاؤں نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج تھا۔ ''چھوڑ دیجیے سرکار... چھوڑ دیجیے اسے... سے ختم ہو گیا ہے...''

پنڈت مہاراج کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے ابھر کر میرے کانوں تک پہنچی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ پنڈت مہاراج اور اس کے دو تین چیلے مجھے جارج کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ''وقت'' کا ذکر کر رہے تھے اور جارج کو بتا رہے تھے کہ مقابلے کے قاعدے کے مطابق ''وقت'' ختم ہو گیا ہے۔ سورج ڈوب گیا ہے۔

جارج نہیں سُن رہا تھا۔ وہ ایک آخری جھٹکا دے کر ڈراپ سین کرنا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ میری مزاحمت کم ہوتے ہوتے ختم ہو رہی ہے۔

اچانک میری نگاہ کچھ دور عمران پر پڑی۔ وہ جست لگاتا ہوا میدان میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے ہماری طرف آیا اور ان تین چار افراد میں شامل ہو گیا جو مجھے جارج گورا کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عمران کی آمد نے یکا یک صورتِ حال بدل دی۔ اس کی ''پکڑ'' معمولی نہیں تھی۔ جارج کے فولادی بازو پر عمران کی پکڑ قائم ہوتے ہی مجھے اپنے سانس کی آمد و رفت بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں اچانک جیسے موت سے زندگی کی طرف آیا۔ میری گردن جارج کے شکنجے سے نکل گئی۔ میں نے دیکھا جارج غضب ناک انداز میں عمران پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''یو باسٹرڈ... یو باسٹرڈ منکی۔''

اس نے عمران پر کئی مکے چلائے جنہیں عمران نے کمال صفائی سے بچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دفاعی انداز میں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یکا یک بہت سے گارڈز جارج اور عمران کے درمیان کود پڑے۔ کچھ گارڈز نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میرے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ گارڈز مجھے سہارا دیتے ہوئے اس خونی میدان سے باہر لے آئے۔

☆☆☆

اور یہ رات کا وقت تھا۔ میں راج بھون کے اندر ہی ایک مہمان خانے میں تھا۔ عمران اور میرے تین چار معاون بھی میرے ساتھ تھے۔ ان میں پارسی معاون بھی تھا۔ وہ ایک اچھے کمپاؤنڈر کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ وہ میرے زخموں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ میری گردن کا پرانا زخم مسلسل خون اگل رہا تھا۔ اس کے علاوہ پسلیوں پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ کسی وقت مجھے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہونے لگتا تھا۔ اگر میں زندہ تھا تو اس میں میری خوش قسمتی کو بھی دخل تھا۔ جیسا کہ چند دن پہلے ہی مجھے بتا دیا گیا تھا کہ شبھ گھڑی کے مطابق یہ مقابلہ سورج غروب ہونے سے قریباً ایک گھنٹا پہلے شروع ہو گا اور غروب آفتاب تک جاری رہے گا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ یہ مقابلہ اتنی دیر چلے گا۔ ایسی خونی لڑائیاں عموماً بیس پچیس منٹ کے اندر ہی اختتام پذیر ہو جاتی تھیں اور بعض اوقات تو پہلے دو تین منٹ کے اندر ہی فیصلہ ہو جاتا تھا مگر اس لڑائی نے غیر متوقع طول پکڑا تھا۔ یہاں تک کہ پنڈتوں کی رائے کے مطابق سورج غروب ہو گیا تھا۔ اب بھی اگر مقابلہ جاری رہتا تو یہ سراسر ''پاپ'' ہوتا... لہٰذا اسے روک دیا گیا۔ اب کل سورج نکلنے کے بعد یہ مقابلہ پھر شروع ہونا تھا... اور پہلے پہر کی تیسری گھڑی تک جاری رہنا تھا۔

آج کی لڑائی ایک نہایت مایوس کن موڑ پر ختم ہوئی تھی۔ عمران خاموش تھا۔ میرے معاونوں کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔ پارسی گوئل نے کہا۔ ''تابش صاحب! آپ کی قسمت نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ورنہ جارج صاحب کے اس داؤ میں آ کر کوئی نکلتا نہیں۔ کل پھر وہ شروع میں ہی آپ کو اس داؤ میں پکڑنے کی کوشش کریں گے... اور آپ گھائل بھی ہیں۔''

''کیا تم صرف نراشا کی باتیں کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہو؟'' دوسرے معاون نور محمد نے تڑخ کر کہا۔

''میں وہ کہہ رہا ہوں جو نظر آوت ہے۔ تم ان کی گردن کا زخم نا ہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ کھل گیا ہے۔ میں نے بڑے جتن سے پٹیاں باندھ کر خون روکا ہے۔ اور یہ پسلیوں والی چوٹ بھی معمولی نا ہیں ہے۔''

''لیکن کچھ بھی ہے، تمہیں حوصلہ بڑھانے والی بات کرنی چاہیے... اگر ہم...'' ایک دم معاون نور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

عمران نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ گارڈز کے پیچھے آٹھ دس افراد اندر آ گئے۔ ''نمستے نمستے'' کی کئی آوازیں گونجیں۔ اندر آنے والے اپنے حلیے سے مقامی ذات کے ہندو



www.digestpk.com

Asifzamil

لگتے تھے۔ ان کے لباس بھی معمولی تھے۔ پگڑیاں سر سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مسکین لہجے میں کہا۔ ’’سرکار! ہم آپ سے بات کرنا چاہت تھے۔ بڑی مشکل سے اجاجت ملی ہے جی۔ کئی جگہ تلاشیاں دے کر یہاں تلک آئے ہیں۔‘‘

’’آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

’’پہلی بات تو یہ ہے جی کہ اس سامبر مقابلے میں ہم جیسے بہت سے لوگن کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کی جیت چاہت تھے اور... اب بھی چاہت ہیں۔ لیکن سرکار... مم... میرا مطلب ہے کہ... سرکار...‘‘ وہ بُری طرح ہکلا گیا۔

عمران بولا۔ ’’جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔‘‘

اس نے لجاجت سے کہا۔ ’’سرکار! آپ ہماری بات کا بُرا نہیں مانیے گا لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ آپ کی دھرم پتنی سلطانہ بی بی سے ایک اپرادھ ہوا ہے۔ ان سے ایک برہمن موہن کمار جی کی ہتھیا ہوئی ہے۔ پتی ہونے کے کارن اس کا کچھ نہ کچھ بوجھ تو آپ پر بھی پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے طور پر آپ کے اور آپ کی پتنی جی کے زائچے بنوائے ہیں اور فالیں بھی نکلوائی ہیں۔ آنے والے سمے کا ٹھیک ٹھیک پتا تو بھگوان کو ہی ہے لیکن جوتر نجر یہی آوت ہے کہ... آپ... یہ لڑائی جیت نا ہیں سکیں گے۔ ہم آپ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے بنتی کرت ہیں کہ آپ اس لڑائی سے پیچھے ہٹ جاویں۔‘‘

اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی گدلی آنکھوں میں واقعی سچی خیرخواہی نظر آتی تھی۔ میں نے اپنی گردن کی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ’’اگر میں پیچھے ہٹ جاؤں تو کیا ہوگا؟ یہ برہمن زادے مجھے چھوڑ دیں گے... اور وہ سفید شیطان میری جان بخشی کردے گا؟‘‘

’’میں نے پنڈت مہاراج سے بھی بات کی تھی جی... وہ کہوت ہیں کہ ایشور کی طرف سے آپ کو ایک موقع تو ملا ہے۔ یہ لڑائی سورج ڈوبنے کے کارن رک گئی ہے۔ اگر آپ لڑائی سے پیچھے ہٹ جاویں اور کچھ شرطیں مان لیں تو ہو سکت ہے کہ آپ کی موت کی سجا کسی اور سجا میں بدل جاوے۔‘‘

عمران بولا۔ ’’اور ان شرطوں میں سب سے پہلی شرط یہی ہوگی کہ تابش اپنی بیوی کا پتا بتائے اور اسے ان بے رحم قاتلوں کے حوالے کرے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟‘‘

’’اس بات کا تو ٹھیک سے پتا نا ہیں جی۔ پر شاستروں سے نکالی گئی فالیں جھوٹ نہیں بتا سکتیں جی۔ ساری فالوں کا یہی کہنا ہے کہ یہ لڑائی...‘‘ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’تم نے کچھ اور کہنا ہے یا بس؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بس سرکار! یہ ہم سب کے من کی آواج تھی جو ہم آپ تلک پہنچانا جروری سمجھتے تھے۔ آخری فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، تمہاری ہمدردی اور تمہارے مشورے کا شکریہ۔‘‘ میں نے کہا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لوگ اب چلے جائیں۔ مجھے اور عمران کو حیرانی ہوئی جب باہر جانے سے پہلے ان سب مسکین صورت لوگوں نے باری باری میرے پاؤں چھوئے۔

ان کے جانے کے بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ’’تو ہم پرستی کے اسی بُت کو تو ہم نے توڑنا ہے۔ اب ہمارا جیتنا اور بھی ضروری ہوگیا ہے... اور ہم جیتیں گے۔‘‘ اس کی آواز میں وہی ولولہ تھا جو اسے کسی بھی دوسرے شخص سے ممتاز کرتا تھا۔

وہ درد اور تناؤ کی رات تھی۔ ہم آتش دان کے پاس بیٹھے تھے۔ عمران ہر پل میرے ساتھ تھا۔ کبھی میری مرہم پٹی کرتا ہوا، کبھی میرے بازو دباتا ہوا اور مجھے حوصلہ دیتا ہوا۔ کبھی مجھے تکنیکی مشوروں سے نوازتا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنے زخموں کی وجہ سے میں کچھ کمزور پڑ رہا ہوں۔ ایسی صورت میں جارج مجھے اچانک غیر متوازن کرکے اپنے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مجھے سامبر مقابلے کے اس ’’ناک آؤٹ داؤ‘‘ سے ہوشیار رہنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ آخر میں اس نے اپنا وہ پسندیدہ فقرہ بھی میرے سامنے دہرایا۔ میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر اور دلکش انداز میں مسکرا کر بولا۔ ’’تابی جگر! جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا...‘‘

اگلے روز سورج نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد میں اور جارج پھر آمنے سامنے تھے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بہت سے تماشائی سرد موسم کے باوجود ساری رات اس اسٹیڈیم نما جگہ پر موجود رہے ہیں۔ جو گھروں کو چلے گئے تھے، وہ بھی صبح سویرے اپنی جگہوں پر لوٹ آئے تھے۔ سخت سردی میں ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ جوں جوں سورج اوپر آرہا تھا، یہ دھند



اوجھل ہورہی تھی۔ سنہری دھوپ درختوں پر سے اوس چن رہی تھی اور قرب و جوار کی ہر شے کو نکھارتی جارہی تھی۔ شاہی بالکونی کل کی طرح پھر کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ نقارے بج رہے تھے اور نعروں کے شور سے زمین دہل رہی تھی۔

ہمارے لباس کل والے ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ گرانڈیل جارج کے کندھے پر ایک سفید پٹی نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف میری گردن اور پسلیوں پر بھی پٹیاں موجود تھیں۔ کل والے رام پوری چاقو پھر سے ہمارے حوالے کر دیے گئے۔ ہم وسیع اکھاڑے کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ آج جارج کل سے زیادہ بااعتماد نظر آتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی سی کوند رہی تھی۔ وہ مجھ سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اشتعال انگیزی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ خیرات کی زندگی تمہیں پنڈتوں کی طرف سے ملی ہے۔ تم لوگ ہوتے ہی بے غیرت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم رات کو ہی اپنے گلے پر چھری پھیر لیتے لیکن کوئی بات نہیں۔ آج ’’ہم‘‘ یہ کام کریں گے اور زیادہ اچھے طریقے سے کریں گے۔‘‘

میں کل کی طرح آج بھی یکسر خاموش رہا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے پھر جارج نے ہی حملے کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے چاقو سے میری گردن کو نشانہ بنانا چاہا۔ چاقو کی دھار میری گردن کی پٹی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا۔ اس نے پھرتی سے گھٹنا چلایا۔ ضرب میری ٹھوڑی پر لگی۔ میں اچھل کر دور جا گرا۔ وہ مجھ پر جھپٹا۔ مجھے اس کے چاقو سے زیادہ اس کے خطرناک داؤ کا اندیشہ تھا۔ میں اپنی گردن بچانے کے لیے بائیں طرف جھکا اور اپنے دائیں بازو کو اس کے چاقو سے نہ بچا سکا۔ ایک انگارہ سا گوشت میں اتر گیا۔ کندھا زخمی ہوا اور خون نکلنے لگا۔ میں کئی پلٹیاں کھا کر جارج کی زد سے نکلا۔ جارج کے ساتھیوں نے جارج کے کارگر وار پر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مقابلے کے شروع میں ہی یہ زخم لگ جانے سے جارج کا پلڑا اور بھاری ہوگیا۔ لگتا تھا کہ اسے فتح یقینی نظر آنے لگی ہے۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میری شکست کی صورت میں کیا ہوگا۔ غالب امکان یہی تھا کہ جارج مجھے اکھاڑے میں مارنا نہیں چاہے گا بلکہ سولی چڑھانے کے لیے زندہ رکھے گا۔

ایک دم میں چونکا۔ میں اپنی شکست کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران نے یہی کہا تھا کہ شکست کے بارے میں نہیں سوچنا۔ کچھ اسی سے ملتی جلتی بات بارو ندا جیکی بھی کہہ گیا تھا۔ وہ کہتا تھا... تکلیف اور توہین (شکست) کا ڈر ہی فائٹر کو کمزور کرتا ہے۔

یکا یک میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ جارج نے آج میرے ساتھ وہی کیا تھا جو کل میں نے مقابلے کے شروع میں اس کے ساتھ کیا تھا، ایک طرح سے اس نے میرے کل والے جادوئی وار کا جواب دیا تھا۔ میں زخمی کندھے کے سبب اپنے چاقو کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کررہا تھا جب اس نے زبردست ٹائمنگ کے ساتھ ٹانگ چلائی اور چاقو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ ہوا میں اڑ کر اوپر لکڑی کے سائبان میں پیوست ہوگیا۔ اب وہ میری پہنچ سے دور تھا اور میں خود کو نہتا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر جارج کے حمایتیوں نے شورِ قیامت بلند کیا۔ ان میں سے بہت سے اپنی نشستوں پر کھڑے ہوگئے۔ جارج نے اپنے چاقو کو اس طرح پکڑا کہ اس کا رخ نیچے کو ہوگیا۔ اب جارج کا انگوٹھا چاقو کے دستے کے آخری سرے پر تھا۔ اس نے مجھے جھکائی دے کر پہلے بائیں طرف ہٹایا پھر اچانک تڑپ کر وار کیا۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی چاقو والی کلائی میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اپنے زخمی جسم کی رہی سہی طاقت جمع کرکے اس کی کلائی مروڑی۔ میں چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ گورے کا دوسرا ہاتھ آزاد ہے اور میری یہ چاقو چھڑانے والی دیوانہ وار کوشش میری گردن کو پھر سے گورے کے شکنجے میں لاسکتی ہے مگر اب رسک لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور چاقو چھڑانے میں کامیاب ہوگیا۔ چاقو گرا تو میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے کے آخری کنارے تک پہنچا دیا لیکن پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا اور غالباً بہت سے تماشائی بھی جانتے تھے۔ جارج گورا گھوم کر میرے پیچھے آیا اور میری زخمی گردن ایک بار پھر اس کے منحوس شکنجے میں پھنس گئی۔ اس مرتبہ تماشائیوں کا شور فلک شگاف تھا۔ شکتی دیوتا والے کتبے ہوا میں لہرانے لگے اور سیکڑوں بینرز محوِ رقص ہوگئے۔

جارج پھنکارا۔ ’’باسٹرڈ! میں نے کہا تھا نا، حاملہ بکری اور نر شیر کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔‘‘

اگلے آٹھ دس منٹ پھر اسی اذیت ناک صورتِ حال میں گزرے جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں اور اگر کروں گا تو یہ خونی روداد طوالت کا شکار ہوگی۔ یہ بارو ندا جیکی کا انوکھا فلسفہ ہی تھا جو مجھے ان جاں گسل لمحوں میں



www.digestpk.com

Asifzamil

درد سہنے کا حوصلہ دے رہا تھا... میری سانس اکھڑتی جارہی تھی۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ میری زخمی پسلی ٹوٹ چکی ہے۔ میری گردن اور کندھے سے خون کا اخراج بڑھتا جارہا تھا۔ یہ اخراج میری ناتوانیوں کو تیزی سے بڑھا رہا تھا۔ میں مسمار ہورہا تھا... مٹ رہا تھا۔ بعین کل والی صورتِ حال تھی۔ جارج کا لاک مکمل تھا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے لاک میں پھنسایا ہوا تھا تاکہ اپنی گردن پر اس کے بازو کا دباؤ کم رکھ سکوں۔ دوسرے ہاتھ سے میں اسے کوئی جسمانی تکلیف پہنچانے کی جوابی کوشش کرتا تھا تو وہ میرے آگے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو ''بلاک'' کردیتا تھا۔ میں نہتا تھا۔ میرا چاقو کہیں اوپر سائبان میں اٹک چکا تھا اور جارج والا چاقو میں خود پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے سے باہر پھینک چکا تھا۔

تو کیا سب کچھ ختم ہوگیا؟ میں نے خود سے پوچھا۔

کیا باروندا جیکی کی حسرت ناک موت کا بدلہ نہ لیا جا سکا؟ مرتے وقت اس نے جو آگ میرے ارادوں کو سونپی تھی، وہ رائگاں گئی؟

کیا اپنے گھر کے بند دروازے کے پیچھے سلطانہ کے بانکپن اور آبرو کی دھجیاں اڑانے والا جانور ایک بار پھر اپنی غلیظ زندگی کو طول دینے میں کامیاب رہا؟

کیا ہزاروں کے مجمعے میں سسک سسک کر تنہا جان دینے والے اسحاق کی موت بھی فی الحال بیکار رہی؟

میرے ڈوبتے ذہن میں یہ سارے سوال ابھر رہے تھے اور میرے کلیجے کو شق کررہے تھے۔

اسی دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ جارج گورا ایک بار پھر اپنے آزاد ہاتھ کو میری دونوں ٹانگوں کے درمیان پہنچانے کی کوشش کررہا ہے۔ میں جانتا تھا، وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ وہ مجھے ہوا میں اٹھانا چاہ رہا تھا۔ عمران کی بات درست ثابت ہورہی تھی۔ مجھے سامبر کے سارے اصول یاد تھے اور ان میں ایک اصول ''راندی'' کا بھی تھا۔ جو شخص اپنے حریف کو سر سے بلند کرکے زمین پر پٹخنے میں کامیاب ہوتا تھا، وہ اسے ذلیل و خوار کرنے کا حق دار بھی ٹھہرتا تھا۔ وہ اسے ننگا کرسکتا تھا۔ اس کی پشت پر تھوک کر اور اسے لات رسید کرکے اکھاڑے سے باہر پھینک سکتا تھا۔ ''مرو یا مارو'' کے مقابلے میں بھی اس داؤ کے چل جانے کے بعد مقابلہ وہیں ختم ہوجاتا تھا اور پٹخے جانے والے حریف کو ''ناک آؤٹ'' قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فاتح، اس شخص کو جان سے مارنے کا حق دار ٹھہرتا تھا۔ کل اور آج کی لڑائی میں جارج نے متعدد بار ایسی کوشش کی لیکن میں اس طرف سے پوری طرح چوکس تھا۔

دوسری طرف میں نے بھی کل ایک دو موقعوں پر یہ ''ٹرائی'' کی تھی لیکن جارج جیسا شخص جو سامبر کا ایکسپرٹ تھا، مجھے اتنی آسانی سے یہ موقع کیسے دے سکتا تھا؟ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر خود کو حتی الامکان حد تک اکھاڑے کی مٹی کے قریب کرلیا اور یوں خود کو اوپر اٹھائے جانے کی کوشش ناکام بنادی۔

ایک بار پھر وہی جدوجہد شروع ہوگئی جو پچھلے دس منٹ سے جاری تھی۔ غالباً جارج گورا میری گردن کو اتنی دیر تک اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا کہ میری سانس رک جائے اور میں بے ہوش یا بے جان ہوکر زمین بوس ہوجاؤں۔ دوسری طرف میں سانسوں کی کمزور ڈور کو ٹوٹنے سے بچا رہا تھا اور کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جو مجھے جارج کا شکنجہ توڑنے میں کامیاب کرتا... بہرحال، یہ موقع کل کی طرح آج بھی مجھ سے دور تھا بلکہ اب تو دور دور نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بجلی سی لپک گئی۔ دماغ کے تاریک ترین گوشے بھی ایک لحظے کے لیے منور ہوگئے۔ مجھے لگا میں جیت سکتا ہوں۔ میں اب بھی جیت سکتا ہوں۔ ہم سائبان کے نیچے تھے۔ یہی جگہ تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے جارج نے میری ٹانگوں میں ہاتھ دے کر مجھے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش... اس کی شکست کا باعث بن سکتی تھی۔ مجھے ایک ایسی چیز نظر آرہی تھی جو اس کو شکستِ فاش دے سکتی تھی۔ وہ مجھے بدترین طریقے سے ہرانا چاہتا تھا اور اس کی اسی خواہش میں اس کی ''ہار'' کے قوی امکانات چھپے ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا، میں اسے موقع دوں گا۔ میں اسے خود کو اوپر اٹھانے کا موقع دوں گا۔ اور میں جانتا تھا، وہ میرے زخم زخم جسم کو اٹھالے گا... وہ سامبر مقابلوں کا ماہر ترین کھلاڑی تھا... سامبر کے ہر داؤ کا شناور تھا لیکن وہ ایک چیز نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس رام پوری چاقو کو نہیں دیکھ رہا تھا جو قریباً بارہ فٹ کی بلندی پر لکڑی کے سائبان میں پیوست تھا۔ شکتی دیوتا اپنی تمام تر جسمانی اور روحانی شکتی کے باوجود اس چاقو کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

... مجھے لگا کہ باروندا جیکی کی بے بسی، سلطانہ کے لاچار آنسو اور اسحاق کے خونچکاں زخم سب ایک پلڑے میں آگئے ہیں اور انہوں نے آناً فاناً جارج کی توانائیوں اور برتریوں سے لدا ہوا پلڑا ہواؤں میں اٹھا دیا ہے...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں





# مس بڈونچر

کاشف زبیر

نت نئے آہنگ اور مہماتی سرگرمیاں زندگی کو پُرلطف ہی نہیں کبھی کبھی مشکلات سے بھی دوچار کردیتی ہیں... جلیل میاں تو ان مصائب و مسائل جھیلنے کے عادی ہیں... لیکن اس دفعہ ان کی نورِ نظر... رخشِ چمن... اور جان بہاراں نے ایک فرمائش کا اظہار کرکے نہ صرف خود کو بلکہ جلیل میاں کو بھی ششدر کردیا ہے...

**عید کے تہوار پر آپ کے جانے پہچانے کرداروں کی تبسم ریزیاں**

گزشتہ کچھ دنوں سے میں شریفانہ زندگی کے مزے لے رہا تھا جس میں کوئی ہنگامہ اور مار اماری نہیں تھی۔ یعنی کوئی مسئلہ نہیں تھا سوائے شنو کے جسے پی ٹی وی کی طرح ہر سہ ماہی میں نئے ڈرامے کرنے کا مرض لاحق ہے۔ چائنیز کھانوں کے کورس سے وہ تائب ہوگئی تھی کیونکہ اس کی بنائی ہوئی ایک چینی ڈش کھا کر میں دو دن تک بیت الخلا کے مدار میں بے تکان چکر لگاتا رہا تھا۔ غسلِ صحت فرماتے ہی میں نے اسے وارننگ دی تھی کہ اگر اس نے آئندہ کبھی بھی کوئی چینی یا جاپانی ڈش بنانے اور ان ممالک سے پاکستان کے تعلقات خراب کرنے کی کوشش کی تو وہیں ہماری منگنی کا اختتام ہوجائے گا۔ یوں وہ اس شوق سے باز آئی لیکن ان دنوں اس پر ایک نیا بھوت سوار تھا۔ ایک دن اپنے مخصوص اسپاٹ جو موسم کی



www.digestpk.com

Asifzamil

مناسبت سے ان دنوں ہاٹ اسپاٹ بنا ہوا تھا یعنی چھت پر ملاقات کے دوران میں اس نے اچانک کہا۔ ”جلیل تو نے کبھی میرے ساتھ کوئی ایڈونچر نہیں کیا؟“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”اماں اور خالہ موقع دیں تو کروں نا۔ وہ تو تجھ پر خزانے کی ناگن بن کر بیٹھ گئی ہیں۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ ایڈونچر کا موقع ہی اس وقت دیں گی جب میں کسی ایڈونچر کے قابل ہی نہیں رہوں گا۔“

شنو شرمائی۔ ”جلیل بدتمیز، میں شادی کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ تیرے ان ایڈونچرز کی بات کر رہی ہوں جو تو سارے زمانے کے ساتھ کرتا پھرتا ہے اور اس میں نہ جانے کون کون سی عارفائیں شامل ہوتی ہیں سوائے میرے۔۔۔“ اس کے لہجے میں شکوہ آگیا۔ ”میں تو تیری ساری کہانیوں میں گھر تک محدود رہتی ہوں اور تو باہر دوسری عورتوں کو لیے پھرتا ہے۔“

”کیونکہ تو عارفہ نہیں ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”اور جہاں تک دوسری عارفاؤں کا تعلق ہے وہ تو مجبوری ہوتی ہیں اور میں کوئی جان کر بیل کو دعوت تھوڑی دیتا ہوں، یہ تو سر پڑتی ہیں تو بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ یاری دوستی میں مارا جاتا ہوں۔“

شنو نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ ”یہ نازو اور وہ جو مس پیر بخش تھی۔۔۔“

”غزالہ۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”کیا یاد دلا دیا!“ شنو نے مجھے گھورا۔ ”ان سے تیری کون سی دوست ہے؟“

”لاحول ولا۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”شنو تم بالکل غلط سمجھ رہی ہو، یہ دونوں خواتین صرف میری بزنس پارٹنر تھیں اور وہ بھی ماضیِ بعید کی۔“

”اور میں کیا ہوں؟“

”لائف پارٹنر۔“ میں نے دانت نکالے۔ ”مستقبل بعید کی۔“

شنو نے میری بات پر توجہ دیئے بغیر حسرت سے کہا۔ ”جلیل مجھے بہت شوق ہے کہ میں تیری کسی کہانی میں شامل ہوں اور لوگوں کو پتا چلے کہ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔“

”اچھا۔“ میں نے طنزیہ انداز سے اسے دیکھا۔ ”کیوں مجھ میں کیا کمی ہے ان حرافاؤں کے مقابلے میں؟“

”کمی تو کوئی نہیں ہے۔“ میں نے اس پر غور کیا۔ ”بلکہ کہیں کہیں سے زیادتی ہے اور واللہ کیا خوب زیادتی ہے۔“

شنو کچھ دیر سے سمجھی اور سرخ ہوگئی۔ رمضان میں اس نے مجھ پر پابندی لگا دی تھی کہ میں کوئی واہیات بات کہنے سے گریز کروں گا لیکن میں یہ کام جان بوجھ کر تھوڑی کرتا تھا خود بہ خود ہو جاتا تھا۔ جب میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ایک شریف اور گھریلو لڑکی ہے اور شریف لڑکیوں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ۔۔۔ وہ خفا ہوگئی۔

”جلیل تو روایتی تنگ نظر مرد ہے جو کبھی اپنی عورت کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتا۔“

”ایسا نہیں ہے۔۔۔“ میں نے سر کھجایا۔ ”شادی کے بعد بے شک تم بڑھ بڑھ کر گھر کا کام کرنا میں کبھی تمہیں پیچھے نہیں کروں گا۔“

شنو مزید خفا ہوگئی۔ ”جلیل۔۔۔ تیرا ابھی سے یہ حال ہے شادی کے بعد تو مجھے گھر میں قید کر دے گا۔“

”بالکل بھی نہیں پیاری شنو تمہیں باہر جانے اور کدو کریلے کی شاپنگ کرنے کی پوری آزادی ہوگی، میں ذرا بھی مخل نہیں ہوں گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا تو وہ واک آؤٹ کر گئی اور میں بھی یہی چاہتا تھا کیونکہ فتو کے کیفے ڈی پھونس پر راجا سے میری نہایت اہم اپائنٹ منٹ طے تھی۔ ان دنوں عارفہ نے اسے حسبِ معمول عاق کر دیا تھا۔ کیونکہ راجا سوائے رات کے تمام وقت اس کے پاس پایا جاتا تھا اور اپنے باپ کا گھر سمجھ کر رہتا تھا۔ تو جس طرح اس کے باپ نے اسے غیر اعلانیہ عاق کر رکھا تھا اسی طرح عارفہ نے بھی عاق کر دیا تھا۔

اماں اور خالہ ہماری شادی نہ کرنے کے فیصلے پر قائم تھیں لیکن انہوں نے کچھ آزادیاں ضرور عنایت فرما دی تھیں جن میں سے ایک شنو اور مجھے ایک ساتھ باہر جانے کی اجازت تھی اگر کوئی معقول وجہ ہو۔ اماں نے وارننگ دی تھی کہ میں نے اس بار ایک روزہ بھی چھوڑا تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گی۔ نیز شنو کے معاملے میں مجھے جو آزادیاں میسر تھیں، وہ بھی سلب کر لی جائیں گی۔ میں نے بلبلا کر اماں سے کہا۔ ”ایسا کرو ایک بکس بنا کر تم دونوں مل کر شنو کو اس میں بند کر دو، سال میں ایک دو بار نکال کر اس کی زیارت کروا دیا کرنا، میں اسی میں خوش ہو جاؤں گا۔“

”بکواس نہ کر۔“ اماں نے لتاڑا۔ ”مجھے معلوم ہے تو کیوں بلبلا رہا ہے، تجھے روزے جو رکھنا پڑیں گے۔“

اس لیے روزے رکھنے پڑے۔ پہلے دس روزے تو یوں گزرے کہ خود اپنا ہوش نہیں تھا، زمانے کی کیا خبر رکھتے۔ دوسرے عشرے میں کچھ ہوش آیا اور میں نے شنو سے ملنے کے لیے چھت تک جانے کی ہمت کر لی جو روزہ رکھ کر صبح سے شام تک ان گنت کام نمٹاتی تھی اور اس میں بھری دوپہر میں کپڑے دھو کر لٹکانا بھی شامل تھا۔ میری تو بازار جانے کے خیال سے روح فنا ہوتی تھی۔ البتہ تیسرے عشرے تک کسی حد تک عادی ہوگیا۔ اس لیے روزے کے دوران بھی باہر نکل جاتا ورنہ تو افطاری کے دو گھنٹے بعد ہی اپنی دکان پر جانے کی ہمت کرتا تھا، وہ بھی اس لیے کہ رقم وصول کرنی ہوتی تھی۔

عید کا سیزن ہونے کی وجہ سے کمائی کا تناسب ڈبل ہو گیا تھا۔ ماسٹر اکرم نے کے ای ایس سی سے مقابلے کا چیلنج قبول کرتے ہوئے دکان پر ایک جنریٹر رکھ لیا تھا اور کسی سے گیس کنکشن بھی لے لیا تھا اس لیے جب دوسرے دکاندار لائٹ نہ ہونے کی وجہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہوتے تھے تو میری دکان پر کام زور و شور سے جاری رہتا۔

کپڑے لینا، دینا اور پیسے وصول کرنا سب ماسٹر اکرم کا کام تھا۔ شام کو وہ مجھے آئی ہوئی رقم اپنا اور کاریگروں کا حساب منہا کر کے دے دیتا تھا۔ اس میں سے بجلی کا بل اور چھوٹے موٹے اخراجات مجھے ادا کرنا پڑتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ عید کے بعد برابر والی دکان بھی خرید لوں کیونکہ وہ سیزن میں بھی بند پڑی تھی۔ اس روز بھی افطار کے بعد میں دکان کی طرف نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا اور اس کے بعد کیفے ڈی پھونس کا چکر لگانے کا ارادہ بھی تھا کہ خالہ لاؤڈ اسپیکر شنو کے ساتھ چلی آئیں۔ اماں ان کے گلے لگ گئیں۔ ”نفیسہ تم تو عید کا چاند ہوتی جا رہی ہو۔ میں تو سمجھ رہی تھی عید پر ہی نظر آؤ گی۔“

اس پر خالہ لاؤڈ اسپیکر نے دھیمے لہجے میں ان بیماریوں کا ذکر شروع کر دیا جو عموماً جوان بن بیاہی بیٹی کی ماؤں کو ہو جاتی ہیں۔ میں نے شنو سے آہستہ سے کہا۔ ”اور تم چودھویں کا چاند ہوتی جا رہی ہو، کہاں کی تیاری ہے؟“

شنو نے گھبرا کر اپنی اور میری اماں کو دیکھا لیکن وہ اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ ”آہستہ بول، تیرے ساتھ جانا ہے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔“

میں خوش ہوگیا۔ ”اچھا پھر سی ویو بھی چلیں گے۔“

”اس کا پروگرام بعد میں رکھ لینا۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”آج مشکل ہے۔ بہت دیر ہو جائے گی۔“

”کتنی دیر لگے گی؟“

”تقریباً دو ڈھائی گھنٹے۔“

خالہ لاؤڈ اسپیکر اماں کو بتا رہی تھیں کہ آج شنو کو اپنی عید کی کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ میں تیار ہوا اور باہر آیا۔ شنو پہلے ہی تیار تھی۔ روانگی سے پہلے میں نے اسے خبردار کر دیا۔ ”ذرا کس کر پکڑنا آج ٹریفک زیادہ ہوگا۔“

شنو نے مجھے گھورا۔ ”یہ بائیک کا اسٹینڈ اسی وجہ سے نکلوایا ہے تم نے؟“

”نہیں وہ تو اس لیے نکلوایا ہے کہ وزن کے ساتھ تمہارا بیٹھنے کا رقبہ بڑھتا جا رہا ہے اور مجھے تقریباً ٹینکی پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑتا تھا۔“

”جلیل بے شرم۔“ اس نے مجھے چٹکی کاٹی۔ میں نے اچھل کر دولتی جھاڑی یعنی بائیک اسٹارٹ کی اور خفگی سے کہا۔ ”اپنے ہاتھ قابو میں رکھو۔“

”اگر تیری زبان قابو میں رہی تو میرے ہاتھ بھی قابو میں رہیں گے۔“ شنو نے اطمینان سے کہا۔

”جانا کہاں ہے؟“ میں نے مین روڈ پر آتے ہوئے پوچھا۔

شنو نے صدر کی ایک مارکیٹ کا نام لیا جہاں سب کچھ ہی خاصا مہنگا ملتا ہے۔ میں نے شنو کو خبردار کیا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں، کچھ رقم اماں نے دی ہے اور باقی تم دو۔“

مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میں عیدِ قرباں سے پہلے قربانی کا بکرا بنوں گا لیکن یہ سعادت میں نے خود قبول کی تھی اور راضی خوشی قربان ہونے جا رہا تھا۔ شنو بھی خوش ہوگئی تھی اسی لیے ذرا لگ کر بیٹھی تھی اور میں خاموشی سے اس کے ریشمی وجود کی نرمی اور گرمی محسوس کرتا رہا۔ اس دوران میں زبان کو قابو میں رکھا تھا کیونکہ شنو ناراض ہو جاتی تو الگ ہو کر بیٹھ جاتی اور زیادہ ناراض ہوتی تو ظالم چٹکیوں پر اتر آتی۔ میری کوشش تھی کہ ذرا آرام سے ٹہلتے ہوئے جائیں لیکن بے لگام ٹریفک نے جلد مارکیٹ پہنچا دیا۔

”جلدی پہنچ گئے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”چلو کوئی بات نہیں واپسی میں آرام آرام سے جائیں گے۔“

”جی نہیں۔“ شنو اتر کر شوخی سے بولی۔ ”اگر تم نے بائیک آہستہ چلائی تو مجھے ایکسی لیٹر دینا آتا ہے۔“

یہاں سے یہ سیدھی سادی اسٹوری ایک ایسے ایڈونچر میں بدل گئی جس کا میں تو عادی تھا لیکن شنو نے صرف میری کہانیوں میں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے تھے اور سڑک پر ٹریفک بہہ رہا تھا اور فٹ پاتھ پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اچانک ایک برقع پوش خاتون ہمارے قریب آئی۔ میں سمجھا مانگنے والی ہے اور میں معاف کرو بی بی کہنے والا تھا کہ اس نے سرگوشی میں کہا۔



www.digestpk.com

Asifzamil

"جلیل۔"

مجھ سے پہلے شنو اچھل پڑی، اس نے غرا کر کہا۔

"کون ہو تم اور جلیل یہ تجھے کیسے جانتی ہے؟"

"مجھے کیا پتا؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "اے کون ہو تم؟"

"جلیل مجھے نہیں پہچانا؟" اس بار وہ ذرا واضح آواز میں بولی۔ میں دنگ رہ گیا۔

"حسینہ تم؟"

اس بار شنو نے سخت مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تم اسے حسینہ کہہ رہے ہو؟"

"اس کا نام حسینہ ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"ہوگا۔" شنو غرائی۔ "لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

مس حسینہ جو استاد ٹی ٹی کے دست ناراست جانی چریا کی محبوبہ تھی اور آخری اطلاعات کے مطابق وہ مفرور تھی اور جانی چریا قسمیں کھاتا پھر رہا تھا کہ جب تک وہ حسینہ کے کم سے کم پانچ ٹکڑے نہیں کرے گا، چین سے نہیں بیٹھے گا اور اس پر زندگی کا سکھ چین سب حرام ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ نیا ہیئر اسٹائل تک نہیں بنوائے گا۔ جانی چریا ایک ہیئر اسٹائل تین مہینے سے زیادہ نہیں رکھتا تھا۔ جانی چریا کے غیظ و غضب کی وجوہات سے سب واقف تھے۔ مس حسینہ ہر جائی تھی اور اس کے دوسرے مردوں سے بھی تعلقات تھے۔ یہ بات جانی کے علم میں سب سے آخر میں آئی یعنی جب اس کا سارا حلقہ احباب جان چکا تھا اور اس میں سے نصف مس حسینہ کی زلفوں کا اسیر بھی تھا۔ باقی نصف اس کی چاہ رکھتا تھا اس لیے سب نے اتفاقِ باہمی سے زبان بند رکھی تھی جیسے اقوام متحدہ میں بڑے ممالک چھوٹے ممالک کے بارے میں یکساں پالیسی رکھتے ہیں۔

مس حسینہ غضب کی چیز تھی۔ میں نے آخری بار اسے ایک بھرے پرے بازار میں نہایت مردانہ انداز میں فرار ہوتے دیکھا تھا جب وہ مجھے جل دے کر نکل گئی تھی۔ چاکلیٹی رنگ اور تیکھے نقوش کے ساتھ سانچے میں ڈھلا جسم دیکھنے والوں کے ہوش اڑانے کے لیے کافی سے زیادہ ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے عشاق کی تعداد شہرِ خون خرابا میں فی مربع میل کم سے کم ایک درجن ضرور تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو باریابی کا شرف رکھتے تھے اس سے کہیں زیادہ دور سے آہیں بھرنے والے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شنو سے اس کا تعارف کیسے کراؤں۔۔۔ ویسے اسے برقع میں دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کیونکہ وہ تو لباس کی بھی قائل نہیں تھی۔ شنو کھا جانے والی نظروں سے سڑک کے کنارے موجود کھمبے کو گھور رہی تھی لیکن میں جانتا تھا، اس کے تیر نظر کا ہدف یہی خاکسار تھا۔ شنو کی آنکھوں میں قدرتی ناانفاقی پائی جاتی ہے۔ میں نے گلا کھنکار کر کہنا چاہا.....

"شنو یہ....."

"جلیل میرا نام مت لینا۔" مس حسینہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میری جان کے دشمن جانی کے آدمی ادھر ہی گھوم رہے ہیں....." بات کا اختتام اس نے چند مردانہ قسم کی گالیوں پر کیا اور شنو کا منہ سرخ ہو گیا، اس نے مجھ سے کہا۔

"جلیل چل یہاں سے۔"

مگر مس حسینہ کی بات نے مجھے فکر مند کر دیا۔ یہ تو یقینی تھا کہ وہ جانی چریا سے بچتی پھر رہی تھی لیکن اس وقت ہمارے پاس آنے کا کیا مقصد تھا۔ میں نے احتیاط سے آس پاس دیکھا۔ "تم دھوکا دے رہی ہو؟"

حسینہ نے میرے اور شنو کی آڑ میں ہوتے ہوئے کہا۔

"سڑک کے پار دیکھ وہ لال بورڈ والی دکان کے نیچے۔"

میں نے اس طرف دیکھا اور میرے ہوش اڑ گئے۔ وہاں جانی چریا کے دو آدمی موجود تھے اور متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے، میں ان کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور جلدی سے شنو کی آڑ میں ہو گیا کیونکہ جس طرح میں انہیں پہچانتا تھا اسی طرح وہ بھی مجھے جانتے تھے اور مجھے یہاں دیکھ لیتے تو ناممکن تھا کہ میرے پاس نہ آتے۔ ایسی صورت میں جب کہ مفرور مس حسینہ یہاں موجود تھی۔ جانی چریا کے کسی آدمی کا پاس آنا میری صحت کے لیے سخت مضر ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔

"حسینہ یہاں سے دفع ہو جاؤ، میں تمہارے ساتھ مارا جانا بالکل پسند نہیں کروں گا۔"

"بالکل نہیں، میں یہاں سے ہلی بھی تو وہ دیکھ لیں گے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "جلیل مجھے یہاں سے نکال دے۔"

مس حسینہ جس طرح مجھ سے بات کر رہی تھی، یہ انداز شنو کو چراغ پا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا صبر جواب دے چکا تھا لیکن وہ میری وجہ سے چپ تھی۔ اس بار نہ خاموش رہ سکی، اس نے غرا کر کہا۔ "بکواس نہ کر، یہاں سے چلی جا ورنہ میں خود ان لوگوں کو آواز دیتی ہوں۔"

"یہ کون ہے؟" حسینہ نے مجھ سے پوچھا۔ "اس سے بول تمیز سے بات کرے ورنہ منہ بگاڑ دوں گی۔"

"یہ شنو ہے اور تمیز سے بات تم کرو۔" میں نے کہا۔



اتنی دیر میں، میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا تھا۔ حسینہ خوامخواہ ہمارے سر ہو رہی تھی اصولاً تو اسے یہاں رکنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے فرار ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس کا مقصد کیا تھا اور وہ کیوں ہمارے سر ہو رہی تھی۔ میں نے شنو کی طرف دیکھا۔ "چلو۔"

شنو اندر ہی اندر کھول رہی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ آنے والے کئی دنوں تک مجھے اس کی آتش فشانی برداشت کرنا پڑے گی۔ بہرحال مس حسینہ سے میرے دوٹوک سلوک سے وہ خوش ہوئی، اس نے حقارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور میرے ساتھ چلنے کے لیے قدم آگے بڑھایا تھا کہ منجمد ہو گئی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"شنو کیا ہوا، چل کیوں نہیں رہی ہے؟"

مس حسینہ نے مسکراتی آواز میں کہا۔ "یہ نہیں چلے گی میں نے اسے بریک لگا دیا ہے۔"

جب میں نے اس کی لگائی بریک دیکھی تو شنو کے ساتھ میں بھی کچھ دیر کے لیے منجمد ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پستول تھا جو اس نے شنو کی پسلی پر عین دل سے ذرا نیچے لگا رکھا تھا اور اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے شنو نے کبھی پستول بھی نہیں دیکھا تھا اور اپنی پسلی سے لگا ہوا تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر مجھے ہوش آیا اور میں نے بوکھلا کر کہا۔ "تمہارا دماغ درست ہے، یہ کیا کر رہی ہو؟"

"جو تو دیکھ رہا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔ "جلیل مجھے یہاں سے نکلنا ہے ہر قیمت پر۔ اگر مجھے پکڑنے کی کوشش کی گئی تو سب سے پہلے تیری محبوبہ مرے گی۔"

میری محبوبہ کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ محبوبہ قرار دیے جانے پر وہ شرمائی بھی نہیں۔ میں نے حسینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر تم سمجھ رہی ہو کہ اس طرح تم بچ جاؤ گی تو تم غلطی پر ہو۔ خود کو بچانے کے لیے تم اس سڑک پر موجود تمام افراد کو بھی شوٹ کر دو تب بھی جانی کے آدمی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یہ دھمکی میں تجھے دے رہی ہوں۔ اگر شنو کی جان بچانا چاہتا ہے تو میری جان بچا۔ مجھے یہاں سے نکال۔"

"وہ کیسے؟"

"تیرے پاس بائیک ہے اس پر لے چل۔" اس نے سادہ سا حل پیش کیا۔ میں نے شنو کی طرف دیکھا تو وہ رونے والے انداز میں بولی۔

"جلیل اس چڑیل کی بات مان لے ورنہ یہ مجھے مار دے گی ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"وہ تو میری بھی نہیں ہوئی۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"میری بھی نہیں ہوئی ہے اگرچہ تجربہ بہت ہے۔" حسینہ نے شرم کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔ "جلیل تیرے پاس صرف ایک منٹ ہے۔ اس کے بعد تیری شادی کم سے کم شنو سے نہیں ہو سکے گی۔"

مس حسینہ کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ اس کے بارے میں سن رکھا تھا کہ اس نے ناز و ادا و حسن کے ساتھ اپنے ہاتھ سے کئی افراد کو قتل کر رکھا تھا اور ان میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے کم عمری میں اسے کلی سے پھول بنا کر اس راہ پر ڈالا تھا۔ اور بالآخر وہ جانی چریا جیسے آدمی کی محبوبہ بن گئی۔ میں شنو کے معاملے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ "ٹھیک ہے جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا لیکن خدا کے لیے یہ پستول اس سے دور کرو ورنہ اس کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔"

مس حسینہ نے پستول اپنے برقع میں کر لیا۔ "اب نکل یہاں سے۔"

"ہم تینوں بائیک پر کیسے آئیں گے؟" میں نے پریشانی سے کہا کیونکہ شنو کے ساتھ میں ہی مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ مس حسینہ کا وزن اگرچہ شنو سے کم تھا لیکن خاص مقامات سے وہ بھی بھاری تھی۔ وہ صرف اسی صورت میں بائیک پر آسکتی تھی جب میں ٹینکی پر بیٹھ کر ڈرائیو کرتا۔ اس نے کہا۔

"ہم ایسے بیٹھیں گے جیسے مرد بیٹھتے ہیں۔"

"ایسا کرتے ہیں شنو کو چھوڑ دیتے ہیں۔" میں نے تجویز دی۔ "میں تمہیں جہاں کہو گی چھوڑ دوں گا۔"

لیکن مس حسینہ سے پہلے شنو نے یہ تجویز مسترد کر دی۔

"نہیں میں بھی ساتھ جاؤں گی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے، یہ ساتھ جائے گی، چل بیٹھ۔" اس نے شنو کو حکم دیا۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی کیونکہ جانی چریا کے آدمی اب سڑک کے اس طرف آ رہے تھے۔ اگر درمیان میں بے محابا ٹریفک نہ ہوتا تو وہ اب تک یہاں آ چکے ہوتے۔ شنو آج تک اس طرح بائیک پر نہیں بیٹھی تھی، اسے شرم آ رہی تھی مگر مجبوری تھی جیسے تیسے وہ بیٹھی تو جگہ بالکل ہی نہیں بچی کیونکہ وہ مجھ سے یوں دور تھی جیسے مقناطیس کے دونوں سرے ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں۔ مس حسینہ نے بالکل پروا کیے بغیر نشست کے آخری حصے میں اپنی جگہ بنائی اور پھر شنو کو مجھ میں یوں دبایا کہ اب ہم مقناطیس کے چپک



www.digestpk.com

Asifzamil

جانے والے بروں کی طرح یکجا ہو رہے تھے۔ شنو نے میرے۔۔۔کان میں سرگوشی کی۔ ''جلیل یہ کیا مصیبت ہے؟''

مگر میں جانی چریا کے آدمیوں کی صورت میں موت کے فرشتوں کو پاس آتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے عجلت میں ہیلمٹ پہن لیا کہ میری صورت چھپ جائے۔ مس حسینہ نے گرنے سے بچنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر میری بیلٹ پکڑ لی تھی۔ شنو کو پتا نہیں تھا ورنہ وہ مزید برا مناتی۔ میں واقعی ٹینکی پر بیٹھا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ کبھی مس حسینہ، جانی چریا اور اسی قبیل کے لوگوں سے تعلق کیوں رکھا تھا جو آج میرے گلے پڑ رہا تھا۔ اس طرح بائیک چلانا مجھے اتنا ہی مشکل لگ رہا تھا جتنا سرکس میں موت کے کنوئیں میں بائیک چلانا۔ بہ مشکل میں ٹریفک میں شامل ہوا۔ میں نے مخالف سمت کا رخ کیا تھا۔ جتنی جلدی اس جگہ سے نکل جاتا اتنی جلدی اس مصیبت سے جان چھوٹ جاتی جو مس حسینہ کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ شنو نے پھر کان میں کہا۔

''جلیل مجھے شرم آ رہی ہے۔''

''شرما لو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ حالانکہ مجھے اس کے وجود کی نزاکتوں اور نرمیوں کا دور تک خیال نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر سرگوشی کی۔

''یہ بہت بے ہودہ عورت ہے۔''

''وہ تو ہے لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''بس پتا چل گیا۔'' شنو کھسیا کر بولی غالباً کوئی ایسی بات تھی جو وہ مجھے نہیں بتا سکتی تھی۔ ''اس سے جلدی جان چھڑاؤ۔''

''تو اور کیا کر رہا ہوں؟'' میں نے بائیک کو ایک ذیلی سڑک پر موڑتے ہوئے کہا جس پر ٹریفک ذرا کم تھا۔ ''مہربانی کر کے تم ذرا خاموش ہو جاؤ۔''

مگر خاموش ہونا شنو کو آتا تو وہ عورت ہی کیوں کہلاتی۔ اس نے پھر سرگوشی کی۔ ''کاش میرے پاس موبائل ہوتا۔''

''تو تم کیا کرتیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اپنی اماں کو الوداعی کال کرتیں یا۔۔۔۔''

''میں پولیس کو کال کرتی۔'' وہ بولی۔

''جیسے میں تجھے کال کرنے دیتی۔'' پیچھے سے مس حسینہ نے کہا، وہ شنو کی ساری سرگوشیاں سن رہی تھی۔ شنو بھنا گئی۔

''تم ہماری باتیں سن رہی ہو؟''

''بہرا بھی سن لے۔'' وہ بولی۔ ''بے چارہ جلیل شادی کے بعد خوب سنا کرے گا۔''

ظاہر ہے شنو خالہ لاؤڈ اسپیکر کی بیٹی تھی کچھ اثر تو آنا ہی تھا۔ شنو نے طنز کیا۔ ''بڑی ہمدردی ہو رہی ہے۔''

''خدا کے لیے۔'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''تم دونوں لڑنے کے بجائے پیچھے بھی نظر رکھو۔''

''میں دیکھ رہی ہوں۔'' مس حسینہ نے کہا۔ ''ایک کالی گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے اور مجھے شبہ ہے اس میں جانی کے آدمی ہیں۔''

''یہ بات اب بتا رہی ہو۔'' میں نے بائیک کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا اور اچانک اسے ایک گلی میں گھما دیا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ گلی دوسری طرف سڑک پر نکلتی ہے۔ خوش قسمتی سے کسی نے گلی میں شادی، ولیمے، عقیقے یا چالیسویں کا تنبو نہیں لگا رکھا تھا۔ مس حسینہ اب پیچھے نظر رکھے ہوئے رواں کمنٹری کر رہی تھی۔

''گاڑی پیچھے آ رہی ہے۔۔۔۔۔ اس کی رفتار بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ جلیل وہ پاس آ رہے ہیں۔''

وہ پاس آ رہے تھے تو اس کا مطلب تھا، انہوں نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا اور اس سے پہلے وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرتے، ان سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ یہ عام بدمعاش نہیں تھے۔ کلاشنکوف اور مشین گن ان کے لیے کھلونا تھی اور یہ راکٹ ایسے مارتے تھے جیسے بچے لڑائی میں ایک دوسرے کو پتھر مارتے ہیں۔ اگر وہ ایک برسٹ مار دیتے تو ہم تینوں ہی آں جہانی ہو جاتے۔ میں نے بائیک کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شنو مجھے کس کر پکڑ لو۔''

''پکڑا ہوا تو ہے۔''

''ایسے نہیں بغلوں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر پکڑو اور حسینہ تم شنو کو پکڑ لو جلدی۔''

انہوں نے ایسا ہی کیا اور میں نے بائیک بھگانا شروع کر دی۔ میں آنے والی ہر گلی میں بائیک گھما رہا تھا تعاقب کرنے والے سیاہ رنگ کی بڑی جیپ پر تھے اور یہ ہر گلی میں آسانی سے نہیں گھس سکتی تھی۔ ایک تنگ گلی سے ہم چاول چننے والی خواتین کے چاولوں کے درمیان سے گزرے تو انہوں نے زنانہ لغت کی منتخب گالیوں کا سبق دینا شروع کیا ہی تھا کہ جیپ آ گئی اور وہ چاول بھول کر جان بچانے کے لیے گھروں میں گھس گئیں۔ ایک بڑے میاں کا منہ بائیک پر دو عدد خواتین کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر آخری حد کھل گیا۔ میں پاس سے گزرا تو وہ سہم کر سیڑھی پر چڑھ گئے۔ پتا نہیں جیپ سے کیسے بچے۔ وہ ملک الموت کی طرح پیچھے آ رہے تھے اور غالباً



ارادہ بھی ملک الموت والا ہی تھا۔

بالآخر کچھ گلیوں میں گھمانے کے بعد میں ان کو ڈاج دینے میں کامیاب رہا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک پتلی سی گلی نظر آ گئی جس سے بائیک تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی لیکن جیپ تو کیا دنیا کی سب سے چھوٹی گاڑی بھی اس سے نہیں گزر سکتی تھی۔ البتہ گلی سے گزرتے ہوئے ہم جان سے گزرتے گزرتے رہ گئے کیونکہ بائیک تاریکی میں ایک کالے کتے کی دُم پر سے گزر گئی۔ اس پر تین چیخیں نکلی تھیں۔ ایک تو کتے نے بھیانک چیخ ماری۔ وہ حق بہ جانب تھا لیکن باقی دو چیخیں ان دو خواتین نے ماریں جو میرے پیچھے بیٹھی تھیں اور پھر کتا جس زور و شور سے بھونکا، اس سے میرا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ کتے نے میری ٹانگ دبوچ لی ہے اور سچی بات ہے جانی چریا کے گرگوں سے بھی وہ خوف محسوس نہیں ہوا جو ان چند لمحوں میں اس گلی میں محسوس ہوا تھا۔ کھلی سڑک پر آ کر میں نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ دائیں طرف سے ایک ٹرک نمودار ہوا۔ شنو نے میرے کان میں ایک چیخ اور ماری۔ میں نے بائیک لہرائی۔ بائیک تو ٹرک سے بچ گئی لیکن جوشِ انتقام میں دوڑا آنے والا کتا بلاوجہ مرحوم ہو گیا۔ ٹرک اس پر سے گزر گیا تھا، مرحوم کی آخری چیخیں بڑی اونچی اور دردناک تھیں۔ اگر وہ اہنسا کا پجاری ہوتا اور درگزر سے کام لیتا تو زیادہ سے زیادہ دو دن بعد اپنی ٹھیک ہو جانے والی دُم کو دوبارہ گلی میں بچھا کر کسی اگلے بے وقوف کا انتظار کر سکتا تھا جو اس کی دُم پر پاؤں رکھنے کی حماقت کرے اور وہ اس کا پاؤں پکڑ لے۔

بیک وقت اتنے حادثوں سے بچ نکلنے پر شنو رو رہی تھی اور مس حسینہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ ''چل بس کر نا۔۔۔۔ کچھ ہوا تو نہیں۔۔۔۔ کوئی مرا نہیں ہے۔۔۔۔ سب بچ گئے ہیں۔''

درحقیقت مس حسینہ کے اپنے اعصاب متاثر ہوئے تھے اور وہ بول کر انہیں ٹھیک کر رہی تھی۔ خود میرے ہاتھ بائیک پر کانپ رہے تھے اور کوئی دس منٹ بعد ایک سنسان جگہ بائیک روک کر میں مس حسینہ پر برس پڑا اور اسے بے نقط سناتے ہوئے کہا۔ ''اب جان چھوڑو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

مس حسینہ اپنے موڈ میں آ گئی اور میری بات یوں سن رہی تھی جیسے میں اس سے سنسکرت میں بات کر رہا ہوں۔ جب میں چپ ہوا تو اس نے کہا۔ ''اب چل، وہ لوگ یہیں گھوم رہے ہوں گے۔''

''بے شک گھومتے رہیں اب میں تمہیں مزید ساتھ نہیں بٹھاؤں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''جلیل بلاوجہ اڑی مت کر تو جانتا ہے میرے پاس پستول ہے، مجھے بار بار صرف دھمکی کے لیے پستول نکالنا اچھا نہیں لگتا ہے۔''

شنو گھبرا گئی کیونکہ اگر مس حسینہ پستول نکالتی تو یقیناً اسی کی پسلیوں میں لگاتی۔ ''جلیل یہ جہاں چاہتی ہے اسے وہاں چھوڑ دے۔''

میں ابھی تک بھنایا ہوا تھا۔ ''یہ ہمیں جہنم لے جانا چاہتی ہے اپنے ساتھ۔''

مس حسینہ ہنسی۔ ''تو نے ٹھیک سمجھا۔ اب چل ورنہ تیرے سر میں سوراخ کر کے اسے لے جاؤں گی۔ تو جانتا ہے ایک زمانے میں ٹریل چلاتی تھی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شنو کے حوالے سے اس کی دھمکی نے مجھے فکرمند کر دیا۔ ''شنو کو کیوں لے جائے گی؟''

اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''اچھی چیز ہے کہیں کام آئے گی۔''

شنو تڑپ کر بولی۔ ''میں چیز نہیں ہوں اور تیرے ساتھ کیوں جاؤں گی؟''

''جیسے یہاں تک آئی ہے اسی طرح میرے ساتھ جائے گی۔'' حسینہ نے پستول کی جھلک دکھائی۔ ''اس سے تو بھوت بھی ڈرتا ہے تو کیا چیز ہے؟''

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ ویسے میرا دماغ اب ٹھنڈا ہو گیا تھا جسے کتے اور پھر اس کے انجام نے گرم کر دیا تھا۔ میں ایک بار پھر یوم آزادی کی پریڈ کے دوران کرتب دکھانے والے بائیک سواروں کی طرح بائیک چلاتا ہوا حسینہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ یہ شہر کا پرانا علاقہ تھا۔ جلد اس سے گزر کر ہم ایک ایسی جگہ آئے جہاں ہر طرف چھوٹے بڑے گودام پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کباڑیوں کا علاقہ تھا اور یہاں سرِ شام ہی سناٹا چھا جاتا تھا بس کہیں کہیں سے کوٹنے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے بعد پرانے شہر کا وہ حصہ تھا جہاں جا بہ جا جن خانے جیسی سال خوردہ عمارتیں ایک دوسرے سے ٹکی کھڑی تھیں بہت سی عمارتیں تو ایسی ہو گئی تھیں کہ اگر ایک طرف سے بھی سہارا نہ ہو تو فوراً گر جاتیں۔ لوگ ان میں بھی رہ رہے تھے اور ہر عمارت میں انار کے دانوں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ حسینہ نے ایک عمارت کے سامنے بائیک روکنے کو کہا۔ ان دونوں کو اتار کر میں نے بائیک ذرا چھپا کر کھڑی کی کیونکہ کھلے عام چھوڑ کر جاتا تو امکان تھا واپسی پر بائیک ہی نہ ملتی۔ اوپر جانے سے



www.digestpk.com

Asifzamil

پہلے میں نے ایک بار پھر مس حسینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''دیکھ، میں تجھے وہاں سے نکال لایا ہوں اب ہمیں جانے دے۔ اگر تجھے ڈر ہے کہ میں کسی سے کہہ دوں گا تو یقین رکھ ابھی مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا ہے۔''

''مجھے یقین ہے۔'' وہ مسکرائی۔ اس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ ''چل اب اندر۔۔۔ دیر مت کر۔۔۔ تجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ اس کے بعد تو جانے کے لیے آزاد ہوگا۔''

اوپر جاتے ہوئے وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھی اور شنو مجھ پر کہ کہیں میں مس حسینہ کی اشتعال انگیز چال تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس انداز میں چلتی تھی کہ اس کا پورا جسم ڈولتا تھا اور دیکھنے والا اسے نظر انداز کر ہی نہیں سکتا تھا۔ خدا جانے یہ چال اصلی تھی یا وہ جان کر اس طرح چلتی تھی۔ شنو نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سن لے گی، عادت سے مجبور ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ''کتنی بے ہودہ چال ہے۔''

''اچھا، میں نے غور ہی نہیں کیا تھا اب دیکھوں گا۔'' میں نے سادگی سے کہا تو شنو غرائی۔

''خبردار۔۔۔ بالکل بھی نہیں دیکھے گا۔''

ہم چوتھے فلور پر آئے۔ یہ پوری عمارت چھوٹے چھوٹے کاک نما فلیٹوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے اکثر ایک کمرے کے تھے اور ان میں پورے پورے خاندان آباد تھے۔ ایک فلیٹ کے سامنے مس حسینہ نے کہیں سے ایک چابی برآمد کی اور تالا کھولا۔ ہم اندر آئے۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ وہاں ایسی بو بسی ہوئی تھی جیسے یہ فلیٹ اکثر بند رہتا ہو۔ بستر اور فرش پر کپڑے بکھرے ہوئے تھے اور ظاہر ہے زنانہ تھے۔ ان میں کچھ خاص ملبوسات تھے جنہیں دیکھ کر شنو بوکھلا گئی لیکن مس حسینہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے عقب کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور الماری کھولی۔ اس میں سے ایک عدد لباس نکالا اور مجھ سے بولی۔

''جلیل منہ دوسری کر لے ورنہ تیری منگیتر برا منائے گی۔''

شنو نے برا سا منہ بنایا اور زیرِ لب مس حسینہ کو بے نقط سنائیں۔ میں نے منہ پھیرا اور مس حسینہ نے لباس تبدیل کر لیا۔ لیکن جب میں نے رخ سیدھا کیا تو برقع کے ساتھ مس حسینہ کے پاس اتارا ہوا کوئی لباس نہیں تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ کیا وہ صرف برقع میں یوں پھر رہی تھی؟ میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن شنو کے سامنے جرأت نہ کر سکا۔ مس حسینہ نے خود وضاحت کر دی۔

''میں جانی کے ایک آدمی کے ہاتھ آ گئی تھی، اس نے مجھے قید رکھنے کے لیے کپڑے اتروا لیے تھے اور پھر اپنے ساتھیوں کو بلانے گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس طرح بھاگنے سے گریز کروں گی۔''

''حرافہ کہیں کی۔۔۔۔'' شنو جز بز ہو کر بولی۔

''لیکن تم نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا۔۔۔ یہ برقع کہاں سے لیا؟''

''اسی عمارت کی ایک بالکونی سے۔ میں پچھلے پائپ کی مدد سے نیچے آئی اور برقع پہن کر بھاگ نکلی۔''

ایسی جرأت صرف مس حسینہ ہی کر سکتی تھی۔ کمرے میں بیٹھنے کے لیے سوائے بیڈ کے اور کوئی چیز نہیں تھی اس لیے ہم کھڑے تھے۔ شنو اب کچھ سہم گئی تھی اور اس نے میرا بازو پکڑا ہوا تھا۔ ''یہ کیا چکر ہے، جانی تمہارا دشمن ہے اور تم پھر یہاں موجود ہو؟''

''بتاتی ہوں۔'' وہ بولی اور شنو سے کہا۔ ''کھڑی کیوں ہے یہ کپڑے ہٹا کر بیٹھ جا۔'' اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے نہیں بیٹھنا۔'' شنو برہمی سے بولی۔ ''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

میں سمجھ رہا تھا، شنو کو اس بیڈ سے گھن آ رہی تھی اتنی دیر میں وہ مس حسینہ کا ٹائپ سمجھ چکی تھی۔ ویسے بھی خواتین اس قسم کے معاملات کو جلدی بھانپ جاتی ہیں۔ حسینہ نے شانے اچکائے۔ اس نے ایک عدد چست جینز کے ساتھ چست شرٹ پہن لی تھی جس کے آگے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ بھی شنو کے گریز کی وجہ سمجھ گئی۔ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''ہاں تو کیوں بیٹھے گی اس گندے بیڈ پر۔۔۔ شریف زادی ہے نا۔''

شنو نے ایک بار پھر اسے زیرِ لب سنائیں اور میں نے کہا۔ ''تم مطلب کی بات کرو، ہمیں یہاں کیوں لائی ہو؟''

وہ خود بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

''جلیل میں پورے دو سال بعد یہاں آئی ہوں۔ تجھے معلوم ہوگا دو سال پہلے میرا جانی سے پھڈا ہو گیا تھا۔''

''وہ تو ہونا تھا جب تم ہر جگہ منہ مارتی پھرو گی۔''

وہ بھنا گئی۔ ''تو کیا جانی بہت شریف ہے۔ اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات نہیں ہیں؟''

''ہوں گے لیکن وہ باس تھا۔ تم اس کی محبوبہ تھیں۔''

''اتنا غیرت مند نہیں ہے۔'' مس حسینہ نے منہ بنایا۔ ''اسے سب پتا تھا۔''



میں چونکا۔ ''کیا کوئی اور چکر تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''پیسے کا معاملہ تھا۔ جانی کے آدمیوں نے ایک بینک میں ڈاکا مارا تھا۔ انہوں نے لاکر کاٹ کر بہت کچھ لوٹا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا فولادی بکس بھی تھا۔ وہ غائب ہو گیا۔ لوٹ کا مال میرے پاس رکھا گیا تھا۔ جانی نے مجھے الزام دیا اور ہمارا جھگڑا ہو گیا۔''

''یہ تو سمجھ میں آ گیا۔ تم فرار ہو گئیں اور جانی تمہیں تلاش کرتا رہا اب دوبارہ یہاں مرنے کیوں چلی آئیں؟''

''مجھے وہ بکس چاہیے۔'' مس حسینہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں اسے لینے وہاں گئی تھی لیکن پھنس گئی۔ اب میں کسی صورت دوبارہ وہاں نہیں جا سکتی۔ جانی کے کتے وہاں پہرا دے رہے ہوں گے۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ ''تم چاہتی ہو وہ بکس میں وہاں سے نکال کر لاؤں؟''

''ہاں جلیل تو ایسا کر سکتا ہے۔''

''میرا اس بھری جوانی میں دنیا سے گزرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے انکار کر دیا۔ جسے مس حسینہ نے ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور بولی۔

''جلیل تیرے پاس دو گھنٹے ہیں۔ اس دوران میں تو مجھے وہ بکس لا دے اور شنو کو لے جا۔''

میں چونکا۔ ''شنو اس معاملے میں کہاں سے آ گئی؟''

مس حسینہ مسکرائی۔ ''اسی وجہ سے تو میں تجھے یہاں لائی ہوں ورنہ تجھے اکیلے دیکھتی تو جانی کے آدمیوں کے چنگل سے نکلنے کے بعد تجھے ٹاٹا کرتی۔ کیا میں تجھے جانتی نہیں ہوں۔''

''شنو کو جانے دو، میں وعدہ کرتا ہوں تمہارا کام کر دوں گا۔''

وہ ہنسی۔ ''جلیل میں تجھے پاگل دکھائی دیتی ہوں جو تجھ پر اعتبار کروں۔ اگر شنو نہ ہوئی تو تو بکس لے کر یہاں آئے گا؟ کبھی بھی نہیں۔''

واقعی شنو کی وجہ سے میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ شنو اس کے عزائم سن کر سہم گئی۔ اس نے مزید کس کر میرا بازو پکڑ لیا اور منمنا کر بولی۔ ''میں اس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔''

''بکواس نہ کر میں، تجھے کھا نہیں جاؤں گی۔'' مس حسینہ غرائی۔ ''جلیل تیرے پاس وقت کم ہے۔ یقین کر دو گھنٹے بعد شنو یہاں نہیں ملی تو پھر کبھی نہیں ملے گی۔ مجھے بکس لا دے، مجھے یہاں سے نکلنا ہے اگر صبح ہو گئی تو میں بھی ہمیشہ کے لیے پھنس جاؤں گی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے۔ مجھے بتا بکس کہاں ہے اور کیسا ہے؟''

مس حسینہ خوش ہو گئی۔ ''اب تو آیا نا راستے پر۔ دیکھ بکس چمک دار اسٹیل کا بنا ہوا ہے اور چاروں طرف سے بند ہے اسے ویلڈ کیا گیا ہے۔''

اس نے پتا بتایا جو اسی کمرشل علاقے میں ایک فلیٹ کا تھا جہاں میں شنو کو لے کر گیا تھا۔ فولادی بکس اس فلیٹ کے کچن میں لگی جست کی پانی کی ٹینکی کے اندر تھا۔ عام طور سے فلیٹوں میں پانی ذخیرہ کرنے کے لیے اس قسم کی ٹینکیاں کچن اور باتھ روم میں لگائی جاتی ہیں تاکہ اوپر والی ٹینکی میں اچانک پانی ختم ہونے سے مشکل نہ ہو۔ یہ ٹینکیاں مکمل طور پر سیل ہوتی ہیں کیونکہ ان میں پانی کی آمد و رفت مستقل جاری رہتی ہے۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''تم نے اس میں بکس چھپایا کیسے؟''

''بس چھپا دیا۔'' وہ کسی قدر بے چینی سے بولی۔ ''جلیل بس چلا جا، دیر نہ کر۔''

''یہ وقت کم ہے کسی کے فلیٹ میں داخل ہو کر ایسی کارروائی کرنا آسان کام نہیں ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے اس میں کچھ زیادہ وقت لگ جائے۔''

اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مس حسینہ نے کہا۔ ''میں تجھے بارہ بجے تک کا وقت دے سکتی ہوں۔ بارہ بجے تک مجھے ہر صورت میں یہاں سے نکل جانا ہے۔''

''ایک سوال اور ہے، اس فلیٹ میں کون رہتا ہے؟''

''ایک جوڑا ہے۔ پہلے یہ میرا فلیٹ تھا پھر میں نے اسے بیچ دیا۔ میاں بیوی ہیں۔ شریف لوگ ہیں مرد کا نام جمال قاسم ہے۔ اس وقت بچہ نہیں تھا ممکن ہے اب کوئی بچہ ہو۔'' مس حسینہ نے تفصیل سے بتایا پھر معنی خیز انداز میں بولی۔ ''بیوی بڑی خوب صورت ہے کہیں۔۔۔۔''

''میں جانی یا حسینہ نہیں ہوں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''ورنہ تم شنو کو ضمانت نہ بناتیں۔''

''جلیل میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' شنو بولی اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پیار سے اس کے آنسو صاف کیے۔

''شنو جان مجبوری ہے، مجھے اپنی اور تیری جان بچانی ہے۔ بس تھوڑا صبر سے کام لے اور ابھی کچھ دن پہلے تو تو نے کہا تھا کہ میں تجھے اپنے کسی ایڈونچر میں شامل نہیں کرتا ہوں



www.digestpk.com

Asifzamil

سمجھ لے تیری خواہش پوری ہوگئی۔"

وہ روتے روتے ذرا مسکرائی۔ "لعنت ہو ایسے ایڈونچر پر۔"

"بس پیارے یہی جذبات اپنے بھی ہوتے ہیں جب کسی ایسی مصیبت میں پڑے ہوں۔" میں نے مس حسینہ کی طرف دیکھا جو اس جذباتی فلمی سین سے بیزار نظر آرہی تھی۔ کیونکہ وہ ہالی ووڈ کی فلموں والے جذباتی سین کی قائل تھی یعنی مادر پدر آزاد۔ اس نے پستول لہرایا۔

"جلیل اب چلا جا۔"

بادلِ ناخواستہ میں وہاں سے روانہ ہوا۔ درحقیقت شنو کو یوں چھوڑ کر جاتے ہوئے میرا دل گھبرا رہا تھا۔ ایسی حالت میری اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب میں کہیں یقینی موت کے سامنے ہوتا تھا۔ اس روز مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ شنو میرے لیے کیا تھی۔ اس کا ایک ایک آنسو پتھر بن کر میرے دل پر گر رہا تھا۔ میں نے جانے سے پہلے مس حسینہ سے کہا۔ "میں اسے تیرے حوالے کر کے جا رہا ہوں اور تجھ سے لوں گا اگر اسے ذرا بھی کچھ ہوا تو میں ساری عمر تیرا پیچھا کروں گا۔"

"اچھا اچھا.... فلمی ڈائیلاگ نہ مار.... یہ میری ذمے داری ہے۔" اس نے اپنے فراخ سینے پر ہاتھ مارا۔ "بکس لادے اور اسے لے جا۔"

میں نیچے آیا اور بائیک کو اپنی جگہ پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ وقت نہیں تھا اس لیے میں بائیک کو راکٹ کی طرح دوڑاتا ہوا منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ میں اس فلیٹ میں کیسے داخل ہوں گا لیکن جب وہاں پہنچا تو ایک ترکیب ذہن میں آگئی۔ میں شاپنگ سینٹرز کے عقبی علاقوں میں چکرانے لگا اور کچھ دیر بعد مجھے مطلوبہ دکان نظر آگئی جو خوش قسمتی سے کھلی ہوئی تھی۔ میں دکان میں آیا تو ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پلمبر کا پوچھا تو اس نے کہا۔ "تراویح پڑھنے گیا ہے۔"

اتنی دیر میں میں اپنے مطلب کی چیز دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بیٹے مجھے کچھ اوزار چاہییں۔ اگر مل جائیں تو میرا کام ایک منٹ میں ہوجائے گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اوزار نہیں مل سکتے ہیں۔"

"بیٹے میں ضمانت رکھوا کر جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھو میری بائیک ہے اور بالکل نئی ہے۔ یہ اس کے کاغذات ہیں اور یہ میرا ڈرائیونگ لائسنس ہے۔" میں نے ساری چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں تو اس کا انکار کمزور پڑ گیا مگر اسے استاد کا خوف تھا۔ اس خوف کو دور کرنے کے لیے میں نے اس کی خدمت میں دو سو روپے پیش کیے۔

ضمانت سے زیادہ دو سو کے لالچ نے اسے مجبور کیا اور اس نے اپنے استاد کا اوزاروں والا تھیلا اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ روانگی سے پہلے میں نے تسلی کر لی تھی کہ اس میں تمام اوزار تھے۔ وہ مطلوبہ عمارت زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے راستے میں لنڈے کے اسٹال سے پرانی پی کیپ خرید کر پہن لی جیسے کہ عام طور پر کام والے لوگ پہنتے ہیں۔ پی کیپ کی وجہ سے میری صورت خاصی حد تک چھپ گئی تھی اور اگر وہاں استاد جانی چریا کے آدمی تھے تو میرے پکڑے جانے کا امکان کم تھا۔

عمارت متوسط درجے کی تھی اور اس میں نیچے دکانیں اور اوپر فلیٹس تھے۔ آنے جانے کا راستہ ایک ہی تھا اور اس راستے پر دو عدد مسٹنڈے موجود تھے جو ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ میں ان کو نہیں جانتا تھا لیکن وہ یقیناً جانی کے آدمی تھے۔ ان کے سامنے سے گزرنا خطرے والی بات تھی ممکن ہے وہ مجھے جانتے ہوں اور یہ جان پہچان ابھی نہ سہی بعد میں میرے لیے مصیبت بن جائے۔ میں ان لوگوں سے ہمیشہ دور رہ کر کام کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سامنے سے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے میں نے عمارت کے عقبی حصے کا رخ کیا۔ مگر اس طرف بلڈنگ سے بلڈنگ ملی ہوئی تھی اور جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں اس عمارت کی سڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ چھت پر آکر برابر والی عمارت کو دیکھا تو وہ ایک منزلہ نیچی ثابت ہوئی تھی اور درمیان میں کوئی تین فٹ کا خلا بھی تھا۔

لیکن مجھے جانے کا ایک راستہ تو مل گیا تھا۔ خوش قسمتی سے چھت ویران تھی۔ اور وہاں کپڑے سکھانے والی الگنی کی بے شمار رسیاں موجود تھیں۔ میں نے ان میں سے کچھ رسیاں کاٹیں اور ان کو جوڑ کو ایک مضبوط رسی تیار کی۔ اسے عمارت کی اوپری ستون سے نکلے سریے میں مضبوطی سے باندھا اور پہلے اس کی مدد سے اوزاروں کا وزنی تھیلا نیچے پہنچایا۔ پھر رسی کھینچ کر خود بھی اس کے ذریعے نیچے اتر گیا۔ درمیان کا تین فٹ کا خلا طے کرنے میں کچھ وقت لگا تھا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس عمارت کی چھت پر پہنچ گیا جہاں میری منزلِ مقصود تھی۔ مذکورہ فلیٹ تیسرے فلور پر تھا۔ میں سیڑھیوں سے نیچے آیا۔ ابھی تراویح کا وقت ختم نہیں ہوا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ فلیٹ پر مرد نہیں ہوگا۔ ہاں اگر وہ تراویح نہ پڑھنے گیا ہو تو



الگ بات ہوگی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ "کون ہے؟" اندر سے ایک سریلی نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔

"پلمبر۔" میں نے کہا۔ "ادھر کی کمپلین آئی ہے۔"

"پلمبر۔" خاتون نے دہرایا۔ "لیکن یہاں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"پتا نہیں جی مجھے تو دکان کے مالک نے بھیجا ہے۔ پتا یہی ہے آپ کے فلیٹ کا نمبر بی بتیس ہے نا؟"

"ہاں نمبر تو یہی ہے۔" خاتون نے ذرا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔

"جی کچن کی ٹینکی میں کوئی مسئلہ ہے۔" میں رٹا لگانے والے انداز میں بولا۔ "کبھی کبھی پانی رکتا ہے۔"

"ہاں رکتا تو ہے۔" وہ ہچکچا کر بولی۔ "لیکن کمپلین کس نے کرائی؟"

"کوئی جمال قاسم ہیں۔" میں نے جیب سے اپنی چھوٹی سی فون ڈائری نکال کر اس میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ یہیں رہتے ہیں؟"

"ہاں جمال میرے شوہر ہیں۔" وہ بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ وہ اس فکر میں تھی کہ کہیں سچ مچ اس کے شوہر نے شکایت کرائی ہو اور وہ مجھے ٹہلا دے تو بعد میں شوہر سے باتیں سننے کو ملیں۔ اتفاق سے جو میں نے کہا، وہ مسئلہ بھی موجود تھا۔

میں نے اس کی خاموشی پر ذرا بے نیازی سے کہا۔ "جلدی بتائیں جی ابھی مجھے کئی اور جگہوں پر بھی جانا ہے، عید کی وجہ سے رش ہے۔ اگر آپ ابھی نہیں کرانا چاہتیں تو پھر میں عید کے بعد ہی آسکوں گا۔"

"وہ اصل میں جمال گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی پھر میں عید کے بعد آؤں گا۔" میں نے بہ ظاہر واپسی کا ارادہ کیا۔ میں نے ایک جوا کھیلا تھا شاید وہ مجھے بلا لے اور اگر وہ نہ بلاتی تو ظاہر ہے یہ پلان فیل ہو جاتا اور مجھے پھر کوئی دوسری ترکیب اختیار کرنی پڑتی۔ میں دو قدم چلا تھا کہ اس نے عقب سے آواز دی۔

"اے سنو۔۔۔ اچھا آکر دیکھ لو۔"

میں پلٹ کر واپس آیا۔ خاتون نے دروازہ کھول دیا اور میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔ مس حسینہ کا کہنا درست تھا وہ خاصی دلکش تھی۔ آواز میں نغمگی تھی۔ گوری رنگت اور بڑے سلک نقوش تھے۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس کا جسم چھریرا تھا، مجموعی طور پر وہ خوب صورت اور جاذبِ نظر لڑکی نما عورت تھی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ دیکھے بغیر اسے باجی نہیں کہا۔ ورنہ عین ممکن ہے وہ اس بات کا برا منا جاتی اور مجھے اندر گھسنے بھی نہ دیتی۔ اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ مجھے کچن تک لائی۔ جہاں تک فلیٹ نظر آرہا تھا وہ صاف ستھرا تھا۔ کچن بھی صاف تھا اور افطاری کا بچا ہوا سامان رکھا تھا۔ ٹینکی عین سنک کے اوپر تھی۔ اسے دیوار میں فکس اینگل آئرن کی مدد سے لگایا ہوا تھا اور کنکشن لینے کے لیے دیوار میں موجود پائپ کو کھود کر ایک ٹی لگائی گئی تھی۔

ٹی سے ٹینکی میں پانی آرہا تھا اور اس پر ایک وال لگا ہوا تھا۔ ٹینکی کے نیچے سے ایک پائپ نکل کر نیچے سنک تک آرہا تھا۔ جب عمارت کی ٹینکی سے پانی آنا بند ہوجاتا تو اس ٹینکی سے پانی آتا تھا۔ خاتون نے مجھے ٹینکی دکھائی اور خود چائے بنانے میں لگ گئی۔ اس نے گرمی کی مناسبت سے ہلکا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا جو درزی نے اس کا تناسب کو مدِنظر رکھ کر سیا تھا۔ دوپٹا البتہ مناسب تھا۔ پھر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میں یہاں خاتون کا معائنہ کرنے نہیں، کسی اور کام سے آیا ہوں۔ میں ٹینکی کی طرف متوجہ ہوا۔ اوپر سے آنے والا وال بند کر کے میں نے سنک میں آنے والا نل کھول دیا تاکہ ٹینکی خالی ہوجائے۔

اندر کہیں ٹی وی چل رہا تھا لیکن کسی بچے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید ابھی تک وہ اولاد سے محروم تھے اور یہی خاتون کی اسمارٹ نیس کا راز تھا۔ وہ یقیناً حوصلے والی تھی تبھی اس نے مجھے اکیلے ہوتے ہوئے بھی اندر آنے دیا پھر اسے یہ اعتماد بھی تھا کہ یہ فلیٹ تھا وہ ایک آواز نکالتی تو سب سنتے۔ چائے بنانے کے بعد چولہا بند کرتے ہوئے اس نے مجھ سے چائے کا پوچھا۔

"جی نہیں شکریہ۔" میں نے ٹینکی کے نچلے حصے کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ زحمت نہ کریں مجھے ویسے بھی جلدی ہے۔"

"لیکن کام ٹھیک طرح سے کرنا۔" اس نے مجھے خبردار کیا۔ "ایسا نہ ہو پھر بلانا پڑے۔"

"نہیں بی بی کام پکا ہوگا۔" میں نے کہا۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور لاؤنج میں چلی گئی۔ میں پانی ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹینکی کے نچلے حصے میں ایک گول ڈسک لگی تھی اسے اسکروز کی مدد سے لگایا گیا تھا۔ پانی مرمر کر نکل رہا تھا اور میں اپنا کام کر کے یہاں سے نکلنے کے لیے بے تاب تھا۔ کسی وقت بھی جمال قاسم آسکتا تھا اور میرا بھانڈا



www.digestpk.com

Asifzamil

پھوٹ جاتا۔ میں نے پانی ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر اسکروز کھولنا شروع کر دیئے۔ یہ پلیٹ اسی مقصد کے لیے لگائی گئی تھی کہ ٹینکی میں کوئی کچرا آجائے تو اسے کھول کر صفائی کر دی جائے کیونکہ یہ مکمل طور پر سیل ٹینکی ہوتی ہے۔ پلیٹ سے پانی رسنے سے بچاؤ کے لیے ربر کی سیل لگائی گئی تھی۔ جیسے ہی اسکروز کھلے اور پلیٹ ہٹی پانی اوپر سے آبشار کی طرح گرا۔ ابھی آدھی ٹینکی بھری ہوئی تھی۔ سنک کے ساتھ کچن کا فرش اور میں بھی بھیگ گئے۔ پانی گرنے کی آواز سن کر وہ دوڑی ہوئی آئی۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں جی پلیٹ ہٹائی ہے تو پانی گرا ہے۔''

''اف پھر سے صفائی کرنا پڑے گی۔'' اس نے کوفت سے کہا اور اسی لمحے کال بیل بجی۔ خطرہ سر پر آ گیا تھا وہ جیسے ہی دروازے کی طرف گئی میں نے ٹینکی میں ہاتھ ڈالا اور عین پانی کی نکاسی والے سوراخ کے اوپر مجھے ایک چوکور بکس مل گیا۔ پانی اسی وجہ سے ٹھیک سے نہیں آ رہا تھا۔ تعجب ہے ان لوگوں کو پہلے اس کا خیال نہیں آیا۔ اتنے عرصے پانی میں پڑے رہنے سے وہ چکنا ہو رہا تھا میں نے اسے نکالا اور اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ اسی لمحے ایک مرد خاتون کے ساتھ کچن میں آیا، وہ غصے میں تھا اور اپنی بیوی کو سنا رہا تھا۔ ''تم ہر ایرے غیرے کو گھر میں بلا لیتی ہو، پتا ہے آج کل کتنی وارداتیں ہو رہی ہیں، کون ہے یہ؟''

عورت دبی زبان میں بولی۔ ''اس نے آپ کا نام لیا تھا میں سمجھی کہ آپ نے کمپلین کرائی ہے۔''

''تمہارا دماغ درست ہے اگر میں کمپلین کراتا تو اس وقت بلاتا جب میں خود گھر پر ہوتا۔'' مرد بولا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں عبدالرشید ہوں جی۔'' میں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ''مجھے شیخ صاحب نے اس فلیٹ کا پتا اور آپ کا نام دیا تھا۔ میں یہاں آ گیا۔''

''کون شیخ صاحب؟'' مرد بولا۔ وہ شکل سے تیز نظر آ رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اب میں کسی مشکل میں پھنسنے والا ہوں۔

''شیخ صاحب ذرا دور اُن کی دکان ہے۔ ہارڈ ویئر اسٹور بھی ہے۔''

''تم شیخ نورزمان کی بات کر رہے ہو؟'' آدمی بولا تو اس کا لہجہ نرم تھا۔ ''لیکن میں نے تو شیخ صاحب کو کوئی کمپلین نہیں کرائی۔''

''اس کا تو مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا بعض اوقات تُکا بھی درست لگ جاتا ہے۔

''شیخ صاحب نے بھیجا تو میں آ گیا اور میں تو آپ کے نہ ہونے کا سن واپس جا رہا تھا، انہوں نے بلا لیا۔'' میں نے اپنی بلا خاتون کے سر ڈال دی، اس پر مرد نے جن شوہرانہ نظروں سے خاتون کی طرف دیکھا تھا، اس سے مجھے لگا کہ آنے والا وقت اس کے لیے خاصا مشکل ہوگا۔ خاتون نے بوکھلا کر کہنے کی کوشش کی۔

''وہ میں نے سوچا کہ آپ.....''

''بس تم اندر جاؤ۔'' مرد نے بیوی کو جھاڑا تو وہ منہ بسور کر اندر چلی گئی۔ مرد میری طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں تو تم کیا کر رہے ہو اور یہ ٹینکی کیوں کھولی ہے؟''

''جی اس میں پانی سستی سے آ رہا تھا۔'' میں نے کہا اور ربر کا ایک ٹکڑا اس کے سامنے کر دیا۔ ''پائپ میں یہ پھنس گیا تھا۔ اب پانی ٹھیک آئے گا۔''

شیخ نورزمان کا سن کر وہ خاصا نرم پڑ گیا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اب اسے شک نہیں رہا تھا۔ وہ اسے کوئی غلط فہمی سمجھ رہا تھا۔ پھر سچ مچ مسئلہ بھی نکل آیا اور میں نے حل بھی کر دیا۔ ربر کا ٹکڑا میں نے سیل سے توڑا تھا اور پھر اسے سیل دکھائی۔ ''یہ خراب ہو گئی ہے۔ دوسری لانی ہوگی۔''

''اس وقت کہاں سے ملے گی۔'' وہ بدمزگی سے بولا۔

''بعد میں تم کہاں آؤ گے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے جناب اسے لگانا بہت آسان ہے۔ کسی بھی ہارڈ ویئر اسٹور سے پلیٹ دکھا کر سیل لے لیں اور اس طرح پلیٹ پر جما کر اسکروز سے اسے ٹینکی سے لگا دیں۔'' میں نے اسے عملی طور پر کر کے دکھایا اور پھر اپنے اوزار سمیٹنے لگا۔ میری نظر گھڑی پر تھی کیونکہ سوا گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور ابھی مجھے واپس بھی جانا تھا۔ ''اب اجازت دیں؟''

''مزدوری کتنی بنی؟''

''یہ حساب شیخ صاحب..... کریں گے۔'' میں نے تھیلا کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا اور باہر نکل کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ جان چھوٹنے کی خوشی میں میں بھول گیا اور اوپر جانے کے بجائے سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ دروازے پر پہنچ کر چونکا لیکن یہ دیکھ کر سکون کا دوسرا سانس لیا کہ جانی کے دونوں آدمی غائب تھے۔ میں نے سڑک عبور کی اور گھوم کر شاپنگ سینٹرز کے عقبی طرف آیا جہاں دکان پر میری بائیک موجود تھی۔ دکان کا مالک آ گیا تھا اور اس نے اپنے شاگرد کو مرغا بنا رکھا تھا مجھے



بھی کچھ اسی قسم کی توقع تھی۔ میں نے اوزاروں کا تھیلا اس کے سامنے رکھا تو وہ چونک گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔ ''تو تم لے گئے تھے میرے اوزار؟''

''ہاں بھائی مجبوری تھی۔'' میں نے کہا۔ ''پانی بے تحاشا بہہ رہا تھا اور اگر میں تمہارا انتظار کرتا تو گھر سوئمنگ پول بن جاتا۔ مجھے کام آتا ہے لیکن اوزار نہیں تھے اس لیے بائیک اور کاغذات رکھوا کر اوزار لے گیا۔ اب چیک کر لو تمہاری ساری چیزیں موجود ہیں۔''

میں نے بکس پہلے ہی نکال لیا تھا۔ مالک نے باریک بینی سے اپنے خستہ حال اور گھسے پٹے اوزاروں کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''ایک چھوٹا اسکروڈرائیور نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''وہ شاید ادھر ادھر ہو گیا ہوگا۔'' میں نے اس کی چالاکی نظر انداز کر کے افہام و تفہیم سے کام لیا اور اسے سو روپے پیش کیے جو اس نے بلا تکلف رکھ لیے۔ اس سے بائیک کے کاغذات اور اپنا لائسنس لے کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ تب گیارہ بج چکے تھے۔ میں خوش تھا کہ میں نے اپنا کام بروقت کر لیا اور میں شنو کو لے کر گیارہ بجے سے پہلے گھر پہنچ سکتا ہوں۔ بیس منٹ بعد میں اس عمارت کے پاس پہنچ گیا لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ گڑبڑ ہے کیونکہ عمارت کے سامنے وہی دو عمونے موجود تھے جنہیں میں تھوڑی دیر پہلے فلیٹ والی عمارت کے سامنے دیکھ چکا تھا۔ وہ اسی وجہ سے وہاں سے غائب تھے کہ وہ یہاں موجود تھے۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ نیچے موجود تھے تو یقیناً اوپر بھی کوئی ہوگا اور امکان یہی تھا کہ وہ خود استاد جانی چریا ہوگا۔

عمارت سے پہلے میں نے بائیک ایک گلی میں موڑ دی اور کچھ آگے جانے کے بعد اس کا انجن بند کر کے اسے پیدل واپس لایا۔ میں نے گلی کے سرے سے جھانکا۔ وہ دونوں بدستور عمارت کے سامنے موجود تھے انہیں غالباً کسی کو دخل اندازی سے روکنے کے لیے یہاں تعینات کیا گیا تھا۔ ان کی نظروں میں آئے بغیر میں کسی صورت سامنے سے اوپر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے عمارت کے عقبی حصے کا رخ کیا۔ مگر یہاں بھی عمارت سے عمارت پشت لگائے کھڑی تھی۔ ہمارے ہاں ایسا شاید اس لیے کیا جاتا ہے کہ جب عمارت کی میعاد پوری ہو جائے اور وہ گرنے والی ہو تو چند سال دوسری عمارت سے ٹک کر کھڑی رہے۔

لیکن یہاں معاملہ الٹا تھا۔ عقبی عمارت صرف چار منزلہ تھی اور مس حسینہ والی چھ منزلہ اور مجھے اس میں جانے کے لیے دو منزل مزید چڑھنا پڑتا۔ بہرحال مجھے جانا تو تھا۔ میں اس عمارت کی چھت تک آیا جہاں ایک بوڑھا چرس کے نشے میں دھت پڑا سو رہا تھا۔ میں نے اسے ڈسٹرب کیے بغیر دوسری عمارت کا جائزہ لیا۔ دونوں عمارتوں میں یہاں بھی چار فٹ کا خلا تھا جس کا نچلا حصہ کچرے سے اٹ گیا تھا کیونکہ اوپر والے بلا تکلف سوچے بغیر کچرا پھینکتے تھے کہ یہ کچرا جائے گا کہاں؟ بدبو کے بھبکے اوپر تک آ رہے تھے۔ میں پریشان ہو رہا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ مس حسینہ والا فلیٹ بھی چوتھے فلور پر تھا یعنی اس عمارت کی چھت کے برابر ہی تھا۔ مس حسینہ والا فلیٹ عمارت کے پہلو کی طرف کونے پر تھا۔ میں نے یادداشت پر زور دیا اور فلیٹ کا تعین کیا۔ بالآخر ایک فلیٹ میری سمجھ میں آ گیا۔ اب مسئلہ فلیٹ تک رسائی کا تھا۔ یہ مسئلہ بھی چھت پر حل ہو گیا۔ ایک طرف شیٹرنگ میں کام آنے والا لمبا سا تختہ پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دوسری عمارت کے چھجے تک پہنچایا۔ یہ چھجا دیوار سے مشکل سے پون فٹ نکلا ہوا تھا۔ میرے پاس دھاتی بکس تھا اور میں اسے لباس میں کہیں نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ کوئی چھ انچ لمبا، چار انچ چوڑا اور اتنا ہی موٹا تھا۔ میں اسے کہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے اسے پکڑے رکھا۔

میں تختے پر چلتا ہوا چھجے تک پہنچا اور پھر دیوار سے لگ کر عمارت کے پہلو کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ چھجا نہایت خستہ حال تھا اور بعض جگہوں پر اس سے پائپ گزر رہے تھے اور یہاں پائپ پکڑ کر دوسری طرف جانا پڑا تھا۔ ہر لمحہ ایسا لگتا تھا کہ ابھی میرے پیروں تلے سے چھجے کا وہ حصہ نکل جائے گا اور میں مس حسینہ کو کوستا ہوا نیچے کچرے کے ڈھیر میں جا گروں گا اور میری وفات ہڈی پسلی ٹوٹنے سے نہیں بلکہ کچرے کی بو سے ہوگی۔ چوتھی منزل تک اس کے بھبکے آ رہے تھے اور میں بڑی مشکل سے اپنی الٹی روکے ہوئے تھا۔ آخر میں اس طرف آ گیا جہاں مس حسینہ والا فلیٹ تھا۔ کسی بھی کھڑکی پر سلاخیں نہیں تھیں صرف پٹ لگانا کافی سمجھا گیا تھا کیونکہ اس خستہ حال عمارت کے خستہ حال مکینوں کے پاس کوئی قیمتی سامان نہیں تھا جس کے چرائے جانے کا خطرہ ہوتا۔

میں نے کھڑکی کا پردہ خفیف سا ہٹایا جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ مس حسینہ والا فلیٹ یہی تھا لیکن فوراً ہی لاحول پڑھ کر پردہ چھوڑ دیا کیونکہ اندر ایک جوڑا انتہائی کا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا اور ایک دوسرے میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اس نے میری لاحول بھی نہیں سنی۔ میں سرک کر اگلی کھڑکی تک پہنچا اور اس بار میرا اندازہ درست نکلا اس پر اسی ڈیزائن کا پردہ



www.digestpk.com

Asifzamil

تھا جو میں نے فلیٹ میں دیکھا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ آگے چھجا غائب تھا اور اگر مذکورہ فلیٹ آگے ہوتا تو میں کسی صورت آگے نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے خفیف سا پردہ سرکایا تو مس حسینہ مجھے بیڈ پر قلوپطرہ اسٹائل میں بیٹھی نظر آئی۔ یہ پوز نہایت اشتعال انگیز تھا۔ مس حسینہ کی شرٹ کا ایک اور بٹن اس کے زور شباب کی تاب نہ لاتے ہوئے کاج کو داغِ مفارقت دے گیا تھا اس لیے پوز کچھ زیادہ ہی اشتعال انگیز ہو رہا تھا۔ مگر مجھے فکر شنو کی تھی۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے کمرے میں کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مس حسینہ نے فوراً میری غلط فہمی دور کر دی۔ اس نے جذبات انگیز لہجے میں کہا۔

''جانی اتنے دن بعد ملا ہے اور میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا۔''

''جانی چڑیا ہے۔'' کھڑکی کے پاس سے استاد جانی کی آواز آئی۔ ''لیکن اتنا بھی چڑیا نہیں ہے۔ اپن تیرے پردو سال پہلے لعنت بھیج چکا ہے اور اب بھی بھیجتا ہے۔ تھو۔۔۔ ڑے تیری شکل پر۔''

مس حسینہ کا چہرہ بگڑ گیا، اس نے تنتنا کر کہا۔ ''تو نے خود کو دیکھا ہے۔ چڑیا گھر سے بھاگا ہوا گینڈا لگتا ہے۔''

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو مختلف ناپاک اور حرام چیزوں سے ملانے کا مقابلہ ہوا جس میں صرف بیس فیصد الفاظ قابلِ اشاعت تھے۔ مس حسینہ کے منہ میں عورت کی زبان تھی اس لیے بالآخر استاد جانی ہار مان کر مطلب کی بات پر آ گیا۔ ''دیکھ حسینہ میرے کو تیرے سے کوئی مطلب نہیں ہے، میرے کو وہ بکس دے دے۔''

''کون سا بکس؟'' مس حسینہ غرائی۔ ''اپنے باپ کے تابوت کی بات کر رہا ہے تو وہ اس کی قبر سے نکال لے۔''

''لگتا ہے تو اس نے طرح نہیں مانے گی۔'' استاد جانی نے کہا اور پہلی بار منظر میں آیا اس نے آگے بڑھ کر مس حسینہ کو ایک عدد تھپڑ مارا اور وہ اسے گالیاں دینے لگی۔ وہ اتنا ہی کر سکتی تھی کیونکہ اس کا پستول اب استاد جانی کے پاس تھا۔ ممکن تھا وہ اسے گولی مار دیتا اور مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ مجھے تو شنو کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ کہاں تھی، کیا اسے استاد جانی کے آدمی لے گئے تھے یا مس حسینہ نے اسے کہیں کر دیا تھا۔ استاد جانی گالیوں سے بے مزہ ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے مس حسینہ کو دھمکی دی۔

''دیکھ میرے کو شرافت سے بکس دے دے ورنہ تیرے کپڑے اتار کر تجھے اسی طرح لے جاؤں گا اور پورے علاقے میں گھماؤں گا۔''

مس حسینہ ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئی، اس نے چلا کر کہا۔ ''اپنی ماں کو گھما۔''

''کمینی۔'' استاد جانی نے غرا کر کہا اور اچانک ہاتھ بڑھا کر اس کی شرٹ پکڑ کر اتنی زور سے کھینچی کہ وہ پھٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی اور مس حسینہ نے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ مگر وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو ایسی باتوں کی پروا کریں اس نے جوابی کارروائی کی اور استاد جانی کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اپنے سیدھے پاؤں کی ایڑھی ماری۔ استاد جانی کے منہ سے ایک اجنبی آواز نکلی۔ وہ جھکا اور لڑکھڑا کر پیچھے کھڑکی کی طرف آیا۔ جیسے ہی وہ پاس آیا میں نے ہاتھ اندر کر کے فولادی بکس اس کے سر پر رسید کیا۔ اس کا وزن کم سے کم دو کلو گرام تو تھا پھر میں نے زور بھی پورا استعمال کیا تھا۔ استاد جانی نے دوسری عجیب سی آواز نکالی اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ صرف دو ضربیں اس جیسے ساڑھے چھ فٹ کے دیو کو بے ہوش کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ میں جلدی میں کھڑکی سے کود کر اندر آیا اور استاد جانی کے سر کو بکس سے مزید چار پانچ بار بجایا تو وہ ساکت ہو گیا۔ مس حسینہ کا خوشی اور جوش سے برا حال تھا۔

''واہ جلیل تو شیر ہے۔'' اس نے کہا اور اپنی برہنگی کی پروا کیے بغیر میری طرف دوڑی۔

''اے رک جاؤ۔'' میں نے بوکھلا کر کہا اور استاد جانی کے ہاتھ سے گرنے والا پستول اٹھا لیا۔ ''پہلے کچھ پہنو۔''

اب مس حسینہ کو اپنی حالت کا احساس ہوا۔ لیکن اس نے بے پروائی سے شانوں کو ہلایا اور الماری کھول کر اس میں سے ایک دوسری شرٹ نکال کر پہن لی جو پہلی والی سے بھی زیادہ تنگ تھی اور لگ رہا تھا اسے اتارنے کے لیے کسی استاد جانی کو زور آزمائی کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ یہ خود پھٹ کر اتر جائے گی۔ میں نے بھنا کر کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی خالیہ ناپ والی قمیص نہیں ہے یہ ناپ تو پندرہ سال پہلے کا لگتا ہے۔''

''چلتا ہے۔'' اس نے استاد جانی کا معائنہ کیا۔ ''چڑیا بے ہوش ہے، دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔''

''یہ یہاں کیسے آیا؟''

''پتا نہیں شاید اسے معلوم ہو گیا ہو کسی طرح سے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''اسے معلوم تھا اس فلیٹ کے بارے میں مگر میں سمجھی تھی کہ یہ بھول گیا ہو گا۔''

''لیکن اسے یاد رہا۔'' میں نے بھی استاد جانی کا



معائنہ کیا۔ ''نیچے اس کے کم سے کم دو آدمی موجود ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہم اتنی آسانی سے یہاں سے نہیں نکل سکتے ہیں۔ میں خود بڑی مشکل سے برابر والی عمارت سے ہو کر یہاں آیا ہوں۔''

''میں تو تجھے دیکھ کر حیران رہ گئی اور تو نے کتنی آسانی سے اسے لمبا کر دیا۔'' مس حسینہ والہانہ انداز میں بولی۔

''حسینہ میں بکس لے آیا ہوں۔'' میں نے اسے بکس دکھایا۔ ''شنو کہاں ہے؟''

''بکس دے اور شنو لے لے۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا۔

''نہیں پہلے شنو دے اور پھر بکس لے۔'' میں نے بکس پیچھے کر لیا۔ ''ویسے اس میں کیا ہے؟''

اس نے برا سا منہ بنایا اور شنو کو آواز دی۔ ''اے شنو باہر آ جا تیرا خصم آ گیا ہے۔''

ابھی میں حیران ہو رہا تھا کہ شنو پلنگ کے نیچے سے بھوت بنی نمودار ہوئی۔ وہ نیچے چھپی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا کہ مس حسینہ نے اچانک جھپٹا مار کر بکس چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ پیچھے کیا تو بکس جھٹکے سے ہاتھ سے نکلا اور کھڑکی کے راستے تیرتا ہوا باہر تاریکی میں کہیں غائب ہو گیا۔ مس حسینہ کے منہ سے چیخ نکلی۔ ''جلیل یہ کیا کیا؟''

''میں نے کیا ہے۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ''تمہیں کیا ضرورت تھی اس طرح چھیننے کی۔''

لیکن مس حسینہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور شنو دوڑ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ خوف و دہشت کے ساتھ مٹی اور مکڑی کے جالوں سے اس کی حالت بری تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ ''شنو تو ٹھیک ہے نا؟۔۔۔ اس نے تجھے دیکھا تو نہیں ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے سہمے انداز میں بے ہوش استاد جانی کی طرف دیکھا۔ ''جلیل یہاں سے نکل یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ حسینہ نے اس کے کمرے میں آنے سے پہلے مجھے چھپا دیا تھا، اس نے مجھے نہیں دیکھا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ استاد جانی کا اس معاملے میں ہماری شمولیت سے بے خبر رہنا از حد ضروری تھا ورنہ وہ پاگل کتے کی طرح میرے پیچھے پڑ جاتا۔ حسینہ تو نکل گئی تھی اور اب ہمیں بھی یہاں سے نکلنا تھا۔ میں نے شنو سے کہا۔ ''سامنے اس کے آدمی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی ہمیں دیکھے اس لیے ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔'' میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

شنو نے باہر دیکھا اور صاف انکار کر دیا۔ ''میں کسی صورت اس راستے سے نہیں جاؤں گی۔''

شنو کا ایڈونچر کا سارا شوق پورا ہو چکا تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی پورا ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کے لیے ایڈونچر ختم نہیں ہوا تھا۔ اچانک ہی باہر سے کچھ لوگوں کے شور کرنے کی آواز آئی۔ میں نے جھپٹ کر دروازہ بند کیا اور جس وقت استاد جانی کے گرگے دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، میں شنو کو لے کر کھڑکی سے باہر آ گیا۔ یہ مرحلہ کس طرح سر ہوا اور اس دوران میں کیا کیا حماقتیں ہوئیں اور کتنی بار ہم گرتے گرتے بچے پھر تختے سے دوسری عمارت پر جانا کتنا مشکل ثابت ہوا تھا، یہ سب بیان کرنے کے لیے ایک الگ کہانی کی ضرورت ہے۔ کسی نہ کسی طرح ہم وہاں سے نکلے اور پھر گھر پہنچے۔ ہمارا حلیہ خراب ہو رہا تھا اور شاپنگ کچھ کی نہیں تھی اس لیے اس کے لیے الگ سے کہانی بنانا پڑی تھی اور اپنی اپنی اماؤں کو مطمئن کرنا پڑا تھا۔

اگلے دن چھت پر ملاقات کے دوران میں شنو نے مجھے بعد کی کہانی سنائی۔ اس نے بعض باتیں سنسر کی تھیں جو مس حسینہ نے اس سے کی تھیں اور واقعات سنائے۔ خوش قسمتی سے مس حسینہ نے استاد جانی کو اوپر آنے سے پہلے دیکھ لیا تھا اور اتنا احساس اسے بھی تھا کہ اگر جانی نے شنو کو دیکھ لیا تو میرے لیے بھی مشکل ہو گی اور اس کے لیے بھی۔ ابھی تو استاد جانی اسے اکیلا سمجھ رہا تھا۔ اس نے شنو کو بچانے کے لیے پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ جانی کے ساتھ آنے والے زیادہ اور زیادہ مسلح تھے اس لیے مس حسینہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ شنو نے کہا۔ ''اس حرافہ کو امید تھی کہ تم آ کر اسے بچا لو گے۔ جلیل میں نے اتنی بے حیا عورت آج تک نہیں دیکھی۔ کتنے مزے سے صرف برقع پہن کر گھوم رہی تھی۔''

''یہ تو ہے اور وہ عورت کب ہے۔۔۔۔ صرف نفس پرست حیوان ہے۔ جب انسان اس طرح بے حیائی پر اتر آئے تو وہ انسان کہاں رہتا ہے۔ اس لیے اسے عورت کہنا بجا نہیں۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے پر وہ زبان کی پکی تھی اس نے میری حفاظت کی ذمے داری لی تھی۔ اسے پوری طرح نبھایا۔ ورنہ اسے کیا ضرورت تھی مجھے استاد جانی سے چھپانے کی۔'' شنو کے لہجے میں اب ہمدردی آ گئی۔ ''پتا نہیں بے چاری کا بکس ملا بھی یا نہیں۔''

اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس بکس میں کیا تھا؟



www.digestpk.com

Asifzamil

# اپنائیت

سلیم انور

آغاز سے انجام تک تمام مراحل طے کر لینا ہی اصل کامیابی ہے... ان مجرموں نے بھی نہایت کامیابی سے اپنی واردات کو تکمیل تک پہنچا دیا تھا... کامیاب شہ سواروں کا دل خراش احوال....

**اختصار کے ساتھ چونکا دینے والے انجام کا پرتجسس جرم پارہ**

مائیکل کو بہت زیادہ غصہ آرہا تھا۔

ہم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ ناراض تو میں بھی تھا لیکن مائیکل آپے سے باہر ہو رہا تھا اور یہ بات خطرناک تھی۔

''ہم اس عورت کا کیا کریں؟''

میں نے اس پولیس عورت کی طرف دیکھا جس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ مائیکل نے اسے عمدگی سے باندھا تھا... بلکہ نہایت ہی عمدگی سے باندھا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ مائیکل نے اس سے پہلے کسی کو اس طریقے سے کب باندھا ہوگا اور کیوں؟ اس کام میں اس کی مہارت ظاہر ہو رہی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میں واقعی سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی آئیڈیا زنہیں آرہے تھے۔

''کتیا!'' مائیکل نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

''اس نے ہمیں کیسے تلاش کرلیا؟ وہ ہمارا پیچھا بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کسی نے بھی ہمارا تعاقب نہیں کیا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ ڈکیتی کے بعد ہم نے بیس سے زیادہ بلکہ تیس مرتبہ یہ چیک کیا تھا کہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ ہم نے پورا یقین کرلیا تھا کہ کوئی بھی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔

یہ ایک زبردست واردات رہی تھی۔ ہمیں بالکل صحیح مخبری ہوئی تھی۔ ہم نے آدھی رات کو بیکیز کے ٹھکانے پر دھاوا بولا تھا۔ وہاں سیف میں ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رقم موجود تھی۔

''شاید یہ سچ کہہ رہی ہو۔'' میں نے رسیوں سے جکڑی ہوئی پولیس ویمن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید اس نے یہاں کاریں کھڑی دیکھیں تو ادھر چلی آئی ہو کہ دیکھے یہاں کیا ہو رہا ہے؟ تعاقب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاید اس کا تجسس اسے یہاں لے آیا تھا۔''

اور یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی۔

رات کا وقت اور ایک ویران فارم ہاؤس کے باہر چار کاروں کی موجودگی! یہ بات توجہ کا باعث بن سکتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ کو علم ہو کہ فارم ہاؤس خالی پڑا ہے۔ مقامی پولیس کے لیے یہ بات تجسس اور تشویش کا باعث ہوسکتی تھی۔

اور اس عورت کا تعلق مقامی پولیس سے تھا۔

''ہمیں یہ کام ابھی کرنا ہوگا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''بری طرح پسینے میں شرابور تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس نے کیا تہیہ کیا ہوا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس عورت کو شوٹ بھی کرسکتا ہے۔

''ہاں، ہمیں یہ کام بھی نمٹا دینا چاہیے۔ وہ جلدی رقم کی تقسیم کا عمل مکمل کرلیں گے۔'' میں نے کہا۔



الفرڈ اور اس کا بھائی رونالڈ کچن میں تھے اور لوٹ کی رقم کو چار برابر حصوں میں تقسیم کرنے میں مصروف تھے۔ وہ نوٹوں کی ڈھیریاں بنا رہے تھے۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی اس پولیس ویمن کو شوٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اسے شوٹ بھی نہیں کریں گے اور نہ ہی میں اسے مارنا چاہتا تھا۔

یہ بات بھی درست نہیں لگ رہی تھی... ایک نہتی عورت کو شوٹ کرنا۔

لیکن ایسا کرنا ضروری بھی تھا... نہایت ضروری۔

اس لیے کہ اس عورت نے ہمارے چہرے دیکھ لیے تھے اور اس کا تعلق پولیس سے تھا۔ وہ ہمیں بہ آسانی شناخت کر سکتی تھی اور ہم ایسا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ ہم کوئی سراغ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس عورت کو لازمی مرنا ہوگا۔

مائیکل اس عورت کی جانب بڑھا۔ اب پسینہ اس کے بدن سے ٹپک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گرم حمام میں ہو اور بھاپ کا غسل لے رہا ہو۔

پھر اس نے اپنی گن نکال لی اور اس کی نال کا رخ عورت کے چہرے کی جانب کردیا۔ گو اس کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے لیکن وہ اس عورت سے صرف آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا اور اس کا نشانہ کسی طور خطا نہیں ہوسکتا تھا۔

''خنزیر کہیں کی!'' یہ کہتے ہوئے مائیکل نے اپنے پستول کا ٹریگر دبا دیا۔

میں نے بھی اپنا ٹریگر دبا دیا۔

مائیکل کے پستول کا دھماکا میری شاٹ گن کی زوردار گونج میں دب کر رہ گیا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے کان پھٹ جائیں گے پھر جب دھواں صاف ہوا تو میں نے اپنی شاٹ گن کی نال کے پرے دیکھا۔

لاش گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ لاش کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک التجا تھی، ایک سوال تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ان آنکھوں کی چمک ماند ہونے لگی اور وہ زندگی سے بے نور ہوگئیں۔

میں زیادہ دیر اس کمرے میں نہیں رک سکتا تھا۔ میرا جی متلا رہا تھا اور بارود کی بو سے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔

میں کچن میں چلا گیا۔ الفرڈ اور رونالڈ نے رقم شمار اور

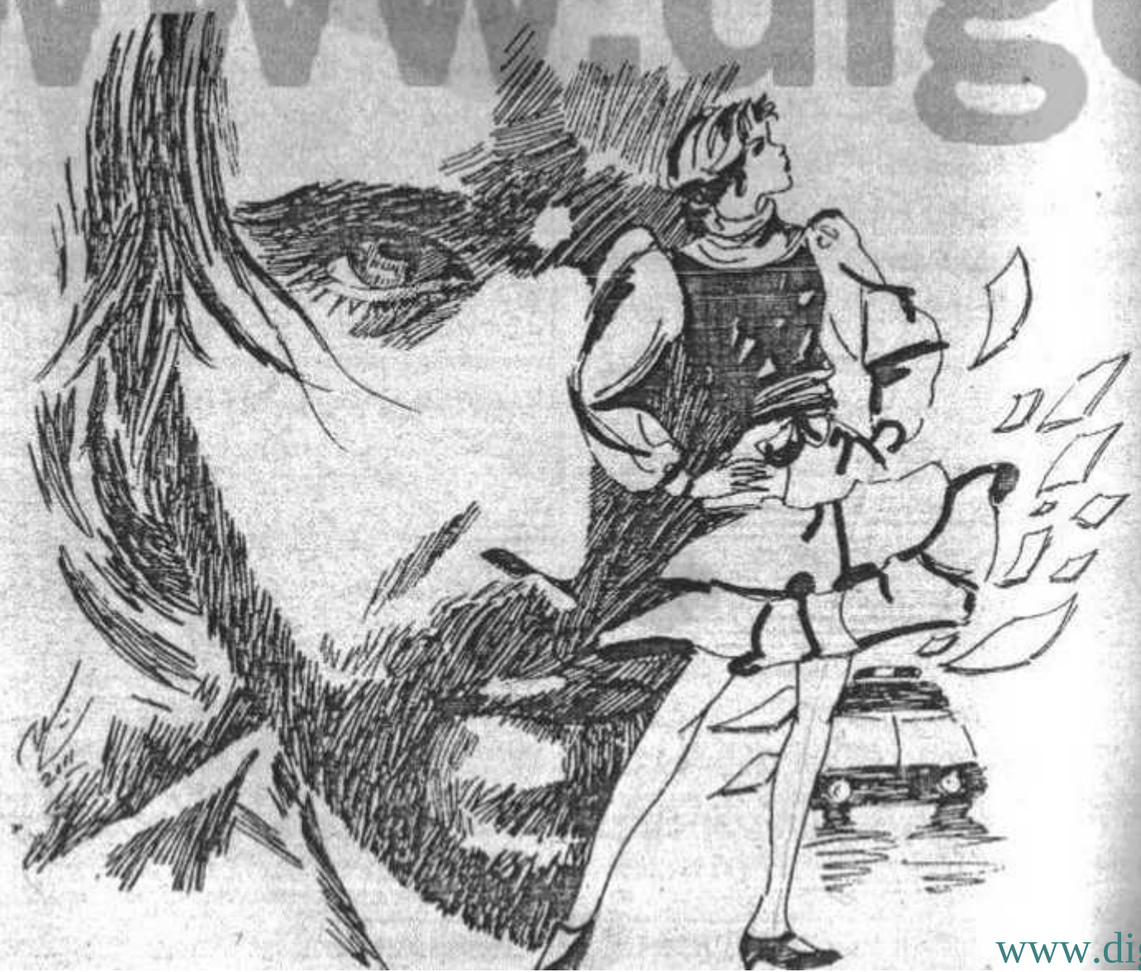

www.digestpk.com

Asifzamil

تقسیم کرنے کا کام مکمل کر لیا تھا۔ وہ دونوں اس وقت سگار پینے میں مگن تھے جو ہمیں اس سیف میں رکھے ہوئے ملے تھے جس میں رقم موجود تھی۔

انہوں نے مجھے بھی سگار کی پیشکش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے تازہ ہوا چاہیے تھی۔ میں سنک کی جانب بڑھا اور نل کے پانی سے اپنے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا۔ میں خود کو تازہ دم رکھنا چاہتا تھا۔

''سب کام ہو گیا؟'' رونالڈ نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''مائیکل اب بھی وہیں ہے۔ خدا جانے اب وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔''

اس بات پر دونوں بھائیوں نے قہقہہ لگایا۔ وہ بہ خوبی جانتے تھے کہ مائیکل کس مزاج کا بندہ ہے۔ اس سے کچھ چیز بھی بعید نہیں تھا۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔

''بہتر ہو گا کہ اب ہم نکل چلیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ کسی نے فائر کی آوازیں سن لی ہوں۔''

اور جیسے یہ ایک ہدایتی اشارہ ہو، آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔

وہ پولیس ویمن دندناتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی اور شاٹ گن کا رخ رونالڈ کی جانب کر دیا۔ رونالڈ نے اپنی گن نکالنا چاہی لیکن اسے دیر ہو گئی۔ اس عورت نے فائر کھول دیا۔ پھر وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ الفرڈ کی جانب گھوم گئی اور پورا بیرل الفرڈ پر خالی کر دیا۔

الفرڈ اس دوران میں نہ صرف اپنی گن اٹھا چکا تھا بلکہ اس نے نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر بھی دبا دیا تھا۔ البتہ اس کی گن کا دھماکا بہت ہلکا تھا جیسے گولی حقیقت میں گن سے نکلی ہی نہ ہو۔

پھر اس عورت نے میری طرف دیکھا۔ اس کی شاٹ گن کے دونوں بیرل خالی ہو چکے تھے اور میز پر دونوں بھائیوں کی لاشیں بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھیں۔ لوٹ کی رقم چار برابر حصوں میں ڈھیر کی شکل میں میز پر موجود تھی۔

پولیس ویمن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ ٹھیک رہا نا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہایت قابلِ یقین۔'' میں نے کہا۔ ''نہایت، نہایت ہی قابلِ یقین!''

آپ سمجھ گئے کہ اس کمرے میں جہاں پولیس ویمن کی مشکیں کسی ہوئی تھیں، کیا ہوا تھا؟ جب مائیکل نے اپنی گن کا رخ اس عورت کی جانب کیا تھا تو میں مائیکل کی جانب گھوم گیا تھا۔ میں نے اپنی شاٹ گن کا رخ اس کی جانب کر دیا تھا۔ وہ حیران رہ گیا اور اس کی حیرانی اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب میں نے اپنی شاٹ گن کا ٹریگر دبا دیا تھا۔

ٹریگر تو مائیکل بھی اپنی گن کا دبا چکا تھا لیکن اس کی گن میں اصلی نہیں خالی کارتوس بھرے ہوئے تھے جبکہ میری شاٹ گن میں اصل کارتوس تھے۔ جبھی تو اس پولیس ویمن پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔

اس کے بعد میں نے پولیس ویمن کی مشکیں کھول کر اسے آزاد کر دیا اور شاٹ گن دینے کے ساتھ اسے چند اضافی کارتوس بھی دے دیے۔

اب میرا کام اپنے دو ساتھیوں کو کچن میں مصروف رکھنا تھا۔ ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

اور پھر وہی ہوا جو ہم چاہتے تھے۔ مائیکل کے بعد الفرڈ اور رونالڈ بھی ٹھکانے لگ چکے تھے۔

پولیس ویمن نے اپنی شاٹ گن کا رخ نیچے کر دیا اور بولی۔ ''کیا تمہیں احساس ہے کہ وہ کتنا ہولناک لمحہ تھا جب وہ مجھ پر فائر کر رہا تھا؟''

''سوری۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے میں تمہیں بتا چکا تھا کہ وہ خالی کارتوس ہوں گے۔ شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔''

میں نے صبح سویرے ہی چپکے سے جا کر اس مقام سے جہاں ہم نے اپنی گنز چھپائی تھیں، گنز سے اصلی کارتوس نکال کر ان کی جگہ نقلی کارتوس بھر دیے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ میں یہ کرنے جا رہا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھ پر بھروسا کیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک عورت ہونے کے ناتے اس پر یہ وقت نہایت کڑا گزرا ہو گا۔

''کم آن۔'' اس پولیس ویمن نے کہا۔ ''اب جلدی سے نکل چلو۔ کیا تمہارے پاس اصلی گولیاں ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور سنک کے نیچے سے کافی کا ایک پرانا ٹن نکالا۔ میں نے ان تمام گنز میں اصلی گولیاں بھر دیں۔ دستانوں میں بند ہاتھوں سے یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا تھا۔

پھر میں نے الفرڈ اور رونالڈ دونوں کے ریوالورز سے چند فائر کیے تاکہ ایسا دکھائی دے جیسے انہوں نے پولیس ویمن پر گولیاں چلائی تھیں لیکن ان کے نشانے خطا گئے تھے۔ البتہ وہ دونوں اس کی جوابی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

پھر میں نے لوٹ کی تمام رقم ایک بیگ میں منتقل کر دی۔

مزے کی بات یہ تھی کہ رقم کی گمشدگی عیاں نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسے وہاں موجود ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بکیز کا مالک ڈکیتی کی واردات کی رپورٹ بھی درج نہیں کرا سکتا تھا۔ بکیز کا سی سی ٹی وی صرف تین افراد کو اندر داخل ہوتے دکھا سکتا تھا۔ میں بہ طور ڈرائیور ان کے ساتھ تھا اور میں نے یہ پورا یقین کر لیا تھا کہ اس واردات کے کسی بھی موقع پر کسی بھی لمحے کیمرے کی زد میں نہ آؤں۔

سیف میں نقب الفرڈ نے لگائی تھی اور کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں کسی طور پر اس واردات میں شامل رہا تھا۔ یہ پلاننگ الفرڈ اور رونالڈ نے کی تھی۔ انہوں نے مجھے اور مائیکل کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا اور یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی۔ نہ ہی انہوں نے کسی کو بتائی تھی۔

فارم ہاؤس سے باہر نکل کر ہم اس مقام پر آ گئے جہاں کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں سب سے نئی کار میں جا بیٹھا۔

''پھر ملاقات ہو گی۔'' میں نے پولیس ویمن سے کہا۔ ''مجھے پندرہ منٹ کی مہلت دے دینا۔ اس کے بعد اپنے پولیس اسٹیشن فون کرنا۔ ٹھیک ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی پٹرول کار اس کے عقب میں کھڑی ہوئی تھی جس کے سائڈ پر یہ الفاظ نمایاں حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ ''جرائم اور جرائم کے اسباب سے جنگ!''

''کیا تم آئندہ ہفتے جینی کی سالگرہ میں آ رہے ہو؟''

میں نے شانے اچکا دیے۔ لیکن پھر اس کی گھورتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ!'' اس نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ تم اس کے اکلوتے ماموں ہو۔ تمہیں تو اس کی سالگرہ میں لازمی شرکت کرنا ہو گی۔''

''ہاں سسٹر!'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ضرور آؤں گا۔''

پھر میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی بہن کو الوداع کہا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی!


عید کی رونقیں پاکیزہ کے سنگ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

ستمبر 2011ء کا شمارہ

**عمیرہ احمد ...... عکس**

عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے
پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

**شیریں حیدر**

**شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں**

مسائلِ حیات کے مختلف زاویۂ
نظر کو اجاگر کرتا ایک پُرتاثر ناول

**عالیہ بخاری ...... خوشبو کا سفر**

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز سمجھ لینے والے
دیوانوں کا ماجرا...... سلسلے وار ناول کی ایک اور کڑی

**راحت وفا ...... ایک تھی نیناں**

انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں......
احساسات و خیالات سے مزین ناول

**رضوانہ پرنس** اور **سدرۃ المنتہیٰ**
کے دلکش و خوب صورت جذبوں میں ڈھلے ناولٹ

**فریدہ اشفاق، عطیہ ہدایت اللہ، سیما یاسمین مجتبیٰ، غزالہ فرخ، قرۃ العین رائے، نزہت جبیں، رفاقت جاوید** اور دیگر مصنفات کی دلچسپ اور یادگار تحریریں

آپ کی آراء کی یادگار شاہکار سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!




www.digestpk.com

Asifzamil

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

قسط 27

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ
ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں..... مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی
کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و
تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر
ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا
نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی
جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت
نہ تو روایتوں کو مانتی ہے..... نہ طبقوں میں
تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب
کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے
اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے
آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی پلٹ بھی
جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے..... جرم
، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا
آزمائشوں کا ایک ایسا ہیلا متناہی سلسلہ

www.digestpk.com

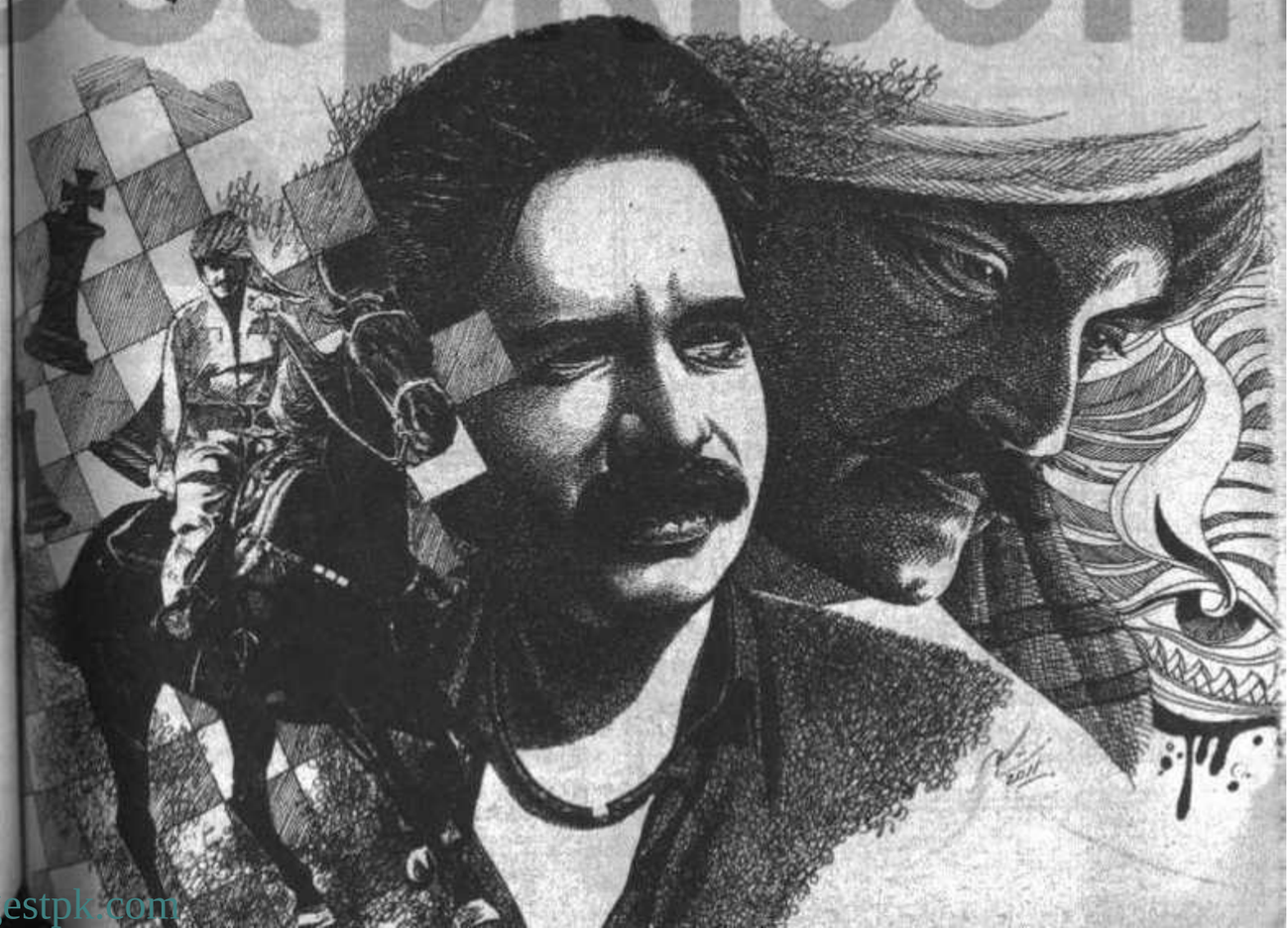



www.digestpk.com

Asifzamil

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کرلیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کردیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کرلیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیتا ہے اور چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرالیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہوجاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا ئمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جکو کا سہارا لیتا ہے اور جکو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو آری کسنڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہریار ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کردیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ مہاگرو (ورما) کے لوگ ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر شہریار پریشان ہوجاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہوجاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ادھر شہریار اپنے قدم بھٹکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گرجاتا ہے اور ماریا کی طنزیہ گفتگو سن کر اس سے شادی کرلیتا ہے۔ وڈی چودھرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو کھلی فضا میسر کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک پھلواری میں لے جاتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کرکے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشابرم خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ کشور کی زندگی بچالی جاتی ہے۔ اس دوران آفتاب کو پتا چلتا ہے کہ چودھری کے گرگے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آفتاب اور کشور میرپور خاص آجاتے ہیں۔ ادھر فریدہ چودھرائن کی سازش کا شکار ہوکر سیڑھیوں سے گرجاتی ہے اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر طارق ہوٹل میں چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے۔ راحیلہ واپس اپنے گھر آجاتی ہے۔ اس کی نگرانی پر مامور شہریار کا آدمی اسے رپورٹ دیتا ہے۔ شہریار جکو کو فون کرکے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالمنان شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کرکے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کہنے پر ڈاکو شہریار کے گھر پر دھاوا بول دیتے ہیں اور زیورات لوٹ کرلے جاتے ہیں۔ چودھری بختیار، چودھری افتخار کے گھر جاکر اسے فریدہ کے ساتھ ہونے والی سازش کے بارے میں بتاتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ شہریار کے خلاف چودھری کی کارروائی سے نالاں ہوتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ادھر ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہوجاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے۔ مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ آفتاب چودھری کو خط لکھ کر نانا بننے کی نوید سناتا ہے۔ چودھری چراغ پا ہوجاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ چھوٹی چودھرائن ناہید کو حویلی کی ذمے داریاں دے دیتا ہے جبکہ بڑی چودھرائن کو تہ خانے میں قید کروادیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی ان کی بات سن لیتی ہے اور زبردستی ان کے ساتھ شامل ہوجاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ وہ بچی کو لے کر نکل رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں ہتھیار بردار افراد انہیں دبوچ لیتے ہیں اور بچی کو ان سے لے لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی بھاگنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ راستے میں رکاوٹ بننے والے پہرے داروں کو مار کر وہ بھاگ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پیچھے فائرنگ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فائرنگ ڈیرے پر پولیس کی چڑھائی کی وجہ سے ہورہی ہوتی ہے۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کرکے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کرلیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی اور دو ڈاکو اسلم اور جمرو بھی ہاتھ نہیں آتے۔ شہریار اس صورت حال پر بہت افسردہ ہوتا ہے۔ ادھر آفتاب شبانہ کو فون کرکے اپنی بچی کے بارے میں دریافت کرتا ہے اور موجودہ صورت حال کا سن کر اسے افسوس ہوتا ہے۔ جکو کی زبانی شہریار کو پتا چلتا ہے کہ آفتاب پر چودھری کے گرگے دھاوا بول دیتے ہیں تاہم جکو کے آدمی ان کی تمام کوششیں ناکام بناکر آفتاب کی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ شہریار اس خبر پر خوش ہوتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ اسلم ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے شکار کرنے نکلتا ہے۔ وہ ایک پرندے کا نشانہ لے کر گولی چلاتا ہے اور بھاگ کر پرندے کو ذبح کرنے کے لیے پکڑتا ہے مگر ایک آواز پر چونک کر پلٹتا ہے۔ ایک رائفل کی نال نے للی اور ماہ بانو کو اپنی زد میں لے رکھا ہوتا ہے۔ وہ بے بسی سے اس سمت دیکھتا ہے جہاں اس کی رائفل پڑی ہوتی ہے۔



## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رائفل اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ وہ بہت زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا، تب بھی اس حد تک کامیاب نہیں ہوسکتا تھا کہ للی اور ماہ بانو کو زد میں لیے کھڑے جمرو کی رائفل کے شعلہ اگلنے سے قبل اس تک پہنچ جاتا۔ ہاں، وہ جمرو ہی تھا جو نہ جانے کس طرح ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اب کسی عفریت کی طرح دانت نکوستا ہوا ان کے سروں پر کھڑا تھا۔

”نہ نہ میرے ہیرو! رائفل کی طرف بڑھنے کی غلطی نہ کرنا۔ یہ غلطی کی تو سمجھ لینا کہ اِدھر تو ہلا، ہور میں نے گولی چلائی۔ ہاں، یہ تو بتادے کہ پہلی گولی تیری محبوبہ کی کھوپڑی میں اتاروں یا اس عاشقہ کی جو وچاری نہ تو فلموں کی ہیروئن بن سکی ہور نہ ہی تیری۔ چچ چچ وچاری کی قسمت ہی ماڑی ہے۔ ورنہ شکل کے تو ہم تم دونوں ہی گواہ ہیں کہ یہ وچاری رج کے سوہنی تھی۔“ جمرو نے اس کی نظروں کا زاویہ پہچان لیا تھا اس لیے فوراً ہی اسے تنبیہ کرڈالی۔

”فضول بکواس نہ کر اور جو چاہتا ہے صاف صاف بتا دے۔“ ان دونوں کو رائفل کی زد میں دیکھ کر وہ اندر سے خاصا پریشان ہوگیا تھا لیکن اپنی اس پریشانی کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

”چاہتا تو میں تیری جان ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بتا کہ تو بغل میں یہ دو دو چڑیاں دبائے کدھر جارہا تھا۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ ڈیرے پر پولیس کا ریڈ ہوتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا ہور دوسروں کی طرح رک کر مقابلہ کرنے کی حماقت نہیں کی۔ وہ پولیسیے جس طرح فائر پر فائر کر رہے تھے، صاف پتا لگ رہا تھا کہ وڈی تیاری کے ساتھ آئے ہیں ہور کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے سوچا مارے جانے یا گرفتار ہونے سے بہتر ہے کہ بھاگ نکلوں۔ بھاگنے کے لیے اس راستے کو چنتے ہوئے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ اِدھر تم لوگوں سے ٹاکرا ہوجائے گا۔ وہ تو اچانک ہی یہ دونوں نظر آگئیں تو میں حیران رہ گیا۔ تو نے تو سب سے زیادہ پھرتی دکھائی وہاں سے بھاگنے میں بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ تو پولیس والوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ادھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اچانک افراتفری میں بھاگا ہوتا تو ان دونوں کو لے کر نکلنا آسان نہیں ہوتا فیر تمہارے حلیے بھی بتارہے ہیں کہ تم لوگ پوری تیاری سے بھاگے تھے۔ سچ بتا کہ کہیں تو نے ہی تو پولیس کو مخبری نہیں کردی تھی؟ تجھے ملوم ہوگا کہ پولیس کب ڈیرے پر حملہ کرے گی اس لیے تو پہلے ہی سے بھاگ نکلا۔“ ذرا سی دیر میں جمرو نے جو اندازے قائم کیے تھے، وہ کسی حد تک صحیح تھے لیکن زیادہ تر الزام تراشی کے زمرے میں آتے تھے۔

اس کے ان الزامات کو سن کر اسلم بھنّا گیا اور دانت پیستے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ ”جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید کرنا تمہاری فطرت ہوسکتی ہے، میری نہیں۔ میں گروہ کو چھوڑنے کے ارادے سے ضرور وہاں سے نکلا تھا لیکن غداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غداری بزدلوں کا شیوہ ہے اور میں تیری طرح بزدل نہیں ہوں۔“

”میں نے تجھے بزدل کہا بھی کب ہے؟ تو تو ہیرو ہے ہیرو۔ جب ہی تو دو دو لونڈیوں کو بغل میں لے کر گھوم رہا ہے۔ یہ سالی للی تو سالوں سے تیری دیوانی ہے پر قسمت دیکھو کہ یہ چار دن کی آئی لونڈیا تیرے دل پر ایسی چڑھ گئی کہ تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہوگیا۔ ایسا قبضہ جمایا تو نے اس پر کہ ہم تو اسے چھونے کو ترس گئے۔ اب میں تیرے سامنے ہی اس کی مٹی پلید کروں گا۔ وڈا ترسایا ہے تو نے ہمیں اس کے لیے۔ اب میں اپنے دل کے سارے ارمان نکالوں گا۔“ جمرو کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ افراتفری میں بس اپنی رائفل لے کر ہی ڈیرے سے بھاگ سکا ہے۔۔۔ اور صرف اس وجہ سے کہ وہ تنہا تھا اور اس کے ساتھ اسلم کی طرح دو نازک اندام خواتین نہیں تھیں، ان کا طے کردہ فاصلہ ان سے قلیل وقت میں پاٹ کر وہاں تک آپہنچا ہے لیکن اس سب کے باوجود اس کی خباثت اپنے عروج پر تھی۔ نہ تو اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوس میں فرق آیا تھا اور نہ ہی ہونٹوں پر دوڑتی شیطانی مسکراہٹ جدا ہوسکی تھی۔ وہ اب بھی وہی جمرو تھا جو ڈیرے پر ہوتا تھا۔

”اگر تو نے ماہ بانو کو انگلی بھی لگائی تو میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔“ اس کی باتیں سن کر اسلم کا پارا چڑھ گیا اور وہ اس کے ہاتھ میں دبی رائفل کی پروا کیے بغیر غضب ناک ہوکر اس پر جھپٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

”وہیں رک جا اسلم ورنہ ایک سیکنڈ میں گولی اس کی کھوپڑی کے اندر ہوگی۔“ جمرو نے فوراً ہی رائفل کی نال ماہ بانو کے سر سے لگادی اور اسے دھمکی دی۔ اسلم نے شدید بے بسی کے احساس کے ساتھ اپنے قدموں کو روک لیا۔ ابھی اس کا شکار کیا ہوا پرندہ تڑپنا پھڑکنا چھوڑ کر ساکت ہوگیا۔



www.digestpk.com

Asifzamil

"اب تیرا ہیرو پن نہیں چل سکے گا۔ زیادہ منہ زوری دکھانے کی کوشش کرے گا تو اس پرندے کی طرح ہی زمین پر گرا اپنے خون میں لت پت مردہ پڑا ہوگا۔ ادھر اس ویرانے میں کوئی تجھے کفن دفن دینے کے لیے بھی نہیں ملے گا۔" جمرو کا لہجہ کسی درندے کی غراہٹ لیے ہوئے تھا۔ اسلم کو اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن وہ صرف اس لیے خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھا کہ اس کی ذرا سی لغزش ماہ بانو کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی۔ یہ تو اپنی جگہ طے تھا کہ وہ جیتے جی جمرو کو اس کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دے گا لیکن انتہائی صورت سے پہلے ایسی کوئی جذباتی حرکت کرنا جو ماہ بانو کے لیے نقصان دہ ثابت ہو، کسی طور مناسب نہیں تھا۔

"للی جانم! ذرا ادھر سے وہ رائفل تو اٹھا کر میرے پاس لے آ۔ یہ ادھر پڑی رہی تو اپنا ہیرو خوامخواہ اس تک پہنچنے کے لیے پھڑکتا رہے گا۔" اسلم کو ساکت ہوتے دیکھ کر جمرو نے طنزیہ لہجے میں للی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے حرکت میں آگئی اور ایک ایک قدم مضبوطی سے رکھتی ہوئی رائفل کی طرف بڑھی۔ ماہ بانو کے سر سے رائفل کی نال لگائے کھڑے جمرو کی نگاہیں چابک دستی سے اس کی اور اسلم کی بہ یک وقت نگرانی کرتی رہیں۔ للی کے رائفل لے کر واپس پلٹنے تک اس نے کہیں کوئی موقع نہیں دیا کہ اسلم اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا پاتا۔

"شاباش، تجھ میں ایک یہی گن اچھی ہے کہ کبھی کسی فرمائش کو پورا کرنے سے انکار نہیں کرتی۔ تو نے وڈی پیاس بجھائی ہے میرے بدن کی۔ تیری اس خدمت کے صلے میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے جان سے نہیں ماروں گا۔" اسے رائفل سمیت واپس پلٹتا دیکھ کر جمرو نے چہک کر کہا۔

"لیکن میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ تو اسلم کو کچھ کر سکے، اس سے پہلے میں تجھے جان سے مار دوں گی۔" اس کی جانب آتی للی یکدم ہی اس سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر رک گئی اور رائفل کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غرائی۔

"یہ تو کیا کر رہی ہے؟" جمرو بوکھلا گیا۔

"تو نے مجھے اسلم کی عاشقہ کہا تھا تو پھر تو یہ کیوں بھول گیا کہ میں اسلم کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" للی نے اسے جواب دیا۔

"رائفل پھینک دے للی ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔" جمرو نے اسے دھمکی دی۔

"مار دے۔ یہ مر گئی تو میری راہ کا کانٹا آپ ہی نکل جائے گا۔" للی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس جواب کے بعد جمرو کسی نئی حکمتِ عملی سے کام لیتا، اس سے قبل ہی اسلم تقریباً اڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ للی میں الجھ کر اس کی توجہ بٹ گئی اس لیے وہ ایک پل کے لیے اسلم کی طرف سے غافل ہو گیا تھا اور اسلم کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے سب سے پہلے جمرو کے رائفل والے ہاتھ کو ہی قابو میں کیا اور وحشیانہ طاقت سے کام لے کر ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ بدحواسی کا شکار ہو جانے والا جمرو فوری طور پر خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر گیا۔ اسلم نے رائفل کو نال کی طرف سے ڈنڈے کی طرح پکڑا اور جمرو پر پل پڑا۔ اس کے چار پانچ ضربیں لگانے تک تو جمرو اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر سکا اور ادھر ادھر لڑھکتا رہا لیکن پھر اسے بھی ایک موقع مل ہی گیا۔ یہ موقع اسے اس پتھر کی صورت میں ملا تھا جس کے قریب وہ اتفاقاً جا گرا تھا۔ پتھر بہت بڑا نہیں تھا اور آسانی سے اس کے بائیں ہاتھ میں سما گیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ پڑے پڑے اسے پوری قوت سے اسلم کی طرف اچھال دیا۔ پتھر اڑتا ہوا اس کے پیٹ میں جا کر لگا۔ خوش قسمتی سے وہ پتھر کسی سخت چٹان کے حصے کے بجائے مٹی کا ڈھیلا ثابت ہوا ورنہ جمرو نے جس طاقت سے اسے اس کی طرف اچھالا تھا، اس کا حشر نشر ہو جاتا۔ اب بھی وہ لڑکھڑا سا گیا اور سنبھلنے تک جمرو کو اٹھ کر کھڑے ہونے کی مہلت مل گئی۔ اور اس کے ایک ہی حملے نے اسلم کے ہاتھوں سے رائفل گرا دی تھی۔

اس کی اور اسلم کی دشمنی کی بنیاد تب ہی پڑ چکی تھی جب اسلم کا دل ماہ بانو پر اس بری طرح آ گیا تھا کہ اس نے اسے سب کے ہاتھوں کا کھلونا بننے..... کے بجائے سردار کے قدموں میں اپنا سارا مال و متاع ڈھیر کر کے محفوظ و مامون کر دیا تھا۔ عورت کا رسیا جمرو اس صورتِ حال پر بڑا اچھلا یا تھا۔ اس کی رال مسلسل ماہ بانو پر ٹپکتی رہی تھی لیکن وہ باوجود کوشش کے اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ماہ بانو کو لے کر شروع ہونے والی ان دونوں کے مابین یہ چپقلش دوسرے جھگڑوں کا سبب بھی بنی تھی اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ خصوصاً جمرو تو موقع کی تلاش میں ہی رہتا تھا کہ کب اسلم کا کانٹا بیچ سے نکلے اور اس کی ماہ بانو تک رسائی ہو سکے۔ آج بدترین حالات میں بھی جب اسے لگا کہ وہ اسلم کو قابو کر سکتا ہے تو اس نے فوراً ہی اس کے خلاف کمر کس لی لیکن اب دونوں کے ہی نہتے رہ جانے کی صورت میں طاقت کا توازن تقریباً برابر ہو چکا تھا اور فتح اسے ہی حاصل ہونی تھی جو خود کو زیادہ بڑا شہ زور ثابت



کر دیتا۔ طاقت کے اس توازن کو اگر کوئی بگاڑ سکتا تھا تو وہ للی تھی۔ وہ اسلم کی حمایتی تھی اور اس وقت اسلم کی لوڈڈ رائفل لیے وہاں کھڑی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے ان دونوں کے جھگڑے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور خاموشی سے ان کے مابین جاری لڑائی کو دیکھ رہی تھی۔

جمرو نے کھڑے ہوتے ہی اسلم کی طرف چھلانگ لگائی۔ اتفاق سے یہی حرکت اسلم نے بھی کی اور نتیجتاً دونوں فضا میں ہی ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور ان کے سروں کے درمیان ہونے والی ٹکر کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔ ٹکرانے کے بعد دونوں ہی پیچھے کی طرف الٹ کر گر پڑے اور دونوں ہی نے بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کر لیا۔ کھڑے ہوتے ہی وہ ایک بار پھر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ اسلم کے دائیں ہاتھ کا گھونسا جمرو کے جبڑے پر پڑا اور اس کی بتیسی ہل کر رہ گئی۔ زخمی منہ سے جاری ہونے والا خون اس کی باچھوں سے نکل کر بہنے لگا مگر اسے ان چوٹوں کی پروا ہی کہاں تھی۔ اپنی چوٹ پر منہ سے ذرا سی بھی آواز نکالے بغیر اس نے اسلم کے کان پر ایک جوابی گھونسا رسید کیا۔ گونسا خاصی قوت سے رسید کیا گیا تھا۔ اسلم کو یوں لگا جیسے اس کے کان کا پردہ پھٹ گیا ہو، بری طرح بلبلاتے ہوئے اس نے اپنا گھٹنا موڑ کر جمرو کے پیٹ میں مارا۔ اس چوٹ کو کھا کر جمرو بری طرح ڈکرایا لیکن اسلم کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اس سے چمٹ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اسلم کی گردن کو گرفت میں لے کر دبا دے۔ اسلم نے طرح دینے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی گردن جمرو کے ہاتھ میں آ گئی اور اس نے پوری قوت سے اسے دبانا شروع کر دیا۔ جواباً اسلم نے بھی اس کے ساتھ یہی حرکت کی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا گلا دبا کر ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے تھے لیکن خود گرفت میں ہونے کے باعث پوری طرح زور لگانے سے قاصر تھے۔

"تم رائفل لے کر ایسے خاموش کیوں کھڑی ہو؟ اس لڑائی کو ختم کیوں نہیں کرواتیں؟" بہت دیر سے خاموش ماہ بانو نے محوِ تماشا للی کو یہ صورتِ حال دیکھ کر ٹوکا۔

"یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہاں جمرو کی لاش نہیں گر جاتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ انسان کی لاش گرنے کا ذکر ایسے کر رہی ہو جیسے کسی کیڑے مکوڑے کی بات ہو۔۔۔ اور ویسے بھی کیا ضروری ہے کہ لاش جمرو کی گرے۔ اسلم کو بھی تو کچھ ہو سکتا ہے۔" ماہ بانو نے برہمی کا اظہار کیا۔

"میرا اسلم شیر ہے۔ اسے کسی کے ہاتھوں مات ہو، اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ادھر اگر کسی کی لاش گرے گی تو وہ جمرو ہی ہوگا اور تم یہ سمجھ لو کہ جمرو کا مرنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ اس کے ارادے تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔" للی کا جواب سن کر اسے خاموش ہونا ہی پڑا۔ دوسری طرف وہ دونوں ایک دوسرے کو گلا دبا کر ہلاک کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد ایک بار پھر ایک دوسرے کو ضربیں لگانے لگے تھے۔ اسلم کے پنچ نے جمرو کا بایاں رخسار ادھیڑ ڈالا تھا اور رخسار سے بہنے والا خون باچھوں سے بہتے خون کے ساتھ مل کر اس کے بھیانک چہرے کو مزید بھیانک بنا رہا تھا۔ اس زخم کو کھانے کے بعد وہ خود بھی پیچھے نہیں رہا تھا اور اسلم کی ناک پر اتنی بری طرح سر مارا تھا کہ اس کی نکسیر پھوٹ پڑی تھی۔ ناک سے بہنے والے خون نے اس کے ہونٹوں کو تر کر دیا تھا لیکن وہ دونوں ہی اپنی حالت سے بے خبر دیوانہ وار لڑنے میں مصروف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ زندگی اور موت کی لڑائی ہے۔ اس لڑائی میں جو ذرا ڈھیلا پڑا، وہ جان سے جائے گا اس لیے بقا صرف اسی میں تھی کہ ہر زخم کی شدت کو حوصلے سے برداشت کر کے لڑائی کو جاری رکھا جائے۔

وہ دونوں ہی اپنی پوری جان سے لڑ رہے تھے اور ابھی تک کسی کا پلڑا بھاری نہیں ہو سکا تھا۔ ایک کی لات چلتی تو دوسرے کا ہاتھ فوراً ہی اگلے کا مزاج پوچھ ڈالتا۔ اب بھی اسلم نے جمرو کی گردن کا نشانہ لے کر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا لیکن وہ عین وقت پر جھکائی دے گیا اور وار اس کی گردن کے بجائے پشت پر لگا۔ پشت پر محسوس ہونے والی وار کی شدت نے جمرو کو بتایا کہ اگر اس کی گردن زد میں آ جاتی تو گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے محفوظ نہ رہتی۔ اس نے غصے میں جھکے جھکے ہی اسلم کے پیٹ پر سر کی زوردار ٹکر ماری۔ ان کی لڑائی کی ابتدا ہی میں اسلم پیٹ پر پتھر کی زوردار ضرب کھا چکا تھا، اسی مقام پر ایک اور چوٹ لگی تو وہ فوری طور پر خود کو سنبھال نہیں سکا اور پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ جمرو پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا فوراً ہی اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس کے سر اور چہرے پر تابڑ توڑ گھونسے مارنے لگا۔ خود کو ان گھونسوں کی زد سے بچانے کے لیے اسلم نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر لیے لیکن جمرو کے ہاتھ کہاں رکنے والے تھے۔ اس نے گھونسوں کا سلسلہ روک کر اسلم کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑنے کی



www.digestpk.com

Asifzamil

کوشش کی تاکہ اسے سخت زمین سے ٹکرا کر اس کی کھوپڑی کھول سکے۔ اسلم بھی کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا کہ ہر چوٹ سہتا ہی چلا جاتا۔ جمرو سے پہلے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر اپنی تمام تر جسمانی قوت صرف کر کے اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ جمرو اس کے اوپر سے گرا ضرور لیکن چاروں شانے چت نہ ہوا اور فوراً ہی اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسلم بھی دو چار سیکنڈز کے فرق سے کھڑا ہو گیا تھا لیکن یہ چند سیکنڈ کا فرق لڑائی میں بہت بڑا تھا۔ جمرو نے اس کا فائدہ اٹھایا اور اس کے کھڑا ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسلم کھڑا ہوا تو اسے حملے کی مہلت دیے بغیر اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور کچھ فاصلے پر کھڑی للی پر دے مارا۔ للی کے لیے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اسے خود کو بچانے یا ایک طرف ہٹنے کی قطعی مہلت نہیں مل سکی اور وہ اسلم کی زد میں آ کر چاروں شانے چت گر پڑی۔

گرنے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ میں موجود رائفل نکل کر اس سے دور جا گری۔ اس بار جمرو نے اسلم پر حملہ کرنے کے بجائے رائفل کی طرف جست لگائی اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ للی کے اوپر جا گرنے والا اسلم جب تک کھڑا ہوا، لڑائی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ طاقت کا توازن جمرو کے حق میں جھکا ہوا تھا اور وہ کسی رعایت کے لیے تیار نہیں تھا۔ رائفل ہاتھ لگتے ہی اس نے اسے سیدھا کیا اور بے دریغ اسلم پر فائر داغ دیا۔ فائر کی گونج کے ساتھ ہی فضا میں ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی۔ یہ للی کی چیخ تھی جو اسلم کی طرف فائر ہوتے ہی زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اسلم کی طرف جاتی گولی کو اپنے سینے پر روک لیا تھا۔ حالات کی چکی میں پس کر مدقوق اور بے کشش ہو جانے والی للی کے سینے سے فوراً ہی خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ اسلم کی جگہ للی کو زد میں آتے دیکھ کر جمرو ایک پل کے لیے گڑبڑا گیا تھا اس لیے دوسرا فائر نہیں کر سکا۔ اس کی اس پل بھر کی غفلت کا اسلم نے فائدہ اٹھایا اور پنڈلی پر بندھا خنجر کھینچ کر نکالنے کے بعد برق رفتاری سے جمرو کی طرف پھینک دیا۔ طویل مشق سے حاصل ہونے والی مہارت نے اس لمحے اسے مایوس نہیں کیا اور خنجر جمرو کے سینے کی بائیں طرف کی پسلیوں سے گزرتا ہوا سیدھا اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ دل میں اتر جانے والے خنجر نے لحیم شحیم جمرو کے سارے کس بل نکال دیے اور وہ لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دوبارہ زمین پر سے نہیں اٹھ سکے گا۔ اسلم نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور للی کی طرف لپکا۔ اس سے قبل ماہ بانو اس کے قریب پہنچ چکی تھی اور اس کا سر اپنی گود میں لے لیا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا للی؟" اسلم گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے ہوئے دکھ سے بولا۔

"تمہیں اپنا بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو سوچا تم پر قربان ہی ہو جاؤں۔ اب تم خوش رہنا کہ للی کبھی تمہاری راہ میں نہیں آئے گی۔" وہ اپنے پپڑی جمے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بہ دقت بولی۔

"میں تم سے اتنی نفرت تو نہیں کرتا تھا کہ تمہاری جان کے درپے ہو جاتا۔" وہ واقعی بہت دکھی تھا۔

"لیکن میں تو تم سے اتنی محبت کرتی تھی نا کہ تم پر خود کو قربان کر دیتی۔" شدید تکلیف کے عالم میں بھی وہ غضب کی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"تم نے مجھے بڑا مقروض کر دیا۔ تمہارے اتنے بڑے احسان کا بدلہ میں کیونکر اتار پاؤں گا۔" اسلم کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، وہ بھی ایک ایسی عورت کے لیے جس سے اس نے ہمیشہ کراہت محسوس کی تھی۔

"تم میرا سر اپنی گود میں لے کر میرے مرنے تک یہیں بیٹھے رہو۔ میں تمہیں دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلی جاؤں گی تو سمجھوں گی کہ زندگی سے سب کچھ پا لیا۔" اس نے اپنی خواہش بیان کی۔ ماہ بانو نے آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ اس پہیلی سی عورت کا سر اپنی گود سے اٹھا کر اسلم کے زانوؤں پر رکھ دیا۔ بے حد دل شکستہ سا اسلم دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ یہاں اس ویرانے میں وہ اس کے لیے بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی خواہش کے مطابق بنا سکے۔ للی کے سینے سے جاری خون کا بہاؤ صاف بتا رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندگی سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ وہ لوگ کسی آبادی میں ہوتے تو وہ پھر بھی کوشش کرتا کہ للی کو کسی اسپتال تک پہنچا دے لیکن وہ تو خود ہی بے سمت تھا۔ اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی سکے گا یا نہیں۔

"اسلم۔۔۔" اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اس پر مرکوز رکھے للی نے آہستہ سے اسے پکار کر خیالات سے باہر نکالا۔

"ہوں۔۔۔ بولو۔" وہ فوراً ہی اس کی طرف متوجہ



ہوا۔

"اگر۔۔۔ ہو سکے تو کبھی میرے ماں باپ سے۔۔۔" اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور یوں لگا کہ وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائے گی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بہت دھیمی آواز میں بولی۔

"ان سے میرے لیے معافی۔۔۔" جملہ اب بھی ادھورا ہی تھا لیکن مفہوم واضح ہو چکا تھا۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔" اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں سے نکل سکے گا یا نہیں لیکن ایک مرتے ہوئے انسان کی موت کو آسان کرنے کے لیے اس سے وعدہ کر ڈالا۔ اس اثنا میں ماہ بانو چلو میں تالاب سے پانی بھر لائی تھی۔ اس نے وہ پانی للی کے خشک ہونٹوں پر ٹپکایا۔ پانی کے چند قطرے اس کے حلق سے نیچے اترے اور باقی پانی باچھوں سے بہہ نکلا۔ اب اس میں کچھ بھی بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک حسرت بھری نظر ماہ بانو اور اسلم کے چہروں پر ڈالی اور پھر جسم کو لگنے والے آخری جھٹکے کے ساتھ اس کی وہ بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں جنہیں دنیا میں آ کر پہلی بار کھولنے کے بعد جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا تھا تو اس نے بڑی محبت سے اس کا نام غزالہ رکھا تھا۔ وہ عزت دار آدمی اپنی غزالی آنکھوں والی پہلی اولاد سے بہت محبت کرتا تھا لیکن بیٹی اس چاہنے والے باپ کی عزت کی لاج نہیں رکھ سکی اور شوبز کی چکاچوند سے اس بری طرح متاثر ہوئی کہ غزالہ سے لیلیٰ اور للی بن گئی۔ اسے لیلیٰ اور للی بننے والوں میں سے نہ تو کوئی مجنوں کی طرح اس کا دیوانہ ثابت ہو سکا اور نہ ہی کسی نے للی کا پھول جان کر قدر کی۔

خودسری اور عاقبت نااندیشی کا شکار وہ لڑکی بری طرح روندی گئی اور ایک ویرانے میں ایسی موت مری کہ اس کا کوئی خونی رشتہ اس کے مردہ جسم کے قریب بیٹھ کر نوحہ کرنے والا نہیں تھا۔ دو افسردہ چہرے اگر اس پر آنسو بہا رہے تھے تو وہ بھی صرف اس لیے کہ اس نے محبت کو اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لاش اور بھی پڑی تھی۔ مرنے والا وہ شخص اس سے بھی زیادہ بدقسمت تھا۔ زندگی بھر اس نے جو ظلم کمایا تھا، اس کے عوض اسے مرتے وقت پانی کے چند قدرے اور کوئی ایک بھی آنسو بہانے والی آنکھ میسر نہیں آ سکی تھی۔ زندگی اپنے آپ کو ڈھنگ سے نہ برتنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ جو لوگ متعین اصولوں سے ہٹ کر زندگی کے ساتھ پیش آتے ہیں، انہیں زندگی اگر عمر بھر ڈھیل دیتی بھی رہے تو خود سے جدا کرتے وقت اس بے دردی سے پیش آتی ہے کہ دیکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنے والا سبق دے ڈالتی ہے لیکن اس سبق کو یاد رکھنے کی فرصت ہی کسے ہوتی ہے۔ اگر انسان دوسروں کے تجربات سے سبق حاصل کر کے سدھرنے والا ہوتا تو پھر خسارے میں کیوں رہتا؟

☆☆☆

شبانہ بہت مضطرب تھی۔ اسے افسوس تھا کہ وہ آفتاب سے وعدہ کرنے کے باوجود اس کی بیٹی کو اس تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسے اس بات کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس کے کچھ کرنے سے قبل ہی بچی کو اسپتال کی نرسری سے غائب کر دیا گیا تھا۔ وہ آفتاب کو اس واقعے کی اطلاع دے کر معذرت بھی کر چکی تھی اور آفتاب نے اس کی معذرت کو قبول بھی کر لیا تھا، اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی۔ اس کا دل اس سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ کچھ ایسا کرے کہ آفتاب اور کشور کو ان کی کھوئی ہوئی خوشی واپس مل جائے۔ آفتاب کے ساتھ اس کے دل کا عجیب ہی معاملہ تھا۔ وہ بہت اچانک ہی اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور چھا گیا تھا۔ محبت جس طرح اس کے دل پر وارد ہوئی تھی، اس طرح کے واقعات عام نہیں ہوتے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں تھا جسے گرفت میں لے کر کہا جا سکتا کہ اس پل محبت نے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے دل میں اترا تھا۔ دیکھا جائے تو ان کا تعلق بھی بہت سرسری سا تھا۔ اس کا اور آفتاب کا بس چند دن کا تو واسطہ تھا۔ وہ بچی کی پیدائش کے سلسلے میں اسپتال میں داخل اپنی بیوی کی دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے کتنی دیوانہ وار محبت کرتا ہے، یہ اس کے ایک ایک انداز سے پتا چلتا تھا۔ شبانہ بہ طور نرس کشور کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دے رہی تھی اور اس قسم کی خدمات انجام دینا اس کا برسوں کا معمول تھا لیکن اس کے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی اور کی محبت کو دیکھ کر اتنی بری طرح متاثر ہوئی کہ خود ہی محبت میں مبتلا ہو گئی۔

اپنے دل میں پیدا ہونے والی اس انوکھی محبت کے لیے وہ ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو سکی تھی کہ آفتاب و کشور کے دشمن ان تک پہنچ گئے۔ اس موقع پر شبانہ نے ان دونوں میاں بیوی کو غیر معمولی فیور دیتے ہوئے نہ صرف وہاں سے فرار ہونے میں مدد دی بلکہ یہ وعدہ بھی کر لیا کہ نرسری میں داخل ان کی بیٹی ان تک پہنچا دے گی۔ حالات نے اسے یہ وعدہ وفا کرنے کی مہلت نہیں دی البتہ وہ خود ملازمت سے



www.digestpk.com

Asifzamil

مستعفی ہونے پر مجبور کر دی گئی۔ اسپتال کی ملازمت سے فارغ ہونے کا مطلب تھا کہ اسے رہائش کے لیے اسپتال کی طرف سے ملا ہوا کوارٹر بھی خالی کرنا تھا۔ برسوں سے مقیم ایک جگہ سے منتقلی کے لیے ساز و سامان کو سمیٹنا بھی ایک دقت طلب کام تھا اور اس وقت وہ اسی مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھنے کے بعد اسے بند کرتے ہوئے یکدم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً اپنے کام کو روکا اور اپنی اس کولیگ کو فون کرنے لگی جو اسپتال میں ریکارڈ کیپر کے فرائض انجام دیتی تھی۔

''روبی! ذرا ریکارڈ میں دیکھ کر مجھے مسز آفتاب کا رہائشی پتا تو بتا دو۔'' رابطہ ملتے ہی اس نے اپنی ساتھی سے مطالبہ کیا۔

''تم اس کے ایڈریس کا کیا کرو گی؟'' اس کی ساتھی نے چونک کر پوچھا۔

''بس کچھ کرنا ہے نا، تم یہ بتاؤ کہ مجھے ایڈریس دے رہی ہو یا نہیں؟'' اس نے دوستانہ دھونس سے کام لیا۔

''اچھا میں بتاتی ہوں۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں خود تمہیں فون کر کے ایڈریس نوٹ کروا دوں گی۔'' دوسری طرف سے مزید کوئی سوال کیے بغیر فوراً ہامی بھر لی گئی تو اس نے لائن کاٹ دی اور ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ اس کے اردگرد بہت کام بکھرا ہوا تھا لیکن اب یہ سب غیر ضروری ہو گیا تھا اور وہ سب سے پہلے اپنے دل میں آنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ آفتاب کے لیے کچھ نہ کر سکنے کے ملال نے اسے اکسایا تھا کہ وہ اس کے کسی طرح تو کام آئے اور اس خواہش نے اسے یہ راہ سجھائی تھی کہ وہ آفتاب کی رہائش گاہ پر جا کر اس کا ضروری نوعیت کا سامان وہاں سے اٹھا کر اسے پہنچا دے۔ اس تدبیر کے سوجھنے میں یہ لالچ بھی کارفرما تھا کہ اس طرح سے آفتاب سے ایک اور ملاقات کا موقع میسر آ سکتا ہے۔ دل کی باتوں میں آ کر اس نے بہت سے دوسرے نکات فراموش کر دیے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ آفتاب اور کشور کا معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے اور اسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے بعد یقینی طور پر پولیس بھی ریکارڈ سے ان کا پتا لے کر وہاں پہنچی ہو گی۔

اپنی ہی دھن میں مگن اس نے روبی کا فون آنے تک کا وقت بہ مشکل گزارا اور پھر اس سے پتا ملتے ہی روانہ ہو گئی۔ وہاں بسیں وغیرہ تو چلتی نہیں تھیں، البتہ اسپتال کے باہر اسے رکشا ضرور مل گیا۔ رکشے میں سوار ہو کر وہ اپنی منزل کی طرف بڑھی۔ راستے سے اس نے ایک لاک میکر کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ اس کے گھر کا بند قفل کھلوا سکے۔ لاک میکر بھی بے چارہ کہاں جانتا تھا کہ ایک معزز نظر آنے والی خاتون اس سے کسی اور کے گھر کا تالا کھلوانے لے جا رہی ہے۔ اس نے وہاں پہنچ کر آرام سے لاک کھولا اور اپنے معاوضے کے ساتھ واپسی کا کرایہ لے کر بخوشی واپس روانہ ہو گیا۔ شبانہ اس کی روانگی کے بعد گھر میں داخل ہوئی تو وہاں اس گرد سے واسطہ پڑا جو چند دن کسی گھر کے بند رہنے سے اس کا حصہ بن جاتی ہے لیکن یہاں کچھ اور بھی تھا۔ گرد پر بہت سے قدموں کے نشان نمایاں تھے اور سامان بھی خاصا بکھرا ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہاں کچھ لوگوں نے آ کر تلاشی لی ہے۔ جوش و جذبات میں بھرے اس کے ذہن کو یہ دیکھ کر دھچکا لگا اور عقل نے خطرے کی سیٹی بجاتے ہوئے اسے فوراً وہاں سے نکل جانے کا مشورہ دیا لیکن اسی لمحے اس کی نظر دیوار پر چپکے اس کاغذ پر پڑ گئی جس پر دھمکی آمیز پیغام تحریر تھا۔

''اگر اپنی بچی زندہ سلامت چاہتے ہو تو اس شخص کے پاس چلے آؤ جس سے بھاگتے پھر رہے ہو۔'' پیغام دینے والے کا کوئی نام پتا موجود نہ ہونے کے باوجود یقیناً پیغام کے الفاظ اس شخص کے لیے بہت واضح تھے جسے یہ پیغام دیا گیا تھا۔ شبانہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ اس پیغام کو آفتاب تک پہنچایا بھی جائے یا نہیں۔ اگر وہ اسے پیغام پہنچا دیتی تو یقیناً بچی کی محبت میں وہ پیغام دینے والے کے پاس بھاگا جاتا۔ جو شخص بھرے اسپتال میں اپنے غنڈے بھیج کر اسے گھیرنے کی کوشش کر سکتا تھا، وہ کس نوعیت کا دشمن ہو گا شبانہ کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ اس کی نوخیز و خاموش محبت آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اسے یہ بھی احساس تھا کہ آفتاب اور کشور اپنی بیٹی کی جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ تذبذب میں مبتلا وہ ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑی ہوئی جہاں سے کسی ایک فیصلے پر پہنچنا بہت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ شش و پنج کی اس کیفیت میں مبتلا وہ ذہن میں ابھرنے والے خطرے کے احساس کو بھی فراموش کر بیٹھی اور اس وقت ہوش میں آئی جب کسی نے چپکے سے اس کے پیچھے آ کر گردن پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ بے ساختہ ردِعمل کے طور پر وہ فوراً ہی بدک کر پیچھے کی طرف پلٹی۔ اس کے عقب میں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک پینتیس چھتیس سالہ آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں دبے پسٹل کا رخ اس کی طرف ہی تھا۔



''کک۔۔۔ کون ہو تم؟'' شبانہ نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو تم مجھے بتاؤ گی کہ تم کون ہو اور اس طرح اس گھر میں چوری چھپے گھس کر کیا کر رہی ہو؟'' جواباً پولیس والے نے اس سے کڑک دار لہجے میں باز پرس کی۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے ایک بودا سا بہانہ پیش کیا۔

''دروازے کا تالا زبردستی کھول کر؟'' پولیس والے نے طنز سے پوچھا تو اس کا حلق خشک ہو گیا اور وہ وہیں سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔ وہیں چل کر ہم تم سے اگلوائیں گے کہ تم یہاں کیا کر رہی تھیں۔'' پولیس والے نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اسے پسٹل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

''میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ نہ ہی چوری چکاری کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ میرے جاننے والے ہیں اور میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ اگر یہاں ان کا کوئی ضروری سامان ہو تو وہ لے جاؤں تاکہ بعد میں انہیں دے سکوں۔'' تھانے جانے کے نام سے شبانہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی جسے سن کر پولیس والے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''یہ ساری وضاحتیں تھانے جا کر پیش کرنا بی بی! میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔ مجھے حکم تھا کہ اگر کوئی شخص زبردستی اس مکان میں گھستا ہوا نظر آئے تو اسے گرفتار کر کے تھانے پہنچا دوں۔'' پولیس والے نے سختی سے جواب دیا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے کا اشارہ کرنے لگا۔ شبانہ کو چار و ناچار قدم آگے بڑھانے پڑے۔ ایک بڑے اسپتال کی نرس کی حیثیت سے شہر میں کئی لوگ اس سے آشنا تھے سو اس کے لیے پولیس کی نگرانی میں تھانے پہنچنا رسوائی کا سبب بن سکتا تھا۔ قدرے زیادہ عمر کی ہونے کے باوجود وہ بہرحال تھی تو ایک کنواری لڑکی ہی چنانچہ اس صورتِ حال پر گھبرا کر رونے لگی۔ تھانے پہنچنے تک اس کے آنسوؤں کا تسلسل جاری رہا تھا۔

''اوئے نورے یہ تو کسے اٹھا لایا ہے؟'' پولیس والا جو کہ عہدے کے اعتبار سے سنتری تھا، اسے لے کر تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کرسی پر اکڑ کر بیٹھے شخص نے سوال کیا۔

''بڑے کام کی چیز لایا ہوں سر جی! آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔'' نورے کے نام سے پکارے جانے والے سنتری نے خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، اسے پچھلے کمرے میں بند کر دے۔ رات کو دل خوش کریں گے۔ ابھی تو اگر ایس ایچ او صاحب کی نظر پڑ گئی تو وہ قبضہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔'' ایس ایچ او کی غیر موجودگی میں اس کی کرسی پر اکڑ کر بیٹھے اے ایس آئی نے جواب دیا۔ یہ وہی اے ایس آئی خالد تھا جس سے شہریار کی آفتاب کے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ شہریار نے تو آفتاب سے رابطے کے لیے اس کا نمبر ملایا تھا لیکن دوسری طرف سے شراب کے نشے میں مدہوش اے ایس آئی خالد نے اناپ شناپ بکنا شروع کر دیا۔ اب شبانہ اسی اے ایس آئی کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس نے پہلے مرحلے میں ہی اپنی خبیثانہ فطرت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ پہلے سے ہی خوف سے زرد پڑتی شبانہ کا رنگ اس کا جملہ سن کر مزید زرد پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''آپ اس طرح سے بھی اپنا دل خوش کر لیجیے گا سر جی پر میں تو آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی ماسٹر کو جانتی ہے۔ ابھی میں اسے اس کے گھر سے ہی پکڑ کر لا رہا ہوں۔ آپ اس سے اگلواؤ کہ ماسٹر کدھر ہے؟''

سنتری کی اطلاع پر اے ایس آئی خالد کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے اور وہ شبانہ کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے لگا۔ ظاہری طور پر تو اے ایس آئی خالد اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے اسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے متعلق انکوائری پر مامور تھا لیکن اندر سے وہ مقامی غنڈے سومرو سے ملا ہوا تھا۔ سومرو وہ شخص تھا جس نے اسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی میں شیدے کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ آفتاب اور کشور کا کوئی کھوج لگے تو شیدے کے آقا چودھری افتخار عالم شاہ سے بڑا انعام حاصل کر سکے۔ اسی لالچ میں اس نے اے ایس آئی سے ساز باز کر رکھی تھی۔

''یہ تو تو نے بڑا کام کیا۔ چل پھر پہلے اس شہزادی سے یہی معلوم کر لیتے ہیں کہ ماسٹر کہاں ملے گا؟ لیکن پہلے اسے پچھلے کمرے میں لے چل۔ یہ میرا اپنا کیس ہے، ایس ایچ او صاحب کو ہوا بھی لگ گئی تو وہ اپنا حصہ مانگنے بیٹھ جائیں گے۔'' اے ایس آئی نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔

''خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اپنے ساتھ متوقع سلوک کو جان کر شبانہ نے اے ایس آئی کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا لیکن



www.digestpk.com

Asifzamil

وہ کانوں میں روئی ٹھونس کر بیٹھا تھا، ذرا بھی اس کی درد بھری التجا پر کان نہ دھرے اور اس کا سنتری شبانہ کو کھینچتا ہوا عقبی سمت موجود ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک جھلنگا سی چارپائی کے علاوہ بیٹھنے کی کوئی اور شے موجود نہیں تھی۔ البتہ ایک دیوار پر کیلوں سے رسی کا گچھا، پلاس، چمڑے کی بیلٹ اور اسی طرح کا کچھ دوسرا سامان لٹکا ہوا تھا۔ شبانہ نے خود کو یہاں کھینچ کر لائے جانے کے دوران چیخنے چلانے اور مزاحمت کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ایک تنومند آدمی کے آگے اس کی ذرا پیش نہ چلی تھی اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اس کمرے تک لے آیا تھا۔

''ایس ایچ او صاحب تھانے پہنچ گئے ہیں۔ تم اس کا منہ بند کر کے بٹھاؤ، میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر یہاں آتا ہوں۔'' اے ایس آئی خالد جو پیچھے کہیں رک گیا تھا، تیز تیز قدموں سے چلتا وہاں پہنچا اور اپنے ماتحت کو یہ ہدایات دے کر جھپاک سے باہر نکل گیا۔ سنتری نے حکم کی تعمیل میں پھرتی سے کام لیا اور سب سے پہلے شبانہ کے منہ میں اسی کا دوپٹا چھین کر ٹھونس دیا۔ اب یہ بھی امید نہیں رہی تھی کہ وہ چیخ چلا کر کسی کو اس طرف متوجہ کر سکے۔ ویسے بھی ایس ایچ او کا کردار اس سے ملاقات کیے بغیر بھی اس کے سامنے آچکا تھا۔ اے ایس آئی خالد نے جن الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی کافی حریص اور بدفطرت ہے۔

اس کی آواز کا گلا گھونٹنے کے بعد سنتری نے اس کے ہاتھ پیر بھی رسی کی مدد سے باندھ دیے اور پھر اسے جھلنگا سی چارپائی پر دھکیل کر خود بھی تیزی سے باہر نکل گیا۔ ادھر ایس ایچ او بس یونہی راؤنڈ مارنے کے لیے تھانے آیا تھا۔ اس نے بے دلی سے ایک نظر روزنامچے پر ڈالی، عملے کو بلاوجہ چند سخت سست سنائیں اور پھر کسی ضروری سرکاری کام سے جانے کا بہانہ کر کے تھانے سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد اے ایس آئی خالد اور اس کے ساتھی سنتری نے عقبی کمرے کا رخ کیا۔ تھانے میں موجود مختصر عملے میں سے چند کو اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ یہاں کوئی عورت لائی گئی ہے لیکن انہوں نے دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ جو بھی معاملہ ہے، وہ جلد سامنے آجائے گا اور کسی بھی قسم کے فائدے کی صورت میں وہ محروم نہیں رہیں گے۔

''اوئے نورے! تو تو بڑا ظالم ہے۔ اتنی سوہنڑی مس صاحبہ کو ایسے باندھ بوندھ کر ڈال دیا ہے۔ چل کچھ نہیں تو اس کا منہ ہی کھول دے۔ اچھی بھلی آواز ہے بے چاری کی اور تو نے اس کا گلا ہی گھونٹ دیا۔'' چارپائی پر پڑی شبانہ کو دیکھ کر اے ایس آئی مکاری سے بولا تو سنتری نے آگے بڑھ کر شبانہ کے منہ میں ٹھنسا اس کا دوپٹا نکال لیا۔ منہ کھلتے ہی وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ شاید کپڑے کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہو کر چھل گیا تھا۔

''اسے پانی پلا یار!'' اے ایس آئی نے بیزاری سے حکم دیا جس کی تعمیل میں نورا جست کے ایک گندے سے گلاس میں پانی لے آیا اور شبانہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ نرسنگ کے پیشے سے وابستہ شبانہ جو عام حالات میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا بہت خیال رکھتی تھی، اس گندے گلاس سے غٹاغٹ پانی کے کئی گھونٹ پی گئی۔

''ہاں بھئی شہزادی! اب شروع ہو جا اور بتا کہ وہ ماسٹر کدھر ہے؟'' کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے اے ایس آئی نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے جدا ہوتے ہی اس سے سوال کیا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ وہ کوئی میرا جاننے والا نہیں ہے۔ اسپتال میں میری ڈیوٹی اس کی بیوی کے کمرے میں تھی، بس میں اسی حوالے سے اسے جانتی تھی۔ بعد میں جب وہ اور اس کی بیوی اسپتال سے فرار ہو گئے تو اس نے فون کر کے مجھ سے اپنی بیٹی کے سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر ہو سکے تو میں اس کے گھر جا کر ایک بار جائزہ لے لوں کہ وہاں کا کیا حال ہے۔'' شبانہ درمیانی وقفے میں اپنے ذہن میں ایک قدرے معقول کہانی تراش چکی تھی لیکن اس کہانی کے ایک نکتے کو پکڑ کر ہی اے ایس آئی نے اس سے ایک نکیلا سوال کر ڈالا۔

''تم اسے کس طرح اطلاع دیتیں۔ تمہیں اس کا ایڈریس یا کوئی فون نمبر وغیرہ یاد ہے؟''

''نن۔۔۔ نہیں۔'' وہ گڑبڑائی۔ ''اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی کسی وقت فون کرے گا۔''

''میرے خیال میں اس سالی کو مرمت کی ضرورت ہے۔ نورے! تو ٹائم برباد نہ کر۔ اس کے سارے ناخن پلاس سے پکڑ کر کھینچ لے۔'' تجربہ کار و گھاگ اے ایس آئی نے فوراً ہی اندازہ کر لیا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے چنانچہ سرد لہجے میں اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا اور چارپائی پر پڑی شبانہ کے دائیں ہاتھ کی چھنگلی کا ناخن پلاس میں دبا کر پوری قوت سے کھینچ لیا۔ نفاست سے سیٹ کیا نیل پالش سے سجا ناخن جڑ سے اکھڑ گیا




خوبصورتی خوبصورت جلد سے جبکہ خوبصورت جلد سکن ٹونر سے وہ بھی چند سیکنڈز میں

جلد کی خوبصورتی کیلیے سب سے بہتر سکن ٹونر / آج آزمائیں فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس

یوں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کیلیے انسان صدیوں سے مختلف جتن کرتا چلا آرہا ہے۔ خاص طور پر چہرہ تو ہر کوئی خوبصورت چاہتا ہے اس سلسلے میں بعض چہرے کی کچھ مخصوص ورزشیں کر کے چہرے کے عضلات کو مضبوط بناتے ہیں تاکہ وہ چاک چوبند اور جوان نظر آئیں۔ خاص طور پر مرد۔ جبکہ بعض چہرے پر کچھ لگا کر جلد کو گورا، نرم، ملائم اور چمکدار بناتے ہیں کہ وہ خوبصورت نظر آئیں خاص طور پر خواتین۔ ہم نے بھی اپنی تحقیقات کو اس مقصد کے حصول پر مرکوز کیا۔ یعنی جلد کی خوبصورتی کیلیے کہ جلد گوری نرم ملائم اور چمکدار ہو۔ طویل تحقیق کے بعد ہم ان نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ لگتے ہی دو چار سیکنڈ میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یعنی جلد نرم ملائم گوری اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ دانے اور خارش ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہماری دن رات تھکا دینے والی طویل تحقیق اور محنت سے ہی ممکن ہو سکا۔ رنگ گورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی بھی بلیچ کریم سے آسانی سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ رنگ بھی گورا ہو۔ اور مضر اثرات بھی نہ ہو۔ اگر استعمال چھوڑ دیا جائے تو چہرہ بھی خراب نہ ہو اثر بھی دیرپا ہو اس وقت مارکیٹ میں مختلف ناموں سے مہنگی سستی کریمیں دستیاب ہیں جن کے اثرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ استعمال کرتے رہیں تو ٹھیک چھوڑ دیں تو چہرہ ایک دم خراب لہٰذا ہم نے اپنی تحقیق میں سب سے زیادہ توجہ اس پر دی کے روزانہ کا استعمال بھی نہ ہو استعمال چھوڑ دیں تو چہرہ خراب بھی نہ ہو اثر دیر تک رہے سو ہم اس میں کامیاب ہوئے سکن ٹونر استعمال کرنے سے جلد 5 سیکنڈ میں ہی نرم ملائم گوری اور چمکدار ایک دفعہ استعمال کا اثر مہینوں تک اپنی ہی جلد پر ہاتھ پھیر کر یا دیکھ کر خود ہی پر پیار آجائے سکن ٹونر ہماری اب تک کی ایجادات میں ایک بڑی ہی اہم ایجاد ثابت ہوئی جس کا طریقہ استعمال بھی نہایت آسان اور فوری موثر ہے حتیٰ کہ لگائیں اور فوراً دھو دیں تو بھی اپنا اثر دکھاتا ہے کہ دیکھنے والے بھی کہیں اور خود کو بھی محسوس ہو

سکن ٹونر کے استعمال فوائد:

تھوڑا سا سکن ٹونر دونوں ہاتھوں پر مل کر چہرے پر لگائیں 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے اور اب چہرہ خشک ہونے پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں خود ہی پر پیار آجائے گا اور آئینہ دیکھیں تو حیرانگی ہو گی [illegible] اثر اور اب یہ اثر کم از کم ایک مہینے تک رہے گا لہٰذا سکن ٹونر کا ایک بار کا استعمال ایک مہینے کیلیے کافی ہے پھر بھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں دوبارہ استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح چہرہ، ہاتھ، پاؤں اور گردن پر بھی سکن ٹونر لگائیں اور 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے تو ہاتھ، پاؤں بھی نرم ملائم گورے اور چمکدار ہو جائیں گے پھٹی ایڑیاں ٹھیک ہو جائے گی اور یہ اثر ایک ماہ تک رہے گا پھر سکن ٹونر ایک ماہ میں دوبارہ استعمال ہو سکتا ہے اور اگر پورے جسم کو نرم و ملائم اور چمکدار بنانا ہو تو پورے جسم پر سکن ٹونر لگا کر 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے آپ حیران ہوں گے کہ اپنے ہی جسم پر ہاتھ پھیر کر یا دیکھ کر خود ہی پیار آجائے گا کہ جسم نرم و ملائم گورا اور چمکدار ہو جائے گا دانے اور خارش ختم ہو گی سکن ٹونر پورے جسم پر ہر مہینے ضرور لگائیں حسب ضرورت مہینے میں دوبار بھی استعمال کر سکتے ہیں

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کا سکو پانڈ، مینگورہ (سوات)

042-37666818
0300-9486848

نوٹ: سکن ٹونر حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ) بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں


www.digestpk.com

Asifzamil

اور اذیت کی ایک لہری اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ شبانہ کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح چیخنے لگی۔

"رکنے کی ضرورت نہیں ہے نورے۔ جب تک اسے اپنے یار کا پتا اور فون نمبر یاد نہ آجائے تو اس کا ایک ایک ناخن اکھاڑتا رہ۔" اس کی چیخوں کو خاطر میں لائے بغیر اے ایس آئی بے رحمی سے بولا۔ نورے نے فوراً ہی شبانہ کا ہاتھ جکڑ کر دوسرا ناخن بھی کھینچ ڈالا۔ یہ ناخن آدھا ہی ٹوٹا تھا لیکن شبانہ کو لگا کہ اس کے جسم سے روح پرواز کر گئی ہے۔ وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوگئی۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر پانی پھینک کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ وہ کراہتی ہوئی ایک بار پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں درد کی بے پناہ لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ باوجود کوشش کے اس درد کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

"اس کے زخموں پر نمک اور مرچ چھڑکو۔" ایس آئی خالد نے ایک بار پھر بے رحمی سے حکم دیا۔ اس حکم کی بھی فوری تعمیل کی گئی اور شبانہ کی خونم خون انگلیوں میں گویا انگارے سے بھر گئے۔ وہ اذیت سے چیخنے لگی۔

"بول ماسٹر کا اتا پتا بتائے گی یا تیری تیسری انگلی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے؟ پر یاد رکھنا اب کی بار نورا سارے ناخن اکھیڑنے تک رکے گا نہیں۔" ایس آئی نے سرد اور ظالمانہ لہجے میں اس سے کہا تو اس کی روح اندر تک لرز اٹھی۔ یہ تکلیف ایسی نہیں تھی کہ وہ عام سی لڑکی اسے سہہ پاتی۔ درد بھرے انداز میں روتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس ان لوگوں کا کوئی پتا نہیں ہے بس ایک ٹیلی فون نمبر ہے۔ آفتاب صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے ان کی بیٹی امید کے بارے میں کوئی خبر ملے تو میں اس نمبر پر فون کر کے انہیں اطلاع دے دوں۔"

"ٹھیک ہے، وہ فون نمبر بتا۔" اے ایس آئی نے اسے حکم دیا۔

"نمبر میرے موبائل میں ہے اور موبائل اس بیگ میں جو تم لوگوں نے مجھ سے چھین لیا ہے۔" اس نے کچھ کچھ اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جا بھئی نورے تو جا کر اس کے موبائل میں نمبر چیک کر، میں اسے چیک کرتا ہوں۔" اے ایس آئی نے خباثت سے ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے سنتری کو حکم دیا تو وہ دانت نکالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی اے ایس آئی شبانہ پر پل پڑا۔ اس کا چیخنا چلانا، رونا دھونا سب بے کار گیا اور وہ اس درندے کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ برسوں سے سنبھال کر رکھی گئی دوشیزگی کی دولت یوں لٹی کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکی اور اذیت ناک انداز میں سسکتی رہی لیکن اسے کہاں معلوم تھا کہ اذیت کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم ہونے والا نہیں ہے اور بھی بہت سے گدھ ہیں جو بظاہر تو عوام کی خدمت و حفاظت کے لیے جسموں پر وردی سجائے گھومتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی بوٹیاں نوچنے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بے بس شبانہ تو ان کا بہترین شکار تھی، وہ اسے کیوں چھوڑتے چنانچہ وہ بے چاری تھانے کی چار دیواری کے اندر لٹتی رہی اور باہر چورا چکے مزے سے گھومتے رہے۔ کوئی نہیں تھا جو اس مظلوم لڑکی کی دادرسی کرتا، جو اپنی خاموش محبت کے جرم میں اتنی بڑی سزا کاٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ شخص جس کی خاطر وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی، اس سے بہت دور اپنی محبوب بیوی کی دل جوئی میں مصروف تھا۔ شاید خاموش محبتوں کا نصیب ہی یہ ہوتا ہے، محبت کرنے والا اندر سے جل مرتا ہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔

☆☆☆

"چودھری صاحب! وڈی چودھرائن کی حالت وڈی خراب ہے۔ انہیں کھانا ہضم ہی نہیں ہو رہا ہو وہ الٹیوں پر الٹیاں کر رہی ہیں۔ جو نوکرانی انہیں کھانا پہنچانے جاتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ کل سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا، صرف پانی ہی پر ہیں ہو وہ بھی ان کے پیٹ میں نہیں ٹھہر رہا۔ ابھی وہ دوپہر کا کھانا پہنچانے گئی تھی تو بتا رہی تھی کہ وڈی چودھرائن بالکل نڈھال پڑی ہے اور پکار کا جواب نہیں دے رہی۔ اب آپ بتائیں چودھری صاحب کہ کیا کرنا ہے؟ اگر کچھ ہو ہوا گیا تو کہیں مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔" منشی اللہ رکھا چودھری کے سامنے دست بستہ کھڑا دھیمی آواز میں اسے تہ خانے میں قید وڈی چودھرائن کی حالت سے آگاہ کر رہا تھا۔

"مرتی ہے تو مر جائے۔ مجھ سے غداری کرنے کا مزہ تو چکھے وہ۔" چودھری نے غصے سے جواب دیا۔

"دیکھ لیں چودھری صاحب، کہیں مشکل نہ ہو جائے۔ چودھرائن کے پیکے والوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ طوفان اٹھا دیں گے۔ خیر، ان کا آپ کا تو کوئی مقابلہ نہیں، پر اصل پریشانی آپ کی اپنی اولاد کی ہے۔ آدمی دنیا سے لڑ لے، پر اپنی اولاد کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے چودھری مراد شاہ آپ کے خلاف بھڑک اٹھے تو آپ کو مشکل ہو جائے گی۔" منشی نے اسے عقل کی راہ دکھائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے سوچ بچار میں مبتلا ہوتا دیکھ کر منشی ایک طرف ہاتھ



باندھے خاموش کھڑا ہو گیا۔ اسی اثنا میں اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے دیکھا تو شیدے کے دوست سومرو کا نمبر تھا۔ سومرو کے ذریعے وہ ابھی تک آفتاب اور کشور کو تلاش کروانے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے اس کی کال سننا ضروری تھا۔ کال سننے کے لیے وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہاں بولو، کیا گل ہے؟" کال ریسیو کر کے اس نے خشک لہجے میں فون کیا۔

"آپ کے لیے خوش خبری ہے۔ آپ کو جن لوگوں کی تلاش تھی، ان کا پتا مل گیا ہے۔ وہ حیدرآباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو ہوٹل کا نام، ٹیلی فون نمبر اور ان دونوں کا کمرا نمبر بتا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے پہلے آپ کو دو لاکھ ادا کرنے ہوں گے۔ جس اے ایس آئی نے یہ سب معلوم کیا ہے، اس کا یہی مطالبہ ہے۔" سومرو نے اسے اطلاع دی۔

"رقم مل جائے گی لیکن یاد رکھنا کہ خبر غلط نہیں ہونی چاہیے۔" منشی نے دھمکی دی۔ چودھری کا دستِ راست ہونے کی وجہ سے اس کے پاس اتنا اختیار تو تھا ہی کہ وہ دو لاکھ کی رقم اپنی صوابدید پر خرچ کر سکے۔

"آپ کب تک رقم بھجوا دیں گے؟" سومرو پکا کاروباری تھا، اس کی دھمکی کا اثر لیے بغیر اپنے مطلب کی بات پوچھی۔

"رقم آج رات سے پہلے تم تک پہنچ جائے گی لیکن تم پتا تو بتاؤ۔" منشی نے جھنجلا کر اس سے مطالبہ کیا۔

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اے ایس آئی پہلے رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

"اس اے ایس آئی کی تو ایسی کی تیسی۔ جب میں نے کہہ دیا کہ رقم مل جائے گی تو سمجھ جائے گی۔ ہم کوئی تمہاری طرح تھرڈ ریٹ غنڈے نہیں ہیں کہ اپنی زبان سے پھر جائیں۔" منشی جھنجلایا۔

"معاف کرنا صاحب! ہم بے شک غنڈے ہیں لیکن ہمارے اپنے اصول ہیں۔ آپ کو ہم سے معلومات اسی صورت میں ملیں گی جب ہم تک رقم پہنچے گی۔" سومرو اس کے لہجے پر مزید اکڑ گیا اور اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ منشی بکتا جھکتا گالیاں دیتا واپس چودھری کے کمرے میں پہنچا۔

"کی گل اے منشی۔ وڈا غصے میں دکھائی دے رہا ہے؟" اندر پہنچنے تک منشی نے اپنی زبان کو تو قابو کر لیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے چودھری نے بھانپ لیا کہ وہ غصے میں ہے۔ جواباً منشی نے اسے ساری بات بتا دی۔

"چنگی گل ہے، تو اس کتے کو رقم بھجوا دے۔ پہلے اپنا کام ہو جائے، بعد میں اسے اس کی جرأت کا مزہ بھی چکھا دیں گے۔" تفصیل سن کر چودھری نے سرد لہجے میں اپنا حکم سنایا۔

"چنگا چودھری صاحب۔" منشی فوراً حکم کی بجا آوری کے لیے تیار ہو گیا۔

"تو اس کام کو نبیڑ، فیر نیچے چل کر چودھرائن کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔" منشی کی عدم موجودگی میں چودھری کسی فیصلے پر پہنچ چکا تھا چنانچہ اس سے بولا۔ جواباً منشی "ہلاں چودھری صاحب" کہتا ہوا حرکت میں آ گیا۔ اس کی واپسی پندرہ منٹ سے بھی کم وقفے میں ہو گئی۔ اس دوران چودھری بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر کم زیادہ ہوتے بل بتا رہے تھے کہ وہ سوچ و بچار میں مبتلا ہے۔ منشی واپس آیا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ حویلی کے الگ تھلگ گوشے میں تھا اور اس گوشے میں کوئی بھی بلا اجازت قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ منشی نے وہاں پہنچ کر اپنے کرتے کی جیب سے چابیاں نکالیں اور تالا کھولنے لگا۔ اس کے تالا کھولنے کے بعد وہ اور چودھری سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے۔ سیلن زدہ فضا والا یہ تہ خانہ چودھری کے بزرگوں میں سے کسی نے تعمیر کروایا تھا اور اس میں الگ الگ کئی کمرے تھے۔ چودھری اور منشی اس کمرے کی طرف بڑھے جس میں وڈی چودھرائن کو رکھا گیا تھا۔ منشی نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری کے لیے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک بھپکا سا باہر آیا۔ چودھری نے فوراً ہی اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر اندر داخل ہوا۔ وڈی چودھرائن فرش پر بچھی چٹائی پر آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹی تھی اور اس کے اردگرد اس کی اپنی الٹیوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ کروفر والی وڈی چودھرائن قید کے چند دنوں میں نچڑ کر رہ گئی تھی اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو جسم پر ڈھیروں ڈھیر سونا لادے، بیش قیمت لباس میں ملبوس حویلی پر حکمرانی کیا کرتی تھی۔ دروازہ کھلنے اور قدموں کی چاپوں کی آواز سے کسی کے آنے کا اندازہ کر کے چودھرائن نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان آنکھوں میں موت کی آمد صاف پڑھی جا رہی تھی۔ چودھری کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

"دیکھ لیا چودھرائن مجھ سے غداری کا انجام! میں نے تو تجھے حویلی کی مالکن بنا رکھا تھا، پر تجھے عزت راس نہیں آئی



www.digestpk.com

Asifzamil

ہورتو میری ہی جڑیں کاٹنے لگی۔ اب دیکھ تو کس حال میں پڑی ہے۔ یہاں پڑے پڑے ہی تو مر جائے گی ہور کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔'' برسوں سے زندگی کی ساتھی عورت کو اس حال میں دیکھ کر بھی اس کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں جاگا اور رعونت بھرے لہجے میں بولا۔

''میرا خون تجھے بہت مہنگا پڑے گا چودھری۔ تو دیکھ لینا کہ تیری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔'' وڈی چودھرائن کی آواز ٹھیک طرح سے نہیں نکل پا رہی تھی پھر بھی اس آواز میں بسی نفرت کی آنچ چودھری تک پہنچ رہی تھی۔

''چل تو یہی خوش فہمی دل میں لے کر دنیا سے چلی جا۔ اس طرح شاید تیری موت کچھ آسان ہو جائے ورنہ تو مجھے تیری حالت بڑی پتلی نظر آرہی ہے۔'' چودھری نے استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے اسے جواب دیا پھر منشی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یہ نمک حرام مر جائے تو اس کی لاش یہیں دفن کر دینا۔ مجھے اطلاع دینے کی کوئی لوڑ نہیں ہے۔'' اس حکم کو دے کر وہ واپس پلٹ گیا۔ ہکا بکا منشی اس کے پیچھے تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ چودھری نے یہ کس قسم کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسری طرف بستر پر بے بس پڑی چودھرائن، چودھری کو ننگی ننگی گالیاں دے رہی تھی لیکن اس کی آواز اتنی نحیف تھی کہ کمرے کی فضا تک ہی محدود تھی۔ آخر بولتے بولتے اسے زور کا ٹھکا لگا تو گالیوں کا یہ سلسلہ تھما اور وہ میلے کچیلے تکیے میں منہ دے کر بری طرح کھانسنے لگی۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چراغِ آخرِ شب ہے جو بس بجھنے کو ہی ہے۔ ادھر چودھری تہ خانے سے نکل کر منشی سے پوچھ رہا تھا۔

''تینوں ملوم ہے نا منشی کہ مینوں لندن جانا ہے۔ ادھر میں تین چار دن یا بہت ہوا تو ہفتہ بھر رہوں گا۔''

''جی سرکار۔'' چودھری کی آنکھوں میں موجود سوچ کی پرچھائیوں کو دیکھتے ہوئے منشی نے تابع داری سے جواب دیا۔

''میں ادھر سے روانہ ہو جاؤں، تب سب کو یہ گل بتانا کہ وڈی چودھرائن کی حالت بہت خراب ہے اس لیے چودھری صاحب لندن گئے ہیں۔'' اپنے ذہن میں پکتی کھچڑی کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس نے منشی سے کلام کا سلسلہ شروع کیا۔

''بہت بہتر سرکار۔'' برسوں سے نمک خوار منشی نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ چودھری کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ چودھری نے وڈی چودھرائن کے غیاب کے سلسلے میں سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر رکھا ہے کہ وہ شدید بیمار ہے اور لندن کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ تہ خانے کی تاریکی میں سزا بھگتتی قریب المرگ چودھرائن کے سلسلے میں مزید یہ پروپیگنڈا کرنا کہ لندن میں اس کی حالت تشویش ناک ہے اس لیے چودھری صاحب لندن جا رہے ہیں، خاصا معنی خیز تھا۔ حالانکہ چودھری درحقیقت ڈیوڈ کے حکم پر لندن جا رہا تھا۔ وہاں چودھری کے جوتوں کے کارخانے میں ہیروئن کی خفیہ لیبارٹری کے قیام کے سلسلے میں کچھ ضروری امور طے ہونے تھے۔ ابتدا میں تو یہ پروگرام تھا کہ ڈیوڈ کا کوئی نمائندہ خود آکر اس سے ملے گا لیکن پھر اچانک ہی پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے چودھری کو لندن روانگی کے احکامات مل گئے۔ اسے وہاں کس سے اور کہاں ملنا تھا، یہ ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا۔ حاکمانہ مزاج رکھنے والے چودھری کے لیے اس انداز سے کوئی کام کرنا بہت مشکل تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلا کا حریص بھی تھا اور جو خطیر دولت ملنے والی تھی اس سے محروم ہونا بے وقوفی سمجھتا تھا چنانچہ خلافِ مزاج کام کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔

''چودھرائن کی حالت تو نے دیکھ لی ہے۔ ایک آدھ دن میں یا تو وہ آپ ہی مر جائے گی یا تو خود اس کا پتا صاف کروا دینا۔ میرے پاس یہ چنگا موقع ہے کہ میں اس مصیبت سے جان چھڑا لوں۔ تو خفیہ طریقے سے لاش تہ خانے سے نکلوا کر شہر پہنچا دینا اور ادھر کسی برف خانے میں رکھوا دینا۔ میں لندن سے واپس پہنچ کر جب ائرپورٹ پر اتروں گا تو تب حویلی میں خبر دینا کہ وڈی چودھرائن گزر گئی ہے اور چودھری صاحب ان کی میت لے کر حویلی پہنچ رہے ہیں۔'' چودھری کا منصوبہ واضح تھا۔ مزید جزئیات بھی وقت کے ساتھ طے کی جا سکتی تھیں۔ اصل میں چودھری غصے میں چودھرائن کے لیے تہ خانے کی قید کی سزا نافذ کر کے پھنس گیا تھا۔ اب اگر وہاں سے اسے زندہ نکال کر آزاد کر دیا جاتا تو وہ انتقام پر اتر آتی اور اس کے لیے مشکلات کھڑی کر دیتی اس لیے موجودہ صورت حال سے نمٹنے کا سب سے اچھا حل یہی تھا کہ چودھرائن کا وجود ہی مٹا دیا جائے اس طرح نہ... بانس رہتا اور نہ ہی بانسری بجتی۔

''تسی فکر نہ کرو چودھری صاحب! میں سب سمجھ گیا ہوں۔ آپ سرکار جب لندن سے واپس آئیں گے تو یہاں سب ٹھیک ملے گا۔'' رمز شناس منشی کے لیے اتنی تفصیلات کافی تھیں، باقی کام وہ خود انجام دے ڈالتا۔ چودھری کے لیے



کام کرنے والے ایسے نمک خواروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی جو صفائی سے یہ سارا کام نمٹا دیتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو پاتی۔

''مجھے تجھ پر بھروسا ہے منشی۔ ایک تو ہی تو ہے جسے کوئی بھی کام کہہ کر میرا بوجھ آدھا ہو جاتا ہے۔'' چودھری نے اعتراف کیا۔

''میں آپ کا نمک خوار ہوں سرکار! وقت پڑا تو آپ پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ مجھے تو یہ ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے بندوں کی نااہلی آپ کے سامنے شرمندہ کروا دیتی ہے ورنہ میرا بس چلے تو آپ کی زبان سے حکم نکلنے سے پہلے اس کی تعمیل ہو جائے۔'' منشی نے فوراً خوشامد کی۔ اس خوشامدانہ رویے کی وجہ سے بھی وہ چودھری کا منظورِ نظر تھا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ مینوں ملوم ہے کہ تو کوئی مار دھاڑ کرنے والا بندہ نہیں ہے، نہ ہی اب تیری ایسی عمر ہے کہ لڑکے بالوں کی طرح بھاگ دوڑ کر سکے۔ پر تو اتنا خیال رکھا کر کہ ان منڈوں کی رسی کھینچ کر رکھ۔ اب یہی دیکھ لے کہ پچھلے دنوں شیدے اور اس کے سنگیوں نے کیسی بے پروائی دکھائی ورنہ تو اب تک ہمارا مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔'' چودھری اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اپنے مخصوص کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شیدے کی نااہلی کا اسے اب تک غصہ تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی آفتاب کی بیٹی امید کو لے کر آرہے تھے کہ راستے میں کسی نے انہیں چھاپ لیا۔ اس کارروائی میں شیدا اتنا شدید زخمی ہوا تھا کہ اگر جلد اسپتال نہیں پہنچایا جاتا تو زخموں کی تاب نہ لا کر وہیں دم توڑ دیتا۔ اب بھی اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے جبکہ باقی بھی شدید زخمی تھے۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر صاف ظاہر تھا کہ حملہ آوروں نے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ لوگ چلتے ہوئے چودھری کے خاص کمرے تک پہنچے تو باہر مؤدب کھڑے ایک ملازم نے پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ چودھری پورے کروفر کے ساتھ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا جبکہ اس سے ایک قدم پیچھے چلتے منشی کو ملازم نے اشارے سے روک لیا۔ روکنے کے بعد ملازم نے اسے جو خبر دی، اسے سن کر منشی خوش ہو گیا اور جوش و خروش میں بھرا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ اس دوران چودھری نے اپنے شاہانہ تخت پر نشست جما لی تھی اور حقے کی نے منہ سے لگائے اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھا۔ حقہ پینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگرچہ بڑی پارٹیوں میں یا شہری افسران سے ملاقات کے دوران سگار اور پائپ سے بھی شغل کر لیتا تھا لیکن حقہ اسے سب سے بڑھ کر محبوب تھا۔

''ایک خوش خبری ہے چودھری صاحب!'' منشی نے اندر داخل ہوتے ہی اس سے کہا۔

''سنا ڈال، آج کل ویسے بھی اچھی خبریں کم ہی ملتی ہیں۔'' حقے کی نے منہ سے ہٹا کر چودھری نے اس سے کہا۔

''وہ سادھو پکڑا گیا ہے۔ وہ اپنی گھر والی اور دھی کے ساتھ گجرات جانے والی بس میں بیٹھا تھا کہ ہمارے بندوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے پاس سے اچھی خاصی رقم بھی ملی ہے۔ ملوم ہوا ہے کہ اس نے یہ رقم شہریار سے ڈیرے کا پتا بتانے کے لیے لی تھی پر اس کا کہنا ہے کہ وہ فرماں بردار حضور ہی کا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ شہریار کو راستے سے بھنکا کر موقع ملتے ہی جان سے مار دے لیکن اس کی کوشش ناکام ہو گئی ہور وہ سرکار کے خوف سے بھاگ نکلا۔'' ابھی جو تفصیلات دروازے پر راستہ روکنے والے ملازم نے اس کے گوش گزار کی تھیں، وہی اس نے چودھری کے سامنے دہرا دیں۔

''ہو سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو، پر ہمارے لیے اب وہ بیکار ہے۔'' ساری بات سن کر چودھری رعونت سے بولا۔

''فیر کیا حکم ہے سرکار! اس کا کام تمام کر دیا جائے؟'' منشی نے اس کا موڈ بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

''کرنا تو یہی پڑے گا پر ہم اسے آسان موت نہیں دینا چاہتے۔ اس نے ایک طرح سے ہمارے ساتھ غداری کی ہے اور غداروں کو نمونہ عبرت بنانا ضروری ہوتا ہے۔ تو ایسا کر کہ اس کی گھر والی اور دھی کو تو حویلی کے خدمت گاروں میں شامل کر دے ہور اسے وہ جو گاؤں کی پرلی طرف سوکھے کنوئیں کے ساتھ برگد کا درخت ہے، اس کے ساتھ باندھ کر ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھکوا دے۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی یاد سے ٹھنسوا دینا۔'' چودھری کے اذیت پسند اور شیطان فطرت دماغ نے سزا کا ایک نیا ڈھنگ نکال لیا۔ اس نے سادھو کو سزا دینے کے لیے جس مقام کا انتخاب کیا تھا، وہاں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بالکل نہیں تھا۔ کوئی اتفاقاً ہی ادھر جا نکلتا تو الگ بات تھی ورنہ کنوئیں کا پانی خشک ہو جانے کے بعد وہ متروک ہو گیا تھا اور برگد کا درخت آسیب زدہ مشہور تھا چنانچہ گاؤں والے کچھ خوف کے باعث اور کچھ ضرورت نہ ہونے کے سبب اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ اس پر سے جب سادھو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جاتا تو وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ وہاں یقیناً ایک اذیت ناک موت مرتا اور جانے اس کے مرنے کے کتنے عرصے بعد اس



www.digestpk.com

Asifzamil

کی لاش دریافت ہوتی۔ چودھری کے لیے یہ سب اہمیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ خود لندن کی آزاد فضاؤں کے لیے پرواز کرنے والا تھا جہاں عیش وعشرت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ مزید دولت اس کی منتظر تھی۔ وہ لندن میں رہ کر مزے لوٹ کر واپس آتا تو یہاں وڈی چودھرائن کا کانٹا بھی نکل چکا ہوتا۔ دیکھا جائے تو وہ اب بھی پورے مزے میں تھا۔ اگر ایک کشور والی پھانس سینے میں نہ گڑی ہوتی تو راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھتا۔

☆☆☆

''آپ کے لیے کسی منشا صاحب کا فون ہے سر۔''

''اوکے ملا دو۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اگلے ہی لمحے لائن ملا دی گئی۔ دوسری طرف حسبِ توقع آفتاب ہی تھا جو یقینی طور پر بہت پریشانی میں مبتلا تھا چنانچہ رسمی گفتگو کے بجائے براہِ راست بولا۔ ''مجھے آپ کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے سر۔''

''میرا موبائل نمبر نوٹ کرلو اور اس پر کال کرو۔'' اس نے آفتاب کو مزید گفتگو کا موقع دیے بغیر سنجیدگی کے ساتھ حکم دیا اور تیزی سے اپنا نمبر نوٹ کروا دیا۔ ٹیلی فون آپریٹر کے چودھری کا منحرف ہونے کا شک ہو جانے کے بعد سے وہ کوئی بھی اہم نوعیت کی گفتگو لینڈ لائن پر کرنے سے گریز کرنے لگا تھا۔ عبدالمنان نے مشورہ بھی دیا تھا کہ آپریٹر اور مشتبہ کلرک کو کہیں اور ٹرانسفر کر دیا جائے لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ موجودہ مخبران کی نظروں میں تھے اس لیے وہ ان سے آرام سے احتیاط کر سکتے تھے، بعد میں چودھری کوئی نیا مخبر بناڈالتا اور وہ نظر میں نہ آپاتا تو پریشانی میں اضافہ ہوسکتا تھا۔

''سوری سر! میں اپنا موبائل کھو بیٹھا ہوں اور آپ کا موبائل نمبر میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہا اس لیے مجبوراً مجھے دفتر کے نمبر پر کال کرنا پڑی۔'' چند لمحوں میں ہی اس کے موبائل پر آفتاب کی کال آگئی اور اس نے معذرت خواہانہ لہجہ اپنایا۔

''مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں کس سلسلے میں میرے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''یعنی آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ میری بیٹی چودھری کے قبضے۔۔۔'' آفتاب کی آواز رندھ سی گئی۔

''تمہاری بیٹی چودھری کے قبضے میں نہیں ہے۔ اسے چودھری تک پہنچنے سے پہلے ہی آزاد کروا لیا گیا تھا۔ اس وقت وہ کراچی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ میں تمہیں ایک کانٹیکٹ نمبر دے رہا ہوں۔ اس نمبر پر رابطہ کر کے تم کراچی پہنچ جاؤ۔ میرا آدمی تمہیں تمہاری بیٹی تک پہنچا دے گا۔'' اس نے آفتاب کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فوری طور پر اسے امید کے بارے میں بتا دیا۔

''تھینک یو ویری مچ سر۔ آپ کے مجھ پر پہلے بھی بہت احسان ہیں لیکن یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ میں چاہوں بھی تو کبھی نہیں اتار سکوں گا۔'' آفتاب جذباتی ہو گیا۔ بیٹی کے زندہ سلامت اور محفوظ مقام پر ہونے کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ اس نے تفصیلات جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ حقیقتاً کشور کے امید کے بارے میں سوال جواب اور خود اپنی ذاتی کیفیات کی وجہ سے وہ اس اسٹیج پر پہنچ گیا تھا کہ خود سے اپنے آپ کو چودھری کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شہریار کو اس نے اپنے اس ارادے سے باخبر کرنے اور مشورہ کرنے کے لیے ہی فون کیا تھا۔

''میں تمہیں تمہاری بہت سی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہوں آفتاب! تم چودھری جیسے شخص کے سامنے ڈٹ کر جس طرح پیر آباد میں اسکول چلا رہے تھے، اس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اگر تم اپنے مخصوص راستے سے ہٹ کر دوسری سمت میں نہ جانکلتے تو ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے معاون ثابت ہوتے۔ بہرحال، اب تم جن حالات کا شکار ہو، ان میں سے بچاؤ کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تم کچھ سالوں کے لیے ملک چھوڑ کر باہر چلے جاؤ۔ تم ایک ذہین اور مخلص آدمی ہو اور ایسا شخص جان بچا بچا کر بھاگنے کے چکر میں ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھے گا تو ضائع ہو جائے گا۔ فی الحال تم اپنے اسکول والے پروجیکٹ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہے ہو لیکن تمہارے پاس قلم کی طاقت تو ہے نا۔ یہاں سے دور کہیں سکون سے بیٹھو گے تو اپنے قلم اور دماغ کا بہتر استعمال کر سکو گے۔'' اس نے بہت سنجیدگی کے ساتھ آفتاب کو ایک مخلصانہ مشورہ دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔ مجھے اب اسی نہج پر سوچنا ہوگا۔ اگرچہ میں پڑھے لکھے افراد کے بیرونِ ملک منتقل ہونے کا شدید مخالف رہا ہوں لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ میں ملک میں رہ کر تو نہیں البتہ یہاں سے دور رہ کر کچھ نہ کچھ خدمت انجام دے سکوں گا۔ کچھ بھی نہ کرنے سے تو یہی بہتر ہوگا کہ میں کچھ تو کر سکوں۔'' آفتاب شاید خود بھی پہلے سے اسی نہج پر سوچ رہا تھا چنانچہ اس سے فوراً ہی متفق ہو گیا۔

''وش یو آل دا بیسٹ۔ جا کر اپنی بیٹی سے ملو اور پھر بیرونِ ملک منتقلی کے سلسلے میں کارروائی شروع کر دو۔ اگر



کہیں پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو بتا دینا، میں جو کر سکا ضرور کروں گا۔'' اس نے اتنا کہہ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور آفتاب سے اجازت چاہی۔ اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر عبدالمنان سے اندر آنے کا کہا۔

''یس سر!'' وہ فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

''پیر آباد چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کافی دن ہو گئے وہاں کا دورہ نہیں کیا۔ چودھری سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ ہی کر لیں گے۔ ذرا پتا تو چلے کہ حالیہ ناکامی نے اس پر کیا اثر ڈالا ہے۔''

''اوکے سر! میں مشابرم خان سے گاڑی تیار کرنے کا کہہ دیتا ہوں۔ آپ بتا دیں کہ کب تک نکلنا ہے؟'' عبدالمنان فوراً مستعد ہو گیا۔

''بس پندرہ منٹ بعد نکلتے ہیں۔'' اس نے بتایا تو عبدالمنان باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد اس نے میجر ذیشان کا نمبر ملایا۔

''کیا خبریں ہیں میجر صاحب! آپ کی طرف سے بالکل خاموشی ہے۔ ہم نے جو بندہ آپ کے حوالے کیا تھا، اس سے کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں یا نہیں؟'' سلسلہ ملنے کے بعد اس نے پہلے تو رسمی علیک سلیک کی پھر استفسار کیا۔ اس کا یہ استفسار اشیش کمار المعروف غلام محمد کے بارے میں تھا۔ اشیش مبینہ طور پر را کا ایجنٹ تھا جو مولوی کا روپ دھار کر چھوٹے گاؤں دیہاتوں کے مدرسوں میں معصوم ذہنوں کو بھٹکانے اور دین کی غلط تصویر کشی کر کے انہیں شدت پسند بنانے کے مشن پر کام کر رہا تھا۔ اس کے ایک ساتھی شاہ نواز کے بھی اللہ آباد میں اسی جرم میں ملوث ہونے کے شواہد ملے تھے۔ شاہنواز تو گرفتار ہونے سے قبل ہی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرار کے وقت اشیش بھی اسی کے ساتھ تھا لیکن وہ یہاں سے نکل کر ایک اور دیہات میں روپ بدل کر اپنے مشن پر جت گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ آفتاب اور کشور بھی پناہ کے لیے اسی دیہات تک پہنچ گئے۔ یوں اشیش کی وہاں موجودگی کا انکشاف ہوا اور شہریار نے میجر ذیشان کی مدد سے اسے گرفتار کر لیا۔ میجر ذیشان بلتستان کی پہاڑیوں میں تباہ ہونے والے شدت پسندوں کے ایک اہم ٹھکانے سے متعلق انکوائری کرنے والی انٹیلی جنس کی ٹیم میں شامل تھا۔ موساد کی خاص ایجنٹ لِنڈا نے اپنے حسن کے ہتھیار سے اسے زیر کیا اور بہت سی اہم معلومات حاصل کر کے اڑ گئی۔ میجر ذیشان یوں بھی محبِ وطن تھا۔ اس واقعے کے بعد احساسِ شرمندگی نے اسے مزید اکسایا کہ وہ دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائے چنانچہ اس نے شہریار سے تعاون قبول کر لیا۔ اس کی حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے شہریار نے اشیش کو اس کے حوالے کرنا منظور کر لیا تھا لیکن مسلسل یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ معاملہ اب کہاں تک پہنچا۔

''ہم اس سے زیادہ کارآمد معلومات حاصل کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس نے یہ اعتراف ضرور کر لیا ہے کہ شاہنواز اس کا ہی ساتھی تھا جس کا اصل نام انیل پانڈے ہے اور انیل پانڈے ہی وہ آدمی ہے جس نے اپنے ٹریڈ کیے ہوئے لڑکوں کی مدد سے نہ صرف نور پور میں خودکش دھماکا کروایا تھا بلکہ وہ اور بھی کئی مقامات پر ایسا کروا چکا ہے اور اب بھی مسلسل اس کام میں مصروف ہے۔ لیکن اس نے پانڈے کے ٹھکانے سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ وہ حقیقت میں بے خبر ہے یا کافی سخت جان ثابت ہوا ہے کہ ہم اس سے پانڈے کا پتا اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ بہرحال، جو بھی ہو آپ اطمینان رکھیں کہ ہم ان ملک دشمنوں کی گردن تک ضرور پہنچیں گے۔'' میجر ذیشان نے اسے مختصر الفاظ میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''میرے ڈرائیور کا خیال ہے کہ انٹیلی جنس والے بہت سست جا رہے ہیں۔ اگر میں پانڈے کو آپ کے بجائے اس کے حوالے کرتا تو وہ چند گھنٹوں میں ہی اس سے سب کچھ اگلوا لیتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ایک موقع پر پیش کیے جانے والے مشابرم خان کے خیالات سے آگاہ کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ واقعی ایسا ہو لیکن ہم اپنی جگہ مجبور ہیں۔ اشیش کے ملک دشمن ہونے کے باوجود ہم اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہیں کر سکتے۔ کم از کم مجھے اپنی وردی کا بہت پاس رہتا ہے اور اس وردی کو پہن کر میں کوئی بھی کام قانون یا ضابطے سے ہٹ کر کرنا مشکل سے ہی پسند کرتا ہوں۔ کبھی لگا کہ وردی میرے مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے تو پھر اسے اتار کر میدان میں اتروں گا۔'' اس کے ہلکے پھلکے جملے کا میجر ذیشان نے بھرپور سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھے آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے میجر صاحب لیکن بس سینے میں ہر دم ایک آگ سی جلتی رہتی ہے جو مجبور کرتی ہے کہ کسی ملک دشمن کو اس سرزمین پر چلنے پھرنے اور سانس لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس لیے کبھی کبھی میں خود بھی اپنے ڈرائیور ہی کی طرح جذباتی ہو جاتا ہوں۔'' اس نے فوراً ہی وضاحت دی۔



www.digestpk.com

Asifzamil

''میں سمجھتا ہوں۔ میرے اپنے جذبات بھی آپ سے مختلف نہیں ہیں لیکن فوجی تربیت اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے آپ سے کہا ہے ناکہ جس روز لگا کہ میں حدود و قیود میں رہ کر کام نہیں کرسکوں گا، اس روز خود کو زنجیروں سے آزاد کروالوں گا۔'' میجر ذیشان کا لہجہ سنجیدہ مگر نرم تھا۔

''میری خواہش ہے کہ ایسی نوبت نہ آئے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے آرمی اپنے شوق سے ہی جوائن کی ہوگی۔ اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بہر حال آپ ایک اچھے اور محب وطن آفیسر ہیں اور ہمارے اداروں کو ہر جگہ آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ پھر آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں وطنِ عزیز کا کثیر سرمایہ بھی تو خرچ ہوا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ہماری فوج آپ سے محروم ہو۔ بہر حال مجبوری اور حالات کے تحت آپ کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔'' اس نے میجر ذیشان کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر ایک آدھ مزید رسمی جملے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ عبدالمنان نے اسے گاڑی تیار ہونے کی اطلاع دے دی۔ وہ چودھری سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے خیال سے مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

اس کے اور چودھری کے درمیان جو جنگ جاری تھی، اس میں ابھی تک کسی کو واضح برتری حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کبھی چودھری اس پر ضرب لگا دیتا اور کبھی وہ اسے زک پہنچانے میں کامیاب ہوجاتا۔ ایک طرف اگر اپنی طاقت اور گھمنڈ کا بت سلامت رکھنے کے لیے ہر حربہ آزمایا جارہا تھا تو دوسری طرف وہ اس بت کو پاش پاش کردینے کی خواہش میں شدت سے کوشاں تھا۔

پہلے وہ قانونی راستے سے چودھری سے نمٹنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن جب چودھری نے اس پر کئی اوچھے وار کر ڈالے تو وہ خود بھی انگلیاں ٹیڑھی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کام میں اسے جگو کا زبردست تعاون بھی میسر آگیا تھا۔ جگو کے شدید بیمار بیٹے کی خاطر اپنا دورہ منسوخ کر کے اسے اسپتال پہنچاتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ جو کام وہ محض انسانی ہمدردی کے باعث کر رہا ہے، وہ آگے چل کر اس کے لیے کتنا سودمند ثابت ہوگا۔ اس کے اکلوتے احسان کے بدلے میں جگو اس کا ایسا گرویدہ ہوا تھا کہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ حالانکہ وہ شہر میں رہ کر جس سیاسی پارٹی کے لیے غنڈا گردی کر رہا تھا، یقیناً اس کی بھی بہت سی ذمے داریاں اس کے سر پر ہوں گی مگر شہریار کے کام کے آگے اس نے کبھی اپنی کسی مصروفیت کا عذر پیش نہیں کیا تھا اور ہر بار فوراً ہی لبیک کہتا تھا۔

دفتر سے نکل کر پیر آباد پہنچنے میں جو طویل وقت صرف ہوا، اس میں وہ عبدالمنان کے ساتھ ضلع میں جاری ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ نور پور میں کام مکمل ہوچکا تھا۔ اسکول اور اسپتال کے لیے عملے کا انتخاب بھی کیا جاچکا تھا اور امید تھی کہ چند ایک روز میں وہاں درس و تدریس اور علاج معالجہ شروع ہو جائے گا۔ اللہ آباد میں انہوں نے شاہنواز کے خالی کیے ہوئے مدرسے کی عمارت کو ہی ٹھیک کروا کر وہاں فوری طور پر دو اساتذہ کا تقرر کر دیا تھا۔ اس طرح وہاں ایک طرح سے اسکول شروع ہوگیا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے اس کا دائرہ کار بہت وسیع نہیں تھا۔ اگر وہ مضبوط خاندانی پس منظر کا مالک نہ ہوتا تو جو کچھ کر رہا تھا، وہ بھی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے کے باوجود اپنے نیچے والوں سے غافل نہیں ہو پاتے اور خواہش مند رہتے ہیں کہ بے چارگی کی زندگی گزارنے والے ان افراد کو کم از کم بنیادی انسانی حقوق تو حاصل ہو جائیں۔ اپنی اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ برسرِ پیکار تھا لیکن اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے ان پروجیکٹس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے کے علاوہ دوسرے محاذوں پر بھی لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف چودھری اور اس کے گرگے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے تو دوسری طرف را کے ایجنٹوں سے بھی وقتاً فوقتاً مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی۔

اندرونی اور بیرونی ان دشمنوں سے نمٹنے کے چکر میں وہ اپنی توجہ کسی ایک نقطے پر مرکوز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر اس کی ذاتی زندگی بھی ایک بڑے طوفان سے گزری تھی۔ اس کے دل نے جسے چاہا تھا، وہ اس پر اپنی چاہت کے اظہار کا ابھی فیصلہ بھی نہیں کرسکا تھا کہ بالکل حادثاتی طور پر ماریا اس کی زندگی میں آگئی۔ ماریا پڑھی لکھی باشعور عورت تھی جسے ناپسند کرنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا کہ وہ ایک کم عمر، نازک سی، قدرے کم تعلیم یافتہ دوشیزہ پر مرمٹا تھا اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ وہ راحتِ دل خود نہ جانے کن مصائب میں پھنسی ادھر سے ادھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اگر ماہ بانو کی زندگی میں ہی کچھ ٹھہراؤ اور سکون آجاتا تو اس کے دل کو چین آجاتا اور وہ یہ سوچ کر کہ بے شک میں اسے اپنا نہیں سکا لیکن وہ جہاں ہے خوش ہے، صبر کرلیتا۔ اب تو یہ صورتِ حال تھی کہ اس نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے بہانے ماہ بانو کی تلاش میں اتنا بڑا



آپریشن کروا ڈالا تھا لیکن ماہ بانو ہی غائب تھی۔ اس کے ساتھ ہی جمرو اور اسلم نامی ڈاکو کے علاوہ ایک اور قیدی عورت للی بھی غائب تھی۔ وہ چاروں جانے کہاں اور کس سمت میں نکل گئے تھے کہ جنگل میں سرچ آپریشن کرنے والی پولیس پارٹی بھی ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

اپنی سوچوں میں غلطاں پیر آباد تک کا سفر کیسے طے ہوا، معلوم ہی نہیں ہوسکا۔ وہ اس وقت چونکا جب مرکزِ صحت کے باہر لگی لوگوں کی بھیڑ پر نظر پڑی۔ بھیڑ میں شامل لوگوں کے چہروں پر دور سے ہی غصے کی جھلک نظر آرہی تھی اور وہ زور زور سے بول رہے تھے۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' وہ مضطرب ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ماریا وہاں آئی ہوئی ہے اور اس کی موجودگی میں مرکزِ صحت کے باہر نظر آنے والے اس ناخوش گوار منظر نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید کسی مریض کی موت واقع ہوگئی ہے اور مریض کے لواحقین اس کے مرنے کا الزام ماریا یا دوسرے ڈاکٹر کے سر دھر کر ان کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

مشابرم خان نے اس کے حکم پر گاڑی اسی مقام پر روک لی اور وہ گاڑی سے اتر کر ہجوم کی طرف بڑھا۔ مشابرم خان بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے ساتھ ہی چپک گیا۔ اس نے اپنی اسٹین گن بھی گاڑی کی سیٹ کے نیچے سے نکال کر ساتھ ہی لے لی تھی تاکہ اگر کوئی شہریار کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو ڈر کر دبک جائے۔ عبدالمنان اگرچہ غیر مسلح تھا پھر بھی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے بائیں جانب چوکنا ہو کر چل پڑا۔

''لو وڈے صاحب آگئے۔ اب ان کے سامنے معاملہ رکھو۔'' ہجوم میں سے کسی نے شہریار کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

''یہ تو وڈی چنگی گل ہے۔ اب یہ آپ ہی اپنی گھر والی سے نمٹ لیں گے۔'' زہر خند لہجے میں یہ جملہ نہ جانے کس نے ادا کیا تھا لیکن شہریار کو اپنے ذہن میں کلبلاتے ہوئے خدشات کی تصدیق ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کا رخ اگرچہ مرکزِ صحت کے دروازے کی طرف تھا لیکن دو بزرگ صورت دیہاتیوں کے سامنے آجانے پر قدم روکنے پڑے۔

''سلام صاحب۔'' ان دونوں نے اس سے باقاعدہ کلام کا آغاز کرنے سے پہلے سلامتی بھیجی جس کا اس نے بہ آوازِ بلند جواب دیا اور پھر خود ہی پوچھ لیا۔

''کیا مسئلہ ہے بزرگو! آپ لوگ اس طرح یہاں کیوں جمع ہیں؟''

بذریعہ ڈاک
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے
ہنر سیکھیے روزگار لیجیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
اگر آپ مندرجہ ذیل کورسز کے علاوہ کسی بھی فیلڈ میں تجربہ رکھتے ہوں اور اس کا سرٹیفکیٹ آپ کے پاس موجود نہیں ہے سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی ترقی کی راہ میں یا ملازمت میں رکاوٹ ہو رہی ہے ہم آپکا ٹیسٹ لے کر سرٹیفکیٹ جاری کردیں گے نیچے دیے ہوئے ایڈریس پر خط لکھ کر تفصیلات منگوائیں
ڈیزل مکینک | لیبارٹری ٹیکنیشن | کشیدہ کاری | لیڈیز ٹیلرنگ | حکمت | ڈسپنسر | ایکوپنکچر | نرسنگ / مڈوائفری | جینٹس ٹیلرنگ | میڈیکل اسسٹنٹ | اے سی فریج مکینک | U.P.S ٹیکنیشن
علاج نبوی | ڈریس ڈیزائنر | میک اپ | مڈوائفری | معالج حیوانات | بیوٹی سلمنگ | نیلی پلاننگ | کیمیکل | عینک سازی | شمسی توانائی | برتن سازی
یوگا | انٹیریئر ڈیکوریشن | لیڈیز ہیئر میک اپ | ایرعیک | بیوٹی پارلر | ایئر ٹکٹنگ | مہر سازی | کوکنگ | سروئیر | کمپیوٹر | کمپیوٹر ہارڈ ویئر
میٹل ورکر | ابتدائی طبی امداد | ہوٹل مینجمنٹ | امپورٹ ایکسپورٹ | آٹو الیکٹریشن | شارٹ ہینڈ | الیکٹریشن | اردو عربی خطاطی
فارمیسی | ہومیو پیتھک کورس | آکو پریشر | الیکٹریکل وائرنگ | فلاور میکنگ | ویلڈنگ | الٹرا ساؤنڈ | فن مصوری | میجک
فزیوتھراپی | آٹو سروسنگ | جیولری میکنگ | بلڈنگ سپروائزر | فش فارمنگ | کورین لینگویج | موبائل فون ریپئرنگ | فائر فائٹنگ
باڈی بلڈنگ | خراد کا ہنر | اسٹیل فکسنگ | جدید مرغبانی | باغبانی | سیٹ ڈیزائنر | نیٹ ورکنگ | مونٹیسوری ٹیچنگ | چائلڈ کیئر کورس | ٹیلی کام ٹیکنیشن
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080



www.digestpk.com

Asifzamil

"یہاں ہم اس بدمعاش زنانی کے لیے کھڑے ہیں جسے اسپتال والوں نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس عورت نے بہت وڈا جرم کیا ہے ہور ہم چاہتے ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہم گناہ گارن کو آپ سزا دے لیں گے۔ باقی ہمارا اسپتال والوں سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" دونوں میں سے ایک نے کسی حد تک معاملے کی وضاحت کی۔ شہریار کے سامنے ادب کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کے لہجے سے طیش جھلک رہا تھا۔

"کون ہے وہ عورت اور اس نے کیا جرم کیا ہے؟" اس نے ہموار لہجے میں سوال کیا۔ خود سے ہم کلام ہونے والے کے الفاظ نے اسے کسی حد تک یہ اطمینان تو دلا دیا تھا کہ درپیش مسئلے کا براہِ راست ماریا سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک کھٹک سی تو تھی کیونکہ ہجوم میں سے کسی نے واضح طور پر اس کی گھر والی یعنی ماریا سے اس کے نمٹنے کا ذکر کیا تھا۔

"شہزادی نام ہے جی اس عورت کا ہور اس کا جرم اتنا وڈا ہے کہ آپ بھی سن کر کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ ساری حیاتی گزر گئی پر پہلے کبھی ایسی گھناؤنی حرکت کرنے والی عورت سے سامنا نہیں ہوا۔ وہ۔۔۔ تو عورت کے نام پر دھبا ہے دھبا۔" عمر رسیدہ شخص اپنی کان کی لو کو ہاتھ لگا کر بولا اور ساتھ ہی عورت کو ایک موٹی سی گالی بھی دے ڈالی۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی بزرگوار اگر آپ مجھے اس عورت کا جرم بھی بتا دیں۔" ابھی تک اصل معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور وہ دونوں سسپنس ہی پھیلانے میں لگے ہوئے تھے اس لیے اس پر جھنجلاہٹ سی طاری ہونے لگی پھر بھی اس نے اپنے لہجے کو قابو میں رکھ کر رسان سے سوال کیا۔

"وڈا گھناؤنا کام کیا ہے جی اس نے۔ اس سے پہلے یہ تو فیر بھی سننے میں آیا تھا کہ لوگ مردوں کا کفن چرا لیتے ہیں لیکن وہ ڈائن تو کفن چوروں سے بھی بڑھ کر نکلی۔ اس بلا نے تو مردے ہی چرانے کی کوشش شروع کر دی۔" بزرگ کا وہ انکشاف یقیناً بہت ہولناک تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس جرم میں ایک عورت ملوث پائی گئی تھی۔

"یہ کب کا واقعہ ہے؟ اس عورت کو آپ لوگوں نے کب پکڑا؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح کے جرائم تو عام طور پر رات کی تاریکی میں انجام دیے جاتے ہیں لیکن یہاں آثار بتا رہے تھے کہ عورت دن کی روشنی میں یہ کام کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔ اگر وہ رات میں پکڑی گئی ہوتی تو یہاں مرکزِ صحت میں اسے پناہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ جس طرح مشتعل نظر آ رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ رات میں گرفتار ہوئی ہوتی تو اب تک اس کا بھرکس نکالا جا چکا ہوتا۔

"زیادہ دیر نہیں گزری جی، بس یہی کوئی گھنٹا بھر ہوا ہوگا۔ گل یہ ہے کہ دو دن پہلے مختار موچی کا نو دس سال کا پتر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ چھوٹا بچہ تھا اس لیے کوئی قل وغیرہ کروانے کی لوڑ ہی نہیں تھی کہ کوئی فاتحہ وغیرہ پڑھنے بچے کی قبر پر جاتا پر کاکے کی ماں اچانک ہی مچل گئی کہ مجھے اپنے کاکے کی قبر پر جانا ہے۔ اس کی ضد دیکھ کر مختار اسے قبرستان لے گیا۔ دوپہر کے وقت ادھر کوئی مشکل سے ہی جاتا ہے۔ کسی کو اپنے مردے کے لیے فاتحہ پڑھنی بھی ہو تو وہ عصر مغرب کے درمیان ادھر کا رخ کرتا ہے شاید اسی وجہ سے شہزادی نے اپنے گندے کام کے لیے وہ وقت چنا تھا۔ مختار ہور اس کی گھر والی قبرستان پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں کہ ان کے کاکے کی قبر پاٹنتی سے کھلی ہوئی ہے ہور شہزادی ایک تیز چھرے سے اس کی ٹانگ کاٹ رہی ہے۔ ان لوگوں کی چیخ پکار سن کر وہ قبرستان سے بھاگ نکلی۔ شاید اس کا ارادہ گاؤں سے باہر نکلنے کا تھا لیکن مختار بھی شور مچاتا ہوا اس کے پیچھے ہی دوڑ پڑا۔ مختار کی ٹانگ میں ہلکا سا لنگ ہے اس لیے وہ بہت تیز نہیں بھاگ سکتا، پر اس کے شور مچانے پر ادھر ادھر کام کرتے لوگ چوکنے ہو گئے ہور شہزادی کو جا لیا۔ مختار نے پکڑنے والوں کو سارا قصہ سنایا تو انہوں نے غصے میں آ کر شہزادی کی ٹھکائی شروع کر دی۔ ہو سکتا تھا وہ موقع پر ہی جان سے ماری جاتی لیکن اسی وقت آپ کی بیگم صاحبہ کی گڈی ادھر پہنچ گئی۔ انہوں نے کسی کی کچھ بھی سنے بغیر زبردستی شہزادی کو اپنی گڈی میں بٹھایا ہور ادھر لے آئیں۔ مارنے والے آپ کی بیگم سے تو جھگڑا نہیں کر سکتے تھے نا اس لیے شہزادی کو ان کے حوالے کر دیا تھا، پر اب سارے گاؤں کا یہی کہنا ہے کہ شہزادی کا جرم بہت گھناؤنا ہے ہور اسے ایسے ہی مافی نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر صاحبہ کو اسے ہمارے حوالے کرنا ہوگا فیر ہم خود اسے دیکھ لیں گے۔" اس شخص نے سارا قصہ مع اپنے مطالبے کے اس کے سامنے بیان کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ لوگوں کے جذبات اور ماریا کی دخل اندازی دونوں کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ لوگوں کے نزدیک شہزادی نامی عورت کا جرم انسانیت سوز اور ناقابلِ معافی تھا جبکہ ماریا جیسی پڑھی لکھی عورت کسی بھی انسان کو ماورائے عدالت سزا دینے کی قائل نہیں ہو سکتی تھی۔

"اگر آپ لوگ تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو آپ کی



بڑی مہربانی ہوگی۔ میں اندر جا کر صورتِ حال معلوم کرتا ہوں پھر آپ لوگوں سے مزید بات کروں گا۔" اس نے نہایت خلیقانہ انداز میں ان لوگوں سے کہا۔ بظاہر اس کے مخاطب وہ دونوں بزرگ ہی تھے لیکن اس نے آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ ہجوم میں شامل دوسرے افراد بھی سن سکیں۔

"اندر جا کر یہ خود بھی اپنی گھر والی سے مل جائے گا۔ افسوس کہ چودھری صاحب پنڈ میں نہیں ہیں ورنہ وہ آپ ہی یہ ماملہ نبیڑ لیتے۔" اس بار یوں کھلے عام اپنے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والا اس کی نظر میں آ گیا۔ وہ یقیناً چودھری کا کوئی پٹھو تھا جو اپنے آقا کا نمک حلال کرنے کے لیے مسلسل زہر اگل رہا تھا جس کا مجمع پر کوئی خاص اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے لیے شہریار محض مستقبل کے سہانے سپنے دکھانے والا کوئی سیاست داں نہیں تھا بلکہ ایک ایسا مخلص اور ایمان دار افسر تھا جس نے ہر موقع پر ان کی عملی مدد کی تھی۔ ایسے شخص کے خلاف بھڑکنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا چنانچہ ہجوم میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی البتہ اس شخص کی زہر افشانی کے نتیجے میں اسے اتنا علم ضرور ہو گیا کہ چودھری پنڈ سے باہر ہے۔

"پھر مجھے اجازت ہے؟" اس نے چودھری کے پٹھو کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے دونوں عمر رسیدہ افراد سے کہا۔

"آہو جی، بالکل۔۔۔ جیسی تہاڈی مرضی ہے۔" ایک بااختیار افسر کا اپنے ساتھ عاجزانہ رویہ انہیں بے حد متاثر کر گیا اور انہوں نے بیک وقت اسے خوشی سے اجازت دے ڈالی۔ اس نے آگے بڑھ کر مرکزِ صحت کے دروازے پر دستک دی۔ مشابرم خان اور عبدالمنان اس کی پشت پر اس طرح آ کھڑے ہوئے کہ ہجوم اور اس کے مابین فاصلہ قائم ہو گیا۔ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ کھلتا تو ہجوم میں سے کوئی فرد ان دونوں کو ہٹائے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ان دونوں کی اصل طاقت مشابرم خان کے ہاتھ میں موجود اسٹین گن تھی جسے اس نے خاص طور پر نمایاں کر رکھا تھا۔

اس کی دستک کے جواب میں اندر سے بہت احتیاط کے ساتھ ذرا سا دروازہ کھولا گیا اور ایک مردانہ سرگوشی سنائی دی۔ یہ ڈاکٹر داور تھا جو اسے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ شہریار دروازے میں بننے والے مختصر خلا سے جیسے ہی اندر داخل ہوا، اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

"تھینکس گاڈ کہ آپ یہاں آ گئے ورنہ صورتِ حال بہت خراب ہو سکتی تھی۔" ڈاکٹر داور کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اندر کسی درز سے باہر کا منظر دیکھتا رہا تھا جب ہی اس کی پہلی دستک کے ہی جواب میں فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

"آپ کو مجھے فون کر کے انفارم کر دینا چاہیے تھا۔" اس نے قدرے سرد لہجے میں ڈاکٹر داور کو باور کروایا۔

"ڈاکٹر ماریا نے کئی بار ٹرائی کیا لیکن نہ جانے کیوں آپ کا نمبر مل ہی نہیں رہا تھا۔" اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ اس اثنا میں وہ داور کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچ چکا تھا جہاں ماریا بستر پر دراز ایک نحیف سی عورت کی نبض دیکھ رہی تھی۔ عورت کے جسم کے مختلف حصوں پر بندھی پٹیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ اچھی خاصی زخمی ہے۔ تاہم وہ ہوش میں تھی اور آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔

"کچھ معلوم ہوا اس عورت سے کہ یہ کون ہے اور ایسی حرکت کرتے ہوئے کیوں پائی گئی؟" اس نے خود کو مطلع نہ کیے جانے پر ماریا سے الجھے بغیر مطلب کا سوال کیا۔

"ابھی صرف اس کا اور اس کے خاوند کا نام معلوم کیا ہے۔ لوگوں کی مار پیٹ کے نتیجے میں یہ اچھی خاصی زخمی ہو گئی تھی اس لیے میں نے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ سے پہلے اس کی ڈریسنگ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اب آپ آ گئے ہیں تو اس کیس کو خود ہینڈل کریں۔ میں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے۔" اس نے شہریار کو اپنی چھوڑی ہوئی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں بی بی! کون ہو تم اور ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی تم نے؟" اس نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ جواب میں وہ اسے محض اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ ان آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف، بے بسی اور مظلومیت تھی۔ آنکھوں کے ان تاثرات کو دیکھ کر اسے خود اپنے اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ وہ کوئی سفلی علم یا جادو ٹونا کرنے والی عورت ہے۔ مردوں اور قبرستان سے اس قسم کے کالے علم کرنے والوں کا خصوصی تعلق ہوتا ہے اس لیے اسے یہ قصہ سن کر سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا کہ پکڑی جانے والی عورت اسی کیٹیگری سے تعلق رکھتی ہوگی لیکن وہ تو کوئی بہت ہی مظلوم عورت معلوم ہوتی تھی جو اس کے سوال کے جواب میں محض اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"اس کا نام شہزادی ہے۔ اس کا شوہر اقبال عرف بالا چودھری کی ملازمت کرتا تھا۔ لیکن پھر کسی جھگڑے وغیرہ میں زخمی ہو کر معذور ہو گیا اور اب مستقل بستر پر زندگی گزار رہا ہے۔"



www.digestpk.com

Asifzamil

عورت کے بجائے ماریا کی طرف سے جواب موصول ہوا جسے سن کر وہ چونک گیا۔ گھنائی ہوئی خوب صورتی والی وہ کمزور سی عورت بالے کی بیوی ہوگی، اسے ذرا بھی گمان نہیں گزرا تھا۔ عورت کا نہ صرف لباس بہت معمولی تھا بلکہ چہرے سے بھی غربت برس رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چودھری کے ایک ایسے جاں نثار کی بیوی تھی جو اپنی صحت مندی کے دور میں چودھری کا بڑا سر چڑھا تھا۔ یقیناً اس جاں نثاری کی اسے چودھری سے ٹھیک ٹھاک قیمت بھی ملتی ہوگی پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ جگو کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے معذور ہوجانے والے بالے کی بیوی مختصر مدت میں ہی برسوں کی فاقہ زدہ نظر آنے لگی تھی۔

''بالا کہاں ہے؟'' لمحہ بھر عورت کی حالت کے بارے میں سوچنے کے بعد اس نے ایک بار پھر براہِ راست اس سے سوال کیا۔ بے شک بالا معذور تھا لیکن اس کی بیوی جس مذموم حرکت میں ملوث پائی گئی تھی، اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ گاؤں والوں نے اسے یکسر نظر انداز کر ڈالا ہو اور گھر سے یہاں تک اٹھا کر نہ لائے ہوں لیکن ہجوم میں اسے بالے کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔

''وہ اور میری ساس بچوں کو لے کر دو دن سے کسی رشتے دار کے گھر گئے ہوئے ہیں۔'' شہزادی نامی اس عورت نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہائے میرا کاکا، ملوم نہیں میرا دودھ پیتا بچہ کس حال میں ہوگا۔ اس کی ظالم دادی تو کاکے کا رونا برداشت نہیں کرتی، اس کی بھوک پیاس کا کیسے خیال رکھے گی۔'' شہزادی کی چپ ٹوٹی تو وہ مسلسل دہائیاں دیتے ہوئے رونے لگی۔ اس سے باز پرس کرنے کا ارادہ رکھنے والے شہریار کو اندازہ ہوا کہ عورت خود کسی بڑی ٹریجڈی کا شکار ہے۔ اس نے ماریا کو اشارہ کیا کہ اسے دلاسا دے کر پانی وغیرہ پلائے تاکہ وہ مزید بات چیت کرنے کے قابل ہوسکے۔ اس کے اشارے پر ماریا حرکت میں آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے عورت کو اس حد تک سنبھال لیا کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دے سکے۔

''دیکھو بی بی، تمہارے اوپر ایک سنگین الزام ہے۔ لوگوں کا بس نہیں چل رہا کہ تمہارے چیتھڑے اڑا کر رکھ دیں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے تفصیل سے ساری کہانی سنا دو پھر میں دیکھوں گا کہ تمہارے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے سنجیدہ لیکن نرم لہجے میں عورت سے دریافت کیا تو اس کا بین کرنا بند ہوگیا اور وہ دھیمی دھیمی سسکیوں کے درمیان بتانے لگی۔

''بالے نے میرے ساتھ اپنی طاقت کے زور پر زبردستی بیاہ کیا تھا۔ بیاہ کے بعد وہ اور اس کی ماں دونوں میرے لیے بڑے ظالم ثابت ہوئے۔ دونوں میں سے جس کا جب دل چاہتا، مجھے بری طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ بالا معذور ہو کر بستر سے لگا تو مجھے سکون ملا کہ چلو ظالموں میں سے ایک تو کم ہوا لیکن وہ وڈا ظالم آدمی ہے۔ اب بھی جب من کرتا ہے، لیٹے لیٹے بھی کوئی چیز پھینک کر مجھ پر دے مارتا ہے۔ میری ساس بھی بڑی چلتی پرزہ عورت ہے۔ جب سے بالا معذور ہوا تھا، ہور چودھری نے اس پر سے ہاتھ اٹھایا تھا وہ کوششوں میں لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اس کا علاج ہوسکے۔ ڈاکٹروں نے تو خیر جواب دے دیا تھا اس لیے وہ پیروں فقیروں کے چکر کاٹ رہی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے وہ جانے کس پیر کے پاس گئی تھی کہ واپسی میں خوشی خوشی آئی ہور اس کے آنے کے بعد دونوں ماں بیٹے چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ مجھے دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی نہ پوچھا کہ مجھے ملوم تھا میرے پوچھنے پر دونوں کچھ بتانے والے نہیں ہیں۔ پر جب دو دن پہلے مختار موچی کا منڈا مرا تو بالے نے مجھے وڈے پیار سے اپنے پاس بلایا ہور بولا کہ شہزادی اگر تو مدد کرے تو میرا اعلاج ہوسکتا ہے ہور میں ایک واری فیر اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کما سکتا ہوں۔ مجھے بالے کے علاج سے تو کوئی مطلب نہیں تھا، پر اس کی صحت کے ساتھ میرے بچوں کی روٹی جڑی ہوئی تھی اس لیے میں فوراً مدد کرنے کو تیار ہو گئی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ اماں ایک بہت پہنچے ہوئے پیر کے پاس گئی تھی جس نے امید دلائی ہے کہ میرا اعلاج ہوسکتا ہے لیکن علاج کے لیے کسی ایسے مردے کی ہڈیوں کا انتظام کرنا ہوگا جو ہفتہ دس دن کے اندر مرا ہو۔ پیر صاحب ان ہڈیوں کا سفوف بنا کر اس پر خاص دم کرنے کے بعد دوا تیار کریں گے جس کو کھا کر میں صحیح ہوجاؤں گا۔ ساری گل سن کر مجھے وڈی گھن آئی جی ہور میں نے یہ کہہ کر بالے کو ٹالنے کی کوشش کی کہ بھلا ایسی ہڈیاں ہمیں کہاں سے ملیں گی۔ اس پر بالے نے مجھے مختار موچی کے پتر کی یاد دلائی۔ میں نے صاف منع کر دیا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتی۔ مجھے تو پہلے ہی اس کاکے کے مرنے کا وڈا افسوس تھا، اس کی قبر کھود کر ہڈیاں نکالنے کے لیے کیسے راضی ہوتی؟ میرے انکار پر میری ساس اور بالے نے مجھے وڈا مارا، پر میں نے ہاں نہیں کی۔ مجھے ضد پر اڑا دیکھ کر دونوں ماں بیٹے نے دوجی چال چلی۔ وہ دونوں بچوں کو لے کر گھر سے چلے گئے اور جاتے جاتے



بول گئے کہ اب بچوں کی شکل تب ہی دیکھنے کو ملے گی جب میں ان کا کام کر دوں گی۔ دو دن ہو گئے جی انہیں گئے ہوئے۔ میرا چھوٹا کاکا تو ابھی کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں۔ ملوم نہیں ننھی جان ماں کے دودھ کے بغیر کیسے جی رہا ہوگا؟'' اس نے ایک بار پھر آنسوؤں سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی داستان واقعی بڑی دردناک تھی جسے سن کر وہ اپنے دل میں افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''تمہاری ساس اور شوہر کہاں گئے ہیں؟'' اس نے شہزادی سے دریافت کیا۔

''یہ انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔''

''تو پھر تم انہیں کام ہو جانے کی اطلاع کیسے دیتیں؟''

''میری ساس نے کہا تھا کہ تین دن بعد ایک آدمی آکر ملوم کرے گا۔ تو ہڈیاں نکال لے تو اس پر سے گوشت وغیرہ صاف کر کے گھر کے صحن میں دفنا دینا۔ وہ بندہ تجھ سے ہڈیاں لے جائے گا ہور ہم لوگ بچوں کو لے کر واپس آجائیں گے۔ میں ایسا گندہ کام کبھی نہیں کرتی لیکن ماں ہوں نا، بچوں کی محبت میں مجبور ہوگئی۔'' وہ عورت واقعی مظلوم تھی لیکن باہر موجود ہجوم اس کی مظلومیت سے واقف نہیں تھا اور اسے ظالم اور مجرم سمجھ کر چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ شہریار نے بہت افسوس سے بستر پر دراز اس آنسو بہاتی عورت کو دیکھا۔ وہ عورت جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والے ظلم کا شکار ہوئی تھی اور ایک ایسے گھناؤنے جرم میں مبتلا ہوگئی تھی جس کے لیے شاید قانون کی کتابوں میں تو کوئی بہت سخت سزا مقرر نہیں تھی لیکن معاشرہ جسے ہرگز بھی معاف نہیں کرسکتا تھا۔ اگر شہزادی اور اس کے سسرال والے بے شک پڑھنا لکھنا نہیں جانتے لیکن دین کی سمجھ بوجھ اور خوفِ خدا رکھتے تو ہرگز اس حرکت کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اب بالے کے معاملے کو ہی دیکھا جاتا تو اس کی معذوری سراسر ایک طبی مسئلہ تھا۔ اس کے اہلِ خانہ کو اگر اس کے لیے کچھ کرنا ہی تھا تو طبی ماہرین سے رائے لیتے اور ان کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتے۔ اگر وہ ان کی طرف سے مایوس ہوگئے تھے اور دوا کے بعد دعا کا ہی آسرا رہ گیا تھا تو براہِ راست اللہ سے مانگنے میں کیا حرج تھا۔ وہ جو شہ رگ سے بھی قریب ہے، کیا ان کی پکار نہیں سنتا۔ بہرحال یہ بڑا پیچیدہ معاشرتی اور مذہبی مسئلہ تھا جس کے بارے میں فی الحال شہریار لب کشائی نہیں کرسکتا تھا۔ ابھی تو اسے باہر موجود مشتعل ہجوم کو سنبھالنے کا مسئلہ درپیش تھا ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ لوگ زیادہ دیر گزر جانے کی صورت میں اس کی وہاں موجودگی کا بھی خیال نہیں کرتے اور مرکزِ صحت کی در و دیوار پر ہلا بول دیتے۔ دروازے پر کھڑا مسلح مشاہرم خان انہیں کہاں تک قابو میں رکھ سکتا تھا۔ اگر ہجوم پیش رفت پر اتر آتا تو مشاہرم خان کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں پر گولیوں کی برسات کر دیتا۔ وہ سارے بے گناہ لوگ تھے جو ایک نہایت افسوس ناک واقعے پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرنے وہاں جمع ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی گولی کا نشانہ بنانا سراسر ظلم ہوتا اور وہ یہ جانتا تھا کہ اشیش کمار اور پانڈے جیسے ملک دشمنوں کے لیے دل میں سخت نفرت رکھنے والا مشاہرم خان باہر موجود لوگوں میں سے کسی کے ساتھ بھی سخت برتاؤ نہیں کرسکتا۔ آخرکار بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا اور قریب ہی کھڑے ڈاکٹر داور کو مخاطب کر کے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''آپ دروازے کے پاس جا کر میرے پی اے کو ہدایت دیں کہ وہ ان دونوں افراد کو اندر بھجوا دے جن سے تھوڑی دیر پہلے میں بات چیت کر رہا تھا۔'' ڈاکٹر داور اس سے ہدایت ملتے ہی تیزی سے حرکت میں آگیا۔

''بہتر ہے کہ تم ان خاتون کو کوئی سکون آور دوا دے دو۔ میں اسے ان لوگوں سے بچا کر لے بھی جاؤں گا تو اس کا ٹھکانا لاک اپ میں ہی ہوگا۔ مجبوری کے تحت ہی سہی اس سے ایک بڑا اخلاقی جرم تو ہوا ہے جس کے لیے اسے قانون کا سامنا کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر داور کے باہر جانے کے بعد اس نے ماریا سے انگریزی میں کہا تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے انجکشن تیار کرنے لگی۔ اسے اس کام میں مصروف چھوڑ کر وہ خود بھی باہر نکل گیا۔ دونوں بزرگان سے اس کمرے سے ہٹ کر بات چیت کرنا ہی مناسب رہتا۔ وہ انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہونے والے بیرونی کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ڈاکٹر داور کے پیچھے ان دونوں کی شکلیں نظر آئیں۔ شاید وہ دونوں اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازے کے بالکل قریب ہی کھڑے رہے تھے اس لیے پیغام ملتے ہی فوراً اندر چلے آئے۔

''بات یہ ہے بزرگو!'' انہیں سامنے بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''فی الحال ملزمہ بے ہوش ہے۔ گاؤں والوں کے اسے زدوکوب کرنے کے نتیجے میں وہ خاصی زخمی ہوئی ہے اور اگر اسے کچھ ہوگیا تو اس مار پیٹ میں ملوث لوگوں کو بھی قانون کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ عورت چاہے جتنی بھی بڑی مجرم تھی، کسی عام آدمی کو اس پر ہاتھ اٹھانے اور تشدد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔



www.digestpk.com

Asifzamil

موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے کہ میں اسے یہاں سے لے جاؤں پھر اس کے ہوش میں آنے کے بعد قانون کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔'' نہایت ہموار لہجے اور دھیمی آواز میں ادا کیے ان جملوں میں ایک دھمکی بھی پوشیدہ تھی جسے ان دونوں بزرگ صورت افراد نے فوراً ہی محسوس بھی کرلیا چنانچہ جب ان میں سے ایک نے گفتگو کا آغاز کیا تو اس کا لہجہ بڑا مصالحانہ تھا۔ آخرکار ان کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ شہزادی کو شہریار اپنے ساتھ لے جائے گا اور وہ دونوں گاؤں والوں کو سمجھانے بجھانے کے ساتھ اس بات کا یقین دلائیں گے کہ شہزادی کو اس کے جرم کی قرار واقعی سزا ملے گی۔ ان دونوں سے اس نے جان بوجھ کر اصل قصے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ذکر کرتا تو یقیناً شہزادی کے لیے آسانی پیدا ہو جاتی لیکن اس کے اپنے ذہن میں جو منصوبہ پل رہا تھا، اس پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کے باہر روانہ ہونے کے بعد وہ واپس پلٹ کر شہزادی والے کمرے میں آیا۔ اس دوران وہ خواب آور انجکشن کی ڈوز ملنے کے نتیجے میں سو چکی تھی۔ اسے اپنی نگرانی میں ایمبولینس میں روانہ کرنے کے بعد وہ خود بھی روانگی کے لیے پر تول رہا تھا کہ یکدم ہی ایک نیا ہنگامہ شروع ہو گیا اور منتشر ہو کر ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹ جانے والے لوگ دیوانہ وار ایک سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

''کیا ہوا؟ کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے باہر موجود عبدالمنان سے پوچھا تو اس نے ایک مدقوق سے نوجوان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نوجوان کو مشابرم خان نے گدی سے پکڑا ہوا تھا اور گھسیٹ کر اسی طرف لا رہا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' اس نے سخت لہجے میں مشابرم خان سے سوال کرتے ہوئے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ گاؤں کے مردوں کے عمومی لباس سے ہٹ کر جینز کی کسی ہوئی پینٹ اور چیک دار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص اس کے دبلے پتلے جسم پر بہت زیادہ ڈھیلی ہونے کے علاوہ سائز میں اتنی بڑی تھی کہ آستین کے کف موڑ لینے کے باوجود اس کی کلائیاں چھپ گئی تھیں۔ شاید اس نوجوان نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے دیگر خصوصیات کو نظر انداز کر کے محض پسند کی بنیاد پر کسی لنڈا بازار سے یہ قمیص خرید لی تھی اور اچھا خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کو یہ عجیب و غریب تاثر دینے میں اس کے لباس کے علاوہ بھی دیگر عوامل کارفرما تھے۔ لڑکے کے گال بالکل بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی بڑی آنکھیں باہر کی طرف ابلی اس کے زرد چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ سر کے لمبے اور الجھے ہوئے بالوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ حلیے سے کوئی آوارہ گرد لگنے کے باوجود لڑکے کے چہرے پر ایسی مسکینیت تھی کہ اس پر کسی مجرم کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟'' مشابرم خان کی طرف سے جواب وصول ہونے سے قبل ہی وہ لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے صاحب! میں بے قصور ہوں۔'' کپکپاتا ہوا لڑکا اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''یہ دور سے بھاگتا ہوا ادھر آیا تھا اور جانے کیا بولا تھا کہ لوگ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ دور ہونے کی وجہ سے اس کی بات صحیح سے سن نہیں سکے لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا اس لیے دوڑ کر پکڑ لایا۔'' اس بار مشابرم خان نے لب کشائی کی اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ایک سمت میں اشارہ کیا۔

''ہاں بھئی، کیا بات تھی جسے سن کر لوگ یوں بھاگ کھڑے ہوئے؟'' اس نے نرم گرم سے لہجے میں لڑکے سے دریافت کیا۔

''ادھر پرانے کنوئیں کے پاس برگد کے درخت سے کسی نے سائیں بابا کو میخیں گاڑ کر رسی سے باندھا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔'' لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے جو انکشاف کیا، اسے سن کر اس کے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سائیں بابا کا تخاطب جانے کس شخص کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پولیس کی اور پھر بعد میں خود اس کی راہنمائی کرنے والا سادھو بھی سائیں بابا کہلاتا تھا۔ وہ سادھو چودھری کا گماشتہ تھا جو جنگل میں اس پر قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد موقع ملنے پر فرار ہو گیا تھا اور پھر کہیں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔ اب اگر یہ سائیں بابا وہی سادھو تھا تو اس کا واضح مطلب تھا کہ اسے اس انجام تک چودھری نے ہی پہنچایا ہوگا۔ شہریار نے بے شک اس سادھو کو غیر متعلقہ اور کم اہم جان کر نظر انداز کر دیا تھا لیکن چودھری نے تو اسے ناکام اور مفرور مجرم ہی جانا ہوگا جس کے سینے میں اس کے کئی اہم راز پوشیدہ تھے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری کو اس رقم کی بھنک مل گئی ہو جو سادھو نے ڈیرے تک کا راستہ دکھانے کے لیے شہریار سے وصول کی تھی۔ اپنے اس باغی اور مفرور مجرم کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے عملی سولی چڑھا دینا چودھری جیسے بندے کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ چند لمحوں میں ہی یہ سب کچھ سوچ لینے کے بعد شہریار نے خود اس مصلوب کو دیکھنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کی



طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

مشابرم خان اور عبدالمنان پیروی کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔

مشابرم خان نے لڑکے کی گردن چھوڑ دی تھی لیکن اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا کیونکہ وہ لڑکا جائے وقوعہ تک ان کی راہنمائی کر سکتا تھا۔ گاڑی میں اسے مشابرم خان کے ساتھ آگے والی سیٹ پر بٹھایا گیا جبکہ عبدالمنان کو شہریار کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ وہ لوگ منٹوں میں ہی مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ سامنے ہی ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ برگد کے سن رسیدہ درخت کے چوڑے تنے سے سادھو کو اس طرح سے باندھا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر پوری طرح کھول کر ان میں میخیں گاڑ دی گئی تھیں۔ لمبی لمبی میخوں نے اعضا کو چھید ڈالا تھا اور جسم میں بننے والے ان سوراخوں سے خون رس رس کر بہتا درخت کے نیچے کچی زمین میں جذب ہو گیا تھا۔ اگر وہاں سے سادھو کو ہٹا لیا جاتا تو زمین کی حالت دیکھ کر یوں لگتا جیسے وہاں کسی جانور کو ذبح کیا گیا ہے۔ سادھو کی حالت البتہ ذبح کیے جانے والے جانور سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور زندگی کی رمق سے عاری چہرہ یوں ڈھلکا ہوا تھا کہ تھوڑی سینے سے آ لگی تھی۔ شہریار دیکھ رہا تھا کہ سادھو کو اس حالت میں دیکھ کر لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ اتنی بربریت دیکھ کر خود اس کے اپنے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے پھر بھی اس نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور لاش کو نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں مشابرم خان کے ساتھ گاؤں کے دو تین جوان بھی شامل ہو گئے۔ اس موقع پر شہریار کی گاڑی کی ڈکی میں پڑے وہ اوزار بہت کام آئے جو کسی ایمرجنسی کی صورت میں گاڑی کی مرمت کے خیال سے رکھے گئے تھے۔ ورنہ میخیں جس طرح ٹھونکی گئی تھیں انہیں صرف ہاتھوں کی مدد سے نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔ میخیں اکھاڑنے کے بعد سادھو کے جسم کے گرد لپٹی رسی کھولی گئی اور پھر اس کا جسم زمین پر رکھنے کے بعد اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا باہر نکالا گیا۔ کپڑا نکالتے ہی سادھو کا سینہ تیزی سے پھولا۔

''یہ تو ابھی زندہ ہے صاحب۔'' اس کے بالکل قریب موجود مشابرم خان نے پُرجوش لہجے میں بتایا تو شہریار تیزی سے آگے بڑھا۔

''اس کے منہ میں پانی ڈالو۔'' اس نے اضطراری طور پر حکم دیا۔ متروک کنوئیں کے پاس پانی کہاں سے آتا۔ عبدالمنان نے... پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی میں رکھے فلاسک سے پانی نکالا اور سادھو کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دیا۔ منہ میں ڈالے جانے والے پانی کا بیشتر حصہ باہر آ گیا لیکن جو چند قطرے حلق سے نیچے اترے انہوں نے بھی کافی کام دکھایا اور سادھو تیز تیز سانس لینے لگا۔

''اسے ہیلتھ سینٹر لے چلتے ہیں۔ وہاں سے فرسٹ ایڈ دلوانے کے بعد کسی اسپتال میں شفٹ کر دیں گے۔'' سادھو کی سانسوں کا سلسلہ بحال ہوتے دیکھ کر اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ایک انسانی زندگی کو بچا لینے کی خواہش کے ساتھ ساتھ اس وقت اس کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ یقینی طور پر چودھری کے ظلم کا نشانہ بننے والا سادھو ہوش میں آنے کے بعد اس کے خلاف ایک اچھا گواہ ثابت ہوگا۔ اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی ہدایت پر عمل کیا جانے لگا اور چار پانچ لوگ آگے بڑھے کہ زخمی سادھو کو اس کی گاڑی میں منتقل کر سکیں۔ پہلے شخص کے ہاتھ لگاتے ہی سادھو نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ان کھلی آنکھوں میں سے آنکھ کے سفید سفید ڈیلے تو نظر آ رہے تھے لیکن پتلیوں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ لحظہ بھر آنکھیں کھلی رکھنے کے بعد اس نے پھر سے بند کر لیں اور پھر اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس جھٹکے کے لگتے ہی اس کا پہلے ہی ڈھیلا پڑ جانے والا جسم بالکل لٹک گیا اور صاف محسوس ہوا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ حقیقتاً اس کی جن علامتوں کو دیکھ کر ان لوگوں نے زندگی کی امید باندھی تھی، وہ دیے کی بجھتی لو کی آخری پھڑپھڑاہٹ تھی۔ سادھو کی موت کا منظر دیکھ کر شہریار کے شانے مایوسی اور بے بسی سے ڈھلک سے گئے۔ جانے چودھری کی رسی قدرت نے کتنی دراز رکھی تھی کہ کسی طور اسے پکڑائی میں لینے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب سادھو کی موت کی تصدیق، اس کے ورثا کی تلاش اور تدفین کے مراحل ہی باقی رہ گئے تھے جن کے لیے اس کی موجودگی کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں چند ہدایات جاری کرنے کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''وہ اطلاع لے کر آنے والا لڑکا کہاں ہے؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے اس لڑکے کا خیال آیا جس نے سادھو کے بارے میں اطلاع دی تھی اور پھر جس کی راہنمائی میں وہ لوگ یہاں تک پہنچے تھے۔

''افراتفری میں اس پر نظر رکھنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر نکل گیا۔ البتہ میں نے اس کے بارے میں لوگوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔'' جواب میں شرمندہ سے عبدالمنان نے وضاحت پیش کی اور اپنی



www.digestpk.com

Asifzamil

کارکردگی کا اظہار کرنے کے لیے بتانے لگا۔ ''لڑکے کا نام اعظم ہے۔ چند سال پہلے کمانے کے لیے گاؤں سے شہر گیا تھا۔ کچھ نہ کچھ کمانے دھمانے بھی لگا لیکن ساتھ ہی نشے کی علت میں بھی گرفتار ہو گیا۔ کبھی کبھار ہی گھر والوں سے ملنے کے لیے یہاں آتا ہے۔ اتفاق سے اب بھی کل رات سے آیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں بتانے والے کا خیال ہے کہ اپنے نشے کی ڈوز لینے کے لیے اس نے آبادی سے ہٹ کر اس طرف کا رخ کیا ہو گا لیکن سادھو کی لاش دیکھ کر گھبرا گیا اور الٹے قدموں دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں سب لوگ جمع تھے۔''

عبدالمنان کی پیش کردہ رپورٹ سن کر وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ لڑکے کا سراپا اب بھی اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ وہ زیادہ عمر کا معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن نشے نے اس کے جسم کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اعظم اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں کے لیے افسوس کرنے لگا۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ تھا کہ اس کے نوجوان تیزی سے تباہ ہو رہے تھے۔ کسی کو نشے کے زہر نے ناکارہ کر دیا تھا تو کوئی خودغرض لیڈروں کے سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھا ہوا تھا۔ سازشوں کا شکار نوجوانوں کی اس بھیڑ میں جو گنتی کے چند کارآمد ذہن بچے تھے، ان میں سے بھی ایک بڑا حصہ مادی ترقی اور روشن مستقبل کی تلاش میں بیرونِ ملک منتقل ہونا پسند کرتا تھا۔ ایسے میں ملک کے مستقبل کے لیے کوئی اچھی امید باندھی بھی جاتی تو کس سے؟ خود اس کے اپنے جیسے سرپھرے تو شاید دو چار ہی تھے اور ان کا ہی دم غنیمت تھا کہ ملک ابھی تک سلامت تھا ورنہ سازشوں کے اس ازدحام میں کب کی یہ ناؤ ڈوب چکی ہوتی۔ وہ افسردگی کے بہت گہرے احساس کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ اپنے طور پر تو وہ چودھری سے چھیڑ چھاڑ کے خیال سے یہاں آیا تھا لیکن گاؤں میں گھستے ہی پے در پے دو اتنے افسوس ناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا کہ طبیعت ہی مضمحل ہو کر رہ گئی۔

''چودھری کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟'' اسے معلوم تھا کہ عبدالمنان اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کا عادی تھا چنانچہ اس یقین کے ساتھ کہ چودھری کی گاؤں میں عدم موجودگی کا سن کر اس نے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کیا ہو گا، اس سے پوچھا۔

''چودھری کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس کی بیوی نمبر ون شدید بیمار ہے اور لندن میں زیرِ علاج ہے۔ چودھری اس کی طرف سے تشویش ناک اطلاعات سن کر لندن گیا ہے۔'' حسبِ توقع عبدالمنان نے اسے مایوس نہیں کیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کو سن کر وہ صرف ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا اور کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ چودھری کی پہلی بیوی یعنی وڈی چودھرائن ہی وہ ہستی تھی جس کی وجہ سے ماہ بانو ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچ گئی تھی۔ اس لالچی عورت نے صرف اور صرف اپنی اولاد کو جاگیر کا وارث بنائے رکھنے کے لیے ہر طرح کی گھناؤنی چالیں چلی تھیں اور اب وہ شدید بیماری کی حالت میں لندن کے کسی اسپتال میں زیرِ علاج تھی تو اسے اس سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔

''گاڑی روکو۔'' ابھی انہوں نے گاؤں کی حدود پار بھی نہیں کی تھیں کہ اس نے اچانک مشابرم خان کو حکم دیا۔ اس نے پھرتی سے بریکیں لگا کر اس کے حکم کی تعمیل کی۔

''تم گاڑی سے اتر جاؤ۔ یہاں سے آگے عبدالمنان ڈرائیو کرے گا۔'' اس کے اس عجیب و غریب حکم پر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے۔

''تم واپس گاؤں جا کر بالے کے گھر کی نگرانی کرو اور اس آدمی کو گھیر کر میرے پاس لاؤ جو شہزادی سے مُردے کی ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آنے والا ہے۔'' اس کے اس دوسرے جملے نے اس کے حکم کی وضاحت کر دی اور مشابرم خان سر کو تفہیمی جنبش دیتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔ عبدالمنان نے برابر والی سیٹ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی پھر اس کا اشارہ ملتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ بیک ویو مرر میں گاؤں کی طرف جاتا مشابرم خان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی کامیابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ مشابرم خان کامیاب ہوتا تو وہ ایک خطرناک فتنے کی بیخ کنی کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کے لائق ہو پاتا۔ اس نے اے سی کا منصب سنبھالتے ہی جو جنگ لڑنے کا آغاز کیا تھا، اس میں چودھری افتخار عالم شاہ ہی اس کا واحد ٹارگٹ نہیں تھا بلکہ وہ تو ہر اس شخص کے خلاف محاذ کھولنے کو تیار تھا جو اس کے دائرۂ کار میں فتنہ و فساد پھیلا رہا تھا۔ یہ جنگ کتنی طویل ثابت ہوتی اور اسے کہاں تک لے جاتی، وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے خبر تھی تو بس اتنی کہ وہ ایک گرداب میں اتر چکا ہے اور اب اس سے مقابلہ کرنا ہے۔

☆☆☆

''تم تھک گئی ہو گی۔ ویسے بھی اب رات سر پر آ گئی ہے، بہتر ہے کہ یہاں رک کر آرام کر لیں۔'' وہ اس پہاڑی سلسلے میں بے سمت سفر کیے جا رہے تھے۔ اسلم روانہ ہونے سے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر چکا تھا کہ اسے پہاڑی



سلسلے میں سے نکل کر کسی آبادی تک پہنچنے کا راستہ معلوم نہیں ہے لیکن جنگل کے جانے پہچانے راستوں سے گزر کر جانے میں زیادہ خطرات کا سامنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اندازے سے پہاڑوں میں ہی سفر کیا جائے اور کوشش کر کے کسی بستی تک پہنچنے کے بعد بڑے شہر کا رخ کیا جائے۔ اب وہ اسی تگ و دو میں مصروف تھے اور بے سمت راستوں پر چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ شام کے سائے، ڈھلنے لگے تو ماہ بانو کی ابتر ہوتی حالت دیکھ کر اس نے یہ تجویز پیش کی جسے اس نے فوراً قبول کر لیا۔ تھکن اتنی شدید تھی کہ اگر دل میں آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی چاہ نہ ہوتی تو وہ کب کی ہمت چھوڑ کر کہیں بیٹھ گئی ہوتی۔

ڈیرے سے روانہ ہونے کے بعد ان کا بیشتر وقت بھاگنے اور چلنے میں ہی گزرا تھا۔ پہلے یہ ڈر تھا کہ کہیں پیچھے سے آنے والا ان کا کوئی دشمن انہیں گھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائے اس لیے وہ دیوانہ وار دوڑتے رہے تھے اور اب پہاڑی سلسلے کی ان بھول بھلیوں سے نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہ کوششیں ابھی تک بارآور ثابت نہیں ہو سکی تھیں لیکن ہمت چھوڑ کر بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ بے عملی کی صورت میں بھوک اور پیاس کا عفریت انہیں کھا جاتا اور شاید دنیا میں اس سے بدترین موت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر مرنے والوں کے مقابلے میں فاقہ کشی سے مرنے والوں کو بہت وقت لگتا ہے اور جان کنی کے عالم میں جتنا وقت گزرے، موت اتنی ہی اذیت ناک ہو جاتی ہے۔

اسلم کی طرف سے رکنے اور آرام کرنے کی پیشکش ملتے ہی اس نے اپنے قدم روک لیے اور ایک ہموار قطعہ زمین دیکھ کر وہاں بیٹھ گئی۔ لیٹنے کے لیے بھی اسے اسی جگہ کو استعمال کرنا تھا۔ وہ جس بے سروسامانی کے عالم میں تھے، اس میں کسی بستر وغیرہ کے تکلف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ذرا سی صاف اور ہموار جگہ مل گئی تھی تو یہی بہت کافی تھا اور اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں لمبی تان کر سو جائے۔

''ابھی سونا نہیں، پہلے کچھ کھا پی لو اس کے بعد آرام سے سو جانا۔'' اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے اسلم نے اسے ٹوکا اور اپنی پشت پر لدا تھیلا کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ روشنی نہ ہونے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اسے کھانے کے لیے کیا دیا گیا ہے۔ یہ ان پرندوں کا گوشت تھا جنہیں اسلم نے تالاب کے کنارے سے شکار کر کے بھون لیا تھا۔ بغیر نمک مرچ کے صرف لکڑیوں کی آگ پر بھونے گئے گوشت کے یہ پارچے ذائقے سے قطع نظر محض پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آ رہے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ سخت ہو کر چبانے کے اعتبار سے بھی بہت دشوار غذا ثابت ہو رہے تھے لیکن وہی بات تھی کہ جسم و جاں کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کچھ تو چاہیے ہی تھا چنانچہ وہ اسلم کے ہاتھ سے گوشت کا وہ ٹکڑا تھام کر آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ خود اسلم بھی اسی عمل میں مصروف ہو گیا۔

شدید بھوک کے باوجود اس کے حلق سے چند نوالوں سے زیادہ نہ نگلے گئے اور اس نے گوشت کا ادھ کھایا پارچہ اسلم کی طرف بڑھا دیا۔

''ٹھیک سے کھا لو۔ اتنا کم کھا کر تم اتنے سخت ماحول میں کیسے زندگی کی جدوجہد کر سکو گی۔'' اسلم نے اسے سمجھایا۔

''بس میں اس سے زیادہ نہیں کھا سکتی۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اچھا تو ایسا کرو کہ تھوڑے سے چنے کھا لو۔'' کچھ سوچتے ہوئے اسلم نے اسے پیشکش کی جس پر اس کا سر فوراً ہی اثبات میں ہل گیا۔ اسلم نے چنوں سے بھری تھیلی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تھیلی میں سے مٹھی بھر کر چنے نکالنے کے بعد اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے وہ یکدم ہی جھجک سی گئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اسلم نے یہ چنے ایسے حالات کے لیے سنبھال رکھے تھے جب انہیں کوئی اور غذا میسر نہ آ سکے۔ پرندوں کا بھنا ہوا گوشت محفوظ کرتے ہوئے ہی اس نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ جب تک یہ گوشت کھانے کے لائق رہے گا، وہ اسی پر گزارہ کریں گے لیکن ماہ بانو کی گوشت سے بے رغبتی دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس کے لیے اپنی بے پناہ محبت کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے کھانے کے لیے چنے پیش کر دیے تھے۔ اسلم کی اپنے لیے اس بے تحاشا محبت کو محسوس کرتی وہ بہت آہستگی سے مٹھی میں موجود چنے ٹونگنے لگی۔ بہت آہستگی سے کھانے کے باوجود بھی وہ مٹھی بھر چنے جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان کے خاتمے پر اس نے بوتل میں سے تھوڑا سا پانی پیا اور سونے کی نیت سے لیٹ گئی۔ پہلے کبھی وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کسی غیر مرد کی موجودگی میں اس طرح کا چست لباس پہن کر لیٹ سکے گی لیکن اسلم سے اس کی جھجک کافی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ دن رات کے اس ساتھ میں اسلم نے خود کو ہر طرح سے قابلِ اعتماد ثابت کیا تھا اور وہ محسوس کر سکتی تھی کہ دل میں اس کے لیے شدید پسندیدگی کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ کبھی اس کی طرف حریص نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور پھر اب وہ جن حالات سے گزر رہے



www.digestpk.com

تھے، وہ اتنے مختلف اور انوکھے تھے کہ معمول کے رویّوں کا اظہار کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ یہ بقا کی جدوجہد تھی جس میں انہیں مردوزن کی تخصیص کے بغیر اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے لیٹنے تک اسلم بھی اپنا کھانا پینا ختم کر چکا تھا اور اب گہری ہوتی تاریکی میں کسی پہاڑی درندے حملے سے بچنے کے لیے الاؤ روشن کر رہا تھا۔

الاؤ جل جانے کے بعد وہ خود بھی ایک سمت کروٹ کے بل لیٹ گیا جبکہ ماہ بانو تو الاؤ سے اڑتی چنگاریوں کو دیکھتے ہوئے اپنے حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔ شکم پری کے لیے کھائے جانے والے مٹھی بھر چنوں نے اسے بچپن کی یاد دلا دی تھی۔ بچپن میں اکثر اسکول سے واپسی میں ابا اسے ڈھیروں میٹھے چنوں کے ساتھ رنگین مرمرے اور بتاشے خرید کر دے دیتے تھے اور وہ راستے بھر مٹھیاں بھر بھر کر مزے سے کھانے کے بعد خالی ہاتھ گھر لوٹتی تھی تو بے بے یونیفارم بدلا کر منہ ہاتھ دھلواتے ہی کھانے کی پلیٹ لیے اس کی خوشامدیں کرنے لگتی تھی کہ تھوڑا سا کھالے۔ چنوں، مرمروں اور بتاشوں سے بھرے ہوئے ننھے سے پیٹ میں گنجائش ہی نہیں رہتی تھی کہ وہ بے بے کے اتنی محبت سے منہ میں ڈالے گئے نوالوں کو نگل سکے۔ بس منہ بناتی ادھر ادھر بھاگتی رہتی تھی اور بے چاری بے بے سخت تشویش میں مبتلا ہو جاتی تھی کہ کڑی کھانا ہی نہیں کھاتی۔ اس موقع پر ابا اس کے ساتھ مثالی اتحاد کا مظاہرہ کرتے تھے اور بے بے کے بار بار پوچھنے پر بھی کبھی اعتراف نہیں کرتے تھے کہ اسے اس کی فرمائش پر کیا کچھ کھلا چکے ہیں۔

بچپن کے وہ ناز و نعم سے بھرے دن کب کے لد چکے تھے اور اگر کچھ سامنے تھا تو زندگی کے گرداب اور الجھنیں۔ چودھری نے اس کی زندگی کو ایسا بھیانک موڑ دیا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلتی تھی تو دوسرے میں پھنس جاتی تھی۔ اس ظالم بدنظر شخص نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ بے بے اور ابا جن کی وہ لے پالک بیٹی تھی، اس سے محبت کرنے کے جرم میں چودھری کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور اس نے ان سے اس کا اتا پتا اگلوانے کے چکر میں انہیں سخت اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ جنم دینے والی ماں الگ پاگل ہو کر گاؤں کی گلیوں میں رلتی پھرتی تھی۔ ایک بہن اور بھائی کو موت کے سفاک پنجوں نے اپنی گرفت میں لے کر جدا کر دیا تھا جبکہ باقی بچ جانے والی ایک بہن سسرال والوں کی خدمت و اطاعت میں مصروف تھی۔ گھربار، پڑھائی لکھائی، سہیلیاں ہر شے چھوٹ گئی تھی اور کچھ باقی بچا تھا تو مصائب کا گرداب۔ زندگی کے طوفانوں کو سہارتے شہریار سے ملاقات ہوئی تو دل اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا لیکن وہ بھی کسی اور کا ہو گیا۔ اب اگر زندگی میں کچھ باقی بچا تھا تو وہ اسلم کی ذات تھی جو اس سے غیر مشروط محبت کرتا تھا۔ حالات کا ستایا ہوا اسلم جسے زندگی کے مصائب نے ڈاکو بنا دیا تھا، اس سے مل کر اس طرح اس کی محبت میں مبتلا ہوا کہ اس کے مطالبے پر یک بیک اپنی مجرمانہ زندگی ترک کرنے کے لیے راضی ہو گیا اور اب وہ کسی مناسب مقام پر پہنچنے کی جدوجہد میں ان پہاڑوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

جب وہ ڈیرے سے نکلے تو تین تھے اور ان کے ساتھ للی نام کی وہ عورت بھی تھی جو کبھی شوبز میں اپنا مقام بنانے کے چکر میں گھر سے نکل کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پھنس گئی تھی۔ اسلم کی محبت میں مبتلا للی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا۔ اگر للی عین وقت پر اسلم کے سامنے آکر اس کی طرف جانے والی گولی اپنے وجود پر نہ کھاتی تو آج اسلم زندہ نہ ہوتا۔ اس نے جمرو سے للی کی ہلاکت کا انتقام لیتے ہوئے اسے جہنم واصل تو کر دیا تھا لیکن خود بھی اس عورت کے لیے اداس تھا جس کے کردار پر بھروسا نہ کرتے ہوئے اس نے کبھی اس کی محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔ تھرکتے شعلوں اور رقاص چنگاریوں پر نظر جمائے اپنی زندگی کی کہانی دہراتے دہراتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس گہری نیند سے وہ دو ڈھائی گھنٹے بعد جاگی۔ جاگنے کا سبب ٹھنڈی ہوتی رات میں محسوس ہونے والی حاجت تھی۔ وہ بے چین سی ہو کر اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ الاؤ اب بھی روشن تھا اور کچھ فاصلے پر اسلم پہلو کے بل لیٹا سو رہا تھا۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور قضائے حاجت کے لیے ایک سمت میں چل پڑی۔ اپنے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں ایک چٹان کی اوٹ میں اسے مناسب جگہ نظر آگئی۔ اس جگہ بیٹھ کر فارغ ہونے کے بعد وہ کھڑی ہوئی تو واپسی کے راستے کو مسدود پایا۔ اندھیرے میں بھی چمکتی وہ دو سرخ آنکھیں ایسی نہیں تھیں کہ ان سے خوف کھائے بغیر رہا جا سکتا۔ اس کے پورے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی اور وہ بے ساختہ ہی چند قدم پیچھے ہٹی۔ بدقسمتی سے پیچھے ڈھلوان سطح تھی۔ وہ کسی طور اپنے قدموں کو سنبھال نہیں سکی اور بری طرح چیختی ہوئی لڑھکتی چلی گئی۔

یہ پر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ھے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں





# لاپتا محبوبہ

سیریناراض

پُراسرار طور پر کھو جانے والے افراد کبھی زندگی سے نہیں نکلتے... ان کی یادیں... کسک بن کر دلوں کو تڑپاتی رہتی ہیں... ایک ایسے ہی محبت کرنے والے شخص کا المیہ جسے ایک قیدی عورت سے محبت ہو گئی... اور وصل سے پہلے ہی ہجر کے موسم نے بسیرا کر لیا...

**محبوبہ کی تلاش میں زندگی تیاگ دینے والے عاشق کا فسانہ**

رینڈل گروز جب کیپٹن فلپ کے خیمے میں داخل ہوا تو اس وقت وہ اپنی میز پر رکھے بڑے سے نقشے کو لپیٹ رہا تھا۔ اُس نے اندر پہنچتے ہی دونوں ایڑیاں جمائیں اور زور سے سیلوٹ کیا۔

”کیا ہوا؟“ کیپٹن فلپ نے اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

”سر! ایک قیدی غائب ہے۔“ اس نے سیدھے کھڑے ہو کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کون ہے وہ؟“ کیپٹن فلپ اب ایک دوسرے نقشے کو کھول کر میز پر پھیلا رہا تھا۔

”میگی......“ اس نے جواب دیا اور تھوڑا سا توقف کر کے کہنے لگا۔ ”سر! میرا مطلب ہے کہ جو لاپتا سزا یافتہ



Asifzamil
www.digestpk.com

Asifzamil

قیدی ہے، وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور اس کا پورا نام مارگریٹ بشپ ہے۔ سب اسے میگی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"کیا تمہارا اس لڑکی کے ساتھ کوئی تعلق تھا؟" پہلے تو رینڈل سمجھا تھا کہ کیپٹن' قیدی لڑکی کی گمشدگی کو زیادہ اہمیت نہیں دے گا مگر اس کے سوال پر وہ چونک گیا۔

"جی ہاں..... کچھ خاص تعلق قائم ہوگیا تھا اُس سے۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد رینڈل نے نظریں نیچی کر کے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اس قیدی لڑکی سے اس کے تعلقات کے بارے میں کیپٹن کو بھی علم ہوگا۔

"یہ تعلقات کتنے عرصے سے قائم تھے؟" کیپٹن فلپ کے لہجے میں تجسس بھی تھا اور افسرانہ رعب بھی۔

"پانچواں مہینا ہونے کو آیا ہے۔" رینڈل، کیپٹن فلپ کے مزاج کو جانتا تھا اس لیے اس نے سوال کا تفصیلی جواب دینے کا تہیہ کرلیا تھا۔ "گڈ ہوپ کے ساحل پر جب 'شیر لیٹ' سے اُسے ہمارے 'فرینڈ شپ' پر منتقل کیا گیا تھا، تب پہلی بار میرا اس سے تعارف ہوا تھا۔ اس ملاقات کے بعد سے ہی ہم دونوں میں دوستی ہوگئی تھی۔"

رینڈل کا جواب سُن کر کیپٹن خاموش رہا اور کچھ سوچنے لگا۔ وہ بھی خاموشی سے کھڑا ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ رینڈل کے خیال میں میگی سے اس کے تعلقات میں کوئی شرمناک بات پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ شاہی بحری بیڑے کے ایسے کئی ملاحوں اور افسران کو جانتا تھا جو زیادہ تر سمندر کے سینے پر مسلسل سفر میں رہتے تھے اور اس دوران انہوں نے جہاں جہاں لنگر ڈالے، وہاں وہاں مختلف عورتوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنا انسانی فطرت ہے اور وہ بھی گھر سے بہت دور، جہاں اُن کی دنیا صرف ایک جہاز ہو، ایسا عمل سرزد ہوجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

اُن دنوں انگلستان میں جرائم کی وارداتیں بہت زیادہ ہوگئی تھیں۔ شاہی حکومت نے جرائم پر قابو پانے کے لیے سخت سزائیں مقرر کردی تھیں۔ یہ سزائیں اتنی سخت تھیں کہ معمولی سی چوری پر بھی موت یا ملک بدری کی سزا دے دی جاتی تھی۔ میگی بھی انہی لوگوں میں شامل تھی۔ اسے اونی کپڑے کے ایک ٹکڑے کی چوری کے الزام میں ساؤتھ ویلز کے ایک قصبے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ چوری کردہ مال کی قیمت تیس شلنگ تھی اس لیے اسے موت کے بجائے ملک بدری کی سزا ملی۔ اگر اس کی مالیت چالیس شلنگ یا اس سے زائد ہوتی تو اُس پر موت کی سزا کا اطلاق ہوتا۔

سترہ اٹھارہ برس کی میگی نہایت خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور بڑے بڑے بال بھی سیاہ تھے۔ یہ اس کے حُسن کی نزاکت تھی کہ اگر کسی شخص کی اتفاق سے اس پر ایک نظر پڑ جاتی تو پھر نظر ہٹانا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ سزا کے بعد اسے ملک بدر کر دیا گیا۔ اب میگی بھی اُن قیدیوں میں شامل تھی، جنہیں اگلی بندرگاہ پر دوسرے جہاز کے حوالے کرنا تھا جو انہیں ایک دور دراز ویران جزیرے پر چھوڑ دیتا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب آسٹریلیا میں انگریز مجرموں کو لا کر چھوڑ دینے کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ برطانوی جہاز شاہی بحری بیڑے کا حصہ تھا اور اُس وقت فوجی مقاصد کی سرگرمیوں پر تھا۔ واپسی پر اسے بھیڑیں خرید کر انگلستان لے جانی تھیں۔ اس مقصد کے لیے جہاز پر بہت ساری جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب وہ آرہے تھے تو انہوں نے شیر لیٹ کی درخواست مان لی اور ان کے کئی ایسے انگریز قیدی جہاز پر سوار کروالیے جنہیں سڈنی ٹاؤن سے کافی فاصلے پر واقع ایک ساحل پر دوسرے بحری جہاز کے حوالے کردینا تھا جو انہیں ویران جزیرے تک پہنچا دیتا۔ ویسے جس جگہ اُن قیدیوں کو دوسرے جہاز کے حوالے کرنا تھا، وہ بندرگاہ سڈنی ٹاؤن سے واپسی کی راہ میں پڑتی تھی۔ اس لیے کیپٹن فلپ کو بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ شیر لیٹ میں کوئی تکنیکی خرابی ہوچکی تھی اس لیے وہ واپس ویلز کی بندرگاہ جارہا تھا۔

میگی کا جرم اگرچہ بہت معمولی تھا لیکن شاہی قانون کے آگے کس کی چلتی۔ البتہ اس وقت جو دوسرے قیدی تھے، ان میں سب کے سب ہی معمولی جرائم کے تحت سزا یافتہ نہیں تھے، اکثر ایسے تھے جن کی مجرمانہ سرگرمیوں سے تنگ آکر اب انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انگلستان بدر کیا جارہا تھا۔ سفر بہت طویل تھا۔ چند روز کے اندر ہی میگی اور رینڈل میں خوب گاڑھی چھننے لگی اور یہ تعلقات بہت آگے تک چلے گئے۔ رینڈل کا خیال تھا کہ اگر میگی کسی طرح اس کی زندگی میں آجائے تو وہ ملاح کی بے کیف زندگی کو چھوڑ کر کہیں زمین پر اپنا چھوٹا سا گھر بنا کر باقی زندگی اپنے خاندان کے ساتھ گزارنا پسند کرے گا۔ خود میگی بھی رینڈل کی محبت میں گرفتار نظر آتی تھی۔ جب سے اسے ملک بدر کیا گیا تھا، اس کی سوچ ہی بدل گئی تھی۔ اب وہ مجرمانہ سرگرمیوں کے بجائے ایک عام سی زندگی بسر کرنے کی



خواہش مند نظر آنے لگی تھی۔

اگرچہ میگی اور رینڈل کے تعلقات کے بارے میں کئی لوگ جانتے تھے تاہم کوئی ناخوش نہیں تھا، ماسوائے ایک شخص کے..... اور وہ تھا پرائیوٹ ٹالبوٹ۔ یہ بھی شاہی بحری بیڑے کا جونیئر ملاح تھا اور شیر لیٹ پر قیدیوں کی حفاظت پر مامور تھا۔ جب شیر لیٹ سے قیدیوں کو فرینڈ شپ پر منتقل کیا گیا تو اسے بھی اسی جہاز پر بھیج دیا گیا تاکہ وہ قیدیوں پر نظر رکھ سکے۔

جب میگی کی گمشدگی کا واقعہ پیش آیا، اُس وقت وہ منزل سے خاصے دور تھے۔ بحری بیڑے کا عملہ سڈنی ٹاؤن کے ساحل پر ڈیرے ڈالے ہوا تھا۔ جہاز گہرے پانی میں لنگر انداز تھا۔ بحری بیڑا جنگی سرگرمیوں کے تحت یہاں بھیجا گیا تھا۔ ان کی آمد کا مقصد تھا کہ سڈنی ٹاؤن جسے حال ہی میں انگلستان نے اپنی نوآبادی بنایا تھا، وہاں قبضے کو فوجی لحاظ سے مزید مستحکم کیا جائے۔ یہاں کافی دن ٹھہرنا تھا اس لیے قیدیوں کو بھی ساحل پر ہی منتقل کردیا گیا۔ اسی دوران ایک صبح انکشاف ہوا کہ میگی لاپتا ہے..... اور اب رینڈل بحری بیڑے کے سربراہ کیپٹن فلپ کو قیدی لڑکی کی گمشدگی کی اطلاع دے کر اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔

"آخری مرتبہ اس لڑکی کو کب دیکھا گیا تھا؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد کیپٹن نے سر اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے رینڈل کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"پرسوں شام..... اس کے بعد سے اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔"

"کیا اس نے کبھی یہاں سے فرار ہونے کی کوئی بات کی تھی؟" کیپٹن فلپ نے جاننا چاہا۔ "میرا مطلب ہے کہ تم نے اس طرح کی کوئی بات کسی شخص کے منہ سے سنی تھی کہ وہ موقع ملنے پر فرار ہونے کی کوشش کرسکتی ہے؟"

"نہیں سر! میں نے ایسی بات نہ تو کبھی میگی کے منہ سے سنی اور نہ ہی کسی دوسرے شخص نے اُس سے متعلق کبھی ایسا کچھ مجھ سے کہا۔"

"اچھا۔" کیپٹن نے مختصر سا جواب دیا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

"سر! میرا خیال ہے کہ اسے ٹالبوٹ نے قتل کردیا ہے۔" جب چند لمحوں تک کیپٹن بدستور سوچ میں ڈوبا رہا تو رینڈل نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟" کیپٹن، رینڈل کی بات سنتے ہی چونک اٹھا۔ اس کی تیوری پر کئی بل پڑ چکے تھے۔ "جانتے ہو کتنی خطرناک بات کہی ہے تم نے؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے؟"

"کچھ تو ہے جو میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔" رینڈل نے کیپٹن کے سوال کا جواب دینے سے پہلے تمہید باندھی۔ "جب میگی شیر لیٹ پر تھی تو اُس وقت ٹالبوٹ اور اس کے درمیان خاصے قریبی تعلقات قائم ہوچکے تھے۔ جب وہ ہمارے جہاز پر منتقل ہوئے، تب ایک بار پھر ٹالبوٹ نے کوشش کی کہ دونوں کے درمیان پہلے جیسے تعلقات قائم ہوجائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میگی میرے بہت زیادہ قریب آچکی تھی۔ وہ ٹالبوٹ کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ ٹالبوٹ جانتا تھا کہ میگی کے اس رویّے کی وجہ میں ہوں۔ وہ پہلے اس کی دوست تھی لیکن اب نہیں۔ اب وہ نہ صرف میری دوست تھی بلکہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ میگی کے سخت خلاف ہوچکا تھا۔" یہ کہہ کر رینڈل سانس لینے کو رُکا۔

"مگر یہ تو کسی کو قتل کرنے کے لیے کوئی خاص وجہ نہیں ہوئی؟" کیپٹن فلپ نے اسے خاموش ہوتا دیکھ کر فوراً سوال کیا۔

"یہاں کئی اور قیدی عورتیں موجود ہیں۔ ٹالبوٹ کے تعلقات کسی اور سے بھی استوار ہوسکتے ہیں۔ صرف اس ایک بات کو وجہ بنا کر وہ میگی کو کیوں قتل کرے گا؟ کیا وہ واحد لڑکی تھی جو اس کی دسترس میں تھی؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ ٹالبوٹ کو اس سے دلی لگاؤ ہوگیا ہو اسی لیے وہ اسے کسی اور کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا ہو۔"

"مگر یہ بھی تو کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہوا۔ تم اس پر قتل کا الزام لگا رہے ہو مگر ثبوت کے طور پر صرف امکانات اور اپنے خیالات پیش کررہے ہو۔" کیپٹن فلپ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ناگواری جھلکنے لگی۔ "اگر تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو اس بارے میں بات کرو ورنہ....."

"سر! ثبوت ہے میرے پاس۔" رینڈل نے قطع کلامی کی۔ اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ "کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میگی تنہا بیٹھی تھی۔ اتنے میں ٹالبوٹ بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی اس وقت قریب موجود تھے۔ وہ نہ صرف دونوں کو دیکھ سکتے تھے بلکہ اُن کی باتیں بھی سن سکتے تھے۔ ٹالبوٹ نے میگی کا ہاتھ پکڑا لیکن اس نے جھٹک دیا جس پر وہ



www.digestpk.com

Asifzamil

سخت مشتعل ہوگیا۔ اس نے میگی کو بانہوں میں لینے کی کوشش کی مگر اس نے دھکا دے دیا۔ اس پر تو وہ غصے سے بالکل ہی پاگل ہوگیا۔ اس وقت کئی لوگوں نے اس بات کو سنا تھا۔ وہ میگی کو دھمکی دے رہا تھا۔ ٹالبوٹ اس سے کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں، قتل کردوں گا۔"

"یہ اُس نے کہا تھا..... یہی الفاظ تھے اس کے؟" کیپٹن نے بھویں چڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں..... بالکل یہی الفاظ کہے تھے اُس نے۔ مجھے اس کی بات حرف بہ حرف یاد ہے۔" رینڈل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھا کہ شاید اب کیپٹن اس سے متفق ہوتا جارہا ہے۔

"یہ تو کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ غصے کی حالت میں ایسی بات تو کسی بھی شخص کے منہ سے نکل سکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ جس نے یہ بات کہی ہو، وہ اس پر عمل بھی کرلے۔" کیپٹن نے تیوری پر بل ڈال کر کہا تو اس کی ساری خوشی مٹی میں مل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کیپٹن آسانی سے بات ماننے والا نہیں ہے۔

"ایک اور ثبوت ہے اس کے خلاف۔" رینڈل نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا؟"

"میگی لاپتا ہے۔" رینڈل نے بے تکان بولنا شروع کیا۔ "وہ یہاں پر بہت خوش تھی۔ اس نے کبھی فرار ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے کبھی کوئی ایسی بات محسوس کی کہ وہ اپنے دل میں فرار کی منصوبہ بندی کررہی ہے۔ کم از کم میں نے تو کبھی اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ اب تو ہم دونوں اپنی شادی کی باتیں کرنے لگے تھے۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رُکا اور کیپٹن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ اہم اور ٹھوس ثبوت ہے کہ میگی فرار نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے فرار ہونے کی کوئی وجہ تھی۔ اسے قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل ٹالبوٹ نے کیا ہے کیونکہ وہ مشتعل تھا کہ میگی نے اس سے تعلقات کیوں ختم کردیے تھے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ بات کیپٹن کے اس شک کو ختم کردے گی کہ وہ فرار نہیں ہوئی بلکہ اس کا قتل کیا گیا ہے اور قتل وہی کرے گا جس کی متوقعہ سے کوئی ذاتی قسم کی سخت رنجش ہوگی۔ ایسا شخص ایک ہی ہے اور کیپٹن اس کا نام بھی جان گیا ہے۔

"تم نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو یہ بات بتائی ہے؟" کیپٹن کے ماتھے پر بدستور بل پڑے ہوئے تھے۔

"نہیں سر!"

"کیوں..... اتنا بڑا واقعہ ہوگیا اور تم اسے بتانے کے بجائے میرے پاس چلے آئے ہو؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"چند روز پہلے کی بات ہے۔ میگی کے معاملے پر میرے اور ٹالبوٹ کے درمیان سخت گرما گرمی ہوگئی۔ بات خاصی پھیل گئی تھی لیکن اچانک میجر رَوس وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ میجر نے ہم دونوں کو تنبیہ کی تھی کہ اگر آئندہ آپس میں میگی کے معاملے پر لڑے تو اُسے بیچ گٹ کی اگلی بندرگاہ پر جہاز سے اتار دیا جائے گا۔ وہ شدید غصے میں تھے۔" رینڈل تفصیل سے کیپٹن کے مختصر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ "میں کبھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو، اس لیے خاموش ہوگیا۔ اب جب یہ واقعہ ہوا تو میں اُن کے پاس اس لیے نہیں گیا کہ وہ کہیں ناراض ہوکر اُلٹا مجھ پر ہی نہ برس پڑیں۔ اسی لیے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور کیپٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

"ٹولیٹ....." رینڈل دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

"شاید یہی اس جزیرے کا نام ہے۔" یہ واحد جزیرہ تھا جس کے بارے میں وہ جانتا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کرکے سات سمندر پار اس جزیرے پر کیوں اتارا جارہا تھا جبکہ اس کے خیال میں پورا ساؤتھ ویلز ہی ایک بہت بڑے قید خانے کی طرح تھا۔

دوسری طرف کیپٹن فلپ بھی کچھ دیر تک سوچتا رہا مگر چند لمحوں بعد ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ "اگر وہ عورت پرسوں شام تک یہیں تھی تو پھر تم جاکر میجر رَوس کو اطلاع کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ باٹنی بے پر چہل قدمی کررہی ہوگی۔" اس کا لہجہ خاصا پُرسکون تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رینڈل کی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں کہ میگی کو قتل کردیا گیا ہے اور یہ قتل ٹالبوٹ نے کیا ہے۔ یہ کہنے کے بعد کیپٹن نے ایک بڑا سا نقشہ اٹھایا اور میز پر پھیلانے لگا۔ وہ بالکل لاتعلق ہوکر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ رینڈل بدستور اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ "ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ کس طرح اس مسئلے کو حل کیا جائے۔" چند لمحوں کے بعد جب اس نے سر اٹھایا تو رینڈل کو اپنی جگہ پر کھڑا دیکھ کر اس کی تیوری پر ایک بار پھر بل پڑ گئے۔ اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ایسا نظر آرہا تھا کہ وہ رینڈل سے بیزار ہوچکا ہے۔

"لیکن....." اس نے کچھ کہنا چاہا مگر بات اس کے حلق



میں ہی رہ گئی۔ کیپٹن چلّایا۔

"اب تم جاسکتے ہو..... ڈِس مِس۔" اس نے فوجی انداز میں حکم دیا۔ اب رینڈل کا وہاں کھڑا رہنا ناممکن تھا۔ اس نے فوراً سیلیوٹ کیا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر رینڈل نے اپنی بندوق اٹھائی اور غیر ارادی طور پر چل پڑا۔ گرمیوں کی جھلسا دینے والی دھوپ اس کے اوپر پڑ رہی تھی لیکن اس نے تپش کا بھی نوٹس نہیں لیا۔ اُس وقت وہ شدید غصے میں تھا۔ اس کا خون غصے سے کھول رہا تھا اور دماغ میں جیسے ایک ساتھ کئی بھٹیاں جل رہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ بس، وہ اپنی دھن میں چلا جارہا تھا۔

شاہی بحریہ کے تمام افسران ایک جیسے ہی تھے۔ کوئی فرق نہیں تھا اُن میں۔ اگر کسی افسر سے کچھ کہو تو وہ ایسا ظاہر کرتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں یا وہ تمہارا مخاطب ہے ہی نہیں۔ رینڈل اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ اسے کیپٹن کا یہ حکم بہت ہی بُرا لگا تھا کہ جاکر میجر رَوس کو واقعے کی اطلاع دو۔ اس نے تو سڈنی ٹاؤن میں ہونے والے قتل پر بھی یقین نہیں کیا تھا جس کے کئی گواہ تھے۔ ایسے میں وہ میگی کے قتل پر کیسے اعتبار کرسکتا تھا جس کو ہوتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ کیپٹن فلپ صرف اس وقت جُرم پر یقین کرتا تھا جب مجرم کو سزا مل چکی ہو۔ میگی کے قتل میں ٹالبوٹ کا ہاتھ تھا۔ اس بات کا رینڈل کو سو فیصد یقین تھا مگر کیپٹن نے اپنی عادت کے مطابق اسے مسترد کردیا۔ حالانکہ جب وہ کیپٹن کے پاس گیا تھا تو نہ جانے کیوں اسے سو فیصد یقین تھا کہ اپنی عادت کے برخلاف وہ نہ صرف اس کی بات پر یقین کرے گا بلکہ ٹالبوٹ کو گرفتار کرنے کا حکم بھی جاری کردے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رینڈل کو ایسا ہونے کی شاید اس لیے امید تھی کہ میگی اس کی محبوبہ تھی۔ اس لیے وہ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا لیکن اب جبکہ وہ اس کے پاس سے ناکام و نامُراد لوٹ آیا تھا تو اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کیپٹن نے صرف اس لیے یہ بات مسترد کی ہے کہ ٹالبوٹ شاہی بحریہ کا ملازم ہے جبکہ میگی ایک معمولی سی جرائم پیشہ اور سزا یافتہ قیدی لڑکی تھی؟ کہیں اسی لیے وہ ٹالبوٹ کو بچانے کی کوشش تو نہیں کررہا ہے؟

سوچ سوچ کر وہ نیم پاگل ہوچکا تھا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ ڈھیروں امیدیں باندھ کر کیپٹن کے پاس گیا تھا اور جب اس کے انکار سے آخری امید بھی دم توڑ گئی تو رینڈل کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔ وہ جس طرح غیر ارادی طور پر آگے بڑھتا جارہا تھا، اسی طرح اس کا ذہن بھی بے سمت پرواز کررہا تھا۔ وہ بے ترتیب سوچوں میں الجھا ہوا غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "یہ کیسا انصاف ہے؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

رینڈل، باٹنی بے کے بارے میں کیپٹن کی بات پر غور کررہا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جاتا کہ وہ فرار ہوکر وہاں پہنچ چکی ہے تو وہ پہلی قیدی نہیں تھی جس نے ایسا کیا۔ "نہیں..... وہ ایسا نہیں کرسکتی۔" یہ خیال آتے ہی وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ "وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ میگی وفادار تھی، بے وفا نہیں۔"

سڈنی ٹاؤن کی نوآبادی کے قریب واقع باٹنی بے فرنچ نوآبادی تھی۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان دشمنی تھی۔ دونوں توسیع پسندانہ عزائم لے کر نئے نئے علاقوں پر قبضے کرتے پھر رہے تھے۔ فرنچ، انگریزوں کو تو ویسے ہی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ جب کیپٹن فلپ کی سربراہی میں بارہ جنگی جہازوں کا بحری بیڑا ویلز سے انگلستان کی نوآبادی سڈنی ٹاؤن پہنچا تو وہاں باٹنی بے کے قریب دو فرنچ جہاز بھی لنگر انداز تھے لیکن انگلستانی بحری بیڑے کو دیکھ کر انہوں نے لنگر اٹھائے اور آگے بڑھ گئے۔ کیپٹن کو معلوم تھا کہ باٹنی بے فرنچ نوآبادی ہے۔ کیپٹن فلپ سڈنی ٹاؤن پر انگلستانی فوج کے قبضے کو مزید مضبوط بنانے کے انتظامات کرنے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی غور کررہا تھا کہ کس طرح باٹنی بے کو فرنچ سے ہتھیا لیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ باٹنی بے پر قبضے سے ایک آسانی یہ ہوگی کہ انگلستان بدر کیے گئے جرائم پیشہ لوگوں کو پناہ کے لیے کوئی جگہ نہیں مل پائے گی۔

کیپٹن فلپ نے جب یہاں پہنچنے کے بعد یہ دیکھا کہ ان کی آمد کے فوراً بعد ہی فرنچ جہاز لنگر اٹھا کر آگے بڑھ گئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ اسے اپنے بارہ بحری جہازوں کے بیڑے کا رعب سمجھا لیکن تیسرے ہی دن وہ دونوں فرنچ جہاز واپس اسی جگہ پہنچ کر لنگر انداز ہوچکے تھے۔ اس بات سے کیپٹن کو لگا کہ اسے یہ جزیرہ بغیر خون خرابے کے نہیں ملے گا۔ فی الحال وہ جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے سڈنی ٹاؤن پر انگریز قبضے کو مستحکم بنانے کے اقدامات پر اپنی بھرپور توجہ مرکوز کیے رہا۔

ویسے باٹنی بے انگریز فوج کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگلستان بدر کیے گئے مجرموں میں سے اگر کوئی شخص فرار ہوکر وہاں تک پہنچ جاتا تو یہ اسے واپس نہیں کرتے



www.digestpk.com

Asifzamil

تھے۔ ایسا عام طور پر ہوتا تھا کہ انگریز مجرموں کو لے کر جانے والے بحری جہاز جب یہاں لنگر انداز ہوتے تو کچھ جی دار قیدی فرار ہو جاتے۔ بائٹی بے ان کی منزل ہوتا۔ وہ وہاں جا کر کام مانگتے جو کہ انہیں نہیں ملتا تھا۔ پھر وہ اُن سے پناہ مانگ لیتے تھے۔ فرنچ انہیں عارضی طور پر اس لیے پناہ دے دیتے جیسے انگریز اُن کے دشمن ہوں، اسی طرح یہ جرائم پیشہ انگریز بھی خود اپنے ہی وطن اور ہم وطنوں کے دشمن بن چکے ہوتے تھے۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے، بس اسی اصول پر وہ کچھ عرصے کے لیے اُن کی پناہ میں آجاتے اور پھر انگلستانی بیڑے کی روانگی کے بعد وہ اپنی قسمت آزمانے کے لیے جدھر سینگ سماتے، اُدھر نکل پڑتے۔

سڈنی ٹاؤن سے راہِ فرار اختیار کرنے والے قیدیوں کی پہلی منزل ہمیشہ بائٹی بے رہا ہے، اس لیے کیپٹن کا یہ شبہ سمجھ میں آتا تھا کہ میگی بھی دوسرے قیدیوں کی طرح فرار ہو کر بائٹی بے پہنچ گئی ہوگی مگر رینڈل اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میگی اس سے پیار کرتی ہے۔ وہ اس سے شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی ہے۔ خود اس کی اپنی بھی یہی خواہش تھی۔ ایسے میں میگی کس طرح فیصلہ کرے گی کہ فرار ہو کر بائٹی بے جائے اور غیر یقینی حالات میں پریشانی مول لے کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے .... جبکہ رینڈل کی ہمراہی میں اسے زیادہ بہتر اور پُرسکون زندگی گزارنے کا موقع ہاتھ آچکا تھا۔ یہی وہ ٹھوس وجہ تھی جس کے باعث رینڈل کے لیے یہ سوچنا بھی محال تھا کہ میگی اسے چھوڑ کر بائٹی بے فرار ہو چکی ہے۔ ''اسے ٹالبوٹ نے ہی قتل کیا ہے۔ وہ تو شکل سے ہی قاتل نظر آتا ہے۔'' رینڈل اچانک زور زور سے کہنے لگا۔ اس وقت وہ ساحل پر کھڑا تھا۔ ٹالبوٹ کے خلاف اس کے سینے میں انتقام کا لاوا اُبل رہا تھا۔ اگر رینڈل کا بس چلتا تو وہ اسی وقت اپنی سرکاری بندوق سے گولی چلا کر اس کا خاتمہ کر دیتا اور لاش کو سمندر میں مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے پھینک دیتا، جیسا کہ اس کے خیال میں اُس نے میگی کے ساتھ کیا تھا۔ اچانک اسے میگی شدت سے یاد آنے لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل ساحل کی ریت پر بیٹھ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ اس وقت وہ یہاں بالکل تنہا تھا۔ ویسے جس بُری طرح وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا، کوئی اسے دیکھ لیتا تو پھر پورے عملے میں وہ تماشا بن کر رہ جاتا۔ رینڈل کافی دیر تک اسی طرح ساحل پر بیٹھا روتا رہا۔ اس وقت اسے نہ دھوپ کی فکر تھی اور نہ ہی کسی کے دیکھ لیے جانے کا ڈر۔ وہ صرف میگی کی یاد میں ڈوبا ہوا تھا۔ سمندر کی پُرشور موجیں بھی اس کا دھیان میگی کی طرف سے ہٹانے میں ناکام تھیں۔

کافی دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا۔ اس نے اپنے اعصاب پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ کیپٹن کے رویّے سے اس پر جو ہیجانی کیفیت طاری ہوئی تھی، وہ بڑی حد تک کم ہو چکی تھی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس بات کو ثابت کیا جا سکتا ہے کہ میگی فرار نہیں ہوئی اور نہ ہی لاپتا ہے بلکہ ٹالبوٹ نے اسے قتل کیا ہے اور اس کی لاش کو یا تو سمندر میں بہا دیا ہے یا پھر اسے کسی ویرانے میں دفن کر دیا ہے۔ ویسے بھی سڈنی ٹاؤن کے ویران ساحلی علاقے میں یہ دونوں امکانات قابلِ عمل تھے۔

''میں یہ ثابت کر کے ہی رہوں گا کہ ٹالبوٹ ہی میگی کا قاتل ہے۔'' اچانک وہ زور سے چلانے لگا اور پھر قدم آگے بڑھانے لگا۔ وہ اُس طرف جا رہا تھا جہاں شاہی بیڑے کے ملاحوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ رینڈل یہ جاننا تھا کہ ٹالبوٹ کس خیمے میں موجود ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اُس کے خیمے کا پردہ اٹھا رہا تھا۔

خیمہ خالی پڑا ہوا تھا۔ ایک کونے میں سفری بستر لگا ہوا تھا اور اس کے برابر میں ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رینڈل، ٹالبوٹ کو قاتل ثابت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ ثبوت کیا ہوگا؟ بس اسے ثبوت کی تلاش تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ کیا شے ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے خیمے میں آیا۔ ہو سکتا تھا کہ اسے یہیں کوئی ٹھوس ثبوت مل جاتا جس کی بنا پر وہ ٹالبوٹ کو میگی کا قاتل ثابت کر سکتا۔ اس نے گہری نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا لیکن صندوق اور بستر کے سوا یہاں کوئی اور شے نہیں تھی۔ پھر وہ بستر کو دیکھنے لگا مگر اسے وہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ وہ آگے بڑھا اور صندوق کھولنے کی کوشش کی مگر اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ رینڈل نے اپنے صندوق کے تالے کی چابی نکالی اور اسے تالے میں لگایا مگر وہ نہیں کھلا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ٹالبوٹ کے خیمے سے نکل رہا تھا تو اسی وقت اتفاق سے وہ بھی پہنچ گیا۔

''اے.... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے جب رینڈل کو اپنے خیمے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو غصے سے چلایا۔

''تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کا ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' رینڈل نے بھی غصے سے جواب دیا۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' وہ ایک بار پھر غصے سے چلایا۔

''میگی کو قتل کیا ہے اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے اس



کی لاش غائب کر دی ہے۔'' رینڈل بھی بدستور طیش میں نظر آ رہا تھا۔

''بکواس کرتے ہو تم۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ وہ موقع ملتے ہی تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب ناکام ہوئے تو اسے مار ڈالا۔''

''بکواس مت کرو۔ میرے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ یہاں ایک سے ایک خوبصورت اور پُرکشش قیدی عورت موجود ہے۔ میں ایک کمینی لڑکی کو اس بات پر کیوں قتل کرنے لگا؟''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' رینڈل نے کہا تو ٹالبوٹ بپھر گیا، وہ اسے مارنے کے لیے لپکا لیکن اسی دوران ایک اور ملاح اسمتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ ٹالبوٹ اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا، وہ بیچ میں آ گیا اور اس نے کسی نہ کسی طرح ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کروا دیا۔ اس نے رینڈل کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔ اس نے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ ابھی اس نے چند قدم ہی آگے بڑھائے ہوں گے کہ اسے پہلے تو ٹالبوٹ کے زوردار قہقہے کی آواز سنائی دی اور پھر اس کا جملہ۔ ''بے وقوف! خوامخواہ اس قیدی کے عشق میں پاگل ہو رہا ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے اور یہ میرے گلے پڑ رہا ہے۔'' وہ اسمتھ سے کہہ رہا تھا۔ یہ جملہ سن کر رینڈل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''چھوڑوں گا نہیں اسے۔ میگی نہیں تو پھر یہ بھی نہیں۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

رینڈل کی ڈیوٹی اسٹور پر لگی ہوئی تھی۔ وہ رات بھر اسٹور کی حفاظت پر مامور رہتا تھا۔ وہ گزشتہ رات سے جاگ رہا تھا مگر نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے خیمے میں آیا اور ٹھنڈے دل سے ساری صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ کئی گھنٹوں کے غور و خوض کے بعد بھی وہ اس بات پر قائم تھا کہ ہو نہ ہو، ٹالبوٹ ہی میگی کا قاتل ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایک معمولی چور کی خاطر شاہی فوج کے ملاح کو شاید قتل کی سزا نہ مل سکے اور رہا ثبوت تو اس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سب سے پہلے مضافات میں ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں کسی کو دفن کیا جا سکتا ہو۔

سڈنی ٹاؤن میں ایک قبرستان بھی تھا جہاں کئی قیدیوں اور خود شاہی فوج کے اُن سپاہیوں کی قبریں تھیں جو یہاں انتقال کر گئے تھے مگر اسے یقین تھا کہ ٹالبوٹ نے اسے قبرستان میں دفنانے کے بجائے کسی ویرانے میں گاڑا ہوگا۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد اسے اطراف میں ایک ہی جگہ ایسی نظر آئی جہاں کسی کو قتل کر کے دفن کیا جا سکتا تھا۔ یہ جگہ سڈنی ٹاؤن کے اطراف میں واقع ساحلی جنگل تھا۔

سہ پہر کو وہ اٹھا اور جنگل میں دور تک گیا۔ وہ زمین کو بغور دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ جنگل جھاڑیوں اور خاردار خودرَو پودوں سے اٹا ہوا تھا۔ اگر اس کے جسم پر موٹی سرخ فوجی وردی نہ ہوتی تو اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو چکا ہوتا۔ اس مہم میں اس کے ہاتھ اور خود چہرے پر بھی درختوں کے نکیلے پتوں کی وجہ سے کئی خراشیں لگیں لیکن وہ تن دہی سے اپنی تلاش میں مگن رہا۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے باوجود بھی وہ کسی ایسی جگہ کو تلاش کرنے میں ناکام رہا جس پر تازہ کھدائی کا ذرا سا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔

میگی کو غائب ہوئے تین روز ہو چکے تھے لیکن رینڈل بدستور اس کی تلاش میں مصروف تھا۔ وہ قیدیوں کے رہائشی علاقے میں بھی گیا تاکہ کوئی نہ کوئی سُن گُن لے سکے کہ غائب ہونے سے پہلے میگی کو کس کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔ جنگل کی تلاش اور قیدیوں سے کسی بھی قسم کی معلومات کے حصول میں ناکامی کے بعد آخر اس نے قبرستان کا رخ کیا۔ گورکن نے بتایا کہ یہاں آخری مُردہ ایک ہفتے پہلے دفن کیا گیا تھا۔ وہ ایک قیدی مرد تھا۔ اس بات سے بھی اسے بڑی مایوسی ہوئی۔

میگی کی گمشدگی کو ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا لیکن ڈھائی سو قیدیوں میں سے کسی نے بھی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ صرف ایک رینڈل ہی تھا جو اس کی تلاش میں خوار ہو رہا تھا۔ اب اسے میگی کی نہیں بلکہ اس کے قاتل کے خلاف ثبوت کی تلاش تھی مگر سر توڑ کوششوں کے باوجود بھی اسے صرف ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑا۔

ایک دن وہ میس میں تنہا بیٹھا لنچ کر رہا تھا کہ اسمتھ آ گیا۔ وہ اگرچہ ٹالبوٹ کا قریبی دوست تھا لیکن رینڈل سے بھی اس کی اچھی بنتی تھی۔ وہ اس کی میز پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کھانے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اسمتھ نے میگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''کچھ پتا چلا اُس کا؟''

''نہیں .... اور پتا چلے گا بھی نہیں کیونکہ وہ ٹالبوٹ کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے۔'' رینڈل نے خشک لہجے میں جواب



www.digestpk.com

Asifzamil

دیا۔

"دیکھو..... تم یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دو۔ ٹالبوٹ نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔" اسمتھ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" رینڈل طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا۔ تم بھی اس لیے یہ بات کر رہے ہو کہ میگی کے قاتل کے دوست جو ٹھہرے۔"

"تم بہت ہی بھولے ہو۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ذرا یہ سوچو کہ..... میگی کو قتل کرنے سے اسے کیا فائدہ ہو گا؟"

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔" رینڈل نے بے رخی سے کہا۔

"اوکے....." اسمتھ فوراً بول اٹھا۔ "چلو ذرا یہ بتاؤ کہ ایک قیدی عورت اگر تم میں دلچسپی لے رہی تھی تو تم سے اسے کیا فائدہ مل سکتا تھا؟"

"اس بات کا میں کیا جواب..... دے سکتا ہوں۔ یہ تو میگی ہی جانتی ہو گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔"

"یہ درست ہے لیکن سوچو کہ میگی کے قتل کی صورت میں ٹالبوٹ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اگر میگی تم سے راہ و رسم رکھتی تو تم سے اسے کئی فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔" اسمتھ منطقی انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ خوامخواہ اس معاملے میں ٹالبوٹ کو نہ گھسیٹے۔

"تم ایک آفیسر ہو۔ تمہیں درخواست پر ایک قیدی عورت بطور ہاؤس کیپر مل سکتی ہے۔ ایسے میں اسے قیدیوں کے بجائے تمہارے کیبن میں رہنے کی اجازت مل جائے گی۔ اسے کھانا بھی اچھا ملے گا اور قیدیوں کی نسبت زیادہ آزادی بھی میسر ہو گی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" رینڈل اب اسمتھ کی باتیں سن کر زچ ہونے لگا۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"سادہ سی بات ہے۔" اسمتھ نے بدستور دھیمے لہجے میں ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش شروع کی۔ "تم ٹالبوٹ کے مقابلے میں بڑے رینک کے افسر ہو۔ جب میگی نے دیکھا کہ ٹالبوٹ سے بڑا افسر میسر ہے تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور تمہارے سنگ ہو لی۔ اب ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی ایسا شخص مل گیا ہو جو تمہارے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو تو وہ تمہیں چھوڑ کر اس کے ساتھ نکل گئی۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔"

"میں بکواس نہیں کر رہا۔ وہ نوجوان ہے، خوبصورت ہے اور سب سے بڑھ کر ذہین ہے۔ اگر وہ ذہین نہ ہوتی تو چند ماہ کے اندر اندر دو افسروں کو اپنی زلف کا اسیر نہ بنا لیتی۔"

"تم خوامخواہ کی بات کر رہے ہو۔"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں..... پہلے اس نے ایک افسر پھنسایا۔ جب اسے اُس سے بڑا افسر ملا تو اُس کی ہو گئی۔ یقیناً اب اسے کوئی تیسرا اور تم سے بڑا افسر مل گیا ہو گا۔ تبھی وہ غائب ہے۔" اسمتھ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لعنت ہو تم پر۔" رینڈل نے اسمتھ کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا اور اٹھ کر میس سے باہر چلا آیا۔

کئی دن گزر چکے تھے۔ نہ تو میگی کا کوئی سراغ ملا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی ثبوت جس کی بنا پر یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کا قتل ہوا ہے۔ میجر رَوس کو بھی اس واقعے کا علم ہو چکا تھا لیکن اس نے کسی قسم کی تحقیقات کرنے کے بجائے فائل پر یہ لکھ کر اپنی جان چھڑا لی کہ وہ باٹنی بے کی طرف فرار ہو چکی ہے۔ یہ بات رینڈل کے علم میں بھی آ گئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میجر کے اس نوٹس کے بعد اب نہ تو میگی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی اور نہ ہی اس کے قاتل کا پتا چلایا جا سکے گا۔ رینڈل وہ واحد شخص تھا جو اب تک بدستور اس بات پر قائم تھا کہ میگی کو قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل ٹالبوٹ نے کیا ہے۔ جس نے بھی اس بات کو سنا، اس نے رینڈل کا مذاق اڑایا مگر وہ بدستور اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

میگی کی گمشدگی کو تین ہفتے بیت چکے تھے۔ سب معمول کے مطابق اپنی اپنی زندگی کے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے تھے، ماسوائے رینڈل کے۔ وہ اب تک میگی کا بکھیڑا اپنی جان سے لگائے پھر رہا تھا۔

رینڈل کے لیے یہ تین ہفتے نہایت کٹھن ثابت ہوئے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح کوئی ایسا سراغ مل سکے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ میگی نے اسے دھوکا نہیں دیا بلکہ اس کا قتل کیا گیا ہے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی جب اسے ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو پھر اس نے ایک منصوبہ بنایا۔

اگلے چند روز تک رینڈل نہایت خاموشی سے منصوبہ بندی کرتا رہا کہ کس طرح وہ فرار ہو کر باٹنی بے تک پہنچ سکتا ہے۔ آخر کار اسے وہ راستہ مل گیا۔ کافی تگ و دو کے بعد ایک



مقامی شخص نے کھانے پینے کے کچھ سامان کے عوض اس کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی۔ یہ رینڈل کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

رینڈل کی ڈیوٹی راشن اسٹور پر لگائی گئی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے جب اس نے اسٹور سے مطلوبہ سامان چرایا۔ اُس وقت تک اس کا مددگار بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے سامان اس کے حوالے کیا اور اسے ایک سنسان جگہ پر انتظار کرنے کا کہہ کر ملاحوں کے رہائشی خیموں کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ بخوبی جانتا تھا کہ ٹالبوٹ کا خیمہ کون سا ہے۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا ٹالبوٹ کے خیمے کے پاس پہنچا۔ کچھ دیر تک اندر کی بُن گن لیتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن دنوں ٹالبوٹ دن میں ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اندر سے خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کو یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند سویا ہوا ہے۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اس نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں اندازے سے چلتا ہوا بستر کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریشم کی بنی ہوئی پتلی لیکن نہایت مضبوط ڈور تھی۔

چند لمحوں کے بعد رینڈل بستر کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سوئے ہوئے شخص کی گردن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے بستر پر لیٹا ہوا جسم ذرا سا اچھلا۔ کچھ کسمسایا، کچھ تڑپا مگر اس کے گلے میں کسی ہوئی ریشم کی ڈور کی گرفت کمزور نہ پڑی۔ چند لمحوں میں ہی جسم ساکت ہو گیا۔ رینڈل اٹھا اور جس طرح خاموشی سے خیمے میں داخل ہوا تھا، اسی طرح باہر نکل آیا۔

"خدا کا شکر ہے۔ میں نے میگی کے قاتل سے بدلہ لے لیا۔" کھلی فضا میں پہنچ کر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ محفوظ ہے تو اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس طرح یہ بات کہہ رہا تھا جیسے کہیں اسے میگی بھی نظر آ رہی ہے..... کچھ دیر بعد مقامی مددگار اور ٹالبوٹ ساحلی جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تقریباً اگلے چھ روز تک جنگل میں پیدل چلتے چلتے آخر وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں سے انہیں کشتی مل گئی اور پھر دن بھر کی مسافت کے بعد وہ باٹنی بے نامی جزیرے پر پہنچ گیا۔ اس کے جسم پر بدستور انگلستانی فوجی وردی تھی جبکہ وہ جزیرہ فرنچ افواج کی عملداری میں تھا۔ اسے دیکھتے ہی فوراً فرنچ فوجیوں نے گرفتار کر لیا مگر جب اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے ملک کی فوج سے بغاوت کر کے نکلا ہے اور پناہ کی تلاش میں ہے تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ اس نے چند روز تک جزیرے پر رہنے کی اجازت مانگی جو اسے دے دی گئی۔

ٹالبوٹ کے قتل اور سڈنی ٹاؤن سے فرار کے بعد وہ ہفتہ بھر باٹنی بے پر رہا۔ اس دوران میں وہ سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا۔ وہ یہ پتا چلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر میگی یہاں ہوئی تو کہیں نہ کہیں اسے ضرور نظر آ جائے گی لیکن جب ہفتہ بھر کی کوششوں کے باوجود بھی اس کا کچھ اتا پتا نہ چلا تو وہ مایوس ضرور ہوا لیکن اس بات پر اسے فخر بھی محسوس ہوا کہ وہ درست سمجھ رہا تھا کہ میگی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اسے اب اس بات پر ذرّہ برابر بھی افسوس نہیں رہا تھا کہ ٹالبوٹ اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے ایک ایسے قاتل کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیا جسے بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ کیپٹن فلپ اور میجر رَوس کو بھی ٹالبوٹ کو بچانے کے جرم میں سزا دینا چاہتا تھا لیکن اتنے بڑے پیمانے پر واردات کرنے کے لیے اس کے اندر نہ تو حوصلہ تھا اور نہ ہی دماغ۔ اس لیے ان دونوں کو اس نے صرف بُرا بھلا کہنے پر ہی اکتفا کر لیا۔

باٹنی بے پر اس کا قیام خاصا طویل ہو چکا تھا۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ اب وہ انگلستان تو واپس جا نہیں سکتا اور نہ ہی ان کی کسی نوآبادی میں وہ محفوظ تھا اس لیے رینڈل نے فرانس فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو کب کا باٹنی بے سے نکل چکا ہوتا لیکن وہ مجبور تھا۔ بدقسمتی سے اب تک ایسا کوئی بھی فرنچ جہاز یہاں نہیں پہنچا تھا جو فرانس جا رہا ہو۔ اس طرح کئی ہفتے اور گزر گئے۔

باٹنی بے پر قیام کے دوران میں ہی اسے خبر ملی کہ انگلستان کے شاہی بحری بیڑے نے سڈنی ٹاؤن سے لنگر اٹھا لیے ہیں، اب وہ واپس انگلستان کے لیے روانہ ہو چکا ہے لیکن اس کے لیے یہ خبر بے معنی تھی۔ سڈنی ٹاؤن بدستور انگلستان کی نوآبادی تھا اور وہاں جانے کا مطلب خود اپنے ہاتھوں اپنی ہی قبر کھودنا تھا۔

خدا خدا کر کے آخر رینڈل کا انتظار ختم ہوا۔ ایک فرنچ جہاز باٹنی بے پہنچا۔ یہ جہاز تازہ دم فوجی دستے، راشن اور دیگر ساز و سامان لے کر آیا تھا۔ واپسی پر اسے یہاں موجود سپاہیوں کو لے کر فرانس روانہ ہونا تھا۔ جزیرے کے فرنچ کمانڈنگ آفیسر کی سفارش پر اسے بھی جہاز میں سوار ہونے کی اجازت مل گئی۔

رینڈل تجربہ کار ملاح تھا۔ جہاز کے کپتان سے چند روز میں ہی اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی اور پیرس پہنچنے سے قبل ہی اس نے رینڈل کو نوکری کی پیش کش بھی کر دی اور پھر طویل عرصے تک رینڈل فرانس کی بحریہ میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔



www.digestpk.com

Asifzamil

اس ملازمت کے دوران میں ہی رینڈل نے پیرس کے نواح میں ایک زمین کا ٹکڑا خرید کر اپنا گھر بھی بنالیا تھا اور ایک مقامی لڑکی سے شادی بھی کرلی۔ رینڈل کی بیوی الیرا اُس جہاز کے کپتان کی بھانجی تھی جس پر سوار ہو کر وہ باٹنی بے سے روانہ ہوا تھا۔ میگی کو لاپتا ہوئے تقریباً پندرہ سال گزر چکے تھے مگر اب بھی کبھی کبھار رینڈل کو اس کی یاد آجاتی تھی۔ جب بھی وہ اسے یاد آتی، وہ اگلے کئی روز تک افسردہ رہتا۔

طویل ملازمت کے بعد رینڈل نے ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی کے باقی ماندہ ایام بسر کرنے لگا۔ بظاہر اس کی زندگی خوشیوں سے بھرپور تھی لیکن اب بھی کبھی کبھار وہ یہ سوچنے لگتا کہ کاش اُس کی بیوی الیرا کی جگہ میگی ہوتی تو زندگی زیادہ مطمئن اور خوشحال گزرتی۔ برسوں گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے دل سے پہلی محبت کو نکال نہ پایا تھا۔ آج بھی اسے میگی کی سیاہ آنکھیں اور لمبے سیاہ بال یاد آتے تو اس کا دل تڑپ کر رہ جاتا۔ یہ سچ ہے کہ میگی اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ مدتوں گزر جانے کے باوجود اس کے دل میں پہلے پہلے عشق کی یاد ابھی تک تازہ تھی۔ رینڈل نے اپنے عشق کی بہار پر کبھی خزاں کو آنے ہی نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کو کئی سال بیت چکے تھے۔ رینڈل اب خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے صبح و شام یا تو سیر کرتے ہوئے گزرتے یا وہ کچھ لکھتا پڑھتا رہتا۔

یہ اکتوبر کی خنک صبح تھی۔

الیرا ناشتا تیار کررہی تھی اور رینڈل ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوا پندرہ روزہ اخبار رائل ایڈمرل ریویو کا مطالعہ کررہا تھا۔ یہ اخبار صرف بحریہ سے متعلق خبروں پر مشتمل ہوتا تھا اور پیرس سے شائع ہوتا تھا۔ اخبار میں انگلستان کے شاہی بحری بیڑے کے سربراہ ایڈمرل فلپ کی موت کی خبر چھپی تھی۔ خبر خاصی نمایاں شائع کی گئی تھی۔ اس خبر نے ایک بار پھر رینڈل کے سارے زخم ہرے کردیے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر کیپٹن فلپ اُس وقت ٹالبوٹ کے خلاف ایکشن لے لیتا تو کم سے کم میگی کی قبر کا تو پتا چل جاتا۔ اس کی باعزت طریقے سے تدفین تو کی جاسکتی تھی۔ یہ سوچ کر اسے ایک دم کیپٹن فلپ پر شدید غصہ آیا۔ اس نے نہایت حقارت سے وہ اخبار اس طرح زمین پر پھینک دیا جیسے وہ فلپ سے برسوں پہلے کی بات کا بدلہ لے رہا ہو۔

کچھ دیر بعد اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور زمین پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھا کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کیپٹن فلپ سے متعلق خبر کو پڑھنے لگا۔

خبر میں بتایا گیا تھا۔ ''انگلستان کی شاہی بحریہ میں کیپٹن کے عہدے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنے والے کیپٹن فلپ نے ایڈمرل کے عہدے تک ترقی حاصل کی۔ کئی سال پہلے انہیں ملازمت سے ریٹائر کردیا گیا تھا جس کے بعد سے وہ ساؤتھ ویلز میں واقع اپنے فارم ہاؤس میں اپنی مسز کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔'' یہاں تک تو اس خبر میں رینڈل کے لیے کوئی خاص بات موجود نہیں تھی لیکن جیسے ہی وہ اس کے اگلے حصے کو پڑھنے لگا، اس کی کیفیت ہی بدل گئی۔ اس کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔

خبر میں بتایا گیا تھا۔ ''کیپٹن فلپ نے سڈنی ٹاؤن میں قیام کے دوران ایک قیدی عورت سے شادی کی تھی جسے معمولی سی چوری کے جرم میں انگلستان بدر کردیا گیا تھا۔ تاہم کیپٹن فلپ نے اس سے شادی کی اور انہی کی درخواست پر شاہی حکم کے تحت اس کی سزا معاف کرکے وطن واپس آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ کیپٹن فلپ پیار سے اپنی بیگم کو میگی کہا کرتے تھے۔''

خبر پڑھتے ہوئے رینڈل کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ اخبار ایک طرف رکھ کر اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ ''آہ! بے چارہ ٹالبوٹ.....'' آج پہلی بار اسے ٹالبوٹ کی موت پر افسوس ہورہا تھا۔ ''اسمتھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔

''کیا ٹھیک کہا تھا؟'' الیرا میز پر ناشتا لگا رہی تھی۔ اس نے جب شوہر کی بڑبڑاہٹ سنی تو پوچھ لیا۔

''کچھ نہیں۔'' رینڈل نے چونک کر سر اٹھایا اور پاس کھڑی الیرا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ گھر تمہارے ہی لیے تھا اور رہے گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ سادہ سی گھریلو عورت شوہر کی یہ بات سن کر پریشان ہوگئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''کچھ خاص نہیں سوائے اس کے کہ مجھے تم سے ہی محبت ہے۔ اب بتاؤ ایک کپ کافی ملے گی بے؟'' یہ سُن کر الیرا شرما گئی۔

آج زندگی میں پہلی بار رینڈل نے نہایت ایمانداری اور خلوص سے اپنے دل میں یہ اعتراف کیا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ میگی اس گھر میں نہیں ہے ورنہ زندگی اتنی مطمئن اور پُرسکون نہیں ہوسکتی تھی۔



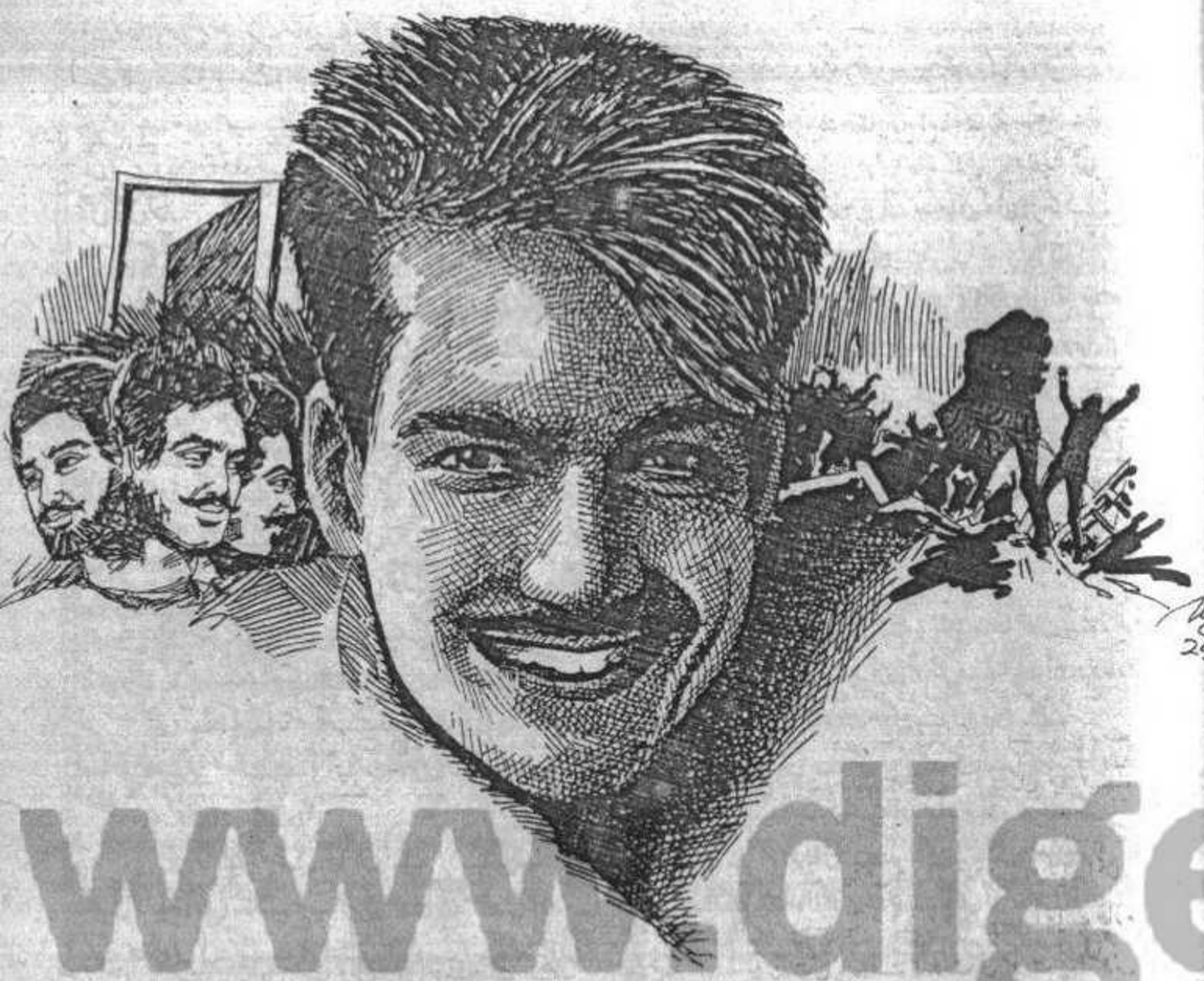

# فریبخہ

منظر امام

کسی کی راہ سے پتھر ہٹانا نیکی سمجھا جاتا ہے... وہ بھی اس پر عمل پیرا تھا... اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ انجانے میں اپنے لیے ان گنت مصائب جمع کررہا ہے...

**خوش گمانیوں میں رہنے والے شخص کا شگفتہ و پُرعبرت ماجرا**

مجھے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری زندگی اس طرح وبال بن کر رہ جائے گی۔ اس شام میں دفتر سے گھر واپس آیا تو بیوی نے سب سے پہلی خبر سنائی۔ ''کچھ معلوم ہے۔ آج پھر بہت ہنگامہ ہوا ہے۔''

''کس بات کا ہنگامہ؟'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ارے۔ وہی۔ مسرور اور اس کے سالوں کے درمیان۔'' بیوی نے بتایا۔ ''آج تو خون خرابے کی نوبت آگئی تھی۔''

''ویسے یہ تو روز کا معمول بن گیا ہے۔''

''ہاں، بن تو گیا ہے لیکن آج معاملہ کچھ سیریس ہوگیا تھا۔'' بیوی نے کہا۔ ''سنا ہے مسرور نے طیش میں آکر اپنا پستول نکال لیا تھا۔'' میں یہ سن کر پریشان ہوگیا۔

ہمارا محلہ سیدھا سادہ اور پُرسکون سا تھا۔ یہاں رہنے



www.digestpk.com

Asifzamil

والے عام طور پر سیدھے سادے اور پڑھے لکھے لوگ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک لیکن جب سے مسرور اور اس کا خاندان اس محلے میں آ کر آباد ہوا تھا، تب سے سوائے پریشانی کے یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

پتا نہیں، کس مزاج کے لوگ تھے۔ سوائے لڑائی جھگڑے کے اور کچھ نہیں کرتے تھے۔ مسرور اپنے تین عدد سالوں کے ساتھ رہتا تھا یا تینوں سالے اس کے ساتھ رہتے تھے۔ بات ایک ہی تھی۔

بظاہر مسرور بہت شریف انسان تھا۔ جب بھی مجھ سے ملاقات ہوتی تو آگے بڑھ کر خود ہی سلام کرتا اور خیریت دریافت کرتا۔ اس کے سالوں کی بھی وہی صورتِ حال تھی۔ وہ بھی بہت ملنسار تھے لیکن جب یہی لوگ گھر میں ایک ساتھ ہوتے تو قیامت برپا ہوجاتی۔ نہ جانے کس بات پر بات اتنی بڑھ جاتی کہ پورے محلے میں ان کی آوازیں گونج رہی ہوتیں۔

میں نے ایک بار مسرور سے دریافت بھی کیا۔ ''مسرور صاحب، یہ کیا سلسلہ ہے۔ آخر آپ لوگوں کے درمیان اتنے جھگڑے کیوں ہوتے ہیں؟''

مسرور نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بس بھائی، کیا بتاؤں... یہ سب میری بیوی کی غلطیوں اور اس کے بھائیوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں کو سر پر بٹھا رکھا ہے۔ شوہر کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو آپ ان تینوں کو اپنے گھر سے الگ کر دیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔'' مسرور نے کہا۔ ''میں نے ایک دو بار کہا بھی لیکن اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ میں صرف اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور ہوگیا ہوں۔ ورنہ نہ جانے کب کا اسے طلاق دے چکا ہوتا۔''

''خیر، اس حد تک تو نہ جائیں لیکن کوئی درمیان کا راستہ ضرور نکالیں۔''

''درمیان کا راستہ یہی ہے کہ میں کسی دن ان کم بختوں کو گولی ماردوں۔'' اور آج شاید یہی نوبت آ گئی تھی۔ اس لیے مسرور نے پستول نکال لیا تھا۔ ورنہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا۔

وہ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اس لیے میرا فرض بنتا تھا کہ میں جا کر صورتِ حال معلوم کروں اور ہوسکے تو سالوں اور بہنوئی کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو ختم کروادوں۔

میں نے جب اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو اس نے کہا۔ ''رہنے دیں، آپ کیوں ان جھگڑوں میں پڑتے ہیں۔''

''نہیں بھئی، یہ میرا فرض ہے کیونکہ پڑوس کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف ہے تو اس اختلاف کا ختم ہونا ضروری ہے۔''

''مرضی ہے آپ کی۔'' بیوی اتنا بول کر خاموش ہوگئی۔ وہ بے چاری اسی مزاج کی تھی۔ مجھ سے ذرا کم ہی اختلاف کیا کرتی تھی۔

میں وقت نکال کر مسرور کے گھر پہنچ گیا۔ مسرور گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ ''آئیں، آئیں۔ فیصل بھائی۔ آپ بالکل صحیح موقع پر آئے ہیں۔''

''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ ان بدمعاشوں نے زندگی عذاب کر کے رکھ دی ہے۔ آج تو میں نے ایک آدھ کو مار ہی دیا ہوتا لیکن ان کی قسمت اچھی ہے کہ وہ بچ گئے۔''

''ہاں، میں نے بھی یہ بات سنی ہے لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ غصہ اسی لیے حرام ہوتا ہے کہ غصے میں اچھے برے کی تمیز ختم ہوجاتی ہے۔'' ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مسرور کا ایک سالا تنویر ہمارے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے۔ اس نے مسرور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تم گھر کی لڑائی کو باہر تک کیوں پھیلا رہے ہو؟''

''تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' مسرور غصے سے بولا۔ ''فیصل بھائی میرے دوست ہیں، انہیں تم لوگوں کی بدتمیزیوں کی کہانی سنا رہا ہوں۔''

''کہانی تو اب ہوگی۔'' تنویر نے اچھل کر مسرور کو ایک گھونسا رسید کردیا۔

اس کی یہ حرکت مجھے بہت بری لگی۔ انتہائی گھٹیا پن کا مظاہرہ کیا تھا اس نے۔ میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں اپنے بڑے بہنوئی پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔'' تنویر اس وقت غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بری طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے مارنا شروع کردیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا ایک اور بھائی وہاں آ گیا اور وہ بھی بغیر کچھ معلوم کیے مجھ سے لپٹ پڑا۔

میں بھی کمزور تو نہیں تھا لیکن وہ دو تھے اور میں اکیلا۔ اس لیے جب تک محلے والے مجھے اور ان دونوں کو الگ



کرتے، اس وقت تک میری خاصی ٹھکائی ہوچکی تھی۔

میں جب سوجے ہوئے چہرے کے ساتھ گھر پہنچا تو بیوی نے واویلا مچانا شروع کردیا۔ ''ارے کیا ہوا، کس نے مارا ہے آپ کو؟''

''کسی نے نہیں۔'' میں نے جواب دیا لیکن بیوی کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے رو رو کر پوچھنا شروع کردیا۔ مجبوراً اسے سب کچھ بتانا پڑا۔ میرے خاموش ہوجانے کے بعد اس نے کہا۔ ''آخر وہی ہوا نا جس کا خطرہ تھا۔ منع بھی کیا تھا کہ ان لوگوں کے جھگڑے میں نہ پڑیں لیکن سنتا کون ہے اور انجام کیا ہوا... مار کھا کر آ گئے۔''

''دماغ مت خراب کرو میرا۔'' میں غصے سے بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں ان لوگوں کو آسانی سے چھوڑ دوں گا۔''

''خدا کے لیے اب بھی سنبھل جائیں اور بھول جائیں جو کچھ ہوا ہے۔ لعنت بھیجیں ان لوگوں پر۔''

''نہیں صفیہ، اگر میں خاموش ہوگیا نا تو یہ میری توہین ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''ان لوگوں سے میرے تعلقات ختم تو ہوگئے ہیں لیکن میں اتنی آسانی سے انہیں نہیں جانے دوں گا۔'' بیوی نے مجھے پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر تو جیسے بھوت ہی سوار ہوگیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ غصے میں کسی نے اس طرح مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہو اور وہ بھی بغیر کسی سبب کے۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی شریف آدمی دنگا فساد کرنے پر اتر آئے تو اس سے بڑا بدمعاش اور کوئی نہیں ہوتا اور میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں ان لوگوں کو مزہ ضرور چکھاؤں گا۔

میرے اس فیصلے کو اس وقت زیادہ تقویت ملی جب میں نے مسرور اور اس کے تینوں سالوں کو ایک ساتھ دیکھا۔ وہ ہنستے بولتے ہوئے اس طرح چلے جارہے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں نے اسی شام موقع پا کر مسرور سے کہا۔ ''مسرور صاحب، یہ کیا سلسلہ ہے۔ میں نے آپ ہی کی خاطر آپ کے سالوں سے جھگڑا کیا اور آپ ان ہی کے ساتھ دیکھے جارہے ہیں۔''

مسرور کے جواب نے تو مجھے پاگل ہی کردیا۔ اس نے کہا ''فیصل بھائی، اب جانے بھی دیں۔ آپ کیوں بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے دشمن تو نہیں رہ سکتے۔'' میں بھنّا کر رہ گیا۔

میں نے کہا تو کچھ نہیں لیکن میرا فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ اب مجھے سرور کے سالوں کے ساتھ ساتھ مسرور سے بھی چڑ ہوگئی تھی۔ وہ ایک خودغرض قسم کا انسان تھا۔

اسی رات مسرور کی بیوی میرے گھر آ گئی۔ اس وقت اتفاق سے میری بیوی گھر پر موجود نہیں تھی۔ مسرور کی بیوی کا آنا کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ لوگ میرے پڑوسی تھے۔ اس لیے اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

''فیصل بھائی، میں آپ سے ضروری بات کرنے آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اس سے کوئی بات کروں۔ اس کے بھائیوں اور شوہر نے میرے ساتھ کوئی مناسب سلوک تو نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ خود میرے پاس آئی تھی۔ اس لیے میں اس کی بات سننے بیٹھ گیا۔

''ہاں بتائیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں۔''

''فیصل بھائی، میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرے بھائیوں نے آپ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔''

ایک آدمی سڑک سے گزر رہا تھا کسی بلڈنگ پر سے اس کے سر پر پانی گرنے لگا تو وہ چلایا۔ ''پانی کون پھینک رہا ہے؟'' اس پر اوپر سے آواز آئی۔ ''ارے بھیا کس نے پھینکا ہم تو بچے کو پیشاب کرا رہے ہیں۔''

☆☆☆

ایک سہیلی: (دوسری سے) ''ارے سنگیتا تو نے اتنے لمبے آدمی کے ساتھ شادی کیسے کرلی؟''

سنگیتا: ''میں نے ان سے شادی اس لیے کی کہ یہ مجھ سے سر جھکا کر بات کریں اور میں ان سے سر اٹھا کر بات کروں۔''

☆☆☆

ایک جگہ شادی ہو رہی تھی، چند گویّوں نے دیکھا تو داخل ہوگئے۔ صاحب خانہ کو بڑا غصہ آیا۔ وہ گویوں کو بلانا نہیں چاہتے تھے۔ گویوں کو بھگانے کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں۔ گویے اندر آ کر گانے لگے آخرکار صاحبِ خانہ نے انہیں 100 روپے دیے اور جانے کو کہا کیونکہ لوگ ان کی بھونڈی آواز سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ کہنے لگے۔

''صاحب! ہم نے اتنا گایا ہے اور اس کا معاوضہ صرف 100 روپے۔''

تو لوگوں نے کہا۔ ''ارے بھائی یہ تمہارے گانے کے پیسے تھوڑے ہی ہیں، یہ تو تمہیں چپ کرانے کے پیسے ہیں۔''



www.digestpk.com

Asifzamil

"تم اپنے بھائیوں کی بات کررہی ہو۔" مجھے غصہ آنے لگا۔ "میں تو تمہارے شوہر تک کو دیکھ چکا ہوں۔"

"اس لیے تو آپ سے مدد لینے آئی ہوں کہ آپ کوئی راستہ نکالیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ مسرور کو کس طرح مجبور کردیا گیا ہے۔"

"مجبور کردیا گیا ہے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے ہنسی خوشی اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتی ہوں... ایسی بات نہیں ہے۔ میں ان کے سامنے بے بس ہوں۔ وہ تینوں بدمعاش ہیں اور ایسی کون عورت ہوگی جو اپنے شوہر کا ساتھ نہیں دے گی لیکن مجھے اس مقام تک پہنچادیا گیا ہے جہاں میرے لیے اب کوئی راستہ نہیں رہا۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی؟" میں نے کہا۔ "تم اپنے بھائیوں کو اپنے گھر سے نکال سکتی ہو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکتی۔ وہ تینوں ہی بدمعاش ہیں۔ ان کی فطرت میں سرکشی ہے۔ وہ مجھے یا مسرور کو نقصان پہنچادیں گے۔"

"لیکن مسرور تو ان کے ساتھ اب بہت خوش دکھائی دیتا ہے۔"

"وہ خوش نہیں ہیں فیصل بھائی۔ وہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر ایسا کررہے ہیں۔ ورنہ ان تینوں نے تو ان کی زندگی عذاب کرکے رکھ دی ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے بھائی ہیں تمہارے۔"

"اسی بات کا تو رونا ہے کہ خود بھائی ہی بہن کے دشمن ہوگئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"چلو مان لیا کہ یہ سب ہورہا ہے لیکن... میں کیا کرسکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا آپ بھول گئے ہیں کہ ان تینوں نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا؟"

"خیر اس بات کو تو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اور موقع ملا تو ان کا حساب برابر بھی کردوں گا۔"

"تو بس میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ میرا ساتھ دیں۔ کیا فائدہ ایسے بھائیوں کا جو اپنی بہن کے سہاگ کے دشمن ہوں۔ مسرور بے چارے آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔ وہ خود آتے آپ کے پاس لیکن میں نے انہیں منع کردیا اور خود آگئی۔"

"نہیں، مسرور کے لیے میرے دل میں کوئی شکایت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"فیصل بھائی، کچھ ایسا کریں کہ یہ کم بخت ہمارے گھر سے نکل جائیں۔ کوئی ایسا چکر چلائیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"دیکھو... اس قسم کے لوگ کسی قسم کی سازش سے نہیں جانے والے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ ویسے بھی لمبا سلسلہ ہوتا ہے کہ سازش کرو اور دیکھتے رہو کہ اس کا اثر کیا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ تو ڈائریکٹ کارروائی ہونی چاہیے اور براہِ راست ان کو دھکے دے کر گھر سے نکال دو۔ ان سے صاف صاف کہہ دو کہ وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔"

"پھر ہمارے لیے یہ کام آپ ہی کردیں۔"

"میں یہ کام کردوں۔ میں کس حیثیت سے ایسا کرسکتا ہوں۔ وہ تو پہلا سوال یہی کریں گے کہ آپ کون ہوتے ہیں ہمیں گھر سے نکالنے والے۔ جس طرح مسرور نے کہا تھا کہ آپ کون ہوتے ہیں مداخلت کرنے والے۔"

"میں نے بتایا نا کہ مسرور نے یہ بات مجبور ہوکر کہی تھی اور جہاں تک آپ کی حیثیت کا معاملہ ہے تو آپ ہمارے لیے بہت کچھ ہیں۔ پڑوسی بھی، دوست بھی۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اب ہم نے سارا اختیار آپ کو دے دیا ہے کیونکہ میں تو ان کی بہن ہوں۔ میں یہ بات ان لوگوں سے نہیں کرسکتی۔ مسرور اپنی مروت سے مجبور ہیں۔ اس لیے آپ ہی رہ جاتے ہیں۔"

کاش اس وقت میں نے یہ سوچ لیا ہوتا کہ مجھے اس چکر میں نہیں پڑنا چاہیے لیکن میں تو ان تینوں سے انتقام کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کا تھا لیکن میں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔

میں نے مسرور کی بیوی سے کہا۔ "بھابی آپ ایسا کریں کہ مسرور کو میرے پاس بھیج دیں۔ میں اس کو جو کچھ بتاؤں گا۔ آپ دونوں اس پر عمل کرلیں تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

دوسری صبح مسرور شرمندہ شرمندہ سا میرے سامنے آگیا۔ "فیصل بھائی، کیا بتاؤں میں ان کم بختوں کی وجہ سے کتنا الجھا ہوا ہوں۔ فیصلہ کرنا دشوار ہورہا ہے۔ انہوں نے مجھے نفسیاتی مریض بنادیا ہے۔ اس لیے میں اس دن آپ سے نہ جانے کیا الٹی سیدھی بکواس کرگیا تھا۔"



"ارے بھائی بھول جائیں اس کو۔ یہ سوچیں کہ اب کیا کرنا ہے؟"

"یہ تو آپ بتائیں گے۔" اس نے کہا۔ "آپ نے میری بیوی سے کہا تھا کہ آپ کے پاس کوئی ترکیب ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ مکان تبدیل کرلیں۔" میں نے بتایا۔ "اور ویسے بھی آپ کا مکان کرائے کا ہے۔"

"کیسے ہوسکتا ہے ایسا کہ ان لوگوں کو پتا نہیں چلے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "نہیں جناب یہ ترکیب مناسب نہیں ہے۔"

"آپ پورا منصوبہ تو سن لیں۔ آپ صرف دو کاروں کا فلیٹ تلاش کریں۔ ظاہر ہے اتنے چھوٹے سے فلیٹ میں وہ تینوں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے پھر آپ انہیں اپنی مجبوری بتاسکتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں الگ ہونا پڑے گا۔"

"ترکیب تو اچھی ہے۔" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ شگفتہ راضی ہوگی یا نہیں۔" شگفتہ مسرور کی بیوی کا نام تھا۔

مسرور کی بیوی نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کردیا۔ اس کا بھی کہنا معقول ہی تھا کہ اس سے بات نہیں بنے گی۔ یہ لوگ پھر بھی آتے جاتے رہیں گے۔ کوئی اور راستہ نکالا جائے۔

اس دوران میں ایک اور بات ہوئی۔ تنویر کے چھوٹے بھائی یعنی مسرور کے سالے نے ایک بار راستے میں مجھے پکڑلیا۔

"بھائی صاحب، آپ اپنی سازشیں بند کردیں ورنہ بہت بُرا ہوگا۔"

"کیسی سازشیں؟"

"ہمارے گھریلو معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کریں۔" اس نے کہا۔ "سب سے پہلے تو ہم تینوں اس مسرور سے نمٹیں گے جو آپ کے بہکاوے میں آرہا ہے۔ اس کے بعد آپ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

"تم لوگ مسرور کا اور میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ارے جاؤ، بہت دیکھے ہیں تم جیسے۔" اور شاید وہی ہماری اس کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ میں نے اسے مارنا شروع کردیا۔ اس دن جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں جی کھول کر اس کا بدلہ لے رہا تھا کیونکہ وہ اکیلا تھا پھر مجھ سے کچھ کمزور بھی تھا۔

دو دوست ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اچانک ایک نے دوسرے سے کہا۔

"ہمارے پیچھے کوئی خوب صورت لڑکی آرہی ہے۔"

دوسرے نے پلٹ کر دیکھا تو واقعی ایک خوب صورت لڑکی خراماں خراماں آرہی تھی۔ دوسرے نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ پیچھے کوئی خوب صورت لڑکی آرہی ہے؟"

"بہت آسانی سے، سامنے ایک نوجوان اس کی طرف دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوسکا کہ سامنے گٹر کا ڈھکن غائب ہے۔"

**چارسدہ سے کاشف خان کی عنایت**

میں نے اسے بری طرح مارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا اور لہولہان ہوگیا۔ سب سے بڑا تماشا اس وقت ہوا جب ہنگامہ سن کر مسرور اور اس کی بیوی بھی باہر آگئے۔ اس کی بیوی نے آتے ہی شور مچانا شروع کردیا۔

"ہائے، ہائے میرے بھائی کو مار دیا۔ خون کردیا میرے بھائی کا... دوڑو... پکڑو۔"

انتہا یہ تھی کہ خود وہ کم بخت مسرور بھی بکواس کرنے لگا۔

"ارے بھائی کس نے کہا تھا کہ اس بری طرح ماریں اس کو۔ آپ نے تو ظلم کی انتہا کردی۔" ستم یہ ہوا کہ اس کے باقی دونوں سالے بھی آگئے۔ وہ مجھ سے لپٹ پڑے۔ اس کے بعد کی کہانی بہت طویل اور دردناک ہے۔

زخمی سالے کو اسپتال پہنچادیا گیا اور میرے خلاف ایف آئی آر درج کروادی گئی۔ پولیس مجھے اٹھا کرلے گئی۔ کچھ رشتے داروں نے میری ضمانت کروادی۔

یہ سب تو تھا ہی لیکن المیہ یہ تھا کہ مسرور بھی ان تینوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے مجھ سے اس طرح آنکھیں پھیرلی تھیں جیسے اس جھگڑے سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

ان کی بے وفائی مجھے خون کے آنسو رلا رہی تھی لیکن کیا فائدہ... میرا کیس تو ابھی تک چل رہا ہے۔ نہ جانے کتنے روپے میں وکیل کو دے چکا ہوں لیکن ابھی تک پیشیاں ہی بھگت رہا ہوں۔ اس چکر میں میری جاب بھی ختم ہوگئی۔ اور اب جاکر مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ "جھگڑے میں کودنا بہت آسان ہے لیکن اس سے نکلنا بہت مشکل..."



www.digestpk.com

Asifzamil



پہلا رنگ

# مسافتیں

سلیم فاروقی

غروبِ آفتاب سے طلوعِ صبح تک
کہیں کوئی ستارا ہے جو کشتیوں کا پاسبان ہے

اماوس کی راتیں کتنی ہی کیوں نہ ہوں... امید اور رجائیت کے چراغ ہمیشہ فروزاں رہتے ہیں... ظلم کے سامنے سر اٹھانا ہی دراصل ظلم کی موت ہے... چاہے وقوع پذیر ہونے میں کتنا ہی وقت لگ جائے... ایک ایسے ہی نوجوان کی سرگزشت جو ناانصافی اور ظلم کے خلاف تھا... اسے اپنی ذات اور فہم و فراست پر مکمل یقین و اعتبار تھا... لیکن حالات کی کشیدہ صورتِ حال اس کی مسافتوں کو ہر دم طویل کر رہی تھی... خرابات کے سلسلے اس کی زندگی کو اندھیروں سے قریب اور اجالوں سے دور کر رہے تھے...

**کٹھن راستوں کا انتخاب کرنے والے ایک پُرجوش نوجوان کا سفرِ خارزار**

میری آنکھ کھلی تو وال کلاک نو بجا رہی تھی۔ ثنا اس وقت بستر پر نہیں تھی۔ میں نے کسل مندی سے انگڑائی لی اور ثنا کو آواز دی۔ ''ثنا!''

ثنا شاید کچن میں تھی۔ وہ میری آواز پر کمرے میں آ گئی۔

''چائے تو لاؤ!'' میں نے کہا۔ ''تاکہ میری آنکھیں کھلیں۔''

''دودھ نہیں ہے۔'' ثنا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''دودھ والے نے دودھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا؟ اس نے انکار کیوں کر دیا؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ پہلے اپنا پچھلا حساب چکائیں۔'' ثنا نے تلخی سے کہا۔

''اچھا چھوڑو دودھ کو..... آج بغیر دودھ کی چائے ہی پی لوں گا۔''

''چائے بنانے کے لیے پتّی اور چینی کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔'' ثنا کا لہجہ حسبِ معمول تلخ تھا۔ ''پتی، چینی، دودھ کچھ نہیں ہے۔ گرم پانی لا دوں؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''حالات ذرا سے خراب ہو گئے ہیں تو تم اس لہجے میں بات کرنے لگی ہو؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''کل سے جب فاقے شروع ہوں گے پھر پوچھوں گی آپ سے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''اللہ کے واسطے ثنا۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''صبح صبح میرا دماغ خراب مت کرو۔''

''دماغ تو دن بھر میرا خراب ہوتا ہے۔ کبھی مالکِ مکان دروازہ بجاتا ہے، کبھی دودھ والا، کبھی اخبار والا۔ یہ سب تو مجھے باتیں سناتے ہیں۔''

''اچھا چھوڑو، تم مجھے ایک گلاس پانی پلا دو اور اخبار لے آؤ۔''

''اخبار؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''اخبار والے نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب وہ اخبار نہیں لائے گا۔'' وہ پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

جاتے ہوئے اس پر میری نظر پڑی۔ یہ وہ ثنا تو نہیں تھی جسے میں نے کبھی چاہا تھا..... جس سے ملنے کو میں بے چین رہتا تھا۔

اس وقت وہ خوب صورت، تر و تازہ اور انتہائی پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ وہ خاصی خوش لباس تھی اور اس کے گھنے براؤن بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بہت خوب صورت لگتے تھے۔ اس کا جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔

ابھی جس ثنا کو میں نے دیکھا تھا، وہ اس سے یکسر مختلف تھی۔ اس کے کپڑے ملگجے اور بال کھردرے سے ہو رہے تھے۔ جسم ابھی تک ویسا ہی تھا لیکن چہرے کے گلاب نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی اور جس آواز میں ایک عجیب سی نغمگی تھی، وہ اب کانوں کو گراں گزر رہی تھی۔

اس میں اس بے چاری کا بھی کیا قصور؟ قصور تو میرا ہی تھا۔ مجھے اپنی سچائی اور اصول پرستی کی سزا مل رہی تھی۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں۔ ابّو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ امی بھی ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ میرا بچپن اور لڑکپن بہت آسودگی بلکہ عیاشی میں گزرا تھا۔

امی مجھے انجینئر بنانا چاہتی تھیں لیکن مجھے تو صحافت کا شوق تھا۔ ابو نے کہا کہ اس پر اپنی رائے مت ٹھونسو۔ یہ جو پڑھنا چاہتا ہے، پڑھنے دو۔

یوں بی اے کے بعد میں نے یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کیا۔ ابو چاہتے تھے کہ میں یونیورسٹی میں پڑھانے لگوں۔ ایم اے میں میری دوسری پوزیشن تھی اور یونیورسٹی کی طرف سے مجھے ملازمت کی پیش کش بھی ہوئی تھی۔

میں نے ابو سے کہا۔ ''مجھے اگر یونیورسٹی ہی میں پڑھانا ہوتا تو میں کسی بھی مضمون میں ایم اے کر لیتا۔ میں عملی طور پر صحافت کرنا چاہتا ہوں۔''

''عملی صحافت!'' ابو نے ہنس کر کہا۔ ''عملی صحافت تمہارے بس کا کام نہیں ہے سلمان!''

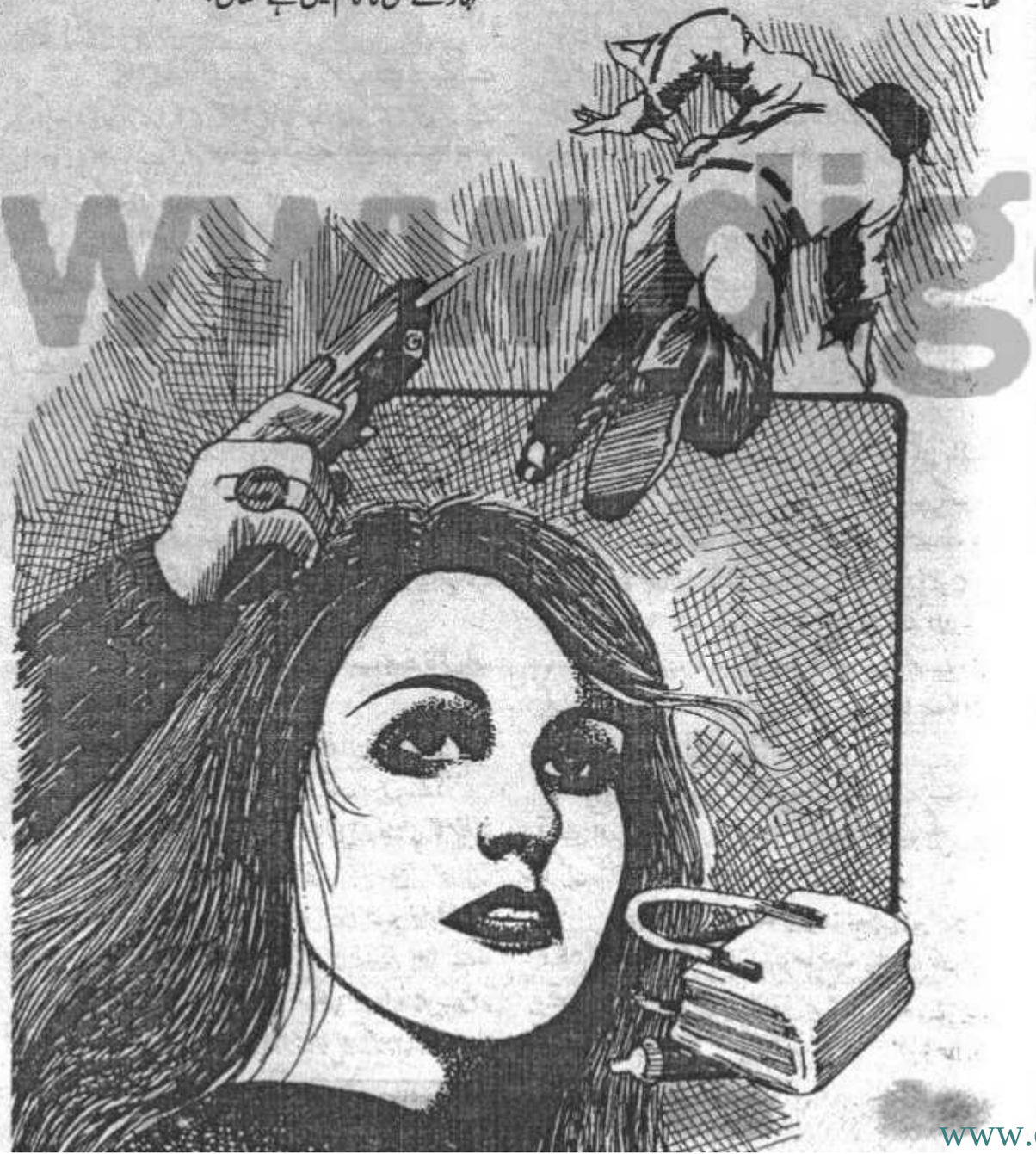





www.digestpk.com

Asifzamil

"کیوں ابو؟" میں نے بُرا مان کر کہا۔ "یہ جو اتنے بڑے بڑے صحافی ہیں، یہ کیا کسی اور ملک سے آئے ہیں۔ ان میں سے اکثریت تو ہماری یونیورسٹی کے فارغ ہونے والوں کی ہے۔ پھر اب تو الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ میں عملی صحافت کیوں نہیں کرسکتا؟"

"صحافت میں بعض اوقات جھوٹ بولنا پڑتا ہے..... حالات سے سمجھوتا بھی کرنا پڑتا ہے۔ تمہارے مزاج میں یہ سب کہاں ہے؟"

میں نے ابو کو مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، شورش کاشمیری وغیرہ کی مثالیں دیں تو وہ مسکرا کر بولے۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی بھر حالات سے لڑتے رہے۔ انہوں نے صحافت کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے بیٹا۔"

"ابو! وہ دور تو غلامی کا تھا، اب تو ہم آزاد ہیں، ہمارا میڈیا آزاد ہے اور....."

"اچھا اچھا۔" ابو نے حسبِ معمول مجھے بولنے سے روک دیا۔ "میرا کام سمجھانا تھا۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے احساس ہورہا ہے کہ تم صحافت کا فیصلہ کر چکے ہو۔ بیٹا! تم جو مناسب سمجھتے ہو کرو۔"

یہ ابو کا اصول تھا۔ وہ کبھی بھی اپنی رائے دوسروں پر نہیں تھوپتے تھے۔

انہی دنوں ملک کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے سے انٹرویو کا خط آ گیا۔ میں نے ایم اے کا نتیجہ آنے سے پہلے ہی وہاں درخواست دے دی تھی۔

وہ ملک کا خاصا بڑا اخبار تھا۔ بس ایک ہی خرابی تھی کہ اس کے مالک شجاع صاحب خود صحافی نہیں تھے۔ مالک اگر خود صحافی نہ ہو تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوتے لیکن شجاع صاحب کو ابتدا ہی میں صحافیوں کی ایسی ٹیم مل گئی تھی کہ اس نے پورے اخبار کو سنبھال لیا۔

اخبار کے ایڈیٹر شریف الدین صاحب بہت قابل اور منجھے ہوئے صحافی تھے۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "سلمان صاحب! آپ ڈیسک پر کام کرنا پسند کریں گے یا رپورٹنگ کریں گے؟"

میں نے کہا۔ "سر! میں فی الحال ڈیسک پر کام کرنا چاہوں گا۔"

ہمارے یونیورسٹی کے ایک استاد نے کہا تھا کہ کامیاب صحافی وہی ہوتا ہے جو بہترین ایڈیٹر ہوتا ہے۔ ڈیسک پر کام کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کروں۔ اس سے خبروں کی اہمیت اور ان کی ساخت کا علم ہوتا ہے۔ کون سی خبر کو کتنے کالم میں لگانا چاہیے، کس صفحے پر لگانا چاہیے اور کس انداز میں لگانا چاہیے، یہ سب باتیں ڈیسک پر بیٹھ کر اور خبریں بنا کر ہی سیکھی جاسکتی ہیں۔ رپورٹر کا کام تو دفتر کے باہر ہوتا ہے۔ وہ سیکھنا بھی بہت ضروری ہے لیکن پہلے ایڈیٹنگ!

میرے جواب سے شریف الدین صاحب بہت خوش ہوئے اور بولے۔ "آپ واقعی اس شعبے میں کامیاب رہیں گے۔"

یوں میں نے اس روزنامے میں ملازمت شروع کر دی۔ کام میرا من پسند تھا لیکن اوقات بہت تکلیف دہ تھے۔ یعنی شام کو چار بجے سے رات دو بجے تک کیونکہ اخبار کی آخری کاپی رات کے دو بجے تک ہی پریس میں جاتی تھی۔

وہاں کام کر کے مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ انسان اپنے اردگرد کے لوگوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ کسی بھی تقریب میں شرکت نہیں کرسکتا، کسی سے ملاقات نہیں کر سکتا کہ جو تقریبات اور ملنے ملانے کا وقت ہوتا ہے، میں اس وقت دفتر میں ہوتا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ جاپان میں کیا ہوا، امریکا نے عراق اور افغانستان میں کیا کیا، دنیا میں کہاں ہوائی حادثہ ہوا، کہاں بم کا دھماکا ہوا لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ گھر میں کیا صورتِ حال ہے۔ امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ عجیب زندگی ہو کر رہ گئی تھی لیکن یہ میرا اپنا انتخاب تھا اس لیے میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے کام کرنے میں مزہ آتا تھا۔

ان دنوں امی کی طبیعت خراب تھی۔ میں تین ساڑھے تین بجے تک گھر پہنچتا تو وہ اکثر جاگ رہی ہوتی تھیں۔ وہ مجھے کھانا دیتیں، چائے دیتیں اور اس امید میں میرے پاس بیٹھ جاتیں کہ میں ان سے باتیں کروں لیکن میں تو بستر پر لیٹتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ دوسرے دن بارہ، ساڑھے بارہ بجے تک سوتا رہتا پھر نہانے دھونے، ناشتا کرنے اور کپڑے استری کرنے میں میرے جانے کا وقت ہو جاتا۔ بس زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔

ایک دن میرے نیوز ایڈیٹر صاحب میرے پاس آئے اور بولے۔ "سلمان صاحب! آپ گھر چلے جائیں۔"

"کیوں سر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ اس وقت تو کام کا شدید دباؤ تھا اور ایک صاحب پہلے ہی نہیں آئے تھے۔

"آپ کے والد کا ٹیلی فون آیا تھا۔" انہوں نے کہا۔



"آپ کی والدہ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کچھ خراب؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "ابو طبیعت کچھ خراب ہونے پر تو مجھے کبھی ٹیلی فون نہیں کرتے۔"

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی اپنی بنائی ہوئی خبریں سمیٹنے لگا۔

"آپ رہنے دیں۔" نیوز ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ "آپ جائیں ورنہ ابھی کام کا پریشر اور بڑھ جائے گا، پھر آپ کا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے اپنی ڈائری اٹھائی اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر میں نے اپنا سیل فون آن کیا۔ میں دفتر میں عموماً سیل فون آف ہی رکھتا تھا کہ میرے کام میں مداخلت نہ ہو۔ میرے اکثر ساتھی بھی اپنے سیل فون بند ہی رکھتے تھے۔

میں نے ابو کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے فوراً ہی ٹیلی فون اٹھالیا۔

میری آواز سنتے ہی وہ بولے۔ "سلمان بیٹا! تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں دفتر سے نکل چکا ہوں اور گھر آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب وہ ٹھیک ہیں۔ تم چھٹی کے بعد ہی آنا۔"

"ابو! میں دفتر سے نکل چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور آدھے گھنٹے تک گھر پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کسی رکشا یا ٹیکسی کی تلاش میں اردگرد نظریں دوڑائیں۔ اچانک ایک گاڑی میرے نزدیک آ کر ٹھہر گئی۔ اس میں سے مسعود کی آواز آئی۔ "ارے سلمان! خیریت تو ہے..... تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا آج تمہارا آف ہے؟"

وہ ہمارے اخبار کا کرائم رپورٹر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں امی کی طبیعت کی خرابی کے سبب گھر جا رہا ہوں۔

"آؤ بیٹھو، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ میں بھی اتفاق سے اسی طرف جا رہا ہوں۔" مسعود نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اندر ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا اور اس کی خوش گوار خنکی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ گاڑی بھی تقریباً نئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ مسعود کی تنخواہ مجھ سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ وہ تنخواہ میں اتنی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ لوگوں کو بلیک میل کر کے پیسے کماتا تھا۔ خاص طور پر پولیس سے تو وہ ہر ماہ ایک خطیر رقم وصول کرتا تھا۔

اس نے مجھے پندرہ منٹ کے اندر اندر گھر پہنچا دیا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو امی اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں۔

"امی!" میں نے جلدی سے کہا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ارے، تم کیسے بے وقت آ گئے؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں بیٹا!"

میری آواز سن کر ابو بھی آ گئے اور بولے۔ "اپنی ماں کو سمجھاؤ کہ یہ اتنی محنت نہ کرے۔"

"امی کو ہوا کیا تھا؟"

"انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا لیکن وہ بڑھ بھی سکتا تھا۔ میں انہیں فوراً اسپتال لے گیا... اور تمہیں ٹیلی فون کر دیا تھا۔ لیکن اب اللہ کا شکر ہے، ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہے۔"

"تو امی، آج کے بعد آپ آرام کریں گی۔ گھر کے کام کاج کے لیے کوئی ماسی رکھ لیں۔" میں نے کہا۔ "اور اسکول سے بھی دو تین مہینے کی چھٹی لے لیں۔"

اس دن امی نے مجھ سے ڈھیروں باتیں کیں۔ مجھے بھی گھر آ کر اس وقت بہت اچھا لگ رہا تھا۔ امی کی ہر بات کی تان میری شادی پر ٹوٹتی تھی۔ وہ جلد سے جلد میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

انہی دنوں خاندان میں ایک شادی تھی۔ اس دن میرا آف تھا۔ امی کے مجبور کرنے پر میں بھی شادی میں چلا گیا۔

وہاں میں نے پہلی دفعہ ثنا کو دیکھا۔ وہ شوخ اور پٹر پٹر بولنے والی خوب صورت لڑکی پہلی ہی ملاقات میں میرے دل میں اتر گئی۔

"آپ جرنلسٹ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں، مجھے تو جرنلسٹ بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔

وہ میری رشتے کی ایک خالہ کی بیٹی تھی کیونکہ اس کی امی، میری امی کی چچازاد تھیں۔

پھر تو اکثر میں ان کے گھر جانے لگا۔ ہر ملاقات میں وہ مجھے پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی۔

وہ ان دنوں بی اے کر رہی تھی۔

میں صرف اسی دن اس سے ملاقات کرتا تھا جس دن میرا آف ہوتا تھا۔ پورا ہفتہ گزارنا میرے لیے عذاب ہو جاتا تھا۔

ہاں، سیل فون پر البتہ اس سے روزانہ بات ہو جاتی



www.digestpk.com

تھی۔ میں نے اس سے ملاقات کا حل بھی نکال لیا۔

صبح کے وقت تو میں گھر ہی میں ہوتا تھا۔ میں نے ثنا سے کہا۔ ”ثنا! کیا تم آج میری خاطر چھٹی کر سکتی ہو؟“

”کیوں؟“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ”آج کیا آپ کی منگنی ہو رہی ہے؟“

”آج تم سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”تو میرے چھٹی کرنے سے کیا ہوگا؟“ اس نے کہا۔

”بھئی، آج کہیں گھومیں پھریں گے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔

”سلمان صاحب!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ مجھے بہت غلط سمجھ رہے ہیں، میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔“

”ثنا صاحبہ! غلط تو آپ مجھے سمجھ رہی ہیں۔“ میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ ”میں بھی اس قسم کا لڑکا نہیں ہوں کہ لڑکیوں سے فلرٹ کرتا پھروں۔ میری بات سے آپ کو تکلیف پہنچی، اس کے لیے معذرت۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند لمحے بعد میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر ثنا کا نام دیکھ کر میں نے لائن کاٹ دی۔ پھر دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا۔

میں جلتا کڑھتا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا کہ ناحق میں نے اپنی نیند خراب کی۔

کچھ دیر بعد گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر بعد امی کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔ ”سلمان! تمہارا ٹیلی فون ہے۔“ امی نے اسکول سے چھٹی لے لی تھی اور اب واقعی سارا وقت آرام ہی کرتی تھیں۔

’اس وقت کس کا ٹیلی فون آگیا؟‘ میں نے سوچا۔ ’وہ بھی لینڈ لائن پر!‘

میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ثنا کی آواز سنائی دی۔

”اب کیا بات ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”سلمان..... ٹیلی فون بند مت کیجیے گا پلیز! میری بات سن لیں۔“

”جی سنائیے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں تو مذاق کر رہی تھی۔ بتائیے، کہاں آؤں؟“

میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تم ایسا کرو گھر آجاؤ۔“

”آنٹی کیا سوچیں گی؟“ اس نے کہا۔

”بھئی وہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچیں گی کہ ثنا آج کالج نہیں گئی اور کیا سوچیں گی؟“

یوں ثنا ہمارے گھر آگئی۔ امی بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ وہ کالج کے سفید یونیفارم میں تو کچھ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

یوں ہماری ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور میری سپاٹ اور بے رنگ زندگی میں بھی کچھ رنگ بکھر گئے۔

امی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میں ثنا کی محبت میں گرفتار ہوں۔ شادی کے موضوع پر آج تک ثنا سے میری بات نہیں ہوئی تھی۔

امی نے مجھ سے کہا۔ ”سلمان! ثنا اچھی لڑکی ہے۔ تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

میں ایک دم بوکھلا گیا۔ ”امی..... وہ..... میں نے ابھی تک..... شادی کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔“

”تو اب سوچ لو۔ بیٹا! میں تو چاہتی ہوں کہ اپنی زندگی ہی میں تمہارے سر پر سہرا سجا دوں۔ کل نہ جانے میں رہوں یا نہ رہوں۔“

”امی! آپ ایسی باتیں کریں گی تو میں تین چار شادیاں ایک ساتھ کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔

امی میری بات پر ہنسنے لگیں اور بولیں۔ ”تو ابھی صرف ایک شادی تو کر لے۔“

”تو پھر جائیں ثنا کے گھر۔“ میں نے یوں کہا جیسے امی پر احسان کر رہا ہوں۔

یوں دو مہینے کے اندر اندر ثنا میری دلہن بن کر آگئی۔

میرے گھر میں گویا ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ ثنا کی مترنم ہنسی سے گھر کا سناٹا ٹوٹ گیا۔

امی تو ثنا کی دیوانی تھیں۔ ابو بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔

سال بھر میں ثنا نے امی کی دوسری خواہش بھی پوری کر دی اور انہیں دادی بنا دیا۔ ننھے فہد کی کلکاریوں سے میرا گھر گویا جنت بن گیا۔

ثنا کو مجھ سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ میں اسے وقت نہیں دیتا، اس کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت نہیں کرتا، اسے شاپنگ نہیں کراتا۔

میں اس سے یہی کہتا تھا کہ میں رپورٹنگ میں تبادلے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر میں آٹھ، دس بجے تک گھر آجایا کروں گا۔ دوپہر کا کھانا بھی گھر ہی میں کھاؤں گا۔

میرے اصرار پر شریف الدین صاحب نے مجھے رپورٹنگ پر لگا دیا۔




جدید طبی تحقیق ”ہارموٹانک کریم“ رنگ گورا کرنے اور اکثر جلدی امراض کیلئے انتہائی مفید، بے ضرر اور سستی ثابت ہوئی

صبح، دوپہر، شام تین دن مسلسل استعمال سے کیل، دانے، چھائیاں ختم اور رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ چہرہ معصوم، شگفتہ اور شاداب نظر آتا ہے

ایک ہاتھ پر ”ہارموٹانک کریم“ اور دوسرے پر کوئی بھی مہنگی سے مہنگی کریم لگا کر دیکھیں
”ہارموٹانک کریم“ والا ہاتھ واضح طور پر نرم و ملائم اور گورا ہوگا

رنگ:

صحت مند جلد کے فوائد:

جلد اور حفاظت:

ہارموٹانک کریم کے استعمال، فوائد:

عمل بھاپ سے ایک ہی دن میں نکھرنا:

پرہیز:

نوٹ:

صارفین کے تاثرات:

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکو پانڈ، مینگورہ (سوات)
042-37666818
0300-9486848

نوٹ: ہارموٹانک کریم حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ) بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں

Asifzamil

ہمارے چیف رپورٹر اسد ہاشمی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم کون سی رپورٹنگ کرنا پسند کرو گے؟ کورٹ رپورٹنگ، پولیٹیکل رپورٹنگ، میڈیکل رپورٹنگ یا پھر.....''

اسی وقت مسعود کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''سر! مجھے ایک معاون کی ضرورت ہے۔ آپ سلمان کو میرے حوالے کردیں۔''

میں نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ یوں میں مسعود کے ساتھ رہ کر کرائم رپورٹنگ سیکھنے لگا۔

مسعود نے جلد ہی مجھے کرائم رپورٹنگ میں طاق کر دیا۔ اب میں اپنے طور پر بھی کام کرنے لگا لیکن ہر خبر پہلے میں مسعود کو دیتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت سینئر تھا اور کچھ ہی دنوں بعد چیف رپورٹر بننے والا تھا۔

ایک دن میں پولیس کے خلاف ایک خبر لے کر آیا اور اسے بنا کر حسبِ معمول مسعود کی میز پر رکھ دیا۔ مسعود اس وقت تک دفتر نہیں پہنچا تھا۔

ایک گھنٹے بعد مسعود نے مجھے اپنے کیبن میں بلا لیا اور بولا۔ ''سلمان! تم تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔'' پھر اس نے اپنی دراز کھولی اور ایک لفافہ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

''یہ کیا ہے مسعود؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ تمہارا انعام ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دس ہزار روپے تھے۔

''یہ کیسا انعام ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کس کی طرف سے ہے؟''

''ارے یار! تم آم کھاؤ، پیڑ گننے کیوں بیٹھ گئے؟'' مسعود کچھ جھنجلا گیا۔

''مجھے معلوم تو ہونا چاہیے مسعود!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ اس ایس ایس پی کی طرف سے ہے جس کی خبر تم نے بنائی ہے۔'' مسعود نے کہا۔

ایک دم ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ خبر دیکھ کر مسعود نے اس ایس ایس پی سے رابطہ کیا ہوگا اور اسے خبر کے بارے میں بتایا ہوگا۔ ایس ایس پی نے خبر روکنے کے لیے مسعود کو رشوت دی ہوگی۔ خبر اتنی بڑی تھی کہ مسعود نے اس کے صرف دس ہزار وصول نہیں کیے ہوں گے۔

''سوری۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں یہ نہیں لے سکتا۔''

''تم ابھی نئے ہو سلمان۔'' مسعود نے کہا۔ ''کیا زندگی بھر اسی طرح کام کرتے رہو گے؟ ساری زندگی اس موٹر سائیکل پر گزار دو گے جو اخبار کی طرف سے تمہیں ملی ہے؟''

''میں اسی میں مطمئن ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' مسعود نے خشک لہجے میں کہا اور لفافہ دوبارہ دراز میں ڈال دیا۔

دوسرے دن کے اخبار میں وہ خبر نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ میں شریف الدین صاحب سے اس سلسلے میں بات کروں، پھر یہ سوچ کر ان سے بات نہیں کی کہ میں نے تو اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب خبر کا لگنا یا نہ لگنا میری ذمے داری نہیں ہے۔

میں اب دس بجے تک گھر آ جاتا تھا۔ کوئی اہم خبر ہوتی تو وہ گھر ہی سے ٹیلی فون پر لکھوا دیتا تھا۔

زندگی بہت پُرسکون انداز میں گزر رہی تھی کہ اچانک سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ امی اور ابو کسی تقریب میں گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر ان کی ٹیکسی کسی بس سے ٹکرا گئی۔ وہ دونوں شدید زخمی ہو گئے۔ ابو تو اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ہر تکلیف سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔ امی کی حالت نازک تھی اور وہ آئی سی یو میں تھیں۔

میرے سر پر تو گویا مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ابو کی موت کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ امی بھی مُردوں سے بدتر حالت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔

میں نے ان کے علاج کے لیے پیسا پانی کی طرح بہایا۔ انہیں شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں داخل کرایا۔ میرا خیال تھا کہ اخبار سے مجھے ان کے علاج کے لیے رقم مل جائے گی لیکن شریف الدین صاحب نے کہا کہ وہ اسپتال اب ہمارے اخبار کے پینل پر نہیں ہے۔ اصل میں لوگوں نے اس مراعت سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ذرا ذرا سی بیماریوں کے لیے..... ہر آدمی اس اسپتال کا رخ کرتا تھا۔

میں وہاں سے مایوس ہو کر نکل آیا۔ امی گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے اسی اسپتال میں تھیں اور اب تک لاکھوں کا بل بن چکا تھا۔

مصیبت کی اس گھڑی میں ثنا نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا لیکن اتنی بڑی رقم کا بندوبست تو وہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پھر شاید امی کو بھی میری حالت پر رحم آ گیا اور ایک شام خاموشی سے انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر



لیں۔

میں تو صدمے سے نیم پاگل ہو گیا۔ میں دُہرے عذاب میں تھا۔ امی کی موت کا صدمہ تو تھا ہی، اسپتال کا بل بھی عذابِ جاں بنا ہوا تھا۔ بل کی ادائیگی کے بغیر میں امی کو وہاں سے لا بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے مل کر اونے پونے مکان کا سودا کر دیا لیکن شرط یہ رکھی کہ مجھے کیش ہر صورت میں آج ہی چاہیے۔

اسے پچاس لاکھ کا مکان تیس لاکھ میں مل رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر رقم کا بندوبست کر دیا۔

امی کی تدفین کے دس دن بعد مجھے وہ مکان چھوڑنا پڑا۔

میں نے گلشن اقبال میں کرائے پر ایک مکان لے لیا اور ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ اب گھر میں ننھی افشین کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

کچھ دن تو میرا ذہن بالکل ماؤف رہا پھر آہستہ آہستہ مجھے بھی قرار آ گیا۔

اخبار کے مالکان نے اتنی ہمدردی ضرور کی کہ مجھے ایک مہینے کی چھٹی دے دی۔

میں چھٹی کے بعد دفتر پہنچا تو وہاں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ دفتر میں فرنیچر تبدیل ہو چکا تھا، دیواروں پر نیا رنگ و روغن تھا۔ ہر کمرے میں اے سی لگ چکا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ مسعود وہاں سے ملازمت چھوڑ کر دبئی کے ایک اخبار میں جا چکا تھا۔

میں شریف الدین صاحب سے ملا تو انہوں نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ اب تم اخبار کے چیف کرائم رپورٹر ہو۔ تمہاری تنخواہ میں بھی پانچ ہزار روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور تمہارے سیل فون اور لینڈ لائن ٹیلی فون کا بل بھی ادارہ ادا کرے گا۔

مجھے یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ امی اور ابو اگر زندہ ہوتے تو مجھے واقعی خوشی ہوتی۔ لیکن وہ دونوں تو مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ ان کے بعد مجھے ہر قدم پر احساس ہوتا تھا کہ امی اور ابو نے گھر کی کتنی ذمے داریاں اٹھا رکھی تھیں۔ اب تو ہر کام مجھے خود کرنا پڑتا تھا۔

میں بے دلی سے اپنے نئے دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔

شریف الدین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ فی الحال دو رپورٹر کام کر رہے ہیں اگر تم ان کے کام سے مطمئن ہو گے تو ٹھیک ہے ورنہ تم اپنے اسسٹنٹ رپورٹرز کا انتخاب خود کر لینا۔

دونوں رپورٹر انتہائی ذہین اور محنتی تھے۔ میں ان کے کام سے مطمئن تھا۔

اس دن میں پریس کلب سے اپنے دفتر کی طرف جانے کے لیے نکلا تو میری نظر دو عورتوں پر پڑی۔ ان کے ساتھ برقع میں ملبوس ایک اور عورت بھی تھی۔

ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کا تعلق کسی اخبار سے ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ پریس کلب ہے اور یہاں اخبار کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ آپ کو کوئی کام ہے؟''

''ہمیں پریس کانفرنس کرنا ہے۔'' ان میں سے ایک عورت نے کہا۔

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''پریس کانفرنس..... کس سلسلے میں پریس کانفرنس کرنا چاہتی ہیں آپ؟''

''ہمارے گھر میں دو دن پہلے ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ ڈاکو اسلحے کے زور پر گھر میں موجود تمام نقدی، زیور اور قیمتی اشیا لے گئے تھے۔''

''آپ اندر آ جائیے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اطمینان سے مجھے بتائیے۔'' میں نے انہیں اپنے اخبار کا نام بتایا اور انہیں بتایا کہ میں چیف کرائم رپورٹر ہوں۔

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ میں انہیں لے کر پریس کلب کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

''اب بتائیے۔'' میں نے کہا اور ویٹر کو چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔

ان میں سے ایک عورت بولی۔ ''میرا نام صائمہ ہے، صائمہ اکبر علی..... میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر ہوں۔ یہ میری بڑی بہن ہیں۔'' اس نے دوسری عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ میری بھانجی ربیعہ ہے۔'' اس نے برقع میں لپٹی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اب ان تینوں کا غور سے جائزہ لیا۔ وہ مجھے پڑھی لکھی اور اچھے خاندان کی لگ رہی تھیں۔

''میں نے ڈکیتی کی رپورٹ علاقے کے پولیس اسٹیشن میں درج کرا دی تھی۔ اس سلسلے میں پولیس کے دو سب انسپکٹر صبح شام گھر آنے لگے۔ کبھی تفتیش کے بہانے، کبھی ملزمان کی شناخت کے بہانے۔ دو دن میں ہماری تو زندگی عذاب ہو گئی۔''



www.digestpk.com

Asifzamil

"اس علاقے کا ایس ایس پی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں کا ایس ایس پی چودھری سرور ہے۔" صائمہ نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھا۔ یہ وہی ایس ایس پی تھا جس کے خلاف مسعود نے خبر نہ لگانے کی رشوت وصول کی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ آج کل کس علاقے میں ہے لیکن فوری طور پر ذہن میں نہیں آسکا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، اب پولیس آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔

"بات صرف اتنی ہی نہیں ہے سلمان صاحب!" صائمہ نے کہا۔ "کل ربیعہ نے طارق روڈ پر ڈکیتی کی واردات کے ایک ملزم کو شناخت کرلیا۔"

"شناخت کرلیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" صائمہ نے کہا۔ "واردات کے وقت تو ان کے چہرے نقابوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے لیکن ایک ڈاکو کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی ایک پور کٹی ہوئی تھی۔ اس نے..... ہاتھ میں رولیکس کی قیمتی گھڑی بھی باندھ رکھی تھی۔ آج ربیعہ نے طارق روڈ پر اس شخص کو دیکھا تو اس کی کٹی ہوئی انگلی اور رولیکس گھڑی سے پہچان گئی ہے۔ اس نے پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔"

میں اچھل پڑا۔ "کیا آپ کو یقین ہے مس ربیعہ؟" میں نے براہِ راست اس سے پوچھا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے دو سو فیصد یقین ہے۔ اس کی آواز، اس کا قد، جسامت سب کچھ وہی ہے۔" ربیعہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہی ہو۔

"میں نے اسی وقت ایس ایس پی صاحب سے رابطہ کیا۔" صائمہ نے کہا۔ "اور انہیں بتایا کہ آپ ہی کا ایک افسر اس واردات میں ملوث ہے۔ ایس ایس پی نے مجھ سے کہا کہ آپ آج شام کو میرے آفس آکر باضابطہ رپورٹ درج کرائیں۔ اس لڑکی کو ضرور لائیے گا جس نے اس پولیس اہلکار کو شناخت کیا ہے۔ اگر وہ میرے علاقے کا ہوا تو میں اسی وقت شناخت کرالوں گا۔"

"اس کا نام سب انسپکٹر اکرم ہے۔" میں نے کہا۔ "ربیعہ نے اس کی جیب پر لگی ہوئی پٹی پر نام بھی پڑھ لیا تھا۔"

"آپ شام کو سات بجے تک میرے دفتر پہنچیں، پھر دیکھتا ہوں کہ کیا ہوسکتا ہے۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔ "آپ دفتر گئیں؟"

"جی ہاں، میں ربیعہ کو ساتھ لے کر اس کے دفتر پہنچی۔ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ اس نے پوچھا، سب انسپکٹر اکرم ہی نام بتایا تھا نا آپ نے؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا کہ سب انسپکٹر اکرم کو میرے آفس میں بھیجو۔ پھر وہ ہم سے بولا کہ آپ لوگ اس کمرے میں چلی جائیں۔ میں آپ کو اس کے آنے کے بعد بلاؤں گا۔ ہم دونوں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اس کمرے میں بھی ایک میز کرسی اور پرانا سا ایک صوفہ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایس ایس پی کے ساتھ سب انسپکٹر اکرم کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی ربیعہ کو بالوں سے پکڑ لیا پھر..... پھر....."

"پھر کیا ہوا مس صائمہ؟" میں نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

"پھر..... میری آنکھوں کے سامنے اس نے ربیعہ کو پامال..... کردیا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ اس کے ساتھ..... نہ صرف..... اس کمینے ایس ایس پی نے زیادتی کی..... بلکہ..... اس ڈکیت..... سب انسپکٹر اکرم نے بھی....." اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

"میری بات غور سے سنیں مس صائمہ!" میں نے کہا۔ "میں اس ایس ایس پی کی گردن دبوچ سکتا ہوں لیکن اس میں آپ کی بہت بدنامی ہوگی۔"

"تو کیا بدنامی کے ڈر سے ہم اس کمینے کو من مانی کرنے دیں؟" صائمہ نے کہا۔ "مزید بدنامی کیا ہوگی۔ ہمارے محلے کے ایک صاحب وہاں کسی کام سے آئے تھے۔ انہوں نے ربیعہ کو اس حالت میں دیکھ لیا۔ میں نے بھی نہ چاہتے ہوئے انہیں بتا دیا۔ پھر تو یہ خبر پورے محلے میں پھیل گئی۔ بدنامی تو ہو ہی چکی ہے سلمان صاحب! اب تو میں اس ایس ایس پی اور سب انسپکٹر کو سزا دلائے بغیر نہیں چھوڑوں گی۔"

"اچھی طرح سوچ لیں مس صائمہ!" میں نے کہا۔ "وہ ایس ایس پی بہت کمینہ ہے۔ اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔"

"چاہے کچھ بھی ہو۔ میں اسے سزا دلا کر رہوں گی۔" صائمہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"پھر سب سے پہلے تو آپ ایس ایس پی کے خلاف



ڈی آئی جی کرائمز کے نام ایک درخواست لکھیں۔ اس کی ایک کاپی مجھے بھی دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آج ہی ربیعہ کا طبی معائنہ ہوجائے۔"

صائمہ نے اسی وقت ایک درخواست لکھی۔ میں نے اس کی دو تین فوٹو اسٹیٹ کاپیاں کرا کر صائمہ کے دستخط لے لیے اور اس سے کہا۔ "آپ یہ رپورٹ آج ہی ڈی آئی جی تک پہنچا دیں۔" پھر میں نے جیب سے اپنا تعارفی کارڈ نکالا اور صائمہ کو دے دیا۔ "کوئی غیر معمولی بات ہو تو آپ فوراً مجھ سے رابطہ کریں۔" میں نے کہا۔ "اس کارڈ پر میرے دفتر، گھر اور سیل فون کا نمبر بھی درج ہے۔"

ان کے جانے کے بعد میں بھی اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے کچھ وقت دفتر میں گزارا، کچھ خبریں فائل کیں اور اپنی موٹر سائیکل پر ایس ایس پی کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

میرا تعارفی کارڈ دیکھتے ہی اس نے فوراً مجھے آفس میں بلالیا۔

"زہے نصیب!" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ نے زحمت کیوں کی سلمان صاحب! مجھے ٹیلی فون کردیتے، میں حاضر ہوجاتا۔"

"کام میرا تھا اس لیے مجھے آنا پڑا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"حکم کریں سرکار!" وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔

میں نے اپنی ڈائری سے صائمہ کی رپورٹ نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ "اس بارے میں کیا کہیں گے آپ؟"

اس نے ایک نظر رپورٹ پر ڈالی، لمحے بھر کو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا پھر وہ فوراً ہی سنبھل بھی گیا۔ وہ خاصا گھاگ پولیس افسر تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "یہ..... یہ عورت اب مجھے یوں بدنام کرے گی؟ یہ رپورٹ جھوٹ کا پلندا ہے سلمان صاحب۔"

"اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں تو صرف اس خبر کی تصدیق کے لیے آیا تھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ یہ رپورٹ جھوٹ کا پلندا ہے۔" ایس ایس پی نے کہا۔

"میں آپ کا مؤقف بھی اخبار میں شائع کردوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس لڑکی کے طبی معائنے کی رپورٹ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "طبی معائنہ؟ وہ کب ہوا؟"

"وہ آج ہی ہوا ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "اس کی رپورٹ بھی میرے پاس ہے، کیا اب بھی آپ اس رپورٹ کو جھوٹ کا پلندا کہیں گے؟"

"سلمان صاحب!" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "اصل میں یہ صائمہ کافی عرصے سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے انکار کردیا تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔"

"یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ سب کچھ آپ عدالت کو بتایئے گا۔"

"عدالت میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" وہ مکاری سے مسکرا کر بولا۔ "بس آپ مجھ سے تعاون کریں، میں آپ سے تعاون کروں گا۔"

"مثلاً کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اس درخواست اور میڈیکل رپورٹ دونوں کو بھول جائیں۔ باقی میں خود سنبھال لوں گا۔" اس نے اپنی دراز سے چیک بک نکالی اور چیک لکھنے لگا۔ پھر اس نے چیک بک سے وہ چیک پھاڑ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ پورے دس لاکھ کا بیریئر چیک ہے۔"

"آپ نے میری بہت کم قیمت لگائی ہے ایس ایس پی صاحب۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ اپنی قیمت خود ہی بتا دیں؟" وہ پھر مکاری سے مسکرایا۔ "لیکن خیال رکھیے گا، میں غریب آدمی ہوں۔"

"اس چیک میں ایک صفر اور بڑھا دیں۔" میں نے اسے آزمانے کو کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "سلمان صاحب! اتنی رقم تو میں نہیں دے سکتا۔" اس نے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ دل ہی دل میں اس نے مجھے گالی بھی دی ہوگی۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ تشریف تو رکھیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں نے چائے منگوائی ہے آپ کے لیے۔"

"وہ چائے میری طرف سے آپ سب انسپکٹر اکرم کو پلا دیں۔" میں نے کہا۔

"ایک صورت ہوسکتی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں فوری طور پر آپ کو پچاس لاکھ دے سکتا ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے کسی جائداد کا سودا کر رہا ہو۔



www.digestpk.com

Asifzamil

''سوری مسٹر ایس ایس پی۔'' میں نے رپورٹ اٹھا کر ڈائری میں رکھی اور باہر کی طرف بڑھا۔

''ایک بات میری بھی سنتے جائیں رپورٹر صاحب!'' ایس ایس پی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے اخبار پر کیس بھی کرسکتا ہوں۔''

''شوق سے کریں۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارے اخبار پر بیس بائیس کیس پہلے سے چل رہے ہیں، ایک اور سہی۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں سلمان صاحب!'' ایس ایس پی اپنے اصل روپ میں آگیا۔ ''میں ابھی اتنا بے بس نہیں ہوں۔ جائیں، آپ جو کرسکتے ہیں کرلیں۔''

میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ میں نے صائمہ کو ٹیلی فون کیا۔ اس نے بتایا کہ ڈی آئی جی کو درخواست دے دی ہے اور آپ کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ آپ کے اخبار کا نام سن کر انہوں نے فوراً ہی ربیعہ کو طبی معائنے کے لیے بھجوا دیا تھا۔

''اس وقت آپ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم لوگ اس وقت اسپتال میں ہیں اور اپنی باری کا انتظار کررہے ہیں۔''

''میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اسپتال پہنچا تو ربیعہ کا میڈیکل چیک اَپ ہوچکا تھا۔ میں نے صائمہ سے کہا۔ ''آپ لوگ فوری طور پر گھر جانے کے بجائے اپنے کسی رشتے دار کے گھر چلی جائیں۔''

''کیوں؟'' صائمہ چونک کر بولی۔

''میں احتیاطاً ایسا کہہ رہا ہوں۔ ویسے اس ایس ایس پی سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم یہاں سے گھر نہیں جائیں گے۔''

ان کے جانے کے بعد میں لیب انچارج سے ملا اور اس سے کہا۔ ''یہ رپورٹ اگر آپ ارجنٹ تیار کردیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔''

''سلمان صاحب! آپ اتنے بڑے اخبار کے رپورٹر ہیں۔ آپ تو حکم کریں جناب۔''

''میں تو آپ سے درخواست ہی کرسکتا ہوں۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

اب میرا رخ پھر دفتر کی طرف تھا۔

میں نے ایس ایس پی کی وہ خبر تین کالمی بنائی، اس کے ساتھ میں نے صائمہ کی اس رپورٹ کا عکس بھی لگا دیا جو اس نے ڈی آئی جی کو دی تھی اور صائمہ کے گھر میں ڈکیتی کا پس منظر بھی لکھ دیا۔

میں نے وہ رپورٹ چھپنے کے لیے بھجوا دی۔

اس وقت شریف الدین صاحب موجود نہیں تھے لیکن وہ آخری کاپی پریس بھیجنے کے موقع پر ضرور موجود ہوتے تھے۔ وہ آخر وقت تک نہیں پہنچے۔ آخری کاپی پریس چلی گئی تو میں بھی گھر آگیا۔ میں عموماً اتنی دیر تک دفتر میں رکتا نہیں تھا لیکن اس دن میں خاص طور پر وہاں رکا تھا کہ ممکن ہے ایس ایس پی اخبار کے نیوز ایڈیٹر یا کسی رپورٹر کو خرید لے اور خبر عین وقت پر غائب ہوجائے۔

میں کھانا وغیرہ کھا کر سونے کے لیے لیٹ چکا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے نیم غنودگی کے عالم میں سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اسکرین پر شریف الدین صاحب کا نام تھا۔

میں نے بٹن دبا کر فون کان سے لگالیا اور بولا۔ ''یس سر!''

''ایس ایس پی سرور کے خلاف خبر کون لایا تھا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں خود لایا تھا سر!'' میں نے کہا۔

''اس خبر کو فوراً رکوائیں سلمان صاحب!'' انہوں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

''اب تو بہت دیر ہوگئی سر!'' میں نے کہا۔ ''اب تک تو اخبار چھپ بھی چکا ہوگا۔'' میں نے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ رکوا سکتے ہیں تو آپ ہی رکوا دیں۔'' میں نے کہا۔

''اب چھپنے کے بعد میں کیسے رکوا سکتا ہوں؟'' وہ جھنجلا کر بولے۔ ''یہ بہرحال آپ نے اچھا نہیں کیا۔''

''ایسی خبریں تو چھپتی ہی رہتی ہیں سر!'' میں نے بھی ناگواری سے کہا۔ ''میں نے ہر طرح سے تصدیق کرنے کے بعد ہی وہ خبر لگائی ہے۔''

انہوں نے غصے میں سلسلہ منقطع کردیا۔

میں سوچتا رہ گیا کہ آخر شریف الدین صاحب کو اس خبر سے کیا دلچسپی ہے؟ کیا ایس ایس پی سرور ان کا رشتے دار ہے؟ ایسا بھی نہیں تھا تو کیا..... ایس ایس پی نے..... میرے بجائے شریف الدین صاحب کو..... نہیں..... شریف الدین صاحب اس قسم کے آدمی نہیں تھے۔ میں گزشتہ چھ برس سے ان کے ساتھ کام کررہا تھا۔ اب تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ میں نے پچھلے واقعات پر



نظر دوڑائی تو میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ شریف الدین صاحب تمام خبروں کی سرخیاں دیکھتے تھے۔ انہوں نے کئی ایک خبریں نکالی بھی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر خبریں پولیس کے خلاف تھیں، کچھ سیاست دانوں اور اعلیٰ سول افسروں کے خلاف تھیں۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر غور نہیں کیا تھا لیکن اب مجھے غور کرنا پڑ رہا تھا تو مجھے ساری باتیں یاد آرہی تھیں۔

''کس کا فون تھا؟'' ثنا نے پوچھا۔ ''آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے؟''

''ایڈیٹر صاحب کا فون تھا۔ انہیں ایک خبر پر اعتراض ہے لیکن اب تک تو اخبار چھپ کر مارکیٹ میں آگیا ہوگا۔''

اخبار صبح سویرے میرے گھر بھی آتا تھا۔ میں نے صبح اٹھ کر اخبار دیکھا۔ فرنٹ پیج پر وہ خبر تین کالم میں خاصی نمایاں لگی ہوئی تھی۔ اس خبر میں کچھ زیادہ ہی تلخ زبان استعمال کی گئی تھی۔

میں دفتر پہنچا تو شریف الدین صاحب نے مجھے فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔

''سلمان صاحب! آپ کو پانچ چھ سال ہوگئے ہیں اخبار میں کام کرتے ہوئے یہ بھی نہیں جانتے کہ کون سی خبر لگانا چاہیے اور کون سی نہیں؟''

''سر! میں نے ہر طرح سے تصدیق کرنے کے بعد ہی یہ خبر لگائی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ خبر بے بنیاد ہے۔'' شریف الدین صاحب جھنجلا کر بولے۔ ''آپ آج اس خبر کی تردید شائع کریں اور معذرت بھی کریں۔''

''سوری سر!'' میں نے کہا۔ ''میں یہ نہیں کرسکتا۔''

''تو پھر آپ آج سے خود کو فارغ سمجھیں۔'' انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر!'' میں نے کہا۔ ''آپ چاہے مجھے ملازمت سے نکال دیں لیکن میں صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح نہیں کہہ سکتا۔'' یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

وہاں سے میں اپنے کیبن میں آیا اور اپنی ذاتی اشیا سمیٹنے لگا۔ تمام چیزیں میں نے ایک شاپر میں ڈالیں، پھر میں نے اکاؤنٹس آفس کا رخ کیا۔ اکاؤنٹنٹ ظہیر الدین صاحب سے بھی میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ''آپ نے میرا حساب کتاب کردیا؟''

''سلمان صاحب!'' وہ ہنس کر بولے۔ ''کیسا حساب کتاب؟ کیا آپ نے کچھ رقم ادارے سے پیشگی لے رکھی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہ ادارہ چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے اپنا حساب کتاب صاف کردوں تاکہ یہ نہ ہو کہ بعد میں یہ باتیں بنیں سلمان ادارے کے اتنے روپے کھا گیا۔''

وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والے تھے کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی، انہوں نے انٹرکام اٹھا کر کان سے لگایا اور بولے۔ ''یس سر! جی ہاں، یہیں موجود ہیں..... جی بہتر ہے۔'' انہوں نے انٹرکام کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ''شریف صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' انہوں نے مجھ سے کہا۔

میں نے وہیں سے کاغذ لے کر اس پر اپنا استعفا لکھا اور اسے جیب میں رکھ کر شریف صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

''سلمان!'' انہوں نے کہا۔ ''آپ واقعی ادارہ چھوڑنے کی تیاری کرنے لگے؟ بھائی! آج کل اچھی ملازمت ملتی کہاں ہے؟ آپ کو صرف اتنا ہی تو لکھنا ہوگا کہ بعد کی تحقیقات سے علم ہوا کہ یہ خبر بے بنیاد ہے اور یہ ایس ایس پی سرور کے خلاف سازش ہے۔''

''سوری سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں یہ نہیں کروں گا۔'' میں نے یہ کہہ کر جیب سے استعفا نکالا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بھنا کر بولے۔ ''تم جانا ہی چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ۔ یہ کام تو میں خود بھی کرسکتا ہوں۔''

''تو سر! پھر آپ خود ہی کرلیجیے۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

ظہیر صاحب نے مجھے ادارہ چھوڑنے کا این او سی دے دیا تھا۔ ادارے نے جو موٹر سائیکل مجھے دی تھی، میں اس کی تمام قسطیں ادا کرچکا تھا۔ مہینے کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ ظہیر صاحب کچھ دیر کمپیوٹر دیکھتے رہے پھر مجھ سے بولے۔ ''آپ کی طرف ہمارے کچھ بقایا جات نہیں ہیں۔ آپ اپنی تنخواہ پہلی تاریخ کو بینک سے لے لیجیے گا۔''

میں وہاں موجود سب لوگوں سے ملا پھر اپنا سامان لے کر آفس سے باہر نکل آیا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے پہلی دفعہ یہ پریشانی ہوئی کہ اب اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ بچوں کی فیسیں، مکان کا کرایہ، گھر کا راشن وغیرہ کہاں سے آئے گا؟

''اللہ مالک ہے۔'' میں نے بلند لہجے میں کہا اور خود ہی ہنس دیا۔

ثنا مجھے بے وقت گھر میں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔



www.digestpk.com

Asifzamil

"سر! انہیں نکالا نہیں گیا ہے بلکہ انہوں نے خود ہی استعفا دیا ہے۔" اظہار صاحب نے کہا۔

ساجد صاحب نے استفسار طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے شروع سے آخر تک انہیں بھی ساری بات بتا دی۔

"ایس ایس پی سرور انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے۔" ساجد صاحب نے منہ بنا کر کہا۔ "جب وہ خواتین پریس کانفرنس کرنا چاہتی تھیں تو آپ نے انہیں ایسا کرنے کیوں نہیں دیا؟"

"سر! میرا خیال تھا کہ....."

"سارا کریڈٹ آپ لے جائیں؟" انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کی سروس کتنی ہے سلمان صاحب؟" انہوں نے پوچھا۔

"سر! سروس تو زیادہ نہیں ہے، مشکل سے چھ سال ہوئے ہیں مجھے۔" میں نے کہا۔

"آپ سے پہلے وہاں شاید مسعود تھا؟" انہوں نے کہا۔ "آپ نے اس کے ساتھ بھی کام کیا ہوگا۔ آپ نے اس سے کچھ نہیں سیکھا؟"

"مجھے اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع بہت کم ملا ہے سر!" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر بولے۔ "آئی جی سے بات کراؤ۔ میں ساجد بول رہا ہوں۔" وہ تھوڑی دیر ریسیور کان سے لگائے رہے، پھر بولے۔ "کیا بات ہے آئی جی صاحب! اب ہماری یہ اہمیت رہ گئی ہے کہ آپ ٹیلی فون پر بھی ہمیں گھنٹوں انتظار کراتے ہیں۔" دو منٹ کو انہوں نے گھنٹوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ "..... حکم کیا کرنا ہے..... آپ کے ایک ایس ایس پی سے کچھ کام ہے۔ اسے ابھی پریس کلب بھیج دیں..... سرور نام ہے اس کا..... نہیں، کوئی پریشانی کی بات کم سے کم آپ کے لیے نہیں ہے۔" ساجد صاحب مسکرائے۔ "آپ سرور کو فوراً یہاں بھیجیں۔ میں ابھی آدھے گھنٹے تک پریس کلب میں ہوں۔"

"سر! سلمان صاحب بہت اچھے کرائم رپورٹر ہیں۔" اظہار صاحب نے کہا۔

"یہی تو ان کی خامی ہے۔" وہ ہنس کر بولے۔ "کرائم رپورٹر اگر اچھا بھی ہو تو وہ کامیاب نہیں ہوتا۔"

اس وقت تک ویٹر ساجد صاحب کے لیے بلیک کافی اور ہمارے لیے چائے لے آیا تھا۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ وہ پریس کلب میں بیٹھ کر ٹیلی فون پر مختلف جگہوں سے اور مختلف کرائم رپورٹرز سے خبریں حاصل کرتے تھے اور اس میں اپنی ایک دو خاص خبریں شامل کر کے اسے اپنے اخبار کو ای میل کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ٹیلی فون پر اپنے اخبار سے رابطہ بھی رکھتے تھے اور نیوز ایڈیٹر کو بھی مختلف ہدایات دیتے رہتے تھے۔

ہم نے چائے ختم کی ہی تھی کہ مجھے سرور دکھائی دیا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے ایک ویٹر سے کچھ پوچھا۔ ویٹر نے ساجد صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ بوجھل قدموں سے ہماری طرف آیا اور مجھے ساجد صاحب کے ساتھ دیکھ کر مزید سہم گیا۔ اس نے سنبھل کر کہا۔ "السلام علیکم ساجد صاحب! کیسے ہیں جناب؟"

"جناب تو ٹھیک ہیں۔" ساجد صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ کی خیریت مطلوب ہے۔"

"سر! مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

"سلمان صاحب کا کیا معاملہ ہے؟" انہوں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے سرور اپنے آئی جی کے سامنے کھڑا ہو۔

"سر! معاملہ تو انہوں نے آپ کو بتایا ہوگا۔"

"میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔" ساجد صاحب نے کہا۔

سرور نے بھی وہی کچھ بتایا جو میں نے بتایا تھا۔ بس وہ رقم کا ذکر گول کر گیا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ نے سلمان کو کتنی رقم کی آفر کی تھی؟" ساجد صاحب نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"سر! وہ تو میں نے....."

"میں رقم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟" ساجد صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سر! دس لاکھ روپے کی۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"پھر بعد میں آپ پچاس لاکھ روپے دینے پر آمادہ ہو گئے، کیوں؟"

"سر! ..... میری ..... عزت ..... اور نوکری ..... کا سوال تھا ..... اس ..... لیے ..... میں ....."

"اس کا مطلب ہے کہ سیٹھ اخلاق موتی والا مرڈر کیس میں آپ نے خوب رقم بٹوری ہے ورنہ آپ پچاس لاکھ روپے فوری طور پر کہاں سے دیتے؟"



"سر! اس کیس میں تو....."

"اس کیس کو چھوڑیں ایس ایس پی صاحب۔" ساجد صاحب نے کہا۔ "وہ تو میں معلوم کر ہی لوں گا کہ اس میں کتنی رقم آپ نے لی ہے، کتنی آپ کے افسران نے اور قاتل کون ہے؟ پھر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی نوکری رہتی ہے یا جاتی ہے؟" ساجد صاحب کا لہجہ انتہائی درشت تھا۔ "جب سلمان نے انکار کر دیا تو آپ نے کیا کیا؟"

"سر! میں نے ..... ایڈیٹر صاحب سے ..... بات کرنے کی کوشش کی ..... لیکن ان سے بات نہ ہو سکی ..... ان کا سیل فون آف تھا ..... وہ دفتر میں بھی نہیں تھے ..... نیوز ایڈیٹر صاحب نے کہہ دیا کہ سلمان صاحب کی خبر مستند ہوتی ہے۔ میں اسے نہیں روک سکتا۔ ہاں، عدالت کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ خبر اگر غلط ہو تو آپ اخبار پر مقدمہ کر سکتے ہیں۔ پھر ..... میرا رابطہ جب ایڈیٹر صاحب سے ہوا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی، اخبار چھپ چکا تھا۔"

"آپ نے ایڈیٹر صاحب کو خبر کی تردید کرنے اور معذرت شائع کرنے کے لیے کتنی رقم دی تھی؟" ساجد صاحب اس سے وکیلوں کی طرح جرح کر رہے تھے۔

"سر ..... میں نے ..... وہی ..... آفر ..... پچ ..... پچاس لاکھ روپے ..... ایڈیٹر صاحب کو ..... دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"آپ جانتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا؟" ساجد صاحب بھڑک کر بولے۔ "سلمان صاحب کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ اب آپ جیسے دو ٹکے کے آدمی ہمارے صحافیوں کو ملازمت سے نکلوائیں گے۔" پھر انہوں نے ویٹر کو آواز دی اور اس سے رائٹنگ پیڈ لانے کو کہا۔

ویٹر فوراً ہی رائٹنگ پیڈ لے آیا۔

انہوں نے وہ پیڈ ایس ایس پی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "لکھیے ..... میں نے خبر کی تردید کے لیے مذکورہ اخبار کو پچاس لاکھ روپے دیے تھے جو اس کے ایڈیٹر نے وصول کیے۔"

"سر! یہ تو آپ میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال رہے ہیں۔"

"سرور! تمہیں قادر بخش کا کیس یاد ہے یا میں یاد دلاؤں؟ اس کیس کی فائل ابھی بند نہیں ہوئی ہے اور سیٹھ موتی والا کا واقعہ تو ابھی تازہ ہے۔ تم کیا چاہتے ہو، میں ان دونوں کیسوں میں تمہیں بھی ملوث کر دوں؟ رشوت تو تم نے لی ہے۔ میں ثابت بھی کر دوں گا پھر میں دیکھوں گا کہ تم میری خبر کیسے

## برنارڈ شا کا تحفہ

جارج برنارڈ شا ایک پرانی کتابوں کی دکان پر گئے۔ اتفاق سے وہاں انہیں اپنے ہی ڈراموں کا مجموعہ نظر آ گیا۔ انہوں نے ورق پلٹے تو ایک جگہ خود انہی کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ جارج برنارڈ شا کی طرف سے خلوص کے ساتھ۔ وہ کتاب اس نے کچھ مدت پہلے اپنے دوست کو تحفے میں دی تھی۔ برنارڈ شا نے وہ کتاب خرید لی اور اس میں لکھا۔ جارج برنارڈ شا کی طرف سے دوبارہ خلوص کے ساتھ اور کتاب پھر انہی صاحب کو بھیج دی۔

پنجاب سے عروج آفتاب کا تحفہ

رکواتے ہو۔ لکھو ورنہ....."

ایس ایس پی نے کانپتے ہاتھوں سے وہی کچھ لکھ دیا جو ساجد صاحب نے کہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔

ساجد صاحب نے وہ پرچہ لے کر اپنے بریف کیس میں رکھا اور مجھ سے بولے۔ "سلمان صاحب! آپ بہت سیدھے آدمی ہیں۔ ایسا آدمی کرائم رپورٹنگ میں کیا بلکہ کسی بھی رپورٹنگ میں نہیں چلتا۔ اب میں شریف الدین صاحب کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔ آپ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھیے۔"

"نہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں اب وہاں ملازمت نہیں کروں گا۔"

وہ چند لمحے تک کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ "آپ کی انگریزی کیسی ہے؟"

"میں نے شروع سے لے کر آخر تک انگلش میڈیم ہی سے پڑھا ہے سر۔" میں نے جواب دیا۔

"انگلش میں خبر بنا لیں گے آپ؟"

"بالکل سر! میں اصل میں انگریزی صحافت ہی کرنا چاہتا تھا۔"

"اچھا یہی خبر جو آپ نے اپنے اخبار کو دی تھی، اسے انگریزی میں بنائیں۔" انہوں نے رائٹنگ پیڈ میرے حوالے کر دیا۔

میں نے دس منٹ کے اندر اندر وہ خبر بنا کر ان کے سامنے رکھ دی۔

انہوں نے بہت غور سے خبر کا جائزہ لیا، پھر توصیف آمیز لہجے میں بولے۔ "ویری گڈ! آپ کی انگلش تو بہت اچھی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں گرامر اور اسپیلنگ کی کوئی غلطی بھی نہیں ہے۔ آپ میرے اخبار میں کام



www.digestpk.com

Asifzamil

کریں گے؟"

"سر! اس وقت تو مجھے کہیں بھی ملازمت مل جائے، میں کرلوں گا۔"

"لیکن وہاں آپ کو بہت سے معاملات کو نظر انداز کرنا ہوگا، حالات سے سمجھوتا بھی کرنا پڑے گا اور....."

"سر! میں ایمان داری اور راست بازی سے ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "میں وہاں بھی اسی انداز میں کام کروں گا۔"

"پھر آپ ایسا کریں کہ صحافت چھوڑ کر کوئی اور کام کریں۔" ساجد صاحب نے مجھے گھورا۔ "آپ سے کس حکیم نے کہا تھا کہ آپ صحافت ہی کو اپنا کیریئر بنائیں؟"

"سر! ہمیں پڑھایا تو یہی گیا ہے کہ....."

"کتابوں کی باتوں کو چھوڑیں۔" انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔ "میں نے تو صحافت میں کوئی ڈگری بھی حاصل نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود میں اس پیشے میں کامیاب ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟ میں کتابی باتوں پر عمل نہیں کرتا بلکہ حقیقت پسندی سے کام لیتا ہوں۔ اگر آپ حقیقت پسندی سے کام نہیں لیں گے تو دوسرے آپ کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے اور آپ وہیں پڑے رہ جائیں گے۔ آپ اپنا نہیں تو اپنی بیوی اور بچوں ہی کا کچھ خیال کرلیں۔"

"سر! میں ملازمت انہی کے لیے تو کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میری بات ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن جب تک آپ سمجھیں گے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

ان کے ساتھ ہی اظہار صاحب اور میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ نپے تلے قدم رکھتے ہوئے پریس کلب کے پارکنگ لاٹ میں پہنچے جہاں ان کی جدید ماڈل کی ہنڈا سٹی کھڑی تھی۔

ان کی روانگی کے بعد اظہار صاحب نے کہا۔ "سلمان صاحب! آپ کو ساجد صاحب کی آفر قبول کر لینا چاہیے تھی۔"

"میں تو قبول کر لیتا لیکن....."

"بھئی فوری طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتے۔ بعد میں دیکھا جاتا۔ آپ ملازمت جوائن تو کر لیتے۔"

"اظہار صاحب! یہ منافقت مجھ سے نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔

"اچھا، ملازمت کی تلاش تو جاری رکھیے گا، اس کے ساتھ ساتھ پریس کلب بھی روز آتے رہیے گا۔" اظہار صاحب نے کہا۔ "آپ یہاں بیٹھیں گے تو بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی آپ کو کسی ملازمت کے بارے میں بھی بتا دے گا۔"

تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد میں گھر آ گیا۔

☆☆☆

پھر دو مہینے یونہی گزر گئے۔ میں روز پریس کلب جاتا تھا۔ میں نے کئی اخبارات کے ایڈیٹرز سے بھی ملاقات کی لیکن ان سب کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ابھی کوئی ویکنسی نہیں ہے۔ جیسے ہی کوئی ویکنسی ہوئی ہم آپ کو بلا لیں گے۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے، ثنا چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن رات کے کھانے کے بعد وہ مجھ سے بولی۔ "میں نے بی اے کیا ہے۔ کل سے میں بھی ملازمت کی تلاش میں نکلتی ہوں۔ مجھے کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری تو مل ہی جائے گی۔"

"اس سے گھر کے مسائل حل ہو جائیں گے؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "جانتی ہو، یہ پرائیویٹ اسکولز والے ٹیچرز کو کیا دیتے ہیں؟ ڈھائی تین ہزار یا بہت تیر مارا تو پانچ ہزار۔"

"آپ تو پتا نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں؟ ہمارے پڑوس میں ماریہ رہتی ہے۔ وہ بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اسے پندرہ ہزار ملتے ہیں۔"

"وہ وہاں کب سے پڑھا رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے وہاں پڑھاتے ہوئے چھ، سات سال تو ہو گئے ہیں۔" ثنا نے جواب دیا۔

"اسے چھ سات سال میں صرف پندرہ ہزار روپے مل رہے ہیں تو سوچو کہ تمہیں کیا ملے گا؟"

"کچھ تو ملے گا ہی۔" ثنا نے کہا۔

"اس "کچھ" سے ہمارے مسائل کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں گے۔ گھر اور بچوں کا خیال کون رکھے گا؟ نہیں ثنا! میں ابھی اتنا مایوس نہیں ہوا ہوں کہ تمہیں چند ہزار کی ملازمت کے لیے بھیج دوں۔"

ثنا نے بھی اس وقت مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور بات آئی گئی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "اب بینک میں صرف اتنی رقم ہے کہ اس سے آئندہ مہینے کا خرچ چل سکتا ہے۔"



"مجھے انشاء اللہ اسی مہینے میں ملازمت مل جائے گی، تم پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"آپ کو تو دو مہینے پہلے بھی ملازمت ملنے کی امید تھی؟" ثنا نے سرد لہجے میں کہا۔

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے، میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے لیکن ہر بات میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔" میں نے ثنا کو ساجد صاحب کی آفر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی اور گھر کا ماحول فضول میں کشیدہ ہو جاتا۔ اس سے بچے سہم جاتے تھے اور میرا موڈ بھی بہت خراب ہو جاتا تھا۔ ایسے موقع پر میں گھر سے نکل جایا کرتا تھا۔

صبح ثنا کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔

"کسی کی کال آ رہی ہے۔" اس نے سیل فون میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لیا اور اسکرین پر نام دیکھے بغیر اسے آن کر کے کان سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" دوسری طرف سے اظہار الحق صاحب کی آواز سنائی دی۔ "سلمان صاحب! میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟ آپ غالباً سو رہے تھے؟"

"نہیں اظہار صاحب!" میں نے کہا۔ "میں تو یوں بھی اٹھنے والا تھا۔"

"سلمان صاحب! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیسی خوش خبری؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ ثنا بھی میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"ایک بہت بڑی پارٹی اردو کا روزنامہ نکال رہی ہے۔ میں نے روزنامے کے مالک سے بات کی تھی۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ایک بجے تک پریس کلب پہنچ جائیں۔ ہم لوگ لنچ بھی وہیں کریں گے۔ پھر میں آفتاب صاحب سے آپ کی ملاقات بھی کرا دوں گا۔"

میں نے ثنا سے کہا۔ "تمہیں بہت فکر تھی نا! آج انشاء اللہ مجھے ملازمت مل جائے گی۔"

"واقعی؟" ثنا خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم ذرا میرے کوئی ڈھنگ کے کپڑے استری کر دو۔"

ناشتا کرنے کے بعد میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے اپنے دو تین پرانے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ سب میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

میں پریس کلب پہنچا تو اظہار الحق صاحب اس وقت تک نہیں آئے تھے۔ وال کلاک دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں جلدی آ گیا ہوں۔ ابھی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

وہاں کچھ پرانے دوست مل گئے۔ ان سے بات چیت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

پھر اظہار الحق صاحب ہی نے آواز دے کر مجھے چونکایا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ صرف پندرہ منٹ تاخیر سے پہنچے ہیں۔" میں نے دیوار گیر گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

پریس کلب میں لنچ کے بعد اظہار الحق صاحب مجھے اپنی گاڑی میں آئی آئی چندریگر روڈ لے گئے کیونکہ اخبار کا آفس وہیں تھا۔

اخبار کا آفس ایک نوتعمیر شدہ شان دار بلڈنگ کے نویں فلور پر تھا۔ ایک طرح سے پورا فلور ہی آفتاب صاحب نے لیا تھا اور اس میں کچھ ردّوبدل کرا رہے تھے۔

آفتاب عالم صاحب خاصی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا تعلق سندھ کے ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ اب انہیں صحافت کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ روزنامہ "آوازِ وقت" کے نام سے انہوں نے اخبار کا ڈکلریشن بھی حاصل کر لیا تھا۔ وہ بہت خندہ پیشانی سے ملے۔

میں نے ایڈیٹر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے۔ "سائیں ایڈیٹر تو شمس الحسن صاحب ہیں۔"

"شمس الحسن صاحب؟" میں نے دُہرایا۔ "اچھا، وہ روزنامہ "آبشار" والے؟"

"جی ہاں وہی۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ اخبار تو آپ ہی لوگ چلائیں گے۔ میں تو کبھی کبھی آسکوں گا۔ آپ کی اظہار الحق صاحب نے بھی تعریف کی ہے اور شمس الحسن صاحب نے بھی۔" آفتاب عالم صاحب مسکرا کر بولے۔ "میں آپ کو چیف رپورٹر کی حیثیت سے اپائنٹ کر رہا ہوں۔ اب باقی اسٹاف تو آپ ہی لوگ رکھیں گے۔"

"اخبار اس وقت کس مرحلے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا اس کی ڈمی....."



www.digestpk.com

Asifzamil

"سائیں! ابھی تو میں نے صرف ڈکلریشن لیا ہے۔ آپ دوسرے آدمی ہیں جسے میں نے اپائنٹ کیا ہے۔ اب آپ اور شمس الحسن صاحب جانیں اور اخبار جانے۔"

"سلمان صاحب! آپ کے ذہن میں کوئی اور سوال ہو تو اسے بھی کلیئر کر لیں۔ مثلاً یہاں سے آپ کو پیکیج کیا ملے گا اور ....."

"میں سمجھ گیا۔" آفتاب صاحب مسکرائے۔ "آپ یہی پوچھنا چاہتے ہیں نا کہ میں سلمان صاحب کو سیلری وغیرہ کیا دوں گا؟" پھر وہ سنجیدگی سے بولے۔ "سلمان صاحب! ابھی شروعات ہے اس لیے میں آپ کو زیادہ سیلری تو نہیں دے سکوں گا، فی الحال صرف پچاس ہزار روپے پلس کنوینس دے سکتا ہوں۔"

"آفتاب صاحب! یہ....."

"اظہار صاحب!" انہوں نے کہا۔ "سائیں! میں جانتا ہوں کہ یہ سیلری کم ہے۔ ابھی نیا نیا اخبار ہے۔ کام شروع ہوگا تو میں خود سیلری میں اضافہ کر دوں گا۔" پھر وہ مجھ سے بولے۔ "سلمان صاحب! ٹھیک ہے نا؟"

"جی سر! ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میں نے اسٹاف کے لیے چار گاڑیاں بھی بک کرائی ہیں۔ وہ اگلے مہینے تک آپ کو مل جائیں گی۔"

میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ نیا اخبار ہے۔ وہاں مشکل سے پچیس ہزار تنخواہ ملے گی۔ اس وقت تو میرے لیے وہ بھی غنیمت تھی۔

"اب آپ کل سے اسٹاف کے لیے انٹرویو شروع کر دیں۔ کل شمس الحسن صاحب بھی آئیں گے۔ میں نے انگریزی اور اردو کے ایک اخبار میں اشتہار دے دیا ہے۔ ٹی وی پر بھی ایک اشتہار دیا ہے۔ کل گیارہ بجے سے لوگ آنے لگیں گے۔" پھر انہوں نے گھنٹی بجائی تو ایک چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔ "جی سائیں، حکم۔"

"بابا! سلمان صاحب کو ان کا آفس دکھا دو۔ یہ کل سے چارج سنبھال رہے ہیں۔"

"آیئے سائیں۔" چپراسی نے مؤدب لہجے میں کہا۔

میرا دفتر بہت شان دار تھا۔ وہ روایتی اخبار کا دفتر نہیں لگ رہا تھا کسی ملٹی نیشنل کمپنی یا بینک کے افسر کا دفتر معلوم ہو رہا تھا۔ فرنیچر سے لے کر پردے اور میز پر رکھی ہوئی ہر چیز خوب صورت تھی۔

میں آفتاب صاحب سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو خوشی کے مارے میرے قدم ٹھیک طرح زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

"سلمان صاحب!" اظہار صاحب نے کہا۔ "آفتاب صاحب انتہائی پڑھے لکھے آدمی ہیں اور روایتی جاگیرداروں سے بالکل مختلف ہیں۔ انہیں صحافت کا شوق ہے۔ اسی شوق میں اپنا اخبار نکال رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور شمس الحسن صاحب اپنی محنت سے اخبار کو بہت کامیابی سے چلا سکتے ہیں۔"

میری شمس الحسن صاحب سے دو چار دفعہ پریس کلب میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خاصے سلجھے ہوئے انسان تھے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے کام کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ خیر، یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اب ان کے ساتھ کام کرتا تو ان کے متعلق مزید جان لیتا۔ حیرت تو مجھے یہ تھی کہ اظہار صاحب کے علاوہ انہوں نے بھی آفتاب صاحب سے میری سفارش کی تھی۔

واپسی میں ثنا کے لیے میں نے اس کی پسندیدہ مٹھائی چم چم خریدی، بچوں کے لیے آئس کریم لی اور فاتحانہ انداز میں گھر میں داخل ہوا۔ میں نے مٹھائی کا ڈبا ثنا کے حوالے کیا اور بچوں کو آواز دی۔ "فہد..... افشین بیٹا!"

دونوں بچے بھاگتے ہوئے آگئے۔ "جی بابا۔"

میں نے انہیں آئس کریم دی تو انہیں اتنی خوشی ہوئی جتنی مجھے ملازمت ملنے پر بھی نہ ہوئی ہوگی۔

"لگتا ہے آپ کو جاب مل گئی؟" ثنا نے مسکرا کر کہا۔

ایک عرصے کے بعد مجھے اس کی آنکھوں میں پھر وہی چمک اور چہرے پر وہی نکھار نظر آیا جسے دیکھنے کو میں ترس گیا تھا۔

دونوں بچے آئس کریم لے کر ٹی وی لاؤنج میں چلے گئے۔

"ثنا بیگم! آخر اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ ملازمت بھی اتنی شان دار ہے کہ تم سنو گی تو خوشی سے اچھل پڑو گی۔"

"کیا کسی وزیر کے مشیر مقرر ہو گئے؟" اس نے شوخی سے کہا۔ "وہی ملازمت ہوگی، وہی کام ہوگا، وہی اخبار ہوگا۔ صرف اخبار کے نام کا فرق ہوگا۔"

"یہی تو خاص بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ملازمت تو وہی ہے لیکن تنخواہ ہے پچاس ہزار۔" اب سے تین چار سال پہلے پچاس ہزار روپے کی بہت قدر و قیمت تھی۔

ثنا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اور اخبار کی طرف سے مجھے نئی گاڑی بھی ملے گی۔" میں نے کہا۔

ثنا نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر اس کی

www.digestpk.com

Asifzamil

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اب تم کیوں رو رہی ہو جان!" میں نے ایک عرصے بعد اسے اس انداز میں مخاطب کیا تھا۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہزاروں طرح کے یہ ہوتے ہیں آنسو، اگر دل میں غم ہو تو روتے ہیں آنسو، خوشی میں بھی پلکیں بھگوتے ہیں آنسو۔" میں نے باقاعدہ گانا شروع کر دیا۔ گزشتہ دو مہینے سے تو میں گنگنانا بھی بھول گیا تھا۔

ثنا مسکرا کر بولی۔ "آپ کو گاتا دیکھ کر مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے۔ کیا ہوتا ہے خزاں بہار کے آنے جانے سے، سب موسم ہیں دل کھلنے اور دل مرجھانے سے۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "اللہ کے واسطے..... یہاں آپ اپنی اصول پرستی اور حق گوئی کے علم گاڑنے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

"ثنا! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں صحافی ہوں۔ کوئی بکا ہوا یا "لفافہ" صحافی نہیں ہوں کہ ....."

"لفافہ صحافی؟" ثنا نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیا ہوتا ہے؟ کیا لفافے چھاپتا ہے؟"

"لفافہ صحافی وہ ہوتے ہیں جنہیں کسی سیاسی پارٹی و تنظیم یا پھر بیرونِ ملک سے پیسوں کے لفافے ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ انہی کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ ان کے لیے کالم لکھتے ہیں یا لکھواتے ہیں۔"

"کالم تو آپ بھی لکھتے ہیں۔" ثنا نے کہا۔

"میں کالم صرف اخبار کے لیے لکھتا ہوں اور ہمیشہ جھوٹ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"لیکن اس کے باوجود آپ مصلحت سے کام لیجیے گا۔" ثنا نے کہا۔ "کالم یا خبر بنائیں بھی تو ایسی کہ پڑھنے والوں تک بات بھی پہنچ جائے اور آپ پر الزام بھی نہ آئے۔ اچھا باتیں چھوڑیں، یہ بتائیں کہ کھانے میں کیا بناؤں؟"

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"کیوں؟" ثنا نے کہا۔ "ابھی اتنے پیسے تو ہیں کہ ہم ایک ڈیڑھ مہینے تک آرام سے خرچ کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر آج کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔ پھر تو میں مصروف ہو جاؤں گا۔ بعد میں شاید مجھے فرصت نہ ملے۔"

اس رات ہم نے کھانا بھی باہر کھایا اور دیر تک گھومتے پھرتے بھی رہے۔ بچے اس دن بہت خوش تھے۔ میں انہیں ایک عرصے بعد باہر لے گیا تھا۔

دوسرے دن میں ساڑھے دس بجے کے قریب دفتر پہنچ گیا۔ اس دن آفتاب صاحب کے ساتھ شمس الحسن صاحب بھی موجود تھے۔ وہ بہت والہانہ انداز میں مجھ سے ملے اور بولے۔ "سلمان صاحب! میں نے آپ کے کالم بھی پڑھے ہیں اور آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا بھی ہے۔ مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔"

"سر! آپ حکم کرتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں کوئی وی آئی پی تو ہوں نہیں کہ آپ کو دستیاب نہ ہوتا۔"

"میں تو چاہتا تھا کہ آپ میرے ساتھ کام کریں۔ اب اللہ نے اس کی سبیل بھی پیدا کر دی۔"

"اب انٹرویو کے لیے امیدوار آنا شروع ہو جائیں گے۔" آفتاب صاحب نے کہا۔ "آپ دونوں الگ الگ انٹرویو کریں گے یا ایک ساتھ بیٹھیں گے؟"

"ایک ساتھ ہی بیٹھیں گے سر!" شمس الحسن صاحب نے کہا۔ "بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ بیٹھیں۔"

"اس کے لیے معذرت چاہوں گا۔" آفتاب صاحب نے کہا۔ "یوں بھی مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اسٹاف کا انتخاب تو آپ لوگ ہی کریں گے۔"

دفتر کے باہر والے حصے میں استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ اس کے سامنے دیوار کے ساتھ ساتھ دائرے کی شکل میں صوفے رکھے ہوئے تھے۔

ہم استقبالیہ کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ایک لڑکی وہاں داخل ہوئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے آئی ہو۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ "مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، ابھی دس منٹ ہیں۔" شمس الحسن صاحب نے کہا۔

مجھے اس لڑکی کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ میں کہنے والا تھا کہ ابھی تو انٹرویو شروع بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن شمس الحسن صاحب نے کہا۔ "سلمان صاحب! یہ ہماری ریسپشنسٹ مس ربیعہ ہیں۔"

میں اس نام پر چونک اٹھا۔

"ان کا تقرر بھی میں نے ہی کیا ہے۔ یہ اس سے پہلے کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی تھیں۔"

"آپ..... میں شاید..... آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

ربیعہ کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو اڑ گیا پھر وہ آہستہ



سے بولی۔ "جی ہاں سلمان صاحب! آپ مجھ سے مل چکے ہیں لیکن یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ میں تو آپ کو پہچان گئی تھی لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟"

"آپ کی آواز سے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بھئی سلمان صاحب کا حافظہ بہت غضب کا ہے۔" شمس الحسن صاحب نے کہا۔ "میں نے ان کے بارے میں کئی لوگوں سے سنا ہے کہ یہ اگر کسی شخص سے صرف ایک بار بات کر لیں یا اس سے ملاقات کر لیں تو اسے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ آپ نے بھی شاید ان سے ٹیلی فون پر بات کی ہوگی؟"

"جی سر۔" ربیعہ نے کہا۔ "میں نے اپنے آفس سے دو تین دفعہ سلمان صاحب سے بات کی تھی۔" ربیعہ نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ شمس الحسن اور آفتاب صاحب سے وہ واقعہ چھپانا چاہتی ہے۔ جی ہاں، یہ وہی ربیعہ تھی جس کی وجہ سے ایس ایس پی سرور سے میری ٹھن گئی تھی اور پھر مجھے ملازمت چھوڑنا پڑی تھی۔ اس کی خالہ صائمہ نے اس وقت بھی درخواست کی تھی کہ آپ خبر میں ربیعہ کے بجائے شاہین کا نام لکھیے گا۔ ویسے بھی ربیعہ کا پورا نام ربیعہ شاہین ہے۔

"یہ آپ کی سیٹ ہے۔" شمس الحسن صاحب نے استقبالیہ کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "انٹرکام کے نمبروں کی فہرست کاؤنٹر پر رکھے ہوئے شیشے کے نیچے موجود ہے۔ ابھی آپ کو اتنی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ میرے انٹرکام کا نمبر چھ ہے اور سلمان صاحب کا سات۔ آفتاب صاحب کے انٹرکام کا نمبر ایک ہے۔ فی الحال آپ کو انہی نمبروں کی ضرورت پڑے گی۔"

"بلکہ صرف چھ اور سات نمبر کی ضرورت پڑے گی۔" آفتاب صاحب نے کہا۔ "میں تو جا رہا ہوں۔" وہ ہم دونوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

اس وقت دفتر میں صرف دو چپراسی تھے۔ وہ بھی آفتاب صاحب شاید اپنے گاؤں سے لائے تھے۔ ان کے علاوہ مرکزی دروازے پر دو مسلح گارڈز بھی تھے۔ وہ بھی غالباً میرے آنے کے بعد ہی پہنچے تھے۔

"آفتاب صاحب نے یہاں کی ایک سیکیورٹی کمپنی کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ کمپنی کے گارڈز بھی پہنچ چکے ہیں۔ اخبارات کو تو یوں بھی دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔ اس لیے آفتاب صاحب نے یہ بندوبست کیا ہے۔" پھر وہ ربیعہ سے بولے۔ "مس ربیعہ! انٹرویو کے لیے جو امیدوار بھی آئے، اسے آپ ایک پرچی پر نمبر لکھ کر دے دیں اور اس کا نمبر اور نام اپنے پاس نوٹ بھی کر لیں۔ پھر انہیں اسی ترتیب سے اندر بھیجیے گا۔"

شمس الحسن صاحب مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ ان کا دفتر تو میرے دفتر سے بھی زیادہ شان دار اور کشادہ تھا۔ انہوں نے جہازی سائز آفس ٹیبل کے پیچھے پہلے سے دو کرسیاں رکھوالی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیے۔" پھر انہوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور کہا۔ "دو کپ چائے لے آؤ۔"

ٹھیک گیارہ بجے انٹرویوز کا تھکا دینے والا کام شروع ہو گیا۔ میں نے انٹرکام پر ربیعہ سے پوچھا۔ "مس ربیعہ! انٹرویو کے لیے کتنے لوگ آئے ہیں؟"

"سر! میں ابھی تک ایک سو پچیس پرچیاں بنا چکی ہوں۔" ربیعہ نے جواب دیا۔

امیدوار زیادہ تر فریش تھے اور حال ہی میں یونیورسٹیوں سے فارغ ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو تو اردو بھی صحیح طور پر لکھنا نہیں آتی تھی۔

اس دن ہم نے صرف دو امیدواروں کا انتخاب کیا۔ وہ دونوں ہی لڑکیاں تھیں۔ انہیں ایک اخبار میں کام کرنے کا تجربہ بھی تھا اور خبر کی اہمیت سے بھی واقف تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی رضوانہ تو مضامین بھی لکھتی تھی اور کالم بھی لکھ سکتی تھی۔

شام کو چار بجے کے قریب ہم لوگ اس کام سے فارغ ہوئے تو میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ہم نے ابھی کسی کو حتمی جواب نہیں دیا تھا۔ شمس الحسن صاحب نے سب کو وہی روایتی جواب دیا تھا کہ آپ کو ای میل کے ذریعے یا سیل فون پر مطلع کر دیا جائے گا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آفتاب صاحب نے اسٹاف کے لیے لنچ اور ڈنر کا انتظام بھی اخبار کی طرف سے کیا تھا لیکن ابھی کچن شروع نہیں ہوا تھا۔ ہمارے لیے چپراسی کسی اچھے ریسٹورنٹ سے کھانا لایا تھا۔

کھانے کے بعد شمس الحسن صاحب نے کہا۔ "سلمان صاحب! ایسے تو کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں اخبار چلانے کے لیے تجربہ کار لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں ابھی پریس کلب جاتا ہوں۔ وہاں لوگوں سے بات کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ زیادہ تنخواہ پر اچھے اور تجربہ کار لوگ بھی یہاں آجائیں گے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔"

"آپ چلے جائیں۔ یہاں اب بھی انٹرویو کے لیے لوگ آرہے ہیں۔ میں نے ربیعہ سے کہہ دیا ہے کہ چھ بجے



www.digestpk.com

Asifzamil

کے بعد جو لوگ آئیں، انہیں کل کا وقت دے دے۔ میں ان لوگوں سے انٹرویو کرلوں گا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" انہوں نے کہا اور اپنی گاڑی کی چابی اور چشمہ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ ابھی تین امیدوار مزید آئے ہیں۔ میں نے ربیعہ سے کہہ دیا کہ اب جو بھی انٹرویو کے لیے آئے، اسے آپ کل گیارہ بجے کا وقت دیں۔

وہ تین چار امیدوار بھی میرے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ میں نے جلد ہی انہیں فارغ کردیا۔ پھر ربیعہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔ "سر! پہلے تو میں آپ سے انتہائی معذرت چاہوں گی کہ ہماری وجہ سے آپ کی ملازمت چلی گئی اور ہم بھی ذلیل وخوار ہوگئے۔ امی نے تو اس کے بعد شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہم لوگ لاہور چلے گئے تھے۔ صائمہ آنٹی نے بھی اپنا ٹرانسفر وہاں کرالیا تھا۔ صائمہ آنٹی تو ابھی لاہور ہی میں ہیں۔ مجھے انہی کی کمپنی میں جاب مل گئی تھی اس لیے میں کراچی آگئی۔"

"لیکن مس ربیعہ شاہین!" میں نے کہا۔ "اور کوئی آپ کو پہچانے یا نہ پہچانے، سرور تو پہچانتا ہے اور آپ جانتی ہیں کہ وہ اب ایس ایس پی نہیں رہا بلکہ ڈی آئی جی کرائمز ہے۔"

"اب اس سے مجھے کیا خطرہ ہوسکتا ہے؟" ربیعہ نے کہا۔ "اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم نے اس ملٹی نیشنل فرم کی ملازمت چھوڑ کر یہاں ملازمت کیوں کرلی؟ یہ اخبار ابھی مارکیٹ میں آیا بھی نہیں ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ اخبار کامیاب نہ ہوا تو تم کیا کروگی؟"

"میں نے صائمہ آنٹی سے مشورہ کیا تھا۔" اس نے کہا۔ "انہوں نے کہا کہ تم کسی اخبار میں ہوگی تو تمہیں پریس کی پشت پناہی حاصل ہوگی اور اب شاید سرور تمہیں پریشان بھی نہیں کرے گا۔"

اس کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں نے اس بحث میں سر کھپانا فضول سمجھا۔

پھر میں نے اسے بھی چھٹی دی اور چپراسیوں سے دفتر بند کرنے کو کہا۔

☆☆☆

مجھے اس اخبار میں کام کرتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا۔ شمس الحسن صاحب بہت ذہین اور تعلیم یافتہ ایڈیٹر تھے اور وہ واقعی "صحافی" تھے۔ اس ایک سال میں کئی خبریں ایسی چھپیں جو خاصی متنازع تھیں لیکن شمس الحسن صاحب نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔

میں بھی اس اخبار میں ہفتہ وار کالم لکھتا تھا۔ میں اپنے کالم میں بہت کچھ لکھ جاتا تھا لیکن آفتاب صاحب نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ شمس الحسن صاحب تو ہر کالم پر میری تعریف ہی کرتے تھے۔

اچانک میں پھر ایک دوراہے پر آ کھڑا ہوا۔ ڈی آئی جی سرور ایک مرتبہ پھر میرے راستے میں آگیا۔ مجھے بہت خاص ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ سرور نہ صرف ایک قبضہ گروپ اور بھتا خور گینگ کی سرپرستی کررہا ہے بلکہ وہ انسانی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہے۔ خاص طور پر وہ نوخیز لڑکیوں کو اغوا کے بعد مختلف ممالک میں اسمگل کرادیتا تھا۔

میں نے اپنے ایک ذہین اور تیز طرار ماتحت شکیل کو اس مہم پر لگا دیا کہ وہ ڈی آئی جی کرائمز کے خلاف ثبوت اکٹھے کرے۔ شکیل بہت جوشیلا نوجوان تھا۔ میری تربیت نے اسے مزید نکھار دیا تھا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جرائم کی ایسی خبریں لاتا تھا جس میں پولیس سمیت اعلیٰ سول حکام بھی ملوث ہوتے تھے۔

پندرہ دن کی محنت کے بعد شکیل نے سرور کے خلاف اتنے ناقابلِ تردید ثبوت حاصل کرلیے کہ اس کی ہوشیاری اور ذہانت پر میں بھی اش اش کر اٹھا۔

میں نے اسی روز اسے ڈی آئی جی کرائمز کے خلاف ایک زبردست خبر بنانے کو کہا اور خود اس کی رپورٹ کی روشنی میں کالم لکھنے بیٹھ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہ کالم خبر کی اشاعت کے بعد شائع کروں گا۔ اس ایک سال کے عرصے میں میرا کالم "قلم گزیدہ" قارئین میں بہت مقبول ہورہا تھا۔ اس حوالے سے مجھے اکثر ٹی وی کے ٹاک شوز میں بھی بلایا جانے لگا تھا۔ میرے گھریلو حالات بھی قابلِ رشک تھے۔ دونوں بچے شہر کے اعلیٰ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے اور میں ہر طرح سے آسودہ حال تھا۔

اس خبر کا چھپنا تھا کہ شہر میں گویا بھونچال آگیا۔ اخبار میں ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا۔

اسی دوپہر آفتاب صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہوگیا۔

انہوں نے کسی تمہید کے بغیر درشت لہجے میں پوچھا۔

"سلمان صاحب! یہ کیا خرافات چھاپی ہے آپ نے؟"

"میں سمجھا نہیں سر!" میں نے حیرت سے کہا۔



"آپ میرے کمرے میں آیئے۔" وہ پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔

میں ان کے کمرے میں پہنچا تو شمس الحسن صاحب بھی وہاں موجود تھے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ خبر کیا ہوتی ہے؟" وہ شمس الحسن صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"سر! میں گزشتہ بیس سال سے اس شعبے میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم ہوگا تو کسے معلوم ہوگا۔" شمس الحسن صاحب بھی درشت لہجے میں بولے۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے اخبار شمس الحسن کے سامنے ڈال دیا۔ "میں اس خبر کی بات کررہا ہوں۔" انہوں نے اس تین کالمی خبر کی طرف اشارہ کیا جو ڈی آئی جی کرائمز کے خلاف تھی۔

"میں سمجھا نہیں سر!" شمس الحسن صاحب نے کہا۔

"یہ اسٹوری سلمان صاحب نے ڈیسک پر بیٹھ کر تیار کی اور آپ نے اسے فرنٹ پیج پر نمایاں انداز میں چھاپ دیا؟ وہ بھی ڈی آئی جی صاحب کی تصویر کے ساتھ؟"

"سر! یہ من گھڑت خبر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کبھی بھی غیر ذمے داری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ میرے پاس ثبوت موجود ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟" وہ تلخ لہجے میں بولے۔

"میرے پاس ایک نہیں بلکہ بہت سے ثبوت ہیں۔ اگر ڈی آئی جی صاحب کو اس پر اعتراض ہے تو بے شک وہ اخبار پر مقدمہ کردیں۔ میں عدالت میں ثابت کردوں گا کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے؟" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"سلمان صاحب! اگر واقعی آپ کے پاس ثبوت ہیں تو یہ بھی بتایئے کہ وہ کس ذریعے سے آپ تک پہنچے ہیں؟" شمس الحسن صاحب نے کہا۔

"سر! آپ تو بہت تجربہ کار صحافی ہیں۔ کم سے کم آپ تو ایسی بات نہ کریں۔ رپورٹر اپنا ذریعہ کبھی نہیں بتاتا۔ ہاں ضرورت پڑی تو میں عدالت میں وہ تمام ثبوت پیش کروں گا۔"

انٹرکام پر ربیعہ نے بتایا کہ ایڈیٹر صاحب کے کچھ مہمان آئے ہیں۔

شمس الحسن صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ "سر! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے آفتاب صاحب سے کہا۔ "سر! آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟"

"مجھے اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ آپ نے ڈی آئی جی کے ساتھ ساتھ کئی اہم شخصیات کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ اگر یہ خبر غلط ہوئی تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ اخبار کا ڈکلریشن کینسل ہوجائے گا۔"

"سر! آپ میری بات پر یقین کریں، ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اور میں اس قسم کے لہجے کا عادی بھی نہیں ہوں اس لیے پلیز اپنا لہجہ ذرا دھیما رکھیں۔"

"سوری سلمان صاحب!" آفتاب صاحب نے کہا۔ "اگر آپ واقعی مطمئن ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ کیس عدالت میں گیا بھی تو آپ ہی اس سے نمٹیں گے۔"

"جی سر! میں ہی عدالت کو تمام ثبوت مہیا کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ دھونس اور دھمکیاں تو دیں گے لیکن عدالت کا رخ نہیں کریں گے۔"

"ان دھونس اور دھمکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں

## تین نئے ٹارگٹ

ایک آوارہ مزاج شخص کی گھریلو زندگی بہت تلخ تھی۔ ایک دوست نے اسے مشورہ دیا، تم اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو اور آئندہ کے لیے توبہ کرلو۔ تمہاری بیوی تمہیں معاف کردے گی۔ اس شخص نے دوست کی بات پر عمل کیا۔ بیوی نے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے کہا۔

"چلو تم نے اقرار تو کیا مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ بدذات تھی کون؟" شوہر خاموش رہا۔

"کہیں وہ اسٹانی تو نہیں جو سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہے؟" شوہر خاموش رہا۔

"پھر وہ نرس ہوگی جو بن سنور کر گھر سے نکلتی ہے؟" شوہر پھر خاموش رہا۔

"اچھا اب میں سمجھی۔ وہ نیلی آنکھوں والی جو ساتھ والے فلیٹ میں رہتی ہے؟"

شوہر خاموشی سے اٹھا اور دوست کے پاس جاکر اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ "کیوں کیا بیوی نے تمہیں معاف کردیا۔" دوست نے پوچھا۔

"ارے معافی پر مٹی ڈالو پھر مانگ لیں گے۔ فی الحال تو اس نے تین نئے ٹارگٹ دیے ہیں۔"

اسلام آباد سے شکیل کاظمی کا تعاون



www.digestpk.com

Asifzamil

ہوں۔" آفتاب صاحب نے کہا۔ "ہاں، مجھے آپ کی اور اس لڑکے شکیل کی فکر ہے۔"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں سر۔" میں نے کہا۔ "اگر ڈی آئی جی کورٹ میں گیا تو نہ صرف اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا بلکہ اسے سزا بھی ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، آپ جائیں اپنا کام کریں۔" آفتاب صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ "معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ سے اس لہجے میں گفتگو کی۔"

"شکریہ سر۔" میں نے کہا۔ "معذرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ باس ہیں اور ....."

"سلمان صاحب!" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "اب آپ مجھے مزید شرمندہ مت کریں۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "میں اس لیے بھی زیادہ فکرمند ہوں کہ کل میں کاروبار کے سلسلے میں بیرونِ ملک جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں آپ اس صورتِ حال سے نمٹ لیں گے؟"

"میں اس صورتِ حال سے نمٹ لوں گا سر! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ ہمارا قانونی مشیر بھی بہت ذہین اور قابل وکیل ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی مقدمے نمٹا چکا ہے۔"

"او کے سلمان صاحب!" آفتاب صاحب نے کہا۔ "وش یو گڈ لک!"

"تھینک یو سر۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "مجھے ابھی کچھ اور ضروری کام بھی ہیں۔ اب آپ سے دو ہفتے بعد ملاقات ہوگی۔"

وہ اپنا بریف کیس اٹھا کر دفتر سے نکل گئے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور اپنے کالم کو ایک مرتبہ پھر پڑھنے لگا۔ پھر میں نے وہ کالم کمپیوٹر سے پرنٹ روم میں شفٹ کرا دیا۔

میرا کالم چھپنے کے بعد تو گویا قیامت اٹھ کھڑی ہوگی۔ ٹیلی فون پر دھمکیوں اور گالیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے اپنا سیل فون بھی آف کر دیا اور ربیعہ سے کہا کہ وہ کوئی کال مجھے ٹرانسفر نہ کرے۔

اسی وقت انٹر کام بج اٹھا۔ دوسری طرف شمس الحسن صاحب تھے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں بلا رہے تھے۔

میں ان کے کمرے میں پہنچا تو ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ "سلمان صاحب! آپ کی وجہ سے ہم سب کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ابھی اس خبر کی گرد بھی نہیں چھٹی تھی کہ آپ نے کالم بھی لکھ مارا۔"

"سر پلیز! مجھ سے اس لہجے میں بات مت کریں۔"

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟" وہ بھنّا کر بولے۔

"سر! میں پھر کہوں گا کہ اپنا لہجہ دھیما رکھیں ورنہ چیخنا مجھے بھی آتا ہے۔"

"تم نے کس کی اجازت سے یہ کالم چھاپا ہے؟" انہوں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"ایڈیٹر تو آپ ہیں سر!" میں نے کہا۔ "اگر آپ کو اس کالم پر کوئی اعتراض تھا تو چھپنے سے پہلے کرتے۔ فائنل چیکنگ تو آپ ہی کرتے ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ میں پرچے کا ایڈیٹر ہوں۔ سارا نزلہ تو مجھ پر گرے گا۔ اب تو آفتاب صاحب بھی یہاں نہیں ہیں۔" پھر وہ سرد لہجے میں بولے۔ "اس کا ایک ہی حل ہے۔ میں آپ کو ملازمت سے برطرف کر رہا ہوں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے حیرت اور صدمے سے پوچھا۔ "سر..... آپ نے کیا کہا؟"

"مجھے اپنی پوزیشن بھی تو صاف کرنا ہے۔" وہ سرد مہری سے بولے۔ "اس لیے میں آپ کو ابھی اور اسی وقت ملازمت سے برطرف کر رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں برطرفی کا لیٹر بھی آپ کو مل جائے گا۔"

"لیکن سر.....!"

"ہاں، گاڑی کی چابی اور لیپ ٹاپ آپ جی ایم صاحب کے حوالے کر دیں۔"

"سر! وہ لیپ ٹاپ تو میں نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس میں میرا بہت اہم ڈیٹا محفوظ ہے۔"

"تو پھر اس لیپ ٹاپ کی قیمت آپ کے بقایا جات سے کاٹ لی جائے گی۔"

اب ان سے کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ وہ ایڈیٹر تھے اور ان کے پاس کسی کو بھی برطرف کرنے کے اختیارات موجود تھے۔

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آیا اور اپنی ذاتی چیزیں، کتابیں اور سی ڈیز سمیٹنے لگا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر وہی منظر یاد آیا جب شریف الدین صاحب نے مجھے اخبار سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔

میں نے چپراسی کو بلا کر ایک خالی کارٹن منگوایا اور اپنی تمام ذاتی چیزیں، مضامین، کتابیں اس میں بھر لیں۔ پھر میں جی ایم صاحب کے کمرے میں پہنچا اور بولا۔ "سر! یہ میری گاڑی کی چابی ہے۔"



"کیا اسے ورک شاپ بھجوانا ہے سلمان صاحب؟"

"نہیں بلکہ میں ادارہ چھوڑ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے سبکی محسوس ہو رہی تھی کہ شمس الحسن صاحب نے مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔

"لیکن سلمان صاحب! اچانک ہی..... یعنی....."

"جی ہاں، بہت سے کام اچانک ہی ہوتے ہیں۔" میں نے کہا اور چابی ان کے حوالے کر کے باہر آ گیا۔

کوریڈور میں مجھے شکیل نظر آیا۔ وہ بھی خاصا افسردہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "شکیل! میں تو یہاں سے جا رہا ہوں لیکن تم اپنی محنت سے کام کرتے رہنا۔"

شکیل تلخی سے مسکرایا اور بولا۔ "سر! مجھے بھی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔"

"کیا؟" میں چونک کر بولا۔ "تمہیں بھی....."

"جی ہاں سر!" اس نے جواب دیا۔ "وہ خبر تو میری بائی لائن (نام) کے ساتھ چھپی تھی۔"

میں نے ایک چپراسی سے اپنے سامان کا کارٹن اٹھوایا اور اس دفتر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

شکیل بھی میرے ساتھ ساتھ دفتر سے نکلا اور بولا۔ "سر! کیا میں کبھی کبھی آپ کے گھر آ سکتا ہوں؟"

"تم جب چاہو میرے گھر آ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ جلد ہی کسی دوسرے اخبار میں تمہاری جاب کا بندوبست ہو جائے۔"

اس وقت تک چپراسی نے ایک ٹیکسی روک لی تھی۔ اس نے سامان کا کارٹن ڈکی میں رکھا اور میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔ مجھے ثنا کی فکر تھی کہ اس پر اس خبر کا ردِعمل کیا ہوگا۔ ایک سال کی آسودہ زندگی نے اسے پہلے کی طرح تر و تازہ اور شاداب کر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ میں اسے کل ہی بیاہ کر لایا ہوں۔

میں گھر پہنچا تو ثنا کچن میں تھی اور بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ دروازے کی ایک چابی میرے پاس بھی تھی۔ میں اکثر راتوں کو بہت دیر سے گھر پہنچتا تھا اس لیے ایک چابی اپنے پاس بھی رکھتا تھا۔

ثنا کو میری آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔ میں نے سامان کا کارٹن اسٹور روم میں رکھ دیا اور لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ کر ثنا کو آواز دی۔

وہ گھبرا کر کچن سے نکل آئی۔ "خیریت تو ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اس وقت آپ کیسے آ گئے؟"

"کیوں، میرے اس وقت آنے پر کوئی پابندی ہے؟" میں مسکرایا۔ "مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو۔"

وہ جلدی سے پانی لے کر آ گئی اور بولی۔ "مجھے آپ کی طبیعت واقعی خراب لگ رہی ہے۔ آپ کا چہرہ تو پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔"

"آج گرمی بھی تو بہت ہے۔" میں نے کہا۔

"گرمی!" ثنا نے حیرت سے کہا۔ "آپ کو گرمی لگ رہی ہے؟ آپ ابھی میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

مجھے خود بھی اپنے احمقانہ جواب کا احساس ہو گیا۔ سردیوں کا موسم تھا اور دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ باہر تو اچھی خاصی خنکی تھی۔ میں نے خود بھی اس وقت گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔

"ارے، میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔"

"نہیں، آپ مذاق نہیں کر رہے تھے۔" ثنا نے کہا۔ "مجھے بتائیں کہ کیا بات ہے؟"

"بات کوئی خاص نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بس میری ملازمت ایک مرتبہ پھر....."

"کیا؟" ثنا گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "آپ نے پھر جاب چھوڑ دی؟"

"میں نے جاب چھوڑی نہیں ہے بلکہ مجھے اس مرتبہ ملازمت سے نکالا گیا ہے۔ تم فکر مت کرو، میں لیبر کورٹ میں جاؤں گا۔ اتنی آسانی سے ملازمت نہیں چھوڑ دوں گا۔"

## گدھ

غالب کا ایک شاعر دوست دہلی سے آگرہ غالب سے ملنے آیا۔

محفل مشاعرہ سے جب دونوں واپس آ رہے تھے تو راستے میں چند گدھے چر رہے تھے۔ غالب کے دوست نے ازراہِ مذاق کہا۔

"یار! آگرہ میں گدھے بہت رہتے ہیں۔"

غالب نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں صاحب! باہر سے یہاں آ جاتے ہیں۔"

کراچی سے دریشم یونس کا انتخاب



www.digestpk.com

Asifzamil




''اچھا، آپ یہ کوٹ تو اتاریں۔ آپ کا پسینا تو اب بھی بہہ رہا ہے۔''

میں نے بیڈ روم میں جا کر کپڑے بدلے اور دوبارہ باہر آگیا۔

سب سے بڑا مرحلہ ثنا کو یہ خبر سنانے کا تھا۔ وہ مرحلہ میں نے طے کرلیا تھا۔ اب میری گھبراہٹ ختم ہوگئی تھی۔

''لیبر کورٹ میں بھی کیا مقدمے لمبے چلتے ہیں؟'' ثنا نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''نہیں بھئی۔'' میں نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ ''وہاں تو پندرہ بیس دن، زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ لیبر کورٹ میں جانے کا میرا ارادہ ہی نہیں تھا۔

میں نے اب تک اپنی موٹر سائیکل نہیں بیچی تھی اور وہ آج بھی بہت اچھی حالت میں تھی۔ میں چھوٹے موٹے کام تو موٹر سائیکل پر ہی کیا کرتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو دفتر سے دی ہوئی مراعات کو بے دردی سے استعمال کرتے ہیں۔ میں چاہتا تو ہر وقت گاڑی استعمال کرسکتا تھا لیکن میں اپنے ذاتی کام موٹر سائیکل پر کرتا تھا۔

☆☆☆

مجھے ملازمت سے برطرف ہوئے تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ میں ہمیشہ کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کا عادی تھا۔ پھر آمدنی کے لحاظ سے غیر محسوس طریقے پر اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں۔

میرے دونوں بچے کراچی کے ایک خاصے مہنگے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ میں پرانا مکان چھوڑ کر ایک بنگلے میں شفٹ ہو گیا تھا۔ میں شروع ہی سے اچھے لباس کا شوقین تھا اور اب تو میں انتہائی قیمتی اور امپورٹڈ کپڑے، جوتے، پرفیوم وغیرہ استعمال کرتا تھا۔ میرے پاس درجنوں سوٹ تھے۔

میں ثنا کو بھی ہر مہینے اچھی خاصی شاپنگ کراتا تھا۔ میں بچوں پر بھی دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ ہم لوگ ہفتے میں ایک دفعہ آؤٹنگ کے لیے ضرور جاتے تھے۔

ثنا مجھ سے کہتی بھی تھی کہ اتنی شاہ خرچی مت دکھائیں۔ بچت کی عادت بھی ڈالیں۔ میں نے کبھی اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملازمت چھوڑنے کے تین مہینے بعد ہی حالات خطرناک رخ اختیار کر گئے۔

ثنا کے کہنے پر میں نے جو تھوڑا بہت پس انداز کیا تھا، وہ تین مہینے میں ختم ہو گیا تھا۔ ثنا کے اکاؤنٹ میں البتہ کچھ رقم تھی۔

ثنا کو امید تھی کہ لیبر کورٹ جلد ہی میرے حق میں فیصلہ سنا دے گی لیکن میں سرے سے لیبر کورٹ میں گیا ہی نہیں تھا۔ بس اسے جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دیتا رہتا تھا۔

ثنا ایک مرتبہ پھر خاصی چڑچڑی ہوگئی تھی۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلا کام تو یہ کیا کہ مجھے بتائے بغیر گلشن اقبال میں ایک چھوٹے اور کم کرائے کے مکان کا بندوبست کرلیا۔

ہم پانچ سو گز کا وہ بنگلا چھوڑ کر ایک سو بیس گز کے مکان میں شفٹ ہوئے تو بچوں کو بہت مایوسی ہوئی لیکن میں نے انہیں اس شرط پر راضی کرلیا کہ یہاں ہمارا قیام عارضی ہوگا، ہم دو مہینے کے اندر اندر دوبارہ کسی اچھے سے بنگلے میں شفٹ ہو جائیں گے۔

''آپ نے بچوں کو تو جھوٹی تسلی دے کر بہلا لیا لیکن یہ کب تک چلے گا؟'' ثنا نے کہا۔

''میں پھر کہوں گا ثنا کہ تمہارا ایمان بہت کمزور ہے۔ تمہیں اللہ کی ذات پر بھروسا ہی نہیں ہے۔ ہر کام کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ میں اپنی سی تو پوری کوشش کر رہا ہوں، اب جو اللہ کو منظور۔''

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ثنا پانی کا گلاس لے آئی۔ میں نے سوچا کہ کسی دکان والے سے کچھ سامان اُدھار ہی لے لوں۔ میں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا اور کمرے سے باہر نکلا تو میری نظر بچوں کے کمرے پر پڑی۔ فہد اور افشین دونوں سو رہے تھے۔

''یہ بچے اسکول کیوں نہیں گئے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''کیا آج پھر اسکول وین نکل گئی؟''

''میں نے انہیں جانے سے روک دیا ہے۔'' ثنا نے کہا۔ ''دو مہینے سے اسکول کی فیس نہیں گئی ہے۔ دونوں بچوں کو روز ہی اسکول میں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ کلاس ٹیچر روز انہیں ایک نوٹس تھما دیتی ہے کہ آپ اپنی فیس ادا کریں۔ اس مرتبہ تو پرنسپل نے مجھے بلایا تھا۔ اسکول والے بھی صرف اس وجہ سے اتنی رعایت کر رہے ہیں کہ یہ ایک نامور صحافی کے بچے ہیں۔ پریس سے تو سبھی ڈرتے ہیں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ اس اسکول میں ایک مہینے کی فیس بھی رک جائے تو بچوں کو واپس گھر بھیج دیا جاتا ہے۔'' اس سے پہلے کہ ثنا مزید کچھ کہتی میں گھر سے باہر نکل گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں فوری طور پر کس سے



www.digestpk.com

Asifzamil

اُدھار لوں کہ کم از کم آج کے اخراجات تو پورے ہو جائیں۔

میں گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ میری نظر ظفر صاحب پر پڑی۔ وہ میرے مالکِ مکان تھے اور میری بہت عزت کرتے تھے۔ انہوں نے میرے کالم بھی پڑھے تھے اور مجھے بہت بڑا صحافی سمجھتے تھے۔ ان کا بھی دو مہینے کا کرایہ واجب الادا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ ''سلمان صاحب! اس دفعہ تو آپ نے بہت دیر کر دی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور مکان کے کرائے ہی سے میرے اخراجات چلتے ہیں۔''

''ظفر صاحب! بس مجھے ہفتہ دس دن کی مہلت دے دیں۔''

''آپ نے الیکٹرک، گیس اور ٹیلی فون کا بل بھی جمع نہیں کرایا ہے۔ الیکٹرک اور گیس کا بل تو جمع کرا دیں ورنہ بجلی اور گیس دونوں کٹ جائیں گی۔'' ان کا لہجہ سرد تھا۔

''چلیے، میں تو ایک آدھ ہفتے مزید انتظار کر لوں گا لیکن .....''

''آپ پریشان نہ ہوں ظفر صاحب! میں ادائیگی کی تاریخ سے قبل ہی بل جمع کرا دوں گا۔''

''میں نے تو آپ کو یہ سوچ کر مکان دیا تھا کہ آپ اتنے بڑے صحافی ہیں، ملک کے کروڑوں لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو ایک آدھ ہفتے میں ملازمت مل جائے گی لیکن .....''

''ظفر صاحب!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ میں ادائیگی کر دوں گا تو پھر آپ فضول باتیں کیوں کر رہے ہیں؟''

''سلمان صاحب!'' ظفر صاحب نے رکھائی سے کہا۔ ''آپ ایسا کریں، میرا مکان خالی کر دیں۔ دو ماہ کا کرایہ اور بل وغیرہ میں آپ کے دیے ہوئے ایڈوانس کی رقم سے کاٹ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کا مکان خالی کر دوں گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور اب کرائے کے لیے میرا دروازہ مت پیٹیے گا۔'' میں بھنّا کر آگے بڑھ گیا۔

ایک تو ثنا کی جلی کٹی باتوں نے دماغ خراب کر دیا تھا، اوپر سے ظفر صاحب نے بھی مجھے باتیں سنا دیں۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ ان کا مکان خالی ہی نہ کروں۔ میں اس وقت کسی بھی اخبار میں نہیں تھا لیکن کہتے ہیں کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ پہلے کبھی ہوتا ہوگا، اب اگر کوئی قدر دان مل جائے تو مرا ہوا ہاتھی سوا کروڑ کا ہوتا ہے یا پھر کوئی اسے کوڑیوں کے مول بھی نہیں پوچھتا۔

صبح مجھے بیڈ ٹی نہیں ملی تھی اس لیے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب میرا یہ حال ہے تو ثنا اور بچوں کا کیا حال ہوگا؟

گھر سے کچھ فاصلے پر مقامی بڑی بیکری اور جنرل اسٹور تھا۔ اس کا مالک بھی میری بہت عزت کرتا تھا۔ میں اکثر اس کے اسٹور سے سامان خریدتا تھا۔ وہ تمام گاہکوں کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے کچھ انڈے، ڈبل روٹی اور چائے کا سامان وغیرہ لے لوں۔ کہہ دوں گا کہ میں جلدی میں پرس گھر میں بھول آیا ہوں۔

میں جھجکتا ہوا اس کی دکان میں داخل ہوا۔ اس وقت اس کے تین چار سیلز مین گاہکوں کو نمٹا رہے تھے۔ وہ خود کیش پر بیٹھا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا تو لپک کر میری طرف آیا اور بولا۔ ''جی سلمان صاحب! فرمایئے، کیا خدمت کروں آپ کی؟''

''مجھے انڈے، ڈبل روٹی اور چائے کی پتی دے دیں۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

اس نے فوراً ایک درجن انڈے، سب سے بڑی ڈبل روٹی، چائے کی پتی کا آدھا کلو کا پیکٹ اٹھایا اور ان چیزوں کو شاپر میں ڈال کر شاپر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے اپنی جیب پر ہاتھ مارا، پھر ٹراؤزر کی دوسری جیبیں بھی ٹٹولیں اور بولا۔ ''شٹ، رمضان صاحب! آپ یہ سامان رکھ لیں، میرا پرس کہیں گر گیا۔'' مجھے یہ بہانہ کچھ معقول لگا۔

''کوئی بات نہیں سر!'' رمضان نے کہا۔ ''پیسے پھر دے دیجیے گا۔ آپ سامان تو لے جائیں۔''

''آپ کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن مجھے کچھ مزید سامان بھی خریدنا تھا۔ مجھے دو دن کے لیے اسلام آباد جانا ہے، گھر میں کم سے کم اتنا راشن تو ہو جو بیوی بچوں کو کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔''

''اوہو، یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔''

''زیادہ پریشانی اس لیے ہے کہ تین گھنٹے بعد میری فلائٹ ہے ورنہ میں کوئی نہ کوئی بندوبست تو کر ہی لیتا۔''

رمضان چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''سلمان صاحب! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟''

''میں آپ کی کسی بھی بات کا بُرا کیوں مانوں گا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

اس نے اپنے کیش کاؤنٹر کی دراز کھولی اور ہزار ہزار



کے پانچ نوٹ نکال کر جھجکتا ہوا بولا۔ ''آپ میری طرف سے یہ پیسے رکھ لیں۔ اسلام آباد سے واپسی پر دے دیجیے گا۔''

''نہیں رمضان صاحب! میں .....''

''سر! آپ میرا مان رکھ لیں۔ آپ اتنے مشہور آدمی ہیں۔ کیا میں آپ کی اتنی سی خدمت بھی نہیں کر سکتا؟'' اس نے وہ پیسے زبردستی میری ٹی شرٹ کی جیب میں ٹھونس دیے اور چونک کر بولا۔ ''سلمان صاحب! آپ نے چائے کے لیے دودھ بھی نہیں لیا اور جام جیلی بھی لینا بھول گئے۔''

میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے مکھن، جام جیلی، ٹیٹرا پیک ملک کا ڈیڑھ لیٹر کا پیکٹ بھی رکھ دیا۔

زندگی میں پہلی دفعہ میں نے کسی سے اس انداز میں قرض لیا تھا، وہ بھی جھوٹ بول کر۔

میں وہاں سے جانے لگا تو اس نے دبی زبان میں کہا۔ ''سلمان صاحب! آپ کو پولیس کے تقریباً تمام ہی افسر جانتے ہوں گے؟''

''جی ہاں، پولیس کے بہت سے افسر مجھے جانتے ہیں .... خیریت؟''

''آپ بھی سوچیں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ آپ ..... یقین جانیے سلمان ..... صاحب! ..... میں تو کل رات کو آپ کے گھر بھی آنے والا تھا ..... میں ..... تو .....''

''رمضان صاحب! آپ بتائیں، کیا بات ہے؟'' میں واقعی الجھ گیا تھا۔

''وہ دراصل ..... کل میرے بھائی کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

''کیوں پکڑ لیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ..... جی ..... اصل میں سسرال والوں سے اس کا کچھ جھگڑا تھا۔ کل بات زیادہ بڑھ گئی اور اس کے سالے اپنی بہن کو لینے آ گئے۔ اس کی بیوی میکے جانے پر راضی نہیں ہے۔ بات گالم گلوچ سے ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ میرے بھائی نے پستول نکال لیا اور انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائر کیا۔ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئے لیکن پولیس میں جا کر رپورٹ درج کرا دی کہ احسان نے ہم پر فائرنگ کی ہے۔ احسان میرے بھائی کا نام ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ ''پولیس نے میرے بھائی کو گرفتار کر لیا۔ سارے محلے والے گواہ ہیں کہ احسان نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔''

''احسان کے پاس پستول کا لائسنس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، اس کے پاس لائسنس ہے۔'' رمضان نے جواب دیا۔

''احسان کرتا کیا ہے؟''

''اس نے پانی کا فلٹر پلانٹ لگا رکھا ہے اور دکانوں پر پانی سپلائی کرتا ہے۔''

''وہ کس پولیس اسٹیشن میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بلوچ کالونی کے تھانے میں ہے سر!'' اس نے کہا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے سسرال والے کیا بااثر لوگ ہیں؟''

''ان کے پاس پیسا ہے۔ آج کے دور میں سب سے بڑا رسوخ پیسے ہی میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پولیس والوں کو بھی یقیناً دس بیس ہزار کھلائے ہوں گے۔'' پھر وہ خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں نے آپ کو کسی قسم کی رشوت دی ہے یا .....''

''اگر آپ اس سے پہلے یہ آفر کرتے تو میں اسے رشوت ہی سمجھتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ پیسے قرض ہیں اور میں ادا کروں گا۔''

''آپ کی بہت مہربانی سلمان صاحب! میں تو رات کو بھی آپ کا انتظار کرتا رہا لیکن رات میں آپ بہت دیر سے آئے تھے اس لیے میں نے آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

میں اس کی دکان سے رخصت ہوا تو یہی سوچ رہا تھا کہ آج کل بلوچ کالونی کے پولیس اسٹیشن میں ایس ایچ او کون ہے؟

میں نے راشن کا کچھ سامان لیا اور گھر پہنچ گیا۔

ثنا نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''آپ کے پاس تو ایک پیسا بھی نہیں تھا پھر یہ سامان .....''

''بُرے وقت کے لیے اتنے پیسے تو میں بچا کر رکھتا ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

فہد اور افشین بھی اٹھ چکے تھے۔ افشین نے مجھ سے کہا۔ ''پاپا! ایک تو امی اسکول کی فیس نہیں دیتی ہیں، پھر آج ہمیں اسکول بھی جانے سے روک دیا۔''

''اب تو یوں بھی دو دن بعد تمہارے اسکول کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اب کون سی چھٹیاں بابا؟'' فہد نے حیرت سے کہا۔ ''ابھی تو وِنٹر ویکیشن کے بعد ہمارے اسکول کھلے ہیں۔''



www.digestpk.com

Asifzamil

"ارے ہاں، میں تو بھول ہی گیا تھا۔" میں نے بچوں کو اس قسم کی باتوں میں بہلایا اور اپنے ایک کرائم رپورٹر دوست اختر کو ٹیلی فون کر کے پوچھا کہ آج کل بلوچ کالونی پولیس اسٹیشن میں انچارج کون ہے؟

"وہاں کا انچارج حاکم خان ہے۔ انتہائی بددماغ اور بدزبان شخص ہے۔ خیریت تو ہے؟"

"یار! ذرا بلوچ کالونی پہنچ، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں پہنچتا ہوں۔" اختر نے جواب دیا۔

میں نے سیل فون آف کر کے جیب میں رکھا اور بہت عجلت میں کپڑے بدلے اور موٹر سائیکل نکال کر بلوچ کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اختر وہاں پہلے ہی سے موجود تھا اور اس وقت انچارج کے کمرے ہی میں بیٹھا تھا۔ حاکم خان کو میں بھی جانتا تھا کہ انتہائی بددماغ، بدزبان اور رشوت خور آدمی ہے۔ گزشتہ دنوں اس کی کسٹڈی میں ایک ملزم تشدد سے ہلاک بھی ہو چکا تھا۔ مجھے یہ سب باتیں اس وقت یاد آئیں جب میں گھر سے تھانے کی طرف جا رہا تھا۔

میں نے ایک کانسٹیبل سے اختر کے بارے میں پوچھا اور خود بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔

حاکم خان اپنی ریوالونگ چیئر پر تقریباً نیم دراز تھا۔ اس نے کرسی کی پشت جھکا کر سر دیوار سے لگا رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر بھی اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس نے اپنی گدلی گدلی حریص آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔ "دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں اس وقت میٹنگ میں ہوں۔"

"یہ معروف کرائم رپورٹر سلمان احمد صاحب ہیں۔" اختر نے جلدی سے کہا۔

"سلمان احمد۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تشریف رکھو سرکار! آپ کا نام تو بہت سنا ہے لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اصل میں چھوٹے افسروں سے میرا واسطہ کم ہی پڑتا ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں جی، آپ ٹھہرے وڈے صحافی! ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو کب منہ لگاتے ہیں۔ حکم کریں جناب کیسے زحمت کی؟"

"تم نے کل کسی احسان نامی شخص کو گرفتار کیا ہے؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"احسان؟" اس نے سوچنے کی اداکاری کی۔ "میں نے تو کل چھ بندوں کو گرفتار کیا ہے..... کیا نام بتایا آپ نے..... احسان؟ میں اپنے سب انسپکٹر سے معلوم کرتا ہوں۔" اس نے گھنٹی بجائی تو کمرے میں ایک کانسٹیبل داخل ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو۔ حاکم خان نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "چیمہ صاحب کو بھیجو۔"

تھوڑی دیر بعد کمرے میں ایک سب انسپکٹر داخل ہوا۔ اس کا پیٹ اتنا بڑا تھا کہ پینٹ بار بار نیچے کھسک رہی تھی۔

"چیمہ صاحب!" حاکم خان نے پوچھا۔ "کل آپ نے کسی احسان نام کے شخص کو گرفتار کیا ہے؟"

"جی سر!" چیمہ نے جواب دیتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنی پینٹ اوپر کھسکائی۔

"کس جرم میں؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے اندھا دھند فائرنگ کی ہے جناب! وہ تو ان لوگوں کی زندگی تھی جو وہ فائرنگ سے بچ گئے ورنہ سیدھا سیدھا دفعہ تین سو دو کا کیس بنتا۔"

"ابھی کون سا کیس بنایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اپنا تعارف تو کراؤ جنابِ عالی!" چیمہ نے تمسخر سے کہا۔ "ملزم کے وکیل ہو یا....."

"یہ میڈیا کے بندے ہیں۔" حاکم خان جلدی سے بولا۔ "بہت وڈے کرائم رپورٹر ہیں۔"

چیمہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔

"آپ کرائم رپورٹر ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس پر کون سی دفعہ لگے گی؟"

"حاکم خان!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم نے احسان کے مخالفین سے کتنی رقم لی ہے؟"

"توبہ توبہ جناب! رقم کا کیا سوال۔ ابھی تک تو ہم نے ایف آئی آر بھی درج نہیں کی ہے۔"

"حالانکہ اس گرفتاری کو بارہ گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حاکم خان! میں جانتا ہوں کہ تم شناختی کارڈ گم ہونے کی ایف آئی آر بھی پیسے لیے بغیر درج نہیں کرتے۔" میں نے ہوا میں تیر چھوڑا۔ "کتنی رقم لی ہے اس گرفتاری کی؟"

"جناب! آپ مسلسل مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔" حاکم خان نے سرد لہجے میں کہا۔

"الزام!" اختر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا میں بتاؤں کہ تم نے کس سے کون سے کیس میں کتنی رقم لی ہے؟"



حاکم خان کا چہرہ غصے سے مسخ ہو گیا۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اب تک وہ ہمیں دو چار ٹھڈے مارنے کے بعد حوالات میں بند کرا چکا ہوتا۔ وہ منہ سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن اس کا چہرہ مجسم گالی بنا ہوا تھا۔ اس نے سنبھل کر کہا۔

"اختر صاحب! آپ تو ایسی بات نہ کریں۔"

میں جانتا تھا کہ اختر بھی کوئی فرشتہ نہیں ہے اسی لیے حاکم خان ایسی بات کر رہا ہے۔

"حاکم خان!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہارے خلاف پہلی خبر تو یہ بنے گی کہ تم نے ایک معزز آدمی کو گزشتہ چوبیس گھنٹے سے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ ابھی اس ملزم کا واقعہ تازہ ہے جو تمہاری تحویل میں تشدد سے مر گیا تھا، دوسری خبر اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز ہو گی کہ پولیس کے ایک ذمے دار ایس ایچ او نے پانچ لاکھ روپے لے کر ایک شریف شہری کو بلاجواز لاک اپ میں بند کر دیا۔ تم نے اس پر شدید تشدد کیا اور اس سے اپنا من پسند بیان لینے کی کوشش کی۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں نے پانچ لاکھ روپے لیے ہیں؟"

"مجھے خود انہی لوگوں کے ایک آدمی سے معلوم ہوا ہے کہ حاکم خان نے پانچ لاکھ روپے لیے ہیں۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔" حاکم خان پھر کو بولا۔ "وہ صرف دس ہزار روپے دے کر..... میرا مطلب ہے کہ انہوں نے....." وہ غصے کی شدت میں رقم کا تذکرہ کر گیا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس پر اپنے ایک صحافی دوست کا نمبر ڈائل کر کے بولا۔ "ہیلو! سلمان بول رہا ہوں، ذرا آئی جی صاحب سے بات کرائیں۔"

"سلمان صاحب!" ایس ایچ او نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ میری بات تو سنیے۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے گفتگو جاری رکھی۔ "اچھا میٹنگ میں ہیں۔ میں کچھ دیر بعد ٹیلی فون کر لوں گا۔"

"سلمان صاحب! آپ چاہتے کیا ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اس بے گناہ شخص کی رہائی اور ان لوگوں کی گرفتاری جن سے تم نے رقم لی ہے۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "ایک بات اور سن لو حاکم خان! تمہیں جس افسر کی پشت پناہی حاصل ہے، اب تو اس کی نوکری کے بھی لالے پڑنے والے ہیں۔ اس کے خلاف میرے پاس ایسے ناقابلِ تردید ثبوت ہیں کہ اس کی ملازمت تو جائے گی ہی، اسے دو چار سال جیل کی ہوا بھی کھانا پڑے گی۔"

حاکم خان کے چہرے پر پہلی دفعہ مجھے گھبراہٹ کے آثار دکھائی دیے۔

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ افسر تمہیں بچا لے گا تو یہ تمہاری بھول ہو گی حاکم خان۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اس قسم کے چھوٹے معاملات میں ہاتھ ڈالتا نہیں ہوں لیکن اگر تم نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو میں یہ کیس بھی میڈیا تک لے جاؤں گا۔ میں ثابت کر دوں گا کہ جو ملزم تمہاری تحویل میں ہلاک ہوا ہے، اسے تم لوگوں نے تشدد کر کے ہلاک کیا ہے۔" مجھے بالکل بھی علم نہیں تھا کہ وہ ملزم کیسے ہلاک ہوا ہے اور پولیس کا مؤقف کیا ہے؟

حاکم خان کے مکروہ چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے۔ وہ چند لمحے تک خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سلمان صاحب! یہ معاملہ کسی طرح سیٹ نہیں ہو سکتا؟"

"مثلاً کس طرح؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو، سلمان صاحب سے "مک مکا" کی بات مت کرنا۔" اختر نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ میں اگر احسان کو چھوڑ دوں اور..... ان لوگوں کے خلاف کارروائی نہ کروں تو....."

"تم نے اس پارٹی سے کتنی رقم لی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب آپ سے کیا چھپانا۔" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے بیس ہزار روپے دیے تھے۔"

"تم احسان کو رہا کر کے وہ رقم اسے دے دو۔" میں نے کہا۔ "یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے کہا، پھر ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لائن ملنے پر وہ بولا۔ "میں حاکم خان بول رہا ہوں۔ ڈی آئی جی صاحب سے بات کرائیں۔"

میں نے کریڈل پر ہاتھ مار کر لائن کاٹ دی اور تلخ لہجے میں بولا۔ "بات شاید تمہاری موٹی عقل میں آئی نہیں، پہلے یہ سن لو۔" میں نے اپنا سیل فون جیب سے نکال کر اسے وہ پوری بات چیت سنا دی جس میں اس نے بیس ہزار روپے لینے کا اعتراف کیا تھا۔ میں ایسے موقعوں پر اپنے سیل فون کا ریکارڈر ہمیشہ آن کر دیتا تھا۔

میں نے سیل فون آف کیا اور اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے، اس نوکری سے تمہارا دل بھر گیا



www.digestpk.com

Asifzamil

ہے؟" پھر میں اختر سے مخاطب ہوا۔ "چلو، میں براہِ راست آئی جی صاحب سے بات کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری بات تو سنیں۔" حاکم خان بھی میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "میں تو ڈی آئی جی صاحب سے کسی اور معاملے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ آپ تشریف تو رکھیں۔"

پھر اس نے گھنٹی بجائی تو وہ وہی زندگی سے بیزار کانسٹیبل پھر نمودار ہوا۔

"چیمہ صاحب کو بلاؤ۔" اس نے کہا۔

سب انسپکٹر چیمہ ایک مرتبہ پھر کمرے میں داخل ہوا۔

"چیمہ صاحب! ملزم احسان کو یہاں لے آئیں۔"

چیمہ نے الجھے ہوئے انداز میں حاکم خان کو دیکھا پھر اپنی پینٹ پیٹ پر ٹکانے کی کوشش کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ تقریباً اڑتیس، چالیس سال کے ایک شخص کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور اس کی زنجیر کا دوسرا سرا ایک کرخت صورت سپاہی کے ہاتھ میں تھا۔

"ان کی ہتھکڑی کھول دو۔" حاکم خان نے کہا۔

"لیکن سر! یہ....."

"ہتھکڑی کھولو۔" حاکم خان نے چیمہ کی بات کاٹ دی۔ "بندے پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ تو معلوم کر لیا کرو کہ وہ کس کا آدمی ہے۔ سلمان صاحب اس کے لیے خود یہاں آئے ہیں۔ یہ چاہتے تو ٹیلی فون بھی کر سکتے تھے۔"

چیمہ نے میری طرف یوں دیکھا جیسے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "سر! ملزم کی رہائی تو کورٹ سے ہوگی۔ آپ....."

"زیادہ باتیں مت بناؤ چیمہ! یہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں جو تمہاری باتوں میں آجائیں گے۔ یہ جانتے ہیں کہ ابھی پرچہ نہیں کٹا ہے۔" حاکم خان نے سارا ملبا چیمہ پر ڈال دیا۔ "اور احسان صاحب کے پاس سے جو کچھ برآمد ہوا ہے، وہ بھی واپس کرو۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "میں ابھی آیا سر!" وہ بہ مشکل تمام کرسی کی قید سے آزاد ہوا اور باہر کی طرف لپکا۔

اس دوران میں احسان کی ہتھکڑی کھل چکی تھی اور وہ ابھی تک حیران پریشان کھڑا تھا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے۔

"آپ بیٹھیے احسان صاحب!" میں نے اس سے کہا تو وہ جھجکتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

حاکم خان کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا جس میں کچھ چیزیں بندھی ہوئی تھیں۔

اس نے وہ چیزیں احسان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لیجیے احسان صاحب! آپ کی کوئی چیز کم تو نہیں ہے؟"

احسان نے کپڑا کھول کر اپنی چیزوں کا جائزہ لیا۔ اس میں اس کا سیل فون، پرس، ایک بال پوائنٹ اور ایک آٹومیٹک پسٹل تھا۔

"جی ہاں، چیزیں تو پوری ہیں، بس میری گھڑی اور انگوٹھی نہیں ہے۔" اس نے اپنے پرس کا جائزہ لیا اور بولا۔ "اس میں بھی دو ہزار کم ہیں۔"

حاکم خان نے پھر گھنٹی بجائی اور سپاہی سے کہا۔ "چیمہ صاحب کو بھیجو۔"

فوراً ہی چیمہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔

"احسان صاحب کی گھڑی اور انگوٹھی کہاں ہے اور ان کی نقد رقم میں سے بھی دو ہزار روپے کم ہیں۔"

چیمہ نے ایک حوالدار کو طلب کیا اور اسے جھاڑ پلائی کہ احسان صاحب کی تحویل سے برآمد ہونے والی چیزیں کم کیوں ہیں؟

حوالدار الٹے قدموں واپس آیا اور بولا۔ "ان کی یہ گھڑی اور انگوٹھی وہاں رہ گئی تھی۔ یہ کیش بھی تھا۔" اس نے جیب سے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکالے اور احسان کی طرف بڑھا دیے۔

"کچھ کیش اور بھی تھا۔" حاکم خان نے کہا۔ "میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا کہ....."

"جی سر!" اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکالے اور احسان کو دے دیے۔

"یہ.... تو.... میرے...."

میں نے اشارے سے اسے پیسے لینے کو کہا۔ اس نے الجھے ہوئے انداز میں نوٹ رکھ لیے۔

"اوئے، غفار اور اس کے بھائیوں کے گھر کسی کو بھیجا ہے؟" اس نے حوالدار سے پوچھا۔

"موبائل گئی ہے سر!" اس کے بجائے چیمہ نے جواب دیا۔ "بس وہ آنے ہی والی ہوگی۔"

ابھی اس کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ پھر دو سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں دو افراد داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کا جسم بھاری تھا۔ اس نے جو سفاری سوٹ پہن رکھا تھا وہ بھی خاصا قیمتی تھا۔



اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ دوسرا آدمی جوان تھا، اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے بڑے بڑے بال قمیص کے کالر سے نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔

سفاری سوٹ والے نے ایک نظر احسان کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی۔ پھر کرسی کھینچ کر اس نے بیٹھنے کی کوشش کی۔

"کھڑا رہ غفار۔" حاکم خان گرج کر بولا۔ "تجھ سے بیٹھنے کو کس نے کہا ہے؟ تو اپنی سسرال میں نہیں آیا ہے۔"

غفار نے حیرت سے حاکم خان کو دیکھا پھر بولا۔ "انسپکٹر صاحب!..... میں ....."

"بکواس بند کراوئے!" حاکم خان نے ڈپٹ کر کہا۔ "اوئے، تم نے احسان صاحب کے خلاف جھوٹی رپورٹ درج کرائی تھی۔ میں نے تفتیش کرا لی ہے۔ مجھے ساری حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔" پھر وہ حوالدار سے بولا۔ "ان دونوں کو حوالات میں بند کر دو۔ میں ان سے بعد میں نمٹوں گا۔"

سپاہی ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے اور ٹھڈے مارتے ہوئے حوالات کی طرف لے گئے۔

"اب ہمیں بھی اجازت دیں۔" میں نے کہا۔

"بیٹھیں سرکار! میں نے آپ کے لیے ٹھنڈا منگوایا ہے۔"

"پھر کبھی سہی!" میں نے کہا۔ "میری طرف سے وہ تم چیمہ صاحب کو پلا دینا۔" میں احسان سے مخاطب ہوا۔ "آیئے احسان صاحب!"

ہم حاکم خان کے کمرے سے باہر نکلے تو احسان حیرت سے بولا۔ "آپ کون ہیں سر اور میرے ساتھ....."

"آپ پریشان مت ہوں، میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔"

میں نے اختر کو رخصت کرنے کے بعد احسان کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھایا اور سیدھا اس کے بھائی کی دکان پر پہنچا۔

رمضان تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "سلمان صاحب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟ میں....."

"آپ فی الحال یہ کریں کہ اپنی فیملی کو لے کر عارضی طور پر کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔ کسی ایسے دوست کے گھر جسے آپ کے سالے نہ جانتے ہوں۔" میں نے احسان سے کہا۔ "دکان ابھی کچھ دن بند رہنے دیں۔"

"لیکن سلمان صاحب! میں تو....."

"احسان صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ پولیس کو نہیں جانتے۔ میں ان لوگوں کے کمینے پن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ان لوگوں نے غفار اور اس کے بھائی کو فوری طور پر تو بند کر دیا ہے لیکن وہ انہیں پھر چھوڑ دیں گے۔"

"جیسا سلمان صاحب کہہ رہے ہیں، ویسا ہی کرو۔ یہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں پولیس کو..... تم شاید انہیں پہچانتے نہیں ہو، یہ بہت بڑے صحافی ہیں۔ تم نے اکثر انہیں ٹی وی پر بھی دیکھا ہوگا۔"

احسان نے ایک مرتبہ پھر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں ان سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

میں نے احسان کو تھانے سے رہا تو کرا دیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ ساری کارروائی سرور کو بہت جلد معلوم ہو جائے گی اور یہ بات سرور کو ہضم نہیں ہوگی۔ اس وقت تو میں کسی اخبار سے منسلک بھی نہیں تھا کہ اس کے خلاف اپنی مرضی سے کچھ لکھ سکوں۔ دوسرے اخبارات میرے کالم میں کاٹ چھانٹ کر دیتے تھے۔ کاٹ چھانٹ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس میں سے وہ حصے حذف کر دیتے تھے جو اعلیٰ سول اور پولیس افسران کے خلاف ہوتے تھے۔ میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے یہ سب برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں گھر آ گیا۔

میں گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ کال سرور کی تھی۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو!"

"مسٹر سلمان! تم تو بہت اونچے اڑنے لگے۔" سرور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔"

"مطلب کی بات کرو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا بے روزگار ہونے کے بعد تمہارا دماغ بالکل خراب ہو گیا ہے؟" سرور کا لہجہ توہین آمیز تھا۔ "تم کیا چاہتے ہو، میں تمہارے ان کالموں پر بھی پابندی لگوا دوں جو گھٹیا درجے کے اخبارات میں چھپتے ہیں؟"

"تم اگر سر کے بل بھی کھڑے ہو جاؤ تو میرے قلم پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ میں پھر کہوں گا کہ مطلب کی بات کرو۔"

"تم نے حاکم خان کو کیا دھمکیاں دی ہیں اور تم ہوتے کون ہو کسی ملزم کو پولیس کی حراست سے چھڑانے والے؟"



www.digestpk.com

Asifzamil

"یہ بات تم حاکم خان سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اسے تو میں نے لائن حاضر کر دیا ہے۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ "اس کی نوکری تمہاری وجہ سے جائے گی۔"

"تم اپنی نوکری کی خیر مناؤ۔" میں نے طنز کیا۔ "تم جو ایڈیشنل آئی جی بننے کے خواب دیکھ رہے ہو، وہ دیکھنا بند کر دو..... سمجھے۔"

"تو خود کو سمجھتا کیا ہے دو ٹکے کے صحافی۔" سرور ایک دم بھڑک گیا۔

"میرے وہ دو ٹکے بھی حلال کے ہوتے ہیں۔ تیری طرح میری رگوں میں حرام کا خون نہیں ہے، حرام زادے! مجھ سے اس لہجے میں بات کرے گا تو میڈیا کے سامنے تجھے ننگا کر دوں گا۔"

"میں..... میں..... اب تیرے اس اخبار کو بھی بند کراؤں گا جہاں سے تجھے نکالا گیا ہے۔ میں کورٹ میں جاؤں گا اور تجھے جیل نہ بھجوادوں تو میرا نام سرور نہیں۔"

"بھونکتا رہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب مجھے ٹیلی فون مت کرنا ورنہ میں بھی اس زبان میں بات کروں گا جس میں تم لوگ کرتے ہو۔ اب ٹیلی فون بند کر۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مارے غصے کے میرا برا حال تھا۔

"کون تھا، کس کا ٹیلی فون تھا؟" ثنا نے پریشانی سے پوچھا۔ "اتنا تو میں نے سن لیا ہے کہ وہ کال کسی ڈی آئی جی کی تھی۔ اب آپ نے کیا کر دیا؟"

میں نے کوئی جواب دیے بغیر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی۔ باقی پانی میں نے اپنے سر پر ڈال لیا۔ اس سے مجھے کافی سکون ملا۔ فہد اور افشین نے مجھے اتنے غصے میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ دونوں سہم کر رہ گئے تھے۔

میں نے تولیے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور مسکرا کر فہد سے کہا۔ "بیٹا! تم کیوں ڈر گئے۔ یہ ٹیلی فون تو انکل مسعود کا تھا۔ وہ یوں ہی مجھ سے لڑائی کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں، آج شام کو ہم سب کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"پاپا! میں سی ویو جاؤں گی۔" افشین نے کہا۔

"ہاں، میں اپنی گڑیا کو سی ویو ضرور لے کر جاؤں گا۔"

میں نے کپڑے بدلے اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ثنا میرے لیے چائے بنا لائی۔

میں چائے پی ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل ایک بار پھر بجی۔ اس مرتبہ شمس الحسن صاحب کال کر رہے تھے۔

"ہیلو سر!" میں نے کہا۔

"سلمان صاحب! آپ نے جو کچھ ڈی آئی جی سرور اور دوسرے لوگوں کے بارے میں لکھا تھا، اس کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"سر! کئی ثبوت ہیں لیکن بات کیا ہے؟"

"ابھی ڈی آئی جی صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھے اور اخبار پر مقدمہ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔"

"تو کرنے دیں مقدمہ۔" میں نے کہا۔ "آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے احتشام کو چارج دیا تھا۔ ڈی آئی جی کے خلاف سارے ثبوت بھی میری اسی کیبنٹ میں موجود ہیں۔ اس کی چابی احتشام کے پاس ہوگی۔"

"میں احتشام سے ابھی پوچھتا ہوں۔" شمس الحسن صاحب نے کہا۔ "آپ تو چلے گئے، مصیبت ہمارے گلے پڑ گئی۔ آفتاب صاحب بھی ابھی تک لندن میں ہیں۔ وہ وہاں کوئی نیا بزنس سیٹ کر رہے ہیں۔ میں اخبار کو دیکھوں یا یہ مقدمات بھگتاؤں۔"

"سر! پہلی بات تو یہ کہ میں خود نہیں گیا، آپ کی فرمائش پر جاب چھوڑی ہے ورنہ میں اس ڈی آئی جی سے خود ہی نمٹ لیتا۔ دوسری بات یہ کہ اخبار کا اپنا لیگل ایڈوائزر ہے بلکہ پوری ایک لاء فرم ہمارے پینل پر ہے۔ آپ کو مقدمات دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ خود نمٹ لیں گے۔"

"اب تم مجھے میری ذمے داریاں بھی بتاؤ گے؟" شمس الحسن صاحب بپھر کر بولے۔

"سر! آرام سے بات کریں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اب میں آپ کا ماتحت نہیں ہوں اور آپ سے زیادہ تلخ اور تند و تیز زبان استعمال کر سکتا ہوں۔ اب نہ اخبار سے میرا کوئی تعلق ہے، نہ مقدمے سے! آپ جانیں اور آپ کا اخبار جانے۔"

"اس ہوا میں رہنا بھی مت۔" انہوں نے کہا۔ "جب کیس عدالت میں جائے گا تو تم بھی بچ نہیں سکو گے۔"

"آپ تو محفوظ ہیں، آپ کو میری کیا فکر ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں ابھی احتشام سے معلوم کرتا ہوں کہ اس کے پاس ایسے کون سے ثبوت ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔



ثنا بہت غور سے میری باتیں سن رہی تھی۔ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "اب یہ کیا چکر ہے مقدمے کا۔ زندگی میں سکون تو پہلے ہی ناپید ہے، گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی ہے اور آپ ہیں کہ....."

"ثنا پلیز!" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "اگر میرا ساتھ نہیں دے سکتیں تو اتنا تو کر سکتی ہو کہ خاموش رہو۔"

"آخر کب تک خاموش رہوں؟" ثنا بھی بپھر گئی۔ "آپ نے ہمیشہ اپنی من مانی کی۔ میں شروع سے کہتی رہی کہ مصلحت سے کام لیں لیکن....."

"ثنا پلیز! مجھے پریشان مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میرا ذہن پہلے ہی الجھا ہوا ہے۔"

اچانک میرے سیل فون کی بیل پھر بجنے لگی۔ میں نے جھنجلا کر نام دیکھے بغیر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں نے ابھی احتشام سے پوچھا ہے۔" دوسری طرف شمس الحسن صاحب کی آواز آئی۔ "اس کے پاس ڈی آئی جی کے خلاف ایسی کوئی فائل، کوئی ثبوت نہیں ہے جو مقدمے میں کام آئے۔"

"میں نے جب احتشام کو چارج دیا تھا تو ان چیزوں کی لسٹ بنا کر اس سے سائن بھی لے لیے تھے۔ ڈی آئی جی کے ساتھ ساتھ اس میں دوسرا اہم ریکارڈ بھی تھا۔ اب اگر وہ احتشام کے پاس نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ڈی آئی جی کے خلاف من گھڑت خبریں چھاپیں اور کالم لکھے۔ اب یہ مقدمہ بھی تم ہی کو بھگتنا ہوگا۔"

"آپ بھی میری خبروں کو من گھڑت کہہ رہے ہیں؟"

"آج تو میں کہہ رہا ہوں، کل جب کیس عدالت میں جائے گا تو عدالت بھی یہی کہے گی۔"

"میں اس مقدمے سے نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا لیکن میرا لہجہ کھوکھلا تھا۔ "آپ نے تو اس بے بنیاد خبر کی پاداش میں مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا نا! پھر آپ کو کیا فکر ہے؟" یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرا ذہن مسلسل اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ ڈی آئی جی کی فائل سیف میں سے کہاں گئی؟ کیا احتشام بھی بک گیا اور اس نے فائل غائب کر دی؟ احتشام اس قسم کا آدمی تو نہیں تھا لیکن پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جب شریف الدین جیسا شخص بک سکتا ہے تو احتشام کیوں نہیں بک سکتا؟

مجھے اچانک شکیل کا خیال آیا۔ ممکن ہے اسے کچھ علم ہو۔ میں نے سیل فون پر اس کا نمبر ڈائل کیا۔

اس نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ "السلام علیکم سر!" اس نے کہا۔ "کیسے کیسے ہیں آپ؟ مجھے تو آپ بھول ہی گئے۔"

"تم کیسے ہو شکیل؟" میں نے پوچھا۔ "کہیں جاب کر رہے ہو یا....."

"جاب کہاں سر!" اس نے کہا۔ "کوئی ڈھنگ کا اخبار ملازمت دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ میں تو آج کل بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزارہ کر رہا ہوں۔ ہاں، میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں جو ملک کے بہت سے معزز سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کے چہرے بے نقاب کر دے گی۔"

"گڈ!" میں نے کہا۔ "شکیل! یہ بتاؤ، تمہیں ڈی آئی جی سرور کا کیس یاد ہے؟"

"اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں سر!" شکیل نے کہا۔ "اس نے تو میرا کیریئر برباد کیا ہے۔ میں اسے بھی بے نقاب کر دوں گا۔"

"شکیل! میں اس وقت بہت پریشانی میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "سرور سے میری بہت زوردار جھڑپ ہو گئی ہے۔ اس نے اس خبر کی بنیاد پر اخبار پر مقدمہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔"

"شوق سے کرے۔ ویسے بھی اب آپ تو وہاں ہیں نہیں۔ آپ کو کیا پریشانی ہے؟"

"مجھے یہ پریشانی ہے کہ دفتر سے ڈی آئی جی کے خلاف سارے ثبوت غائب ہو گئے ہیں۔ وہ اخبار کے ساتھ ساتھ مقدمے میں مجھے بھی فریق بنائے گا۔"

"سر! میرا خیال ہے کہ ثبوت وہاں سے غائب نہیں ہوئے ہیں بلکہ کیے گئے ہیں۔ یہ کام احتشام بھی کر سکتا ہے اور کوئی دوسرا رپورٹر بھی جس کی پہنچ اس کیبنٹ تک ہوگی۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "لیکن آپ پریشان مت ہوں۔ میرے پاس اس فائل کے ایک ایک کاغذ کی فوٹو کاپی موجود ہے۔"

"واقعی؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"سر! مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ آپ جیسا سینئر رپورٹر اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا ہے۔ اتنے اہم کیسوں کی تو ایک نقل لازمی طور پر اپنے پاس رکھی جاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے زندگی میں پہلی دفعہ یہ غلطی ہوئی ہے۔ بس سب کچھ اچانک ہو گیا۔ ورنہ میں اس بارے میں کچھ سوچتا۔"



www.digestpk.com

Asifzamil

''اب آپ بالکل ٹینشن مت لیں۔'' شکیل نے کہا۔
''میں نے اس فائل کے تمام کاغذات اسکین کرنے کے بعد انہیں اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس پوری فائل کی فوٹو کاپی بھی بنالی تھی۔ اگر سرور کچھ زیادہ ہی گڑبڑ کرے تو میرے پاس کچھ ایسے ثبوت بھی ہیں جو اسے فوری طور پر حواس باختہ کرنے کو کافی ہوں گے اور وہ مقدمہ کرنا بھول جائے گا۔''

''تم آج کسی وقت میرے گھر آسکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی وقت کیوں سر!'' شکیل نے کہا۔ ''میں ابھی تمام کاغذات لے کر آپ کی طرف آرہا ہوں۔''

''آ دیکھیں ذرا، کس میں کتنا ہے دم!'' میں نے باقاعدہ گنگنانا شروع کردیا۔

ثنا نے کمرے میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''سلمان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں پاگل ہوگیا ہوں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ثنا بیگم! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہر حال میں مدد کرتا ہے۔ اب میں دیکھوں گا اس ڈی آئی جی کو، اس میں کتنا دم ہے؟ تم ذرا اچھی سی چائے بنا لاؤ۔ ہاں، صبح میں بسکٹ کے دو ٹین ڈبے بھی لایا تھا، وہ بھی نکال لینا۔''

''کیوں، کوئی مہمان آرہا ہے کیا؟''

''ہاں، شکیل آرہا ہے۔'' میں نے کہا۔

ثنا کچن میں چلی گئی۔ میں نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اس میں دیکھنے لگا کہ شاید اس میں کوئی ثبوت ہو۔

ڈور بیل بجی تو ثنا ہی نے دروازہ کھولا۔

پھر شکیل گلے میں ایک بیگ لٹکائے کمرے میں داخل ہوا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں سر؟'' اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا۔ ''آپ پہلے کی نسبت کچھ کمزور ہوگئے ہیں۔''

وہ اپنے ساتھ نہ صرف ڈی آئی جی سرور کی فائل لایا تھا بلکہ اپنا لیپ ٹاپ بھی لے آیا تھا۔

''یہ وہ فائل ہے جس کی وجہ سے آپ پریشان تھے۔'' شکیل نے مجھے ڈی آئی جی سرور کی فائل دیتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''آپ کے پاس پرنٹر ہے؟''

''ہاں، میرے پاس پرنٹر بھی ہے اور اسکینر بھی۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس سرور کے خلاف ایسے ثبوت ہیں کہ نہ صرف اس کی ملازمت جائے گی بلکہ وہ پھانسی کے پھندے تک بھی پہنچ جائے گا۔'' شکیل نے مسکرا کر کہا اور اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ ''یہ سرور کی تحریر ہے۔''

میں نے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف گھما کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''تمہارا اسیل فون ہر وقت بند کیوں رہتا ہے؟ کل تک ان دونوں کا کام ہوجانا چاہیے۔ انہوں نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔''

''یہ دونوں کون ہیں؟'' میں نے شکیل سے پوچھا۔

''آپ آگے دیکھیے، آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔'' اس نے لیپ ٹاپ پر ایک تصویر نکالی اور بولا۔ ''اس تصویر کو دنیا کی کوئی عدالت نہیں جھٹلا سکتی۔''

اس تصویر میں دو لڑکیاں زمین پر بیٹھی تھیں۔ سرور ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور دونوں لڑکیوں کے چہرے خوف سے مسخ تھے۔

''یہ...... یہ تو ---- وہ مشہور ماڈل گرلز ہیں جنہیں محمد علی سوسائٹی کے ایک بنگلے میں قتل کیا گیا تھا اور پولیس کا مؤقف یہ تھا کہ ان کے کسی عاشق یا ان کے رقیب نے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔'' مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ''تمہارے پاس یہ تصویریں کہاں سے آگئیں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اصل میں ڈی آئی جی سرور کا ایک آدمی نظام میرے لیے کام کرتا ہے۔ ڈی آئی جی نے اس کی بہن کی عزت بھی پامال کردی تھی۔ نظام کو اس کا علم تو تھا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ تم ایک اسپائی کیمرا خرید لو۔ جب بھی موقع ملے، تم ڈی آئی جی کی تصویریں بنالو اور مجھے دے دو۔ میں اس کی زندگی اجیرن کردوں گا۔''

''اس تصویر کا ایک پرنٹ نکال لو اور اسے میری ای میل آئی ڈی پر بھی بھیج دو۔''

''میرے پاس ڈی آئی جی کے خلاف تمام تصاویر کا پورا ریکارڈ لیپ ٹاپ کے علاوہ کمپیوٹر میں بھی محفوظ ہے۔ پھر میں نے اس تمام ریکارڈ کو اپنی ای میل پر محفوظ کرلیا ہے۔ اگر کبھی سرور نے مجھ سے لیپ ٹاپ چھین بھی لیا اور میرا کمپیوٹر تباہ بھی کردیا تو وہ تمام اسٹف میرے میل باکس میں محفوظ رہے گا۔''

سرور کے خلاف ریکارڈ ہاتھ میں آتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا اور شکیل کے جانے کے بعد سب سے پہلے






www.digestpk.com

Asifzamil

وہ تمام ریکارڈ اسکین کر کے اپنی ای میل پر روانہ کیا پھر اس فائل کی مزید ایک ایک کاپی بنائی اور سرور کی تصویر کا پرنٹ آؤٹ لے کر گھر سے روانہ ہو گیا۔ میں آج ہی سرور سے ملنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا، اس وقت وہ آفس ہی میں ہو گا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو اس کے پی اے نے مجھے ٹوکا۔ ''ڈی آئی جی صاحب میٹنگ میں ہیں جناب۔''

میں نے ایک سلپ پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا اور اس سے کہا۔ ''تم یہ سلپ صاحب تک پہنچا دو۔ وہ میٹنگ میں ہونے کے باوجود مجھے بلا لیں گے۔''

پی اے نے ایک نظر میرے نام پر ڈالی پھر بولا۔ ''سلمان صاحب آپ ہی ہیں؟''

''اتفاق سے میں ہی ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ بھی مسکراتا ہوا چلا گیا اور فوراً ہی واپس آ کر بولا۔ ''صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

میں سرور کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے سامنے دو ایس ایس پی بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ہی مجھے پہچانتے تھے۔

سرور نے ان سے کہا۔ ''او کے، میں آپ لوگوں سے بعد میں بات کروں گا۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''آیئے، ایشیا کے بلکہ دنیا کے عظیم جرنلسٹ صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی۔ مجھے طلب کر لیتے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔ دونوں ایس پی کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

''تم اخبار پر مقدمہ کر رہے ہو؟'' میں نے یوں پوچھا جیسے یہ خبر مجھے ابھی ابھی ملی ہو۔

''اچھا تو تم اس سلسلے میں آئے ہو۔'' سرور نے چہک کر کہا۔ ''سلمان صاحب! بُرے وقت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ آپ کے ایڈیٹر نے تو کہہ دیا کہ میں سلمان کو نوکری سے نکال چکا ہوں۔ اب آپ اس پر براہِ راست مقدمہ کریں۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''مقدمہ تو میں کروں گا۔ مجھے تمہاری وہ گالیاں بھی یاد ہیں جو تم نے مجھے ٹیلی فون پر دی تھیں۔ میں چاہوں تو ابھی تمہیں کسی بھی الزام میں بند کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔''

''اگر تمہاری بات ختم ہو گئی ہو تو میں کچھ بولوں؟'' میں نے کہا۔

''اچھا! اب بھی کچھ بولنے کی گنجائش ہے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب تو جو کچھ بولنا، جیل جا کر بولنا۔ وہاں بھی میں تمہاری زندگی اتنی عذاب کرا دوں گا کہ تم ہمیشہ کے لیے لکھنے سے توبہ کر لو گے۔''

''پہلے یہ فائل دیکھ لو۔'' میں نے فائل اس کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس فائل کو تم نے دفتر سے غائب کرا لیا تھا نا؟''

فائل پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ بپھر کر بولا۔ ''یہ..... یہ فائل تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میں سارے ثبوت دفتر ہی میں چھوڑ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں تم پر مقدمہ کروں گا بلکہ میں کیا کروں گا، کورٹ خود ہی تم سے نمٹ لے گی۔'' پھر میں نے انتہائی ڈرامائی انداز میں وہ تصویر نکالی اور سرور کے سامنے ڈال دی۔

تصویر دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''یہ..... یہ..... تصویر.....''

''یہ تصویر نہیں ہے بلکہ تمہارے لیے پھانسی کا پھندا ہے۔ یہ تصویر کل کے ہر اخبار میں ہو گی اور فرنٹ پیج پر ہو گی۔ تم تو میرے کالم بند کرا رہے تھے نا؟''

''دیکھو سلمان! میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں..... تم.....''

''ذاتی دشمنی نہیں ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''تمہاری وجہ سے میری ملازمت گئی۔ مجھے اس تمام عرصے میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔ تم کہہ رہے ہو کہ ذاتی دشمنی نہیں ہے؟''

''میں تمہیں جاب پر بھی دوبارہ لگوا دوں گا اور تمہارا جو نقصان ہوا ہے، اسے بھی پورا کر دوں گا۔''

''جاب تو مجھے مل ہی جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ کہ تم نے شمس الحسن صاحب کو کتنے پیسے دیے تھے؟''

''اب اس بات کو چھوڑو۔'' سرور نے کہا۔

''نہیں سرور! مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے شمس الحسن جیسے آدمی کو کتنی قیمت دے کر خریدا تھا؟''

''میں نے انہیں بیس لاکھ دیے تھے۔'' سرور نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''اور احتشام کو کتنے پیسے دیے تھے فائل غائب کرنے کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بہت ٹیڑھا بندہ ہے سلمان صاحب!'' اس نے کہا۔ ''میں نے اسے زیرو میٹر گاڑی اور پانچ لاکھ روپے کی آفر کی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔''

''پھر یہ کام کس نے کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔



''اس بات کو جانے دیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو یقین نہیں آئے گا۔''

''کیا شمس الحسن صاحب بھی اس میں انوالو ہیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ بھی انوالو ہیں۔'' سرور نے کہا۔ ''میں نے انہیں بیس لاکھ روپے دیے تھے اور دھمکی دی تھی کہ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں اخبار پر مقدمہ کر دوں گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہ دھمکی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے پہلے کا بھی کچھ حساب کتاب ہے جس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔''

''تو تم نے بیس لاکھ روپے دے کر مجھے ملازمت سے نکلوا دیا؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تمہاری فائل شمس الحسن صاحب نے غائب کی تھی؟''

''نہیں، میری فائل ربیعہ نے وہاں سے نکالی تھی۔'' اس نے اچانک گویا میرے سر پر دھماکا کر دیا۔

''ربیعہ..... وہ..... لڑکی..... جو.....''

''ہاں، وہی ربیعہ۔'' سرور نے کہا۔ ''جس کی وجہ سے میری اور آپ کی دشمنی کی ابتدا ہوئی۔''

''اس نے فائل کیوں نکالی؟''

''وہ اس لیے کہ..... وہ اب..... میری بیوی ہے۔'' اس نے ایک اور دھماکا کیا۔

''تمہاری بیوی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، اس کیس کے بعد میں نے اس سے شادی کر لی تھی۔ وہ لڑکی واقعی مجھے پسند آ گئی تھی۔''

''اسے اخبار میں ملازمت کے لیے بھی تم ہی نے بھیجا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، وہاں تو وہ خود ہی گئی تھی۔ میں نے اس سے شادی کر لی تھی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔''

''گویا اسے ڈرا دھمکا کر شادی کے لیے مجبور کیا تھا؟''

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔ اب ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ لیکن اب بھی اس نے مجھے دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ وہ علیحدہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ میری پہلی بیوی کو اس شادی کا علم نہیں ہے۔ میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح احتشام کی کیبنٹ سے وہ فائل نکال لے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ یہ بتایئے کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

''تم میری خدمت کرنے کے قابل رہو گے تو خدمت کرو گے نا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''سلمان صاحب! میں آپ کے تمام نقصانات کا ازالہ کر دوں گا۔ میری طرف سے نئی کرولا بھی آپ کی نذر ہے اور.....''

''اس کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' میں نے کہا۔

''آپ اس کیس کو بھول جائیں۔''

''سرور! تم پھر وہی غلطی کر رہے ہو جو اس سے پہلے کر چکے ہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں آپ کو دو کروڑ روپے دینے کو تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ دو کروڑ روپے تم اپنے لیے سنبھال کر رکھو۔ ملازمت جانے کے بعد تمہارے کام آئیں گے۔'' یہ کہہ کر میں نے فائل اور... تصویر کا پرنٹ آؤٹ اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔

''سلمان صاحب!'' سرور نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''کیا ہمارے درمیان کسی بھی طرح کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تم ملازمت سے استعفا دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ تمہاری گردن پر نہ جانے کتنے بے گناہوں کا خون ہے۔ ان دونوں ماڈل لڑکیوں کا خون تو ابھی تازہ ہے۔''

''میری گولی سے صرف ایک لڑکی ہلاک ہوئی تھی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''دوسری لڑکی کو تو حاکم خان نے گولی ماری تھی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس پوسٹ مارٹم کی رپورٹ موجود ہے۔'' میں نے ہوا میں تیر چھوڑا۔ ''اس میں دونوں لڑکیوں کی ہلاکت مختلف ریوالوروں سے ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر میں باہر کی طرف مڑا۔ پھر بولا۔ ''تم کل صبح تک مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو کہ تم ملازمت سے استعفا دے رہے ہو اور خود کو قانون کے حوالے کر رہے ہو یا نہیں؟ ابھی تو شاید تمہیں عمر قید ہو لیکن اگر یہ کیس عدالت تک گیا تو تمہارے کریڈٹ پر بہت سے قتل ہوں گے اور سب کے ثبوت میں فراہم کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات اور ٹی وی چینل پر ایک ہی خبر تھی کہ ڈی آئی جی کرائم سرور نے خودکشی کر لی۔ مرنے سے پہلے اس نے ایک خط میں اپنے تمام جرائم کا اعتراف کیا تھا اور کہا تھا کہ میں نے سلمان احمد جیسے سچے اور کھرے صحافی



www.digestpk.com

Asifzamil

کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے اس گناہ کے ساتھ ساتھ دوسرے گناہوں کی بھی سزا ملنا چاہیے۔

اس نے اپنے تمام گناہوں اور جرائم کا اعتراف کرنے کے بعد لکھا تھا۔ ”میں میڈیا کے سامنے اپنی بدنامی اور رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر پھانسی کا پھندا تو میرا مقدر ہوگا ہی۔ اس نے یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ ربیعہ میری بیوی ہے اور اسے بھی میری جائداد میں سے، برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔“

میں اس دن بہت پُرسکون نیند سویا تھا۔ صبح میری آنکھ ٹیلی فون کی کرخت آواز سے کھلی۔ میں نے اپنا سیل فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو!“

”آپ کی وجہ سے میڈیا میں ایک ہنگامہ برپا ہے اور آپ سو رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے آفتاب صاحب کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔

”السلام علیکم سر!“ میں نے کہا۔ ”آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ میں نے اسکرین پر نمبر نہیں دیکھا ورنہ.....“

”میں کراچی سے بول رہا ہوں، رات ہی پہنچا ہوں۔ آپ فوراً آفس پہنچیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے جلدی جلدی شاور لیا۔ ایک کپ چائے پی اور موٹر سائیکل سنبھال کر سیدھا دفتر پہنچ گیا۔

آفتاب صاحب نے والہانہ انداز میں میرا استقبال کیا اور بولے۔ ”سلمان صاحب! مجھے آپ پر فخر ہے۔ آپ کی سچائی کا اعتراف تو اس گھاگ اور جرائم پیشہ ڈی آئی جی نے بھی کیا ہے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولے۔ ”آپ آج ہی سے اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ آپ یہ سمجھیں کہ آپ کچھ ماہ کی چھٹی پر تھے۔ میں آپ کو اس تمام عرصے کی سیلری بھی دوں گا۔ آپ کی مراعات بھی وہی ہوں گی۔ ہاں، گاڑی وہ نہیں ہوگی۔ میں نے اس مرتبہ آپ کے لیے کچھ بڑی گاڑی کا انتظام کیا ہے۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ”آیئے، باقی باتیں آپ کے آفس میں ہوں گی۔ آج میں آپ کا مہمان ہوں۔ چائے تو مجھے آپ ہی پلائیں گے۔ میں کل پھر لندن جا رہا ہوں۔“

میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو آفتاب صاحب بولے۔ ”اب آپ کا کمرا وہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے۔“ انہوں نے ایڈیٹر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”آج سے آپ اخبار کے ایڈیٹر ہیں اور آپ کی سیلری میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ بس اپنی سابقہ سیلری کو دو سے ضرب دے دیں۔ ہاں، آپ کی چھٹیوں کی سیلری وہی ہوگی جو آپ پہلے لیتے تھے۔“

میں نے آفتاب صاحب کے لیے چائے منگوائی اور ان سے کہا۔ ”سر! اگر آپ میری خاطر ایک دن رک جائیں تو.....“

”تو کیا؟“ وہ مسکرائے۔

”آج کا ڈنر آپ میرے ساتھ کریں۔ میری بیوی اور بچے بھی آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں۔“

آفتاب صاحب نے مسکرا کر میری دعوت قبول کر لی۔ پھر بولے۔ ”ابھی تو مجھے ایک دو ضروری کام نمٹانا ہیں۔ اب رات میں ملاقات ہوگی۔“ پھر وہ جاتے ہوئے چونک کر بولے۔ ”یہ استقبالیہ کاؤنٹر خالی کیوں ہے؟“

”سر! آپ شاید بھول گئے کہ ربیعہ، سرور کی بیوی ہے۔“

”بھئی، سارا قصور تو سرور کا تھا، ربیعہ کا اس میں کیا قصور؟ آپ فوراً اسے واپس بلا لیں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر جاتے ہوئے بولے۔ ”ہاں، اب اسٹاف کو رکھنے اور نکالنے کے پورے اختیارات آپ کو ہیں۔ شمس الحسن صاحب تو نہ جانے کہاں فرار ہو گئے ہیں۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے شکیل کو بلایا اور اس سے کہا کہ اب تم اس اخبار کے چیف کرائم رپورٹر ہو۔ احتشام تمہارا اسسٹنٹ ہوگا۔

”سر! میں ایک بات بتاؤں؟“ شکیل نے مسکرا کر کہا۔ ”ڈی آئی جی سرور کی وہ تصویر کمپیوٹر کا کارنامہ تھی جو میں نے آپ کو دی تھی۔ وہ دو مختلف تصویریں تھیں جنہیں میں نے کمپیوٹر کے ذریعے بہت صفائی سے جوڑ کر ایک بنا دیا تھا۔ سرور کے دل میں چور تھا۔ ہوا بھی وہی تھا اس لیے اس نے تصویر کا باریک بینی سے جائزہ نہیں لیا۔“

”اس کا انجام تو یہی ہوتا۔ میں اس تصویر کے بغیر بھی اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔ اب تم جا کر اپنی ذمے داریاں سنبھالو اور آج ہی سے کام شروع کر دو۔“ میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ میں نے سچائی کی راہ میں بہت کڑی مشقت جھیلی تھی۔ مسافت کی یہ گرد چھٹنے میں بھی ابھی کافی وقت درکار تھا لیکن جب منزل کا تعین ہو جائے تو سفر آسان ہو جاتا ہے۔ میرا سفر سچ کا سفر تھا اور اللہ مجھے ہمیشہ اس سفر پر گامزن رکھے۔ اس مسافت کی گرد میں بھی ایک لطف ہے۔



گوز کن را گور در پیش کی عبرت اثر تمثیل سرورق کی دوسری تیکھی کہانی

دوسرا رنگ

# مدفن

مریم کے خان

زندگی تبدیلیوں سے عبارت ہے... سب کچھ بدلتا رہتا ہے مگر ظلم اور جبر مسلسل کا دستور سدا سے ایک ہی انداز میں چلا آرہا ہے... ظالم و مظلوم... شہ زور اور بے زور کے مابین ازل سے جاری کشمکش کی بہت سی داستانیں ہر نئے سورج کے ساتھ وجود میں آتی ہیں... ان ہی میں سے ایک روح فرسا داستاں... ظلم کرنا اس کی سرشت تھی... قدرت نے بھی اس سفاک کی رسی دراز کی ہوئی تھی لیکن کب تک... آخر کار وہ دن آ ہی گیا... جو اس ظالم کا یوم حساب تھا، دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے ایک درندہ صفت کا فسانۂ سنگین...

اسے ہوش آیا تو وہ کسی تاریک جگہ تھا۔ کچھ دیر تک تو اسے کچھ یاد نہیں آیا کہ وہ کون ہے اور اس تاریک جگہ آنے سے پہلے کہاں تھا۔ پہلا تاثر دہشت کا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اسے زندہ ہی دفن کر دیا گیا ہو۔ تاریکی اتنی مکمل تھی جیسے اس کی بینائی نہ رہی ہو۔ اس نے بوکھلا کر اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا سر کسی ٹھوس اور ہموار سطح سے ٹکرایا۔ اسے ہلکی سی چوٹ آئی تھی لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے سطح کو ٹٹولنے لگا۔ محسوس کرنے میں وہ لکڑی تھی۔ ہموار، سیدھی اور مضبوط۔ اس نے دائیں بائیں ہاتھ مارے۔ اطراف میں بھی ایسی ہی لکڑی تھی اور وہ لکڑی کے ہموار تختوں پر لیٹا ہوا تھا، اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سچ مچ کسی قبر میں تھا اور یہ تابوت تھا۔ لکڑی میں معمولی سے رخنے تھے لیکن ان رخنوں کے باہر روشنی نہیں



www.digestpk.com

Asifzamil

بلکہ مٹی تھی۔ ہلکی سی ریت سرک کر رخنوں سے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ کیا وہ مر گیا تھا اور اسے دفن کر دیا گیا تھا لیکن وہ مسلمان تھا اور مسلمان اپنے مُردے تابوت میں نہیں دفناتے..... جب تک اس کی کوئی خاص وجہ نہ ہو۔

پھر وہ خود کو مُردہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ زندہ تھا جیسے اس تابوت میں آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اس نے ذہن پر زور دیا تو اسے اپنا نام یاد آ گیا۔ وہ وڈیرا خدا بخش تھا۔ پورے چار ہزار ایکڑ زمین کا مالک اور اس سے کہیں زیادہ انسانوں کا..... زمین پر خدا (نعوذ باللہ)۔ لیکن وہ یہاں کیسے آیا؟ یہ یاد کرنے کے لیے اسے ذہن پر مزید زور دینا پڑا۔ بہت زیادہ شراب پینے سے اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی، کوئی بات یاد کرنے پر فوری یاد نہیں آتی تھی۔ بالآخر مسلسل ذہن پر زور دینے سے اسے یاد آ گیا۔ وہ ماڈل اور ایکٹریس اور اصل میں ایک ہائی کلاس کال گرل مشال کے گھر پر تھا اور بہت زیادہ پی چکا تھا۔ اس کا سر ویسے ہی چکرا رہا تھا پھر اچانک تاریکی چھا گئی اور کسی نے اس کے سر پر کچھ دے مارا۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ یہ مشال کا کام ہے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے خدا بخش نے چلّا کر اسے گالی بھی دی تھی۔

مگر اب اس کا خیال بدل گیا تھا۔ مشال ایک غیر معروف ماڈل گرل اور اداکارہ تھی جو ٹی وی ڈراموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کرتی تھی۔ شکل صورت کی اچھی تھی، بڑی آنکھیں، مناسب قسم کے نقوش اور سرمئی مائل بال تھے لیکن اس کا اصل اثاثہ اس کا قیامت خیز جسم تھا اور وہ قیامت خیز ترین ادائیں بھی رکھتی تھی اور اس کا کام خدا بخش جیسے لوگوں کا دل بہلانا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک وہ ایک صنعت کار کی منظورِ نظر تھی لیکن جب ایک محفل میں خدا بخش سے ملاقات ہوئی تو اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی پیش کش قبول کر لی کیونکہ صنعت کار سے وہ جتنا کھینچ سکتی تھی، کھینچ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد وہ اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔ ایسا وقت آنے سے پہلے اس نے ایسا خود کر لیا تو کیا بُرا کیا؟

خدا بخش خوش تھا کہ اس کے اشارے پر یہ خوب صورت تتلی خود پھنسنے چلی آئی۔ یہ رات اس نے مشال کے شان دار اپارٹمنٹ میں گزاری اور چند گھنٹوں میں مشال نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اس کے بعد مہینے میں ایک بار اس کا کراچی کا چکر لازمی ہو گیا تھا۔ یہاں اس کا وسیع حلقۂ احباب اور جان پہچان تھی۔ وہ ملتا سب سے تھا لیکن رات مشال کے اپارٹمنٹ میں ہی گزارتا۔ اس کے جسمانی پیچ و خم اور اداؤں نے خدا بخش کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ پچپن سالہ خدا بخش بیویوں کے معاملے میں کوٹا بہت پہلے پورا کر چکا تھا۔ اس کی چار بیویوں سے کوئی سترہ اولادیں تھیں۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا تیس سال کا تھا اور پوری طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ اس نے تین شادیاں کر لی تھیں اور چوتھی کے بارے میں غیر مصدقہ اطلاع تھی کہ وہ حیدر آباد میں ایک طوائف تھی جس سے مراد بخش نے خاموشی سے شادی کر لی تھی۔

خدا بخش کے نو میں سے چھ بیٹے اور آٹھ میں سے چار بیٹیاں شادی شدہ تھیں کیونکہ خاندان میں ان کے لیے مرد مل گئے تھے۔ خاندان میں شادی کے لیے صرف جنس دیکھی جاتی تھی، عمر وغیرہ بے کار چیز تھی۔ اس لیے خدا بخش کی ایک بیٹی کا شوہر عمر میں خدا بخش سے دو سال بڑا تھا اور ایک بیٹی کا شوہر خود اپنی بیوی سے گیارہ سال چھوٹا تھا۔ بیٹی کی عمر بائیس سال تھی یعنی اس کا شوہر عملاً بچہ تھا۔ تین بیٹیوں کے لیے خاندان میں کوئی مرد دستیاب نہیں تھا اس لیے ان کے مقدر میں گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھا ہو جانا تھا اس کے علاوہ وہ کسی سے آشنائی کر سکتی تھیں یا گھر سے بھاگ سکتی تھیں۔ دونوں صورتوں میں پکڑے جانے پر دردناک موت ان کا مقدر بن جاتی اور انہیں کاری قرار دے کر زندہ دفن کر دیا جاتا۔

خود خدا بخش اپنی دو بہنوں کو اسی طرح زندہ دفنا چکا تھا۔ وہ ان کے دو بھائیوں کے ساتھ پکڑی گئی تھیں۔ بھائیوں کو تو خدا بخش اور اس کے باپ نے موقع پر اپنے شکاری کتوں کے حوالے کر دیا تھا اور وہ انہیں چیر پھاڑ کر کھا گئے تھے۔ لڑکیوں کو وہ گھر لے آئے تھے۔ حویلی کے عقب میں ایک بڑی سی زمین اسی کام کے لیے مخصوص تھی اور یہاں ان کے بے شمار دشمن اور معتوب دفن تھے۔ صرف بہت معتمد ملازمین اس خفیہ قبرستان کے بارے میں جانتے تھے، وہی تدفین کے ذمے دار بھی تھے۔ گویا عملاً ان کے شریکِ جرم تھے اس لیے ان کی طرف سے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لڑکیاں اس قبرستان کے بارے میں جانتی تھیں۔ ان میں ایک سترہ سال کی تھی اور دوسری صرف پندرہ سال کی تھی۔ وہ رونے گڑگڑانے لگیں لیکن خدا بخش اور اس کے باپ نبی بخش کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی..... اور یہ تو غیرت کا معاملہ تھا۔ قبر ملازموں نے کھودی تھی لیکن دونوں لڑکیوں کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے دھکا دے کر قبر میں اتارا تھا۔ چھوٹی تو خوف سے بے دم ہو کر لیٹ گئی لیکن بڑی نکل کر بھاگنے لگی۔ خدا بخش نے اس کے سر پر بیلچہ مار کر اسے دوبارہ



قبر میں پھینک دیا اور پھر ملازموں نے قبر کو مٹی سے بھر دیا۔ کچھ دیر لڑکیوں کی چیخیں سنائی دیتی رہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ جنہیں زندہ درگور کرتا تھا، ان پر کیا گزرتی ہو گی۔ دم گھٹ کر مرنے سے پہلے وہ کیسی اذیت سے گزرتے ہوں گے۔ زندگی سے محرومی کا خیال انہیں کیسے تڑپاتا ہو گا۔ آج وہ خود کسی قبر میں پڑا تھا اور شاید کچھ دیر میں دم گھٹ کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ اس خیال نے اسے ڈرا دیا اور اس نے ہاتھ اوپر کر کے لکڑی کے اس تابوت کو کھولنے کی کوشش کی مگر تابوت بہت سختی سے بند تھا یا اس کے اوپر اتنا وزن تھا کہ اسے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ مایوس ہو کر اس نے دائیں بائیں کی دیواروں پر زور آزمائی کی اور چند منٹ میں تھک کر گدھے کی طرح ہانپنے لگا۔ اسے محنت کی عادت نہیں تھی اور شباب اور شراب کی زیادتی نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ موسم سرد تھا اس کے باوجود وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ اچانک وہاں ایک سرگوشی گونجی۔

"اب تم سوچو گے خدا بخش۔"

اسے نہیں معلوم کہ یہ آواز کہیں سے سچ مچ آئی تھی یا اس کے اندر سے گونجی تھی لیکن یہ سرگوشی سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس کا جسم سرد پڑ گیا۔

☆☆☆

نذیر لاشاری خدا بخش کا ایک ہاری تھا۔ وہ اور اس کا خاندان کئی نسلوں سے ان کی زمینوں پر آباد تھا اور کاشت کاری کرتا تھا۔ وہ محنت کرتا اور خرچہ بھی خود کرتا تھا اس کے باوجود فصل کے وقت خدا بخش کا کم دار اس کی فصل کا بڑا حصہ اٹھا لے جاتا اور نذیر اور اس جیسے دوسرے ہاریوں کے حصے میں بس اتنا آتا جس سے وہ بہ مشکل اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکتے تھے۔ اس کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی زینب تھی اور اس کے بعد تین لڑکے امیر، کبیر اور اشرف تھے۔ زینب پندرہ کی ہو چکی تھی۔ اس نے قریب کے اسکول سے آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں اور اب نذیر لاشاری اس کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔ زینب خوب صورت اور گاؤں کے لحاظ سے پڑھی لکھی تھی۔ اس کا رشتہ موجود تھا۔ اس کی اپنی برادری سے تھا لیکن اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اس بار کپاس کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی اور نذیر اس فکر میں تھا کہ اس میں سے نصف مل جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح بیٹی کی شادی کر سکتا ہے۔ مگر جب بٹائی کا وقت آیا تو خدا بخش کے کم دار فیض خان عرف فیضو نے اسے صرف ایک تہائی دیا۔ نذیر نے احتجاج کیا۔

"میرا حصہ آدھا بنتا ہے۔"

"آدھا غلے کی فصل میں بنتا ہے۔ یہ نقدی والی فصل ہے، اس میں تیرا حصہ صرف تیسرا بنتا ہے۔" فیضو نے ڈانٹ کر کہا۔ "اسپرے بھی سائیں نے کرایا ہے۔"

نذیر جانتا تھا کہ اسپرے کرانا تو خدا بخش کی مجبوری تھی ورنہ سنڈی پوری فصل کو برباد کر دیتی لیکن اس بہانے اب وہ فصل میں اس کا حصہ کم کر رہا تھا۔ نذیر فیضو کے سامنے رویا گڑگڑایا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ تیسرا حصہ چھوڑ کر باقی کپاس لے گیا۔ اس وقت نذیر کی عقل پر پردے پڑ گئے اور وہ صبر کرنے کے بجائے فریاد لے کر خدا بخش کے پاس پہنچ گیا۔ خدا بخش اپنی حویلی کے باغ میں شام کو بیٹھک لگا کر لوگوں سے ملتا تھا اور اس دوران میں اس کا شغل مے نوشی بھی جاری رہتا تھا۔ اس نے نذیر کو پہچان لیا اور یہ بھی جان لیا کہ وہ کیوں آیا ہے لیکن وہ انجان بن کر بولا۔ "نذیرے..... کیا حال ہے بابا؟"

"سائیں کی مہربانی ہے۔" نذیر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"جب مہربانی ہے تو مزے کر، یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

"سائیں! اس بار کم دار فصل میں سے صرف تیسرا حصہ چھوڑ گیا ہے۔"

"اگر اس نے تیسرا چھوڑا ہے تو تیرا حصہ تیسرا ہی بنتا ہو گا۔"

"سائیں! ہمیشہ آدھا بنتا ہے، اس بار کم دار نے تیسرا چھوڑا ہے۔ سائیں میں بہت ضرورت مند ہوں۔"

خدا بخش نے بلیک ہارس لیبل کا ایک گھونٹ لیا۔ یہ شراب اس نے گزشتہ دنوں ہی منگوائی تھی۔ تیس بوتلوں کا کریٹ صرف نوّے ہزار میں پڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "بابا، ضرورت مند کون نہیں ہے۔ میں بھی پریشان ہوں۔ خرچ بڑھتے جا رہے ہیں اور آمدنی اتنی ہی ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں ہاری کم کر دوں اور ان کی جگہ ملازم رکھ کر کام چلاؤں۔ ہاریوں کو بلاوجہ حصہ دینا پڑتا ہے۔"

نذیر سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے دھمکی دے رہا ہے لیکن یہ صرف دھمکی تھی۔ جب خدا بخش جیسے وڈیرے ہاریوں کی محنت پر عیش کر سکتے تھے تو بلاوجہ مزدور لاگران کو بھاری معاوضہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ مزدور ان کا غلام بھی نہیں ہوتا، جب دل چاہے ملازمت چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ ہاری گھر بار..... اور بیوی بچوں سے مجبور ہوتے ہیں، کام نہیں چھوڑ سکتے اس



www.digestpk.com

Asifzamil

لیے وڈیروں کی غلامی کرتے ہیں۔ نذیر نے کہا۔ ”سائیں! میری مجبوری ہے، بیٹی کی شادی کرنی ہے اس لیے رحم کرو۔“

خدا بخش نے پہلی بار نذیر کی بات میں دلچسپی لی۔ ”اچھا، تیری بیٹی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ اس کی شادی کررہا ہے؟“

”ہاں سائیں، پندرہ کی ہوکر سولہ میں لگ گئی ہے۔“ نذیر نے دبی زبان میں کہا۔ اس نے خدا بخش کے لہجے سے جھلکتی دلچسپی کو محسوس کرلیا تھا اور اس دلچسپی کے پیچھے چھپی ہوس بھی جان گیا تھا۔

”کوئی رشتہ طے کیا ہے؟“

”ہاں سائیں برادری کا لڑکا ہے۔“ نذیر نے بے دلی سے کہا۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہورہا تھا جو اس نے یہاں آکر کی تھی۔

”ٹھیک ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہوجاتی، اسے یہاں حویلی بھیج دے۔ ادھر کام کاج کرے گی اور اچھا کھائے پیے گی تو صحت بھی اچھی ہوجائے گی۔ شادی کے لیے لڑکی میں جان ہونی چاہیے۔“ خدا بخش کا لہجہ غلیظ ہوگیا۔ ”بچے بھی تو پیدا کرنے ہوتے ہیں۔“

”جی سائیں۔“ نذیر نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح سے وڈیرے کو انکار کرے۔ زینب کو یہاں بھیجنے سے بہتر تھا، وہ اسے اپنے ہاتھ سے کسی کنوئیں میں دھکا دے دیتا۔ حویلی بھیجنے کا مطلب عزت و آبرو کو بھول جانا تھا۔ خدا بخش غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

”کیا سوچ رہا ہے نذیرے، کل لڑکی کو ادھر حویلی بھیج دینا۔“

نذیر لاشاری میں صاف انکار کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی وہ زینب کو ان درندوں کی کچھار میں بھیج سکتا تھا۔ اسے بہانہ سوجھ گیا۔ ”سائیں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، ابھی بخار سے اٹھی ہے۔ طبیعت ٹھیک ہوجائے تو میں اسے حویلی بھیج دوں گا۔“

خدا بخش کا منہ بگڑ گیا۔ جیسے کسی درندے سے منہ آیا شکار دور کردیا جائے۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”اچھا، اب اس میں زیادہ دیر نہیں ہو۔ دو تین دن میں اسے یہاں بھیج دینا۔ اور ہاں، کل میں فیضو کو کہہ دوں گا، وہ حصہ بھجوادے گا۔“

نذیر جانتا تھا، اسے حصہ نہیں، بیٹی کا معاوضہ دیا جارہا ہے۔ وہ گھر آیا اور اس نے اپنی معصوم لیکن بہت پیاری سی بیٹی کو دیکھا تو اس کا دل چاہا اسے قتل کردے۔ آنے والے عذاب سے بہتر تھا وہ باپ کے ہاتھوں ماری جاتی۔ کلہاڑی دیوار پر ٹنگی تھی لیکن وہ اسے نہ اتار سکا۔ رات جب بچے سو گئے تو اس نے چپکے چپکے بیوی کو سب بتادیا۔ وہ بھی ہراساں ہوگئی۔ اس نے شوہر سے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“ نذیر نے فیصلہ کرلیا۔

بیوی مزید پریشان ہوگئی۔ ”کیا کہہ رہے ہو..... ہم یہاں سے کہاں جاسکتے ہیں؟“

”کہیں بھی۔“ نذیر نے چڑ کر کہا۔ ”خدا کی زمین خدا بخش کی زمین سے زیادہ بڑی ہے۔ یہاں رہ کر یا تو زینب کو خدا بخش کی حویلی بھیجنا ہوگا یا اسے خود قتل کردوں اور یہ دونوں کام مجھ سے نہیں ہوسکتے۔“

”پر ہم جائیں گے کہاں؟“

نذیر کے قبیلے کے کچھ لوگ کراچی میں رہتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ وہاں جائے گا تو اسے پناہ مل جائے گی اور وہاں وہ خدا بخش کی پہنچ سے بھی باہر ہوگا۔ اگلے دن کم دار فیضو آیا لیکن وہ اس کا پورا حصہ نہیں لایا تھا۔ اس نے خدا بخش کا پیغام دیا۔ ”سائیں کا حکم ہے اپنی لڑکی کو کل شام تک حویلی بھیج دے اور پرسوں صبح تجھے پورا حصہ مل جائے گا۔“

”بیٹی کی آبرو کا معاوضہ۔“ نذیر نے تلخی سے سوچا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے کم دار میں بھیج دوں گا۔“

فیضو نے اسے گھورا۔ ”کوئی چالاکی مت دکھانا، وڈیرے کی ہزار آنکھیں ہیں، کوئی اس کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔“

”کم دار! میں کیا چالاکی دکھاؤں گا۔“ نذیر نے عاجزی سے کہا۔ ”تم فکر مت کرو، میں کل خود زینب کو حویلی آؤں گا۔“

فیضو کے جاتے ہی نذیر نے گھر آکر بیوی سے کہا۔ ”یہاں سے نکلنے کی تیاری کر، ہم آج رات ہی یہاں سے جا رہے ہیں۔“

انہوں نے وہ سامان باندھا جسے وہ لے جاسکتے تھے اور جو ان کے فرار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ نذیر کا بڑا بیٹا بارہ سال کا تھا، اس سے چھوٹا دس سال کا اور سب سے چھوٹا نو سال کا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ خود سے چل پھر سکتے تھے۔ کوئی گود کا بچہ ہوتا تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی۔ رات ہوتے ہی یہ چھ نفوس تاریکی میں خاموشی سے نکلے اور گاؤں کی حدود سے نکل کر کھیتوں تک آئے۔ یہاں سے خطرے کی حد شروع ہوگئی کیونکہ کھیتوں میں خدا بخش کے آدمی موجود ہوتے تھے اور اگر وہ انہیں دیکھ لیتے تو ان کا فرار ناکام ہوجاتا۔ وہ کھیتوں سے نکلے تو نذیر نے سکون کا سانس



لیا اور اسی لمحے انہیں چاروں طرف سے مسلح افراد نے گھیر لیا۔ نذیر سمجھ گیا کہ وہ ناکام ہوگیا ہے۔ انہیں گھیرنے والے خدا بخش کے آدمی تھے۔ ان میں فیضو کو دیکھ کر تصدیق ہوگئی۔ فیضو نے اسے ٹھوکر ماری اور بولا۔

”میں نے کیا کہا تھا، کوئی چالاکی مت کرنا۔ وڈیرے کی ہزار آنکھیں ہیں۔ پکڑا گیا نا۔“

نذیر اس کے سامنے گڑگڑانے لگا۔ ”فیضو! ہمیں جانے دو، ہم سب چھوڑ کر جارہے ہیں۔ کچھ بھی نہیں لے جا رہے۔“

”بکواس مت کر..... اصل مال تو ساتھ لے جارہا ہے۔“ فیضو نے زینب کا بازو پکڑا تو وہ چلانے لگی۔ نذیر تڑپ گیا لیکن فیضو کے ساتھ آئے آدمیوں نے اسے جکڑ لیا اور پھر وہ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر خدا بخش کی حویلی لے آئے۔ اس حویلی کے نیچے ایک بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ اس میں خدا بخش کے متعتو بین قید رکھے جاتے تھے۔ نذیر اور اس کے تینوں بیٹوں کو یہاں بند کردیا گیا لیکن زینب اور نذیر کی بیوی کو وہ لوگ لے گئے۔ نذیر کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش اسے موت آجائے آنے والی ذلت اور رسوائی کا سوچ کر اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ مرجائے گا۔ اسے اپنی بیوی اور بیٹی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ چیخیں حقیقت میں نہیں تھیں بلکہ اس کے اندر سے ابھر رہی تھیں۔ ورنہ وہ اس سے کہیں بہت دور عذاب سے گزر رہی تھیں۔

اگلی رات تک وہ بھوکے پیاسے وہیں پڑے رہے پھر خدا بخش کے آدمی ان سب کو نکال کر حویلی میں قائم خفیہ قبرستان تک لائے۔ وہاں اجڑی اور لٹی ہوئی ماں بیٹی بھی موجود تھیں۔ بیٹی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ باپ سے نظریں ملا سکتی۔ لیکن بیوی اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ نذیر نے بے بسی سے بیوی کو دیکھا اور وڈیرے خدا بخش سے بولا۔ ”سائیں! تم نے خود کو خدا سمجھ لیا ہے لیکن اصل خدا کوئی اور ہے۔ وہ یہ سب دیکھ رہا ہے۔“

”تو بابا دیکھے، میں نے کب منع کیا ہے۔“ خدا بخش نے تکبر سے کہا۔ ”لیکن خدا بخش کے معاملے میں مداخلت نہ کرے اور تو کیا سمجھتا تھا کہ بچ کر بھاگ جائے گا۔“ خدا بخش کا لہجہ حقارت آمیز ہوگیا۔ ”اگر تو خاموشی سے لڑکی کو یہاں بھیج دیتا تو چند دن رہ کر یہ اسی خاموشی سے واپس چلی جاتی اور پھر تو اس کی شادی کردیتا لیکن تو نے چالاکی دکھائی۔ مجھے دھوکا دیا۔ میرا نام خدا بخش ہے اور میں خود سے دھوکا کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا ہوں۔“

وڈیرے کے آدمیوں نے دونوں میاں بیوی کے لیے ایک قبر کھود لی تھی۔ انہوں نے نذیر اور اس کی بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں قبر میں دھکا دے دیا۔ زینب نے تڑپ کر درمیان میں آنا چاہا تو ایک آدمی اسے پکڑ کر پیچھے لے گیا۔ تینوں لڑکے رو رہے تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خدا بخش کے جلادوں نے قبر کو مٹی سے بھرنا شروع کردیا۔ نذیر خاموش تھا لیکن اس کی بیوی چلا چلا کر وڈیرے سے اپنے بچوں کو معاف کرنے کا کہہ رہی تھی۔ خدا بخش بے نیازی سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ آخر قبر پوری طرح بھر گئی اور اس میں موجود دونوں میاں بیوی موت کی نیند سو گئے۔ فیضو وہاں موجود تھا۔ اس نے وڈیرے سے زینب کے بارے میں پوچھا۔

”سائیں! اس کا کیا کرنا ہے؟“

وڈیرے نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تیرا بھی اس پر دل آیا تھا؟“ اس کا اشارہ زینب کی طرف تھا۔

فیضو نے دانت نکالے۔ ”سائیں غلام کی سوچ سمجھتے ہیں۔“

”یہ تیری ہے۔“ خدا بخش نے کمال فراخ دلی سے کہا۔ ”چاہے تو گھر لے جا۔“

”ان کا کیا کرنا ہے؟“ فیضو نے اب لڑکوں کے بارے میں پوچھا۔

”انہیں ابھی رکھ، بعد میں سوچیں گے ان کا کیا کرنا ہے، بعض اوقات کہیں بھی بندے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔“

”ٹھیک ہے سائیں۔“ فیضو نے مستعدی سے کہا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”ان تینوں کو لے جاکر بند کردو۔“

زینب اب بھائیوں سے لپٹی روئے جارہی تھی۔ لیکن فیضو نے اسے ایک جھٹکے سے ان سے الگ کیا اور کھینچ کر ساتھ لے گیا۔

☆☆☆

جمال خان لاشاری گاڑی سے اترا اور اس ویران نظر آنے والی بڑی سی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ شہر کی مصروف ترین کاروباری شاہراہ آئی آئی چندریگر روڈ سے متصل سڑک پر واقع یہ عمارت خستہ حالی کی آخری حدوں کو پہنچ گئی تھی اور اب اسے گرا کر اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی جانی تھی۔ اس کی اوپری منزلیں گرادی گئی تھیں لیکن پھر کسی وجہ سے کام میں تعطل آیا اور فی الحال کام رکا ہوا تھا۔ جمال دوسری منزل پر واقع ایک دروازے تک آیا اور چابی سے تالا کھولا۔ وہ اندر آیا، شاید کبھی یہ دفتر ہوتا تھا لیکن اب خالی اور گرد آلود



www.digestpk.com

Asifzamil

تھا کیونکہ مہینوں سے خالی پڑا تھا۔ خالی ہال کے آخری سرے پر ایک کمرا تھا، وہ اس میں داخل ہوا۔ یہ کمرا ہال کی طرح خالی تھا اور یہاں صرف ایک عدد آئرن کا بیڈ تھا۔

بیڈ پر مشال بندھی پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ہلکی قسم کی ہتھکڑیوں کی مدد سے بیڈ کی عقبی سلاخوں سے جکڑے ہوئے تھے اور منہ پر مضبوط چوڑا ٹیپ چپکا ہوا تھا البتہ اس کے پاؤں آزاد تھے۔ بیڈ پر چادر سے عاری گدا تھا۔ جمال کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف آگیا۔ جمال خان اس کے پاس بیڈ کے کنارے ٹک گیا اور نرمی سے اس کے منہ سے چپکا ٹیپ اتارا لیکن یہ نرمی بھی مشال کے لیے خاصی سخت ثابت ہوئی، وہ کراہ کر رہ گئی اور پھر بولی۔ ”جمال! تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

جمال نے اس کے رخسار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تم اس بارے میں فکر مت کرو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا موبائل نکالا اور کسی کو کال کرنے لگا۔ جب اس نے خدا بخش کا نام لیا تو مشال چونک گئی۔ وہ نہایت ہوش ربا لباس میں تھی۔ چست جینز اور اوپر چست ترین سوئیٹر میں اس کا سراپا بے حد نمایاں تھا۔ رات وہ خدا بخش کے ساتھ صرف نائٹی میں تھی۔ جمال خان نے اس کے جسم کی طرف توجہ نہیں دی۔ صرف دو مہینے پہلے مشال کی ملاقات اس سے ایک ٹی وی ڈرامے کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ جمال خان وہاں جتنی بے فکری سے موجود تھا، اس سے مشال نے اندازہ لگایا کہ وہ بھی پروڈکشن سے متعلق کوئی آدمی ہے۔ سرخ وسفید رنگت اور کھڑے دل کش مردانہ نقوش کے ساتھ کسی قدر بڑھے ہوئے گھنگرالے بال جمال خان کو ایک خوب صورت مرد بناتے تھے۔ اس نے سیاہ پتلون کے ساتھ ہلکے سرخ رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی اور یہ دونوں چیزیں بہت مہنگی تھیں۔ وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور اس کے انداز میں وقار اور مغروریت نمایاں تھی۔ کام نمٹا کر مشال جب وہاں سے جانے لگی تو اس کی کار کسی طرح اسٹارٹ ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ وہ مسلسل سیلف گھماتی رہی۔ اچانک کسی نے کھڑکی کا شیشہ بجایا۔ مشال نے چونک کر دیکھا۔ وہ جمال خان تھا۔ اس نے شیشہ نیچے کیا۔

”اینی پرابلم؟“ جمال خان نے مہذب لہجے میں پوچھا

”یہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔“ مشال پریشانی سے بولی۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ میں دیکھ لیتا، میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

یہ اسکیم نمبر ون کا ایک سنسان علاقہ تھا جہاں ہزاروں گز کی کوٹھیاں تھیں۔ شوٹنگ ختم ہو چکی تھی اور جانے والے جا چکے تھے۔ اب اسے یہاں سے کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملتی۔ اس کے پاس جمال خان کی پیش کش قبول کر لینے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

جمال خان کے پاس ایک پرانے ماڈل کی بیوک کار تھی۔ لیکن نہایت شاہانہ اور بہترین حالت میں تھی۔ مشال کو کار اچھی لگی۔ اس نے تعریف کی تو جمال خان نے اسے سرسری سے انداز میں لیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ مشال یا اس کی تعریف دونوں اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کی بے نیازی پر مشال کو غصہ آنے لگا۔ کار میں بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔

”آپ نے اپنے بارے میں تو بتایا نہیں۔“ مشال نے کچھ دیر بعد کہا۔

”میرا نام جمال خان لاشاری ہے۔“ اس نے جواب دیا اور چپ ہو گیا۔ اس کے خیال میں بس اتنا بتا دینا کافی تھا۔ اس نے مشال کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

”میرا نام مشال ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ کار کو مین روڈ پر لاتے ہوئے بولا۔ ”تم کہاں رہتی ہو؟“

مشال نے اپنے اپارٹمنٹ کا پتا بتایا۔ جمال خان نے اپنے مخصوص سرسری انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے تم اچھا کماتی ہو۔“

مشال مسکرا دی۔ وہ ہر ایک کو اپنا پیشہ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جمال خان اس کی اصلیت سے لاعلم ہے۔ یہ شخص اسے اچھا لگا تھا۔ اگر وہ اتنا مغرور نہ ہوتا تو وہ اس سے دوستی کر سکتی تھی۔ اچانک جمال خان نے کہا۔ ”تم اچھا کماتی ہو لیکن اتنا نہیں جتنا کما سکتی ہو۔ تم آج کل جس شخص کے ساتھ ہو، وہ دولت مند ضرور ہے لیکن دل کا تنگ ہے۔“

مشال کو جھٹکا لگا۔ ”تت..... تم جانتے ہو؟“

جمال خان نے جواب دینے کے بجائے بے نیازی سے سگریٹ کا آخری بھرپور کش لیا اور ٹکڑا سڑک پر اچھال دیا۔ ”یہ بات بے کار ہے کہ میں جانتا ہوں یا نہیں ..... کام کی بات یہ ہے کہ تم اس سے کہیں زیادہ کما سکتی ہو۔“

”وہ کیسے؟“ مشال نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ جمال خان نے کہا اور اچانک گاڑی روک دی۔ مشال حیران ہوئی، وہ اتنی



جلدی اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ حالانکہ جمال خان کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ مشال کچھ دیر بیٹھی رہی تو جمال خان نے اس کے پاس سے ہو کر ہاتھ دراز کر کے دروازہ کھول دیا اور وہ جھینپ کر نیچے اتر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، جمال خان نے دروازہ بند کرتے ہوئے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ مشال کو غصہ آرہا تھا اس سے پہلے کسی نے اس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا تھا۔ سب اس کے آگے پیچھے پھرنے والے لوگ تھے۔ کسی نے اس سے بے نیازی نہیں برتی تھی۔ اپارٹمنٹ میں جاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مغرور شخص کو منہ نہیں لگائے گی۔ چاہے وہ دوبارہ اس کے پیچھے ہی کیوں نہ آئے۔

لیکن اس پچھلی ملاقات کے صرف تین دن بعد ایک رات مشال کے موبائل پر اجنبی نمبر سے کال آئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”جمال بات کر رہا ہوں۔“ جمال خان کی بے نیاز آواز سنائی دی۔

مشال کو غصہ آگیا۔ ”جی فرمائیے؟“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”میں ابھی تمہارے اپارٹمنٹ پر آرہا ہوں۔“

”میرے ساتھ وڈیرا خدا بخش ہے، تم تو جانتے ہو اس کے بارے میں؟“ مشال نے جھوٹ بولا۔

”ہاں جانتا ہوں، مجھ سے زیادہ کون اس کے بارے میں جان سکتا ہے۔“ جمال خان نے کہا۔ ”لیکن وہ اس وقت یہاں سے کوئی دو سو میل دور اپنی حویلی میں ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا؟“ مشال نے غیر ارادی لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں، اپنے اپارٹمنٹس کے گیٹ کیپر کو میرے بارے میں بتا دو، میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“ جمال خان نے کہا اور کال کاٹ دی۔ مشال ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ یہ شخص اس سے اس طرح پیش آرہا تھا جیسے وہ اس کی زرخرید ہو۔ اس کا دل چاہا کہ جمال خان کی ہدایت پر عمل نہ کرے لیکن کچھ سوچ کر اس نے انٹرکام اٹھایا اور اپارٹمنٹس کے مین گیٹ سے رابطہ کیا۔ یہاں ہمہ وقت دو مسلح گارڈز موجود ہوتے تھے اور کسی بھی شخص کو بغیر اجازت اور شناخت کے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

بیس منٹ بعد اس کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجی۔ مشال نے کیٹ آئی سے جھانک کر تصدیق کی کہ جمال خان ہی ہے اور دروازہ کھول دیا۔ وہ محتاط رہنے کی عادی تھی۔ جمال خان اندر آیا اور پہلے کی طرح سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم نے خدا بخش کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟“

مشال نے شانے ہلائے۔ ”بس بول دیا، شاید میرا تم سے ملنے کا موڈ نہیں تھا۔“

”تب مجھے آنے کیوں دیا؟“

”میں نہیں جانتی۔“ مشال نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر مرنے لگی ہوں یا تم کو پسند کرتی ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے کوئی عورت مجھے دل سے پسند نہیں کر سکتی کیونکہ عورت بے نیازی پسند نہیں کرتی۔“ جمال خان نے کہتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگائی۔

”لگتا ہے، تمہیں سب معلوم ہوتا ہے؟“ مشال نے طنز کیا۔

”سب نہیں لیکن میں جس چیز میں دلچسپی لیتا ہوں، اس کے بارے میں سب معلوم کر لیتا ہوں۔“

”جیسے میرے بارے میں؟“

”چھوڑو ان باتوں کو، کام کی بات کرتے ہیں۔“ جمال خان خود سے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں زیادہ کمانے کے بارے میں بتاؤں گا۔“

”میں جتنا کما رہی ہوں، اس سے مطمئن ہوں۔“

”یہ جھوٹ ہے، ہزاروں میں کمانے والا دسیوں ہزار میں کمانا چاہتا ہے۔ دسیوں ہزار والا لاکھوں میں کمانا چاہتا ہے اور لاکھوں کمانے والا کروڑوں کمانا چاہتا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے، تمہارے کہنے کے مطابق میں کروڑوں کمانا چاہتی ہوں۔“ مشال نے زچ لہجے میں کہا۔ یہ شخص اس کی ہر بات کی نفی کر رہا تھا۔

”گڈ، اس کا مطلب ہے تم کروڑوں کمانا چاہتی ہو۔“ جمال خان نے اس کے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ ”میرا خیال ہے یہ اپارٹمنٹ شاید پچاس لاکھ کا ہوگا اور شاید اتنی ہی مالیت کے تمہارے پاس دوسرے اثاثے ہوں گے..... جیسے کیش، زیورات اور شاید کوئی سرمایہ کاری۔“

مشال اس کے اندازے پر دل ہی دل میں حیران ہوئی لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں کروڑ کچھ نہیں ہوتے۔ ابھی تمہیں ایک جھٹکا لگے گا اور تمہارے لاکھوں



www.digestpk.com

Asifzamil

روپے خرچ ہو جائیں گے تمہارا ماہانہ خرچ بھی لاکھوں میں ہوگا۔ اس خرچ کو برقرار رکھنے کے لیے تمہیں کمانا پڑتا ہے۔ یعنی تم اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار رہی ہو۔ دولت کمانے کے لیے تمہیں خدا بخش اور اسی قبیل کے لوگوں کی حیوانی اور نفسانی خواہشات کو پورا کرنا پڑتا ہے اور تم یہ سب یقیناً خوشی سے نہیں کرتی ہو۔"

"یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" مشال نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے میں یہ سب خوشی سے کرتی ہوں۔"

"اگر تم کہو کہ تم یہ سب خوشی سے کرتی ہو تو میں مان لوں گا۔" جمال خان کے لہجے میں چیلنج تھا۔

مشال کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ "اوکے میں یہ سب مجبوری میں کرتی ہوں۔"

"اگر تمہیں ایک ایسی زندگی ملے جس میں تمہیں اپنی مرضی سے رہنے کے بدلے کسی انسان نما حیوان کی خواہشیں پوری نہ کرنا پڑیں تو کیا تم ایسی زندگی پسند نہیں کرو گی؟"

"ضرور کروں گی لیکن میں جانتی ہوں اس دنیا میں کوئی چیز بھی بنا قیمت کے نہیں ملتی ہے۔ اگر میں ایسی زندگی حاصل کرنا چاہوں گی تو لازمی مجھے اس کی کوئی نہ کوئی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

جمال خان نے پہلی بار اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "تم ذہین بھی ہو جبکہ میرا خیال تھا تم اتنی ذہین نہیں ہو۔"

"میرے بارے میں بہت سارے لوگ غلط اندازے لگاتے ہیں۔" مشال نے تلخی سے کہا اور اٹھ کر ایک خانے سے بوتل اور گلاس نکالا۔

"مشال! کیا تم پانچ کروڑ روپے کمانا چاہتی ہو؟"

وہ ایک لمحے کو حیران ہوئی۔ پانچ کروڑ بہت بڑی رقم تھی اور اس نے کبھی اتنی بڑی رقم کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ "کیوں نہیں..... اگر مجھے بغیر کسی کوشش کے مل رہے ہوں تو میں کمانا چاہوں گی۔"

"بغیر کوشش کے نہیں مل سکتے۔" جمال خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تم نے خود کہا ہے اس دنیا میں کوئی چیز بغیر قیمت کے نہیں ملتی۔"

"تب یہ پانچ کروڑ کیسے ملیں گے؟"

"میرا ساتھ دے کر۔" جمال خان نے کہا۔ "میرے پاس ایک منصوبہ ہے۔ اس کی مدد سے ہم اتنی رقم حاصل کر سکتے ہیں کہ صرف تمہارا حصہ پانچ کروڑ روپے ہوگا۔"

مشال نے آنکھیں گھمائیں..... "کروڑوں روپے..... اس کا مطلب ہے یہ کام قانونی نہیں ہو سکتا۔"

"قانونی کام سے اس ملک میں کروڑوں تو کیا صرف روپے بھی نہیں کمائے جا سکتے۔" جمال خان مسکرایا۔ اس نے دوسری سگریٹ سلگالی تھی۔ وہ چین اسموکر لگ رہا تھا۔

"میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کر سکتی۔" مشال نے انکار کر دیا۔

"ابھی جو تم کر رہی ہو وہ قانون کے مطابق ہے؟"

مشال مسکرائی۔ "چوری وہ ہوتی ہے جو پکڑی جائے اور میں پکڑے جانے والا کام نہیں کرتی۔"

"پانچ کروڑ روپے کے لیے بھی نہیں؟"

مشال سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

☆☆☆

خدا بخش دہشت زدہ تھا۔ کسی نے اسے زندہ دفن کر دیا تھا۔ جو کام وہ دوسروں کے ساتھ کرتا آیا تھا، آج کسی نے اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ اس وقت وہ مکمل لباس میں تھا۔ جب بے ہوش ہوا تھا تو اس کے جسم پر صرف ایک نیکر تھی۔ اچانک گھنٹی کی آواز آئی تو وہ اچھل پڑا۔ گھنٹی کی آواز اس کی جیب سے آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے جیب ٹٹولی اور اس میں سے موبائل فون نکالا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا موبائل اس کی جیب میں ہے۔ یہ جدید ترین موبائل تھا۔ اس نے عجلت میں انجانے نمبر سے آنے والی کال ریسیو کر لی۔

"کون ہے..... کون ہے؟"

"خدا بخش! کیسا لگ رہا ہے زندہ دفن ہو کر؟" ایک بھاری مردانہ آواز نے کہا۔ وہ جمال تھا۔

"کون ہو تم؟" خدا بخش چیخ اٹھا۔ "مجھے یہاں کیوں دفن کیا ہے؟"

"تم لوگوں کو کیوں زندہ دفناتے تھے؟" جمال نے طنز کیا۔

"وہ..... وہ میرے دشمن تھے۔"

"تب تم میرے دشمن ہوئے۔"

"لیکن میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"تم اپنے بہت سے دشمنوں کو نہیں جانتے ہو کیونکہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ میرے تم ایک ہی دشمن ہو اور میں نے تمہارے بارے میں سب جان لیا ہے لیکن مجھے اس کام میں برسوں لگ گئے۔"

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم نے جو بگاڑنا تھا، بگاڑ لیا ہے۔ اب میری باری



ہے۔" درشت لہجے میں کہا گیا۔ "تمہیں فیضو کا انجام یاد ہے؟"

چند مہینے پہلے فیض خان عرف فیضو اس حالت میں اپنے گھر میں مُردہ پایا گیا تھا کہ اس کا سر کسی نے تن سے جدا کر دیا تھا اور اس کی زبردستی کی بیوی زینب غائب تھی۔ پولیس کا شبہ تھا کہ قتل زینب نے کیا ہے کیونکہ اس کام میں گھر کی کلہاڑی استعمال ہوئی تھی۔ فیضو کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اس کا سر اڑا دیا گیا تھا۔ پولیس نہ تو قتل کا معما حل کر سکی تھی اور نہ زینب کا سراغ لگا سکی تھی۔ خدا بخش کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

"فیضو کو تم نے قتل کیا ہے؟"

"خدا بخش! تم موت کے سامنے ہو۔" اس نے خدا بخش کا سوال نظر انداز کیا۔ "زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں تم دم گھٹنے سے مر جاؤ گے کیونکہ اس تابوت میں موجود آکسیجن اس وقت تک لازمی ختم ہو جائے گی۔"

یہ سن کر خدا بخش کے اوسان خطا ہو گئے۔ ہر ظالم کی طرح وہ موت سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ گڑگڑانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، مجھے یہاں سے نکالو، تم جو مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔"

"جان بھی؟"

"جان..... نہیں، اس کے سوا جو مانگو گے۔"

"اپنی کوئی جوان بیٹی دو گے؟"

خدا بخش کے خون میں ایک لمحے کو اُبال آیا لیکن موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ اس اُبال کو زبان تک آنے دیتا، اس نے بدستور عاجزی سے کہا۔ "میں مال و دولت کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا دے سکتے ہو؟"

"تم جتنا کہو..... لاکھ دس لاکھ۔"

وہ ہنسا۔ "بس..... تمہاری جان کی یہ قیمت ہے؟"

"تب تم جو کہو؟"

"میری چھوڑو ابھی میں مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔ ابھی میں تمہیں چانس دے رہا ہوں۔ تمہارے پاس موبائل فون ہے اور اس کی بیٹری بھی پوری طرح چارج ہے۔ تم اپنی مدد کے لیے جس سے چاہو رابطہ کر سکتے ہو۔ اس کام کے لیے تمہارے پاس دو گھنٹے کی مہلت ہے کیونکہ اس کے بعد میں تمہارے سامنے اپنا مطالبہ رکھوں گا اور اس کو پورا ہونے کے لیے کم سے کم دو گھنٹے درکار ہوں گے۔"

"میری بات....." خدا بخش نے کہنا چاہا لیکن لائن کٹ گئی۔ اس نے ایک گالی دی اور موبائل میں موجود اپنے ایک واقف کار ڈی آئی جی جمیل احمد کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی اور وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ خدا بخش دبی زبان میں اسے گالیاں دینے لگا۔ جب وہ مایوس ہو کر کال کاٹنے جا رہا تھا تو جمیل احمد نے کال ریسیو کر لی۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا، وہ رات ڈھیر ساری پی کر سویا ہے۔

"ہاں سائیں! کیا بات ہے، اتنی صبح کیوں یاد کر لیا؟"

"صبح کے بچے۔" خدا بخش نے بلبلا کر کہا۔ "میں مرنے والا ہوں اور تجھے سونے کی پڑی ہے۔"

جمیل احمد، خدا بخش کا احسان مند تھا کیونکہ اسی کی سفارش پر وہ اس عہدے تک پہنچا تھا لیکن خدا بخش نے کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی اور اسی وجہ سے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ "سائیں! کیا ہوا ہے؟"

"مجھے کسی نے اغوا کر کے زمین میں زندہ دفن کر دیا ہے۔"

جمیل احمد کو اس کی بات کا بالکل یقین نہیں آیا، اس نے پوچھا۔ "سائیں! رات کو آپ زیادہ تو نہیں پی گئے تھے؟"

خدا بخش کا دل چاہا کہ اسے وہ گالیاں دے جو وہ اپنے معمولی ملازموں کو دیتا تھا لیکن اس کے پاس گالیاں دینے کی مہلت نہیں تھی۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جمیل احمد کو بتایا کہ وہ رات کو کہاں تھا اور اس وقت کہاں ہے۔ "مجھے یہاں ڈالنے والے نے چیلنج دیا ہے کہ میں جس طرح چاہے آزاد ہونے کی کوشش کروں۔ اسی وجہ سے اس نے موبائل میرے پاس رہنے دیا ہے۔ تم مجھے یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ میں سی ایم سے بھی بات کرتا ہوں۔"

یہ سن کر جمیل احمد کے ہوش اڑ گئے۔ اگر بات سی ایم تک چلی جاتی تو اس پر بہت زیادہ دباؤ آ جاتا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "سائیں! ابھی ایسا نہ کریں۔ وقت نہیں ہے، آپ نے اوپر بات کی تو بہت سارا وقت ان کے سوال جواب میں ضائع ہو جائے گا۔ آپ مجھے مہلت دیں، میں ابھی آپ کی تلاش شروع کرتا ہوں۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں، میں آپ کو ضرور تلاش کر لوں گا۔"

خدا بخش نے سوچا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں تم کیا کرتے ہو۔"

☆☆☆

ڈی آئی جی جمیل احمد اپنے بیڈ روم میں تھا۔ رات، اس کا ارادہ تو کچھ اور تھا لیکن اس کی بیوی غیر متوقع طور پر میکے



www.digestpk.com

Asifzamil

سے آگئی اور مجبوراً اسے رات گھر میں گزارنی پڑی۔ غصے میں وہ زیادہ پی گیا تھا اور اس وقت اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے انٹر کام پر ملازم کو حکم دیا۔ ''پانچ منٹ کے اندر اندر تیز گرم اور سیاہ کافی بناؤ۔''

سر پر پانی ڈال کر وہ باہر آیا۔ وہ شروع سے سفارشی رہا تھا اس لیے اسے تفتیش کے بارے میں اتنا علم نہیں تھا لیکن اسے اپنے آدمیوں سے کام لینے کا ہنر آتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کون سا ماتحت کس کیس کی تفتیش کے لیے موزوں ہے اور وہ ان سے اسی لحاظ سے کام لیتا تھا۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ اس نے اپنے ایک ماتحت ایس پی شہریار بخاری کو کال کی۔ ''شہریار! کہاں ہو؟''

شہریار دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ انویسٹی گیشن میں تھا اور براہ راست جمیل احمد کی ماتحتی میں تھا۔ ''دفتر جا رہا ہوں سر.... حکم فرمائیں۔''

''تم وڈیرا خدا بخش کو جانتے ہو۔ اس کے تعلقات سی ایم تک ہیں۔''

شہریار جانتا تھا کہ جمیل احمد اسی خدا بخش کی وجہ سے اس عہدے تک پہنچا ہے۔ ''جی سر، جانتا ہوں۔''

''اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے اور کہیں زمین میں زندہ دفن کر دیا ہے۔''

شہریار نے اپنی ہنسی بہ مشکل روکی۔ وہ خدا بخش کی شہرت سے واقف تھا۔ وہ خود لوگوں کو زمین میں زندہ دفن کرنے کے لیے مشہور تھا لیکن وہ ہنس نہیں سکتا تھا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا سر؟''

''اس نے مجھے کال کی ہے۔ وہ اپنی کسی داشتہ کے گھر میں تھا اور رات کو کسی نے اسے اغوا کر کے کہیں زمین میں دفنا دیا ہے لیکن ساتھ ہی اسے موبائل بھی دیا ہے تاکہ وہ مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔''

بتیس سالہ شہریار کا تعلق ایک اچھے گھرانے سے تھا۔ اس نے کرمنالوجی میں ماسٹرز کرنے کے بعد سول سروس کا امتحان دیا اور کامیابی کے بعد پولیس جوائن کی تھی۔ دو سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور ایک مہینے پہلے اس کے گھر ایک پیاری سی بیٹی نے جنم لیا تھا۔ اسے دنیا میں اگر کسی سے سب سے زیادہ پیار تھا تو وہ ننھی ماہین تھی۔ گھر سے ہٹ کر اس کی توجہ اپنے پیشے کی طرف تھی۔ وہ ذہین تھا اور اپنی ذہانت کی وجہ سے کئی ایسے کیس حل کر چکا تھا جن سے دوسرے افسران نے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ اس نے ایک منٹ میں جمیل احمد سے ساری معلومات حاصل کیں اور خدا بخش کا نمبر لے کر اسے کال کرنے لگا۔

☆☆☆

خدا بخش سے بات کر کے جمال خان نے موبائل بند کیا تو مشال نے اس سے پوچھا۔ ''تم میرے ساتھ یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''

جمال خان نے آگے جھک کر اس کے ریشمی بال سہلائے۔ اس نے براؤن رنگ کا پوری آستین کا سوئیٹر پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ایک بڑی گول سیاہ کرسٹل کی انگوٹھی تھی جس پر سفید رنگ سے انگریزی کا ایس بنا ہوا تھا۔ ''صرف اس لیے کہ بعد میں تم پر کوئی الزام نہ آئے۔ تم پولیس کو یہیں سے ملو گی۔''

مشال نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ تم نے دھوکے سے مجھے بھی بے ہوش کر دیا تھا۔''

''وہ مجبوری تھی، اگر میں تمہیں ہوش میں لانا چاہتا تو تم کسی صورت راضی نہ ہوتیں۔ اس لیے تمہیں بھی بے ہوش کرنا پڑا۔''

مشال اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''تم ہمیں نیچے کیسے لائے؟''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ رات کے وقت ویسے ہی سناٹا ہوتا ہے۔ تمہاری گاڑی میں لگے سیاہ شیشوں کی وجہ سے گارڈز کو شبہ بھی نہیں ہوا کہ اندر تم نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔''

''نیچے خدا بخش کے محافظ ہوتے ہیں۔''

''ہاں لیکن وہ اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں نہیں تھے بلکہ باہر سڑک پر موجود تھے۔ ان کو پتا بھی نہیں چلا اور میں ان کے برابر سے نکل کر آ گیا۔''

''میری گاڑی کہاں کھڑی کی ہے؟''

''ذرا آگے جو پارک ہے اس کے ساتھ کھڑی کر دی ہے۔ اس سے تمام نشانات بھی صاف کر دیے تھے۔ وہاں سے تم دونوں کو اپنی گاڑی میں ڈال کر لایا ہوں۔''

''خدا بخش بے وقوف نہیں ہے، وہ تمہارا مطالبہ آسانی سے پورا نہیں کرے گا۔''

''آسانی سے نہ صحیح، مشکل سے کر دے گا۔'' جمال خان نے بے پروائی سے کہا۔ ''اور یہ مشکل اسے ہی برداشت کرنا پڑے گی۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''مجھے تو کھول دو۔'' مشال نے التجا کی۔

''نہیں ہنی، تم اسی طرح بندھی رہو گی تو سین بالکل حقیقی لگے گا۔ اور ہاں، فی الحال تمہیں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔''



''کیا میں بھوکی پیاسی بندھی رہوں گی؟'' مشال چلائی۔ ''لیکن کب تک؟''

''زیادہ سے زیادہ آج شام تک۔'' جمال نے اسے تسلی دی اور کھڑا ہو گیا اور اس کے منہ پر دوبارہ ٹیپ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اب آرام کرو۔''

مشال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جمال خان کی باتوں میں کیسے آ گئی اور اس کے ساتھ کام کرنے پر کس طرح تیار ہو گئی جبکہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ جمال خان کا سلوک اس سے اچھا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس کے ساتھ اس منصوبے میں شامل ہو گئی جبکہ اس میں بہت زیادہ خطرہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ شاید مشال، جمال خان سے متاثر تھی کیونکہ اس نے ایک بار بھی اسے ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا جن سے مرد اسے دیکھتے تھے۔ یا شاید وہ خود بھی اس کی طرح خطر پسند تھی۔ یہ مقام مشال نے آسانی سے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس نے بہت دھکے اور دھوکے کھائے تھے۔ لوگوں نے اسے استعمال کیا تھا اور اب اسے عقل آ گئی تھی اس لیے وہ انہیں استعمال کر رہی تھی۔

جمال خان خدا بخش کو اغوا کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے مشال کی مدد درکار تھی۔ مشال پہلے تو سن کر خوف زدہ ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ خدا بخش کتنا طاقت ور اور وحشی ہے۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ مشال بھی اس کے اغوا میں شامل ہے تو وہ اس کا جینا محال کر دیتا۔ پانچ کروڑ میں کشش تھی لیکن شاید اس سے زیادہ کشش جمال خان میں تھی۔ چند ملاقاتوں میں مشال اسے پسند کرنے لگی تھی۔ اس کے باوجود خدا بخش کے اغوا کے منصوبے میں شامل ہو جانا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے جمال خان نے اسے ہپناٹائز کر کے اس منصوبے میں شامل ہونے پر راضی کر لیا ہے۔

طے شدہ منصوبے کے تحت خدا بخش کی آمد کی خبر سنتے ہی اس نے جمال خان کو مطلع کیا اور وہ اس کی مدد سے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے میں کامیاب رہا۔ وہ اس وقت تک نیچے پارکنگ میں چھپا رہا جب تک مشال نے اسے مس کال کی مدد سے اشارہ نہیں دیا۔ وہ اوپر پہنچا تو اس وقت تک خدا بخش پی کر تقریباً مدہوش ہو چکا تھا۔ جمال خان نے اس کی گدی پر مکا مارا تو وہ مکمل بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد جمال خان نے اسے لباس پہنایا اور اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ بند کر کے اسے ایک بوری میں منتقل کیا جو وہ ساتھ لایا تھا۔ مشال خوف زدہ تھی۔ اس نے دوسری بار جمال خان سے پوچھا۔

''اب کیا ہو گا؟''

جمال خان نے اچانک اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ پہلے تو مشال اسے رومانی انداز سمجھی کیونکہ جمال خان کے انداز میں نرمی اور سادگی تھی لیکن جب اچانک ایک رومال اس کی ناک پر جم گیا اور اس سے اٹھنے والی بو اس کے دماغ پر چڑھنے لگی تب اسے سمجھ میں آیا کہ جمال خان نے اسے بھی ڈبل کراس کر دیا ہے لیکن تب تک دیر ہو گئی تھی اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی۔ اسے ہوش آیا تو وہ اس خالی کمرے میں بیڈ سے اسی طرح بندھی ہوئی تھی اور اس کے منہ پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر مکمل اور گرم لباس تھا کیونکہ اس خالی جگہ سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر یہ لباس نہ ہوتا تو وہ اب تک اکڑ چکی ہوتی۔ لازمی بات تھی، لباس اسے جمال خان نے پہنایا ہو گا۔

جمال خان سے مل کر اس کے خدشات کچھ کم ہوئے تھے ورنہ اس کی آمد سے پہلے اس کے ذہن میں بہت خوف ناک خیالات آ رہے تھے۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے لیکن آس پاس کہیں ٹریفک کا شور بتا رہا تھا کہ وہ مرکزی شہر میں ہی کہیں ہے۔ جمال خان کے جانے کے بعد بھی وہ سوچتی رہی کہ وہ کیوں اس کے ساتھ شامل ہونے پر راضی ہوئی تھی مگر اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور بہت سارے جواب تھے لیکن ان میں سے کوئی اس کے دل کو نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اس لیے جمال خان کے ساتھ شامل نہیں ہوئی تھی کہ اسے جمال خان سے محبت ہو گئی تھی بلکہ وہ اس لیے اس کے ساتھ شامل ہوئی تھی کہ اسے خدا بخش سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے بے شمار مردوں سے سابقہ پڑا تھا لیکن اس نے آج تک اتنا غلیظ اور گندی سوچ رکھنے والا مرد نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

بیل بجی تو خدا بخش پھر اچھل پڑا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ وہی شخص ہو گا۔ اس نے کال ریسیو کی اور گڑگڑایا۔ ''خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔''

''سائیں! ہم کوشش کر رہے ہیں۔'' دوسری طرف سے شہریار بخاری نے کہا اور اپنا تعارف کرایا تو خدا بخش کا انداز بدل گیا اور وہ برس پڑا۔

''تم لوگ اب تک کیا کر رہے ہو..... جب میں مر جاؤں گا تو میری لاش نکالنے آؤ گے؟''

''سائیں..... آپ کا کوئی اتا پتا تو سطے، تب ہی آپ کو تلاش کر سکتے ہیں۔'' شہریار نے ٹھنڈے لہجے



www.digestpk.com

Asifzamil

میں کہا۔ ''آپ مجھ سے تعاون کریں۔ میں آپ کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔''

خدا بخش سمجھا کہ یہ پولیس افسر کسی اور تعاون کی بات کر رہا ہے۔ ''بابا تعاون تو میں تب کروں گا جب یہاں سے نکل جاؤں۔ یہاں پڑے پڑے تم سے کیا تعاون کروں؟''

شہریار نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔ ''سائیں! میرا مطلب ہے میں جو پوچھوں اس کا جواب دیں اور مجھے اپنے آس پاس کے بارے میں بتائیں۔''

''آس پاس کے بارے میں کیا بتاؤں، ایک لکڑی کے تابوت میں بند پڑا ہوں۔''

''کوئی روشنی محسوس ہو رہی ہے؟''

''نہیں، بالکل اندھیرا ہے۔ میں تو سمجھا کہ اندھا ہو گیا ہوں۔ ادھر سوراخوں سے مٹی بھی آ رہی ہے۔''

''موبائل کے علاوہ آپ کے پاس کیا ہے؟''

اس سوال پر خدا بخش نے جیبیں ٹٹولیں۔ اس کے پاس اس کا پرس، سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر بھی تھا۔ اس دوران میں اس نے حرکت کی تو اسے دائیں طرف کسی چیز کی موجودگی کا احساس بھی ہوا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا اور خوش ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی ایمرجنسی لائٹ تھی۔ خدا بخش نے اسے آن کیا اور شہریار کو اس بارے میں بتایا۔ اس نے پوچھا۔

''اگر اغوا کرنے والے نے آپ کا موبائل چھوڑ دیا ہے تو اس نے آپ سے رابطہ بھی کیا ہوگا؟''

''ہاں، اس کی کال آئی تھی۔''

شہریار نے پھر خود پر ضبط کیا، خدا بخش اسے یہ بات اتنی دیر سے بتا رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات اسے سب سے پہلے بتانی چاہیے تھی۔ ''کس نمبر سے کال آئی تھی۔'' شہریار نے پوچھا۔ وہ اپنے دفتر پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنے تمام ماتحتوں کو طلب کر لیا تھا۔ خدا بخش نے موبائل میں دیکھ کر اسے نمبر بتایا، یہ بھی ایک موبائل نمبر تھا۔ شہریار نے فوراً اپنے ایک ماتحت کو یہ نمبر چیک کرنے کو کہا اور خدا بخش سے پوچھا۔

''آپ جس لڑکی کے گھر تھے، اس کا نام اور پتا کیا ہے؟''

''بابا نام اس کا مشال ہے۔'' خدا بخش نے کہا اور مشال کا پتا بتایا۔ شہریار نے پتا کاغذ پر اتارا اور فوراً ہی دوسرے ماتحت کو اس بارے میں انکوائری کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے خدا بخش سے پوچھا۔

''اغوا کرنے والے نے کوئی ایسی بات کی یا حوالہ دیا جس سے اس کے بارے میں کوئی اشارہ ملتا ہو؟''

اس سوال پر خدا بخش کو اس کی بات یاد آ گئی۔ ''اس نے میرے کم دار فیض خان کے قتل کا حوالہ دیا تھا، اسے تین مہینے پہلے کسی نے گھر میں گھس کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کی بیوی زینب غائب ہے۔''

''فیض خان کی کس سے دشمنی ہو سکتی ہے؟''

خدا بخش اپنے کرتوت اپنے منہ سے بیان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اچانک اسے خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ''زینب کی شادی اس کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ لڑکی کے ماں باپ کہیں چلے گئے تھے اور بھائیوں نے اسے مارنے کی قسم کھائی تھی۔''

''لڑکی کے بھائی کہاں ہیں؟''

''بابا یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، میں نے انہیں دس سال سے نہیں دیکھا ہے۔'' خدا بخش نے چالاکی سے کہا۔ لیکن شہریار اس سے زیادہ ذہین تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ خدا بخش پورا سچ نہیں بول رہا ہے۔ اس نے کہا۔

''سائیں! آپ کے پاس مہلت کم ہے۔ مہربانی کر کے مجھے سب صاف صاف بتائیں۔''

خدا بخش نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، وہ جتنی دیر کرتا مجرم تک پہنچنے میں اتنی دیر لگتی اور اس کی زندگی کا امکان اتنا ہی کم ہو جاتا۔ اس نے بادل ناخواستہ کہا۔ ''نذیر لاشاری میرا ہاری تھا۔ اس کے تین لڑکے کچھ عرصے میرے پاس رہے پھر وہ فرار ہو گئے۔''

''آپ کی کچی جیل سے؟'' شہریار نے پوچھا تو خدا بخش کھسیا گیا۔

''بابا تمہیں پتا ہے یہ سب زمینداری کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ لڑکے ایک دن بھاگ گئے اور پھر مجھے ان کا کچھ پتا نہیں چلا میں نے پتا چلانے کی کوشش بھی نہیں کی، میری بلا سے وہ جہنم میں جاتے۔''

شہریار نے دل میں سوچا کہ شاید وہ جہنم میں نہیں گئے تھے لیکن وڈیرے خدا بخش کو جہنم پہنچانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اس نے لڑکوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن خدا بخش کو اس سے زیادہ علم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے سائیں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ جلد از جلد آپ تک پہنچ جائیں۔''

کال منقطع کر کے شہریار نے خدا بخش کے علاقے کے پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا اور وہاں کے انچارج جنس آفیسر سے بات کرانے کو کہا۔ چند لمحے بعد ایاز شاہ لائن پر تھا۔ شہریار نے تعارف کرایا اور پھر خدا بخش کے بارے میں مختصر



رپورٹ دے کر اس سے مدد مانگی۔ وہ خدا بخش کا سن کر مستعد ہو گیا۔ ''حاضر سائیں، حکم کرو؟''

''مجھے خدا بخش کے بیوی سمیت لاپتا ہونے والے ہاری نذیر لاشاری کے بارے میں معلومات چاہئیں۔ اس کی بیٹی اپنے شوہر فیض خان کے قتل کے بعد سے غائب ہے۔''

''میں سمجھ گیا سائیں، آپ زینب کی بات کر رہے ہو۔ اس کے شوہر فیض خان کا کسی نے سر اتار دیا تھا۔''

''بالکل وہی، میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس عورت زینب کے تین بھائی خدا بخش کے قبضے سے نکل کر کہاں گئے؟''

''یہ میں آپ کو کچھ دیر میں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے نذیر لاشاری کے ایک رشتے دار نے انہیں پناہ دی تھی لیکن اس کے بعد وہ کہاں گئے، یہ معلوم کرنا ہوگا۔''

شہریار خوش ہو گیا۔ ''اس کا مطلب ہے میں نے درست آدمی سے رابطہ کیا ہے۔ ویسے نذیر لاشاری اور اس کی بیوی کی گمشدگی کا کیا قصہ ہے؟''

''سر..... کہتے ہیں کہ اس میں وڈیرے خدا بخش کا ہاتھ ہے۔ اس نے نذیر لاشاری اور اس کی بیوی کو غائب کر دیا۔ اس کی بیٹی اور تین بیٹوں کو اپنے پاس قید میں رکھا پھر لڑکی کو فیض خان کے حوالے کر دیا اور اس نے اس سے شادی کر لی۔''

''زبردستی؟''

''اور کیا کہا جا سکتا ہے۔'' ایاز شاہ بولا۔

''ٹھیک ہے، تم ان لڑکوں کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔ یہ کام بہت اہم ہے، سب چھوڑ کر پہلے اسے دیکھو۔''

''آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی سر۔'' ایاز شاہ نے یقین دلایا۔

☆☆☆

اس بار موبائل کی بیل بجی تو خدا بخش اچھلا نہیں۔ جمیل احمد اور شہریار سے بات کر کے وہ کسی حد تک پُراعتماد ہو گیا تھا اور اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ ایک بار اس چکر سے نکل گیا تو اس قبر میں ڈالنے والے کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ وہ اغوا کرنے والے کا نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو جمال خان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''سائیں رابطہ کر لیا اپنے لوگوں سے؟''

''ہاں۔'' خدا بخش نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ جلد مجھے تلاش کر لیں گے اور پھر تم بچ نہیں سکو گے۔''

وہ ہنسا۔ ''یہ تو اچھا ہوا، تم میں کچھ دم خم تو آیا ورنہ مرے ہوئے چوہے لگ رہے تھے۔ سائیں مرد بنو، حالات کا مقابلہ کرو اور جب نہ کر سکو تو ہار مان لو۔ تمہارے پاس ابھی ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت ہے۔''

''تم اپنی فکر کرو۔ ایک بار میرے ہاتھ آ گئے تو.....''

''تم اپنے دو پیروں والے کتوں سے میرے ٹکڑے کروا کے مجھے چار پیروں والے کتوں کو کھلا دو گے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''سائیں خدا بخش! تم اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے ہو۔ میں نے کہا نا تمہیں میرے ساتھ جو کرنا تھا، وہ تم کر چکے ہو۔ اب میری باری ہے۔''

خدا بخش کو احساس ہونے لگا کہ یہ شخص اسے محبوبہ کے پہلو سے اٹھا کے یہاں قید کر چکا ہے اور اس معاملے میں پوری طرح پُراعتماد ہے۔ وہ پولیس پر انحصار نہیں کر سکتا تھا، اسے پولیس کی کارکردگی کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ صرف کمزوروں اور ہاتھ آنے والوں پر اکڑتی تھی۔ جہاں کہیں طاقتور اور ذہین مجرم سے واسطہ پڑتا تھا، وہ بے کار ہو جاتی۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''دیکھو، اگر تمہارے ساتھ کچھ بُرا ہو چکا ہے تو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہیں اس کا موقع بھی ملے گا لیکن پہلے تم خود کو آزاد کرانے کی کوشش تو کر لو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کیا ادا کر کے آزادی حاصل کر سکتے ہو۔ خدا بخش، میں دوسروں کو موقع دینے کا قائل ہوں حالانکہ میں تمہاری طرح طاقتور نہیں ہوں لیکن کیا کبھی تم نے کسی دوسرے کو موقع دیا ہے؟'' جمال خان نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ خدا بخش ہاتھ میں فون لیے سوچ رہا تھا کہ اس نے کبھی کسی کو موقع دیا ہے۔ لیکن اسے کوئی ایک فرد بھی ایسا یاد نہیں آیا کیونکہ اس نے آج تک کسی کو موقع نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

شہریار کے ماتحت نے اسے آ کر بتایا۔ ''سر! یہ فون نمبر بغیر نام کے ہے۔''

''اچھا تو ابھی تک اسے بند نہیں کیا گیا ہے؟'' شہریار نے حیرت سے کہا، اس کا ماتحت مسکرایا۔

''سر! آپ جانتے ہیں موبائل کمپنیاں اعلان تو بہت کرتی ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتیں۔ خود میرے پاس دو سم موجود ہیں جو میں نے کسی دکان سے لی تھیں اور وہ ابھی تک کام کر رہی ہیں۔''

شہریار نے ابھی تک اس نمبر پر کال نہیں کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں مجرم اس کی کال کے بعد یہ نمبر بند نہ



www.digestpk.com

Asifzamil

کردے۔ اس کے بجائے وہ خاموشی سے اسے ٹریک کراتا تو زیادہ بہتر رہتا۔ اس نے سی پی ایل سی کے انچارج کو کال کی۔ اسے نمبر دیا اور کہا۔ ''مجھے اس کی رپورٹ چاہیے۔''

''مستقل ٹریک رپورٹ نہیں مل سکتی ہے ایس پی صاحب۔'' انچارج نے کہا۔

''دیکھ لو معاملہ بہت ہائی لیول کا ہے۔ سی ایم صاحب کی طرف سے حکم ہے۔ ایک اہم آدمی اغوا ہوگیا ہے اور یہ نمبر اغوا کرنے والے کے استعمال میں ہے۔''

سی ایم کا سن انچارج الرٹ ہوگیا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں جناب..... لیکن ممکن ہے موبائل کمپنی کے پاس یہ سہولت نہ ہو۔''

''سہولت ہے، بس یہ اقرار نہیں کرتے ہیں۔ آخر یہ مطلوبہ دہشت گردوں کو بھی ان کی موبائل فون کالز کی مدد سے ہی گرفتار کرتے ہیں۔'' شہریار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جب یہ دوسروں کو یہ سہولت دے سکتے ہیں تو ہمیں دیتے ہوئے کیا مسئلہ ہے بھئی؟''

''وہ دوسرا معاملہ ہے جناب۔'' انچارج نے دبے لہجے میں کہا۔ ''اس میں وفاق آجاتا ہے۔ وہ ان موبائل کمپنیوں سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔''

''تم کوشش کرو، اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کرنا۔ میں دفتر میں موجود ہوں۔ میرا موبائل نمبر نوٹ کرلو۔'' شہریار نے اسے نمبر نوٹ کرایا اور پھر ڈی آئی جی جمیل احمد سے رابطہ کیا۔

''میں خود تمہیں کال کرنے والا تھا۔'' جمیل احمد نے کہا۔ ''معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

''موبائل فون نمبر سے اغوا کرنے والے کا سراغ لگانے کی کوشش کررہا ہوں سر..... لیکن سی پی ایل سی والے ٹریک کی سہولت نہیں لے پارہے ہیں۔ اگر ان کو موبائل کمپنی کی طرف سے انکار کیا گیا تو کمپنی کو ہائی لیول سے جیک لگانے کی ضرورت پڑے گی۔''

''میں سی ایم صاحب سے بات کرتا ہوں۔'' جمیل احمد نے کہا۔

''اگر اس موبائل کی ٹریکنگ کی جاسکے تو اغوا کرنے والے کو بہت جلدی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ خدا بخش صاحب کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ جس جگہ بند ہیں، وہاں ہوا محدود ہے اور چند گھنٹے بعد وہاں سانس لینے کے لیے آکسیجن موجود نہیں ہوگی۔''

''یہ مصیبت بھی ابھی گلے پڑنی تھی۔'' جمیل احمد نے اپنے محسن کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ ''بہرحال، اب بھگتنا تو پڑے گا۔ تم کوشش جاری رکھو، کیا تمہارا خدا بخش سے رابطہ ہوا ہے؟''

''جی سر لیکن میں نے زیادہ بات نہیں کی ہے، ان کے پاس موبائل بیٹری محدود ہے۔'' شہریار نے کہا۔ ''مجرم بہت چالاک اور وسائل رکھنے والا ہے۔ وہ شاید کوئی مالی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہے؟ مجھے تو دشمنی کا چکر لگ رہا ہے۔''

''مجھے لگ رہا ہے کہ یہ شخص دشمنی کا تاثر دے رہا ہے اور اس کا مقصد خدا بخش صاحب کو ڈرانا ہوسکتا ہے۔'' شہریار نے اپنا خیال پیش کیا۔

''اس نے کوئی مطالبہ کیا ہے؟'' جمیل احمد نے پوچھا پھر بولا۔ ''اسے بار بار صاحب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیل دی نیم۔''

''نہیں، ابھی تک اس نے کوئی مطالبہ پیش نہیں کیا ہے۔'' شہریار نے کہا۔ ''بلکہ اس نے خدا بخش کو دو گھنٹے کی مہلت دی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کھیل رہا ہے اور اس نے اپنا بندوبست پکا رکھا ہے، تبھی اس نے پورے اعتماد سے اسے موبائل فون دے دیا کہ جس سے چاہے رابطہ کرے۔''

جمیل احمد فکرمند ہوگیا۔ ڈی آئی جی ہونے کے ناتے اسے پولیس کی کارکردگی کا اچھی طرح علم تھا۔ ''ایسے مجرم آسانی سے قابو میں نہیں آتے ہیں۔''

''سر..... اس کی چالاکی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے خدا بخش کو کہیں رکھنے کے بجائے زمین میں دفن کردیا۔ اب وہ کہاں دفن ہے، یہ پتا چلانا ناممکن حد تک دشوار ہے۔ ہاں اغوا کرنے والا ہاتھ آجائے تو پھر اسے بچایا جاسکتا ہے۔''

''میں سی ایم سے بات کرتا ہوں۔ دعا کرنا انہوں نے بھی رات کو زیادہ نہ پی ہو ورنہ بارہ بجے سے پہلے کسی قابل نہیں رہتے ہیں۔''

شہریار کو اپنے اس ماتحت کی رپورٹ کا انتظار تھا جسے اس نے مشال کے اپارٹمنٹ کی طرف بھیجا تھا۔ جیسے ہی اس نے فون رکھا، اس کے موبائل پر کال آگئی۔ ''سر! میں سریش بات کررہا ہوں۔''

''سریش..... کیا رہا؟''

''سر! اپارٹمنٹ کی انتظامیہ نے بڑی مشکل سے اندر جانے دیا ہے۔ اپارٹمنٹ خالی ہے لیکن وہاں شراب کی بوتلیں اور بعض ایسی چیزیں موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ



ایک مرد اور ایک عورت یہاں یکجا تھے۔''

''دروازے کی کیا پوزیشن ہے؟''

''لاک تھا، مجھے لاک توڑنا پڑا ہے۔ نیچے وڈیرے کے گارڈ موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ان کو آرام سے ہیڈ کوارٹر لے آؤ۔'' شہریار نے حکم دیا۔ ''کوئی جھگڑا مت کرنا۔ اگر کوئی تنازع ہو تو میری بات کرادینا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' سریش نے جواب دیا۔

☆☆☆

خدا بخش خاموش لیٹا ہوا تھا، آخری کال کو دس منٹ ہو چکے تھے لیکن یہ دس منٹ اس پر دس صدیاں بن کر گزرے تھے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا حالانکہ ابھی آکسیجن کی اتنی کمی نہیں ہوئی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار کر رونا شروع کردے، وہ بڑی مشکل سے اپنی اس کیفیت پر قابو پائے ہوئے تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اپنے بڑے بیٹے مراد بخش کو فون کرے۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا اور مراد کو کال کی۔ اس کے موبائل پر بیل جاتی رہی لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ پہلے خدا بخش دانت پیستا رہا پھر وہ گالیاں دینے لگا۔ ''ذلیل کہیں کا..... پی کر پڑا ہوگا کسی..... کے ساتھ۔''

بیٹے کو گالیاں دیتے ہوئے وہ بھول گیا کہ وہ خود بھی یہی کرتا تھا اور جب وہ حویلی میں ہوتا تھا تو شاید ہی کسی دن اس کی آنکھ دس گیارہ بجے سے پہلے کھلتی تھی۔ پھر اس نے حویلی کے نمبر پر کال کی۔ فون اس کی ایک منہ چڑھی خادمہ نے اٹھایا، اس کی آواز سن کر وہ چہکی۔ ''سائیں کہاں ہیں آپ..... کل سے بڑی بیگم کال کررہی ہے۔''

خدا بخش کا موڈ خراب تھا، اس نے خادمہ کو چند گالیاں دیں اور بولا۔ ''یہ مراد بخش کہاں ہے؟''

خادمہ گالیاں کھا کر بدمزہ نہیں ہوئی، اس نے دبی زبان میں کہا۔ ''چھوٹا سائیں رات تو میرے ساتھ تھا، اب کمرے میں ہوگا۔''

خادمہ باپ بیٹوں اور آنے جانے والوں کی دولتِ مشترکہ تھی۔ خدا بخش یہ بات جانتا تھا اس نے توجہ نہیں دی اور حکم دیا۔ ''جاکر اسے فوراً جگا۔ اسے بتا کسی نے مجھے کہیں قید کردیا ہے۔''

''کیا سائیں؟'' خادمہ چیخ اٹھی۔ ''قید کردیا ہے، پر کہاں اور کس نے؟''

خدا بخش نے پھر گالیوں کا سبق دہرایا اور دہاڑا۔ ''اب تیری زبان سے ایک لفظ نکلا تو تجھے زندہ دفن کردوں گا۔ جاکر مراد کو اٹھا اور اسے بول مجھے کال کرے میرے موبائل پر۔ اس کے سوا کسی سے بات مت کرنا، سمجھ گئی؟''

''جی سائیں..... جیسا حکم سائیں۔'' خادمہ نے سہم کر کہا۔ اسے معلوم تھا کہ خدا بخش کی دھمکی صرف دھمکی نہیں ہوتی ہے، وہ اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ وہ فون رکھ کر دوڑ گئی۔ خدا بخش نے موبائل نیچے رکھ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ تابوت میں موجود ہوا بھاری ہوچکی تھی اور اسے سانس لینے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ اسے ہوش میں آئے ہوئے ایک گھنٹا ہونے والا تھا۔ اس نے اغوا کرنے والے کے بارے میں سوچا، کیا وہ نذیر لاشاری کا لڑکا تھا؟ لہجے سے تو وہ اس کے علاقے کا لگ رہا تھا لیکن وہ بات اردو میں کررہا تھا۔ کوئی پانچ منٹ بعد موبائل کی بیل بجی۔ یہ مراد کا نمبر تھا، اس نے کال ریسیو کی۔

''بابا۔'' مراد نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ ''یہ شبانہ کیا بکواس کررہی ہے۔ آپ کو کسی نے قید کرلیا ہے؟''

''ہاں اور یہ بات حویلی میں سوائے تیرے کسی کو پتا نہ چلے۔'' خدا بخش نے کہا۔ ''کسی نے مجھے اغوا کرکے زمین میں زندہ دفن کردیا ہے۔''

مراد مشکوک ہوگیا۔ ''بابا! آپ اسی کراچی والی اداکارہ کے گھر ہو؟''

''میں وہاں تھا۔'' خدا بخش نے تصدیق کی۔ ''مجھے وہیں سے اغوا کیا گیا ہے۔''

''بابا! کہیں آپ نے زیادہ تو نہیں پی لی؟''

خدا بخش طیش میں آگیا۔ ''تیرا مطلب ہے میں نشے میں ہوں، بکواس کررہا ہوں۔ میں بوتل پی کر بھی ہوش میں رہتا ہوں۔''

''جی بابا!'' مراد گھبرا گیا۔ وہ اگرچہ تیس برس کا ہوچکا تھا لیکن ابھی بھی باپ سے اس کی جان جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے وحشی باپ کو جب غصہ آجائے تو وہ بیٹے کی پروا بھی نہیں کرتا ہے۔ ''تو آپ یہاں کیسے آئے؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں مشال کے فلیٹ پر تھا۔ کسی نے روشنی بجھا کر میرے سر پر کچھ مارا۔''

''تب وہ بھی شامل ہوگی۔'' مراد نے فوراً کہا۔

''ابھی مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن تو ہوشیار ہوجا۔ اغوا کرنے والا مجھے اپنے علاقے کا لگ رہا ہے۔ وہ رقم مانگے گا یا کوئی اور مطالبہ کرے گا۔ اس کا مطالبہ ہر صورت پورا کرنا ہے، ورنہ تین گھنٹے بعد میں مرجاؤں گا۔''



www.digestpk.com

Asifzamil

"تین گھنٹے بعد..... وہ کیسے بابا؟"

"اس نے مجھے ایک تابوت میں بند کر کے زمین میں دفن کیا ہے۔ تابوت میں ہوا ہے لیکن یہ تین گھنٹے بعد ختم ہو جائے گی۔"

"آپ نے پولیس کو بتایا ہے؟"

"ہاں، ڈی آئی جی جمیل کو بتایا ہے، اس کا آدمی کوشش کر رہا ہے۔" خدا بخش نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ "لیکن پولیس مجھے تلاش نہیں کر سکتی..... معلوم نہیں اس نے مجھے کہاں دفن کیا ہے؟"

مراد صرف میٹرک پاس تھا اور اس نے باپ کے زور دینے کے باوجود آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں کورا تھا لیکن کم عمری سے شراب اور شباب کے شوق نے اس کی فطری ذہانت کو بھی ماند کر دیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ باپ کو بچانے کے لیے کیا کرے۔ خدا بخش کے موبائل پر دوسری کال آ رہی تھی۔ اس نے مراد سے کہا۔ "میری کال آ رہی ہے، میں بعد میں بات کروں گا۔" اس نے کال کاٹ کر دوسری کال ریسیو کی۔ "ہاں بابا! کیا ہوا؟"

دوسری طرف شہریار تھا۔ "سائیں، میں نے مشال کا اپارٹمنٹ دِکھوایا ہے، وہاں مشال بھی نہیں ہے۔ البتہ آپ کے گارڈز باہر موجود تھے، ان کو ہیڈ کوارٹر بلوا لیا ہے۔"

"ان کو ڈالو جہنم میں۔" وہ جھنجلا گیا۔ "یہ بتاؤ مجھے تلاش کرنے کے لیے کیا کیا ہے؟"

"سائیں، سی پی ایل سی سے اس شخص کا نمبر ٹریک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک بار وہ گرفت میں آ گیا تو خود آپ کے بارے میں بتائے گا۔"

"نمبر کا کیسے پتا چلے گا کہ کہاں سے کال کر رہا ہے، یہ تو موبائل ہے بابا۔" خدا بخش نے شک سے کہا۔ "وہ کہیں سے بھی کال کر سکتا ہے۔"

شہریار نے کہا۔ "موبائل کمپنی یہ بتا سکتی ہے کہ فلاں کال اس علاقے سے کی جا رہی ہے۔"

خدا بخش چونکا۔ "بابا! جب اس کی کال کا پتا چلا سکتے ہو تو میری کال کا بھی پتا چلاؤ کہ کہاں سے ہو رہی ہے۔ مجھے تلاش کرو۔"

شہریار اپنی نشست پر اچھل پڑا۔ جو بات اس کے ذہن میں نہیں آئی، وہ ایک دیہاتی وڈیرے کے ذہن میں آ گئی تھی۔ واقعی وہ خدا بخش کی کال کی مدد سے اس کا پتا چلا سکتا تھا۔ اس نے جوش سے کہا۔ "ہاں سائیں! اس طرح آپ کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ میں ابھی بات کرتا ہوں۔"

جیسے ہی شہریار نے کال بند کی، خدا بخش کے موبائل نے بیل دی۔ اس بار اغوا کرنے والے کی کال تھی۔ "کیا ہو رہا ہے خدا بخش..... تمہارے لیے کوشش کی جا رہی ہے؟"

خدا بخش نے چالاکی سے کام لیا۔ "کہاں بابا! ہمارے نکمے پولیس والے کسی کام کے ہوتے تو ملک کا یہ حال ہوتا۔"

"ملک کا جو بھی حال ہے، وہ تمہارے جیسے جاگیرداروں کی وجہ سے ہے۔ ہر شعبے اور ادارے کا تم لوگوں نے بیڑا غرق کر رکھا ہے۔ بہرحال، تم ایک بڑے وڈیرے اور موجودہ حکومت کے چہیتے ہو اس لیے تمہاری تلاش کے لیے کچھ نہ کچھ کوششیں کی جا رہی ہوں گی؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" خدا بخش نے گھبرا کر کہا۔ اسے ڈر تھا جیسے اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اسے موبائل کال کی مدد سے تلاش کیا جا سکتا ہے، اسی طرح یہ بات جمال کے ذہن میں آ گئی تو ممکن ہے وہ پولیس کی آمد سے پہلے اسے یہاں سے نکال لے جائے یا مار سکتا ہے۔ اس نے توجہ بٹانے کے لیے کہا۔ "تمہارے لہجے سے لگتا ہے تم میرے علاقے کے ہو؟"

"ہاں، تم چاہو تو ایسا سمجھ لو۔"

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

"خدا بخش..... اب زیادہ دیر کی بات نہیں رہی ہے، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تمہارے پاس اب صرف آدھا گھنٹا رہ گیا ہے۔" جمال خان نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

شہریار نے سی پی ایل سی کے انچارج کا نمبر ملایا۔

"بات ہوئی؟"

"ہاں، میں نے رپورٹ نکلوائی ہے سر۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن کمپنی مسلسل ٹریک رپورٹ دینے سے انکار کر رہی ہے۔ وہ صرف یہ بتانے کے لیے تیار ہے کہ اس نمبر سے آخری کال کس ٹاور سے کی گئی ہے۔"

"ٹاور۔" شہریار غرایا۔ "ایک ٹاور تقریباً ایک مربع کلومیٹر کا علاقہ کور کرتا ہے۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ یہ کتنی بڑی جگہ ہے؟ خاص طور سے جب کسی آدمی کو زمین کے نیچے تلاش کرنا ہو؟"

"میری مجبوری ہے جناب..... میں اس سے زیادہ



www.digestpk.com

Asifzamil

نہیں معلوم کرسکتا۔'' انچارج نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم ان سے اس نمبر کی کال کی رپورٹ لو اور ایک نمبر اور بتا رہا ہوں، اس کے بارے میں بھی معلوم کرو کہ اس کی آخری کال کہاں سے کی گئی ہے۔'' شہریار نے کہا اور اسے خدا بخش کا نمبر بتایا۔ ''یہ بہت ضروری ہے کیونکہ یہ مغوی کا نمبر ہے..... اس سے پتا چلے گا کہ وہ کہاں ہے؟''

''میں اس کا بھی معلوم کراتا ہوں۔'' انچارج نے مستعدی سے کہا۔ ''مجھے کمپنی کی طرف سے چند منٹ میں کال آنے والی ہے۔''

''میں لائن پر ہوں۔'' شہریار نے کہا۔ ''تم معلوم کرو۔''

انچارج موبائل کمپنی کے حکام سے رابطہ کر رہا تھا۔ اس نے انہیں خدا بخش کا نمبر دیا۔ اس دوران میں ڈی آئی جی جمیل احمد کا لگایا ہوا اعلیٰ سطح کا جیک بھی کام کرنے لگا تھا کیونکہ موبائل کمپنی کے حکام کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا اور وہ تعاون پر آمادہ دکھائی دے رہے تھے۔ اتفاق سے خدا بخش کے موبائل کی سم بھی اسی کمپنی کی تھی۔ انچارج نے کچھ دیر بعد شہریار کو مطلع کیا۔ ''جناب..... وہ جلد بتائیں گے کہ خدا بخش کے موبائل کے سگنل کہاں سے آرہے ہیں۔''

''موبائل کمپنی یہ بھی بتا سکتی ہے کہ سگنل کہاں سے آرہے ہیں؟''

''جی سر لیکن اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والی گاڑی خراب کھڑی ہے اور اگر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے تو وقت بالکل نہیں ہے۔''

شہریار نے اس کی بات پر غور کیا اور بولا۔ ''پہلے نمبر کے بارے میں کیا معلوم ہوا ہے؟''

''اس کی رپورٹ مجھے فیکس پر آرہی ہے۔ ایک منٹ..... رپورٹ آگئی ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' انچارج نے کہا اور رپورٹ دیکھنے لگا پھر اس نے شہریار کو لوکیشن بتائی۔ ''یہ آئی آئی چندریگر روڈ کے ایک علاقے سے کی گئی ہے۔''

شہریار کے کمرے میں شہر کا بڑا سا نقشہ موجود تھا۔ اس نے نقشے پر دیکھا اور پنسل سے اس جگہ پر نشان لگایا۔ ''موبائل کمپنی سے کہو جس ٹاور سے کال کی گئی ہے، اس کی لوکیشن بھی دیں۔''

''لوکیشن ہے جناب۔'' انچارج نے کہا اور اسے ٹاور کا پتا بتایا۔

''اب مجھے خدا بخش کے موبائل کی لوکیشن چاہیے۔''

''انہوں نے دس منٹ مانگے ہیں۔ سسٹم میں تلاش کرنے میں اتنا وقت لگتا ہے کیونکہ ایک وقت میں کوئی دس لاکھ کالز بیک وقت جاری ہوتی ہیں اور اتنی کالز کا ڈیٹا کھنگالنا کمپیوٹر کے لیے بھی مشکل ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی لوکیشن آئے، مجھے میرے موبائل پر کال کر کے بتانا۔'' شہریار نے کہا۔ ''میں دفتر سے نکل رہا ہوں۔''

شہریار اپنی کیپ اٹھا کر باہر کی طرف آیا تھا کہ اس کے موبائل نے بیل دی۔ انچارج کی طرف سے اتنی جلدی جواب ممکن نہیں تھا، اس کا اندازہ درست نکلا۔ ڈی آئی جی کی کال تھی۔ ''شہریار! کیا پیش رفت ہوئی ہے؟''

''سر مجرم کی کال لوکیشن ملی ہے۔ خدا بخش کی لوکیشن ابھی معلوم ہوگی۔ میں اس طرف جا رہا ہوں جہاں سے مجرم نے آخری کال کی تھی۔''

''خدا بخش سے رابطہ ہوا؟'' جمیل احمد فکر مند تھا۔

''مجرم کے دیے وقت میں شاید بیس منٹ رہ گئے ہیں۔''

''سر..... ہمیں مجرم کی دی ہوئی گائیڈ لائن پر نہیں چلنا ہے۔ ہمیں اپنے طور پر تفتیش کرنی ہے۔'' شہریار نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''مجرم اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن معاملہ خدا بخش کا ہے۔ سی ایم کی کال آئی تھی۔''

''سر آپ کے لیے ان معاملات کو دیکھنا کوئی نیا کام تو نہیں ہے۔ آپ انہیں ہینڈل کرتے رہیں۔ میں اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، میں اپنا کام پورا کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جمیل احمد نے گہری سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ شہریار ان چند پولیس افسران میں سے ایک ہے جو اپنے کام سے مخلص ہوتے ہیں۔

''تھینک یو سر۔'' شہریار نے اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

خدا بخش ہر تھوڑی دیر بعد موبائل پر وقت دیکھتا تھا۔ دو گھنٹے پورے ہونے والے تھے اور یہ سوچ کر اس کا دل لرز رہا تھا کہ نہ جانے اب اس پر کیا عتاب آنے والا ہے؟ اس نے گھبرا کر شہریار کا نمبر ملایا لیکن وہ انگیج تھا پھر اس نے جمیل احمد کو کال کرنا چاہی لیکن اس کا نمبر بھی مصروف ملا۔ عادت کے مطابق وہ گالیاں دینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اغوا



کرنے والے نے اس سے کوئی مطالبہ کیا تو وہ اس کا مطالبہ ہر صورت میں پورا کرے گا چاہے اسے اپنی دولت کا بڑا حصہ کیوں نہ دینا پڑے۔ رفتہ رفتہ موت کی طرف جاتے ہوئے اس کا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور اس طرح گمنامی کی موت تو بالکل نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین تھی۔ دولت کا کوئی حساب نہیں تھا۔ گزشتہ حکومت میں وہ اپنے علاقے کا ناظم بھی تھا اور اس حیثیت سے اس نے بے شمار دولت کمائی تھی۔ اس کالی دولت کا بڑا حصہ اس نے چھپا کر رکھا تھا۔ اگر وہ مر جاتا تو یہ ساری دولت اسی دنیا میں رہ جاتی۔ دو گھنٹے پورے ہونے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے کہ اغوا کرنے والے کے نمبر سے کال آئی۔

''خدا بخش..... تمہارا وقت پورا ہوگیا ہے۔''

''خدا کے لیے۔'' وہ بے ساختہ گڑگڑایا۔ ''مجھے معاف کردو۔ تم جو کہو گے میں ماننے کو تیار ہوں۔''

''میں تمہیں اپنا مطالبہ بتاتا ہوں لیکن اس سے پہلے باہر والوں سے تمہارا رابطہ ختم کرنا ہوگا۔'' اس نے کہا اور اچانک خدا بخش کو گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ایسا لگا جیسے اس کے مدفن کے اوپر کوئی بھاری بھرکم پتھر لڑھک رہا ہے۔ تابوت پر بوجھ آیا تھا اور وہ اندر کی طرف دبا تو خدا بخش کی چیخ نکل گئی۔ اس نے موبائل پر کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو..... میں مر جاؤں گا..... ہیلو ہیلو.....'' اسے احساس ہوا کہ موبائل کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے' اس نے جلدی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ موبائل کام کر رہا تھا لیکن اب اس پر سگنل نہیں آرہے تھے۔ شاید اس کے مدفن پر مزید مٹی ڈالی گئی تھی اور اب سگنل کی رسائی نہیں رہی تھی۔ بیرونی دنیا سے کٹ جانے کا احساس اتنا خوف ناک تھا کہ خدا بخش بچوں کی طرح دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ تابوت کی محدود فضا میں اس کی ڈکراتی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی آوازوں میں ایک آواز اور بھی شامل ہے اور یہ گنگناتی ہوئی ہلکی سی آواز تھی۔

اس کی دھاڑیں رک گئیں اور اس نے غور کیا تو یہ جدید فون سیٹ کی گنگناتی ہوئی بیل جیسی آواز اس کے پیروں کی طرف سے آرہی تھی۔ خدا بخش نے جلدی سے سر اوپر کر کے اپنی توند کے گنبد سے آگے دیکھنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے ایمرجنسی لائٹ کی روشنی پہلو سے آگے کی تو اسے پیروں سے ذرا آگے ایک چھوٹا سا فون سیٹ رکھا دکھائی دیا۔ بیل کی آواز اسی سے آرہی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں سے اس سیٹ کو آگے کھسکایا۔ یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ وہ مڑ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اس کے ہاتھ سیٹ تک پہنچ سکتے تھے اس لیے صرف پاؤں سے وہ اسے پیچھے کی طرف سرکا سکتا تھا۔ ایسا کرنا بھی آسان نہیں تھا۔

ذرا سی دیر میں وہ پسینے پسینے ہوگیا۔ اس نے زندگی میں کبھی ایسا کوئی مشقت والا کام نہیں کیا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ پاؤں سے سیٹ کو مزید سرکانا ممکن نہیں رہا۔ وہ اب اس کے گھٹنے سے ذرا نیچے تھا۔ اس دوران میں سیٹ کی بیل مستقل بج رہی تھی اور تعجب کی بات تھی کہ وہ سیٹ کو پاؤں مار رہا تھا لیکن اس کا ریسیو کریڈل سے نہیں ہٹا تھا اور بیل مستقل بجے جا رہی تھی۔ ایک بار جب بیل بج کر خود خاموش ہو جاتی تو کچھ دیر بعد دوبارہ بجنے لگتی۔ کال کرنے والا مستقل مزاجی سے کال ملا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خدا بخش کال ریسیو کرے گا۔

اب خدا بخش کسی طرح ہاتھ سیٹ تک لے جانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تابوت کی تنگی رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس کا لمبا چوڑا جسم آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح گردن موڑ کر اس نے ایک ہاتھ لمبا کیا اور سیٹ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ گھٹنوں تک آیا مگر سیٹ ذرا نیچے تھا۔ جب وہ سیٹ کو نہیں پکڑ سکا تو اس نے گردن مزید موڑی اور ہاتھ سیٹ تک لے گیا۔ اسے لگا جیسے اس کی گردن ٹوٹ جائے گی لیکن اتنا مڑنے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کا ہاتھ سیٹ تک پہنچ گیا۔ اب وہ انگلیوں کی مدد سے اسے ذرا ذرا آگے کھینچ رہا تھا۔ اس میں ایک رکاوٹ اور بھی تھی۔ سیٹ کے ساتھ تار بھی تھا اور وہ رکاوٹ بن رہا تھا۔ بہرحال کافی..... جدوجہد کے بعد خدا بخش نے سیٹ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا تار اتنا لمبا تھا کہ وہ سر تک آگیا۔ اس نے ریسیور اٹھانا چاہا تو وہ کسی چیز کی مدد سے سیٹ سے بالکل جڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹٹولا، یہ شفاف ٹیپ تھا جس کی مدد سے ریسیور کو سیٹ سے اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ کسی صورت نہیں نکل سکتا تھا۔ اس نے عجلت میں یہ ٹیپ اتار پھینکا اور ریسیور اٹھایا۔ اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''ہیلو۔''

جمال ہنسا۔ ''بالآخر تم نے فون اٹھا لیا۔ میں نے اسے اس طرح رکھا تھا کہ تم اسے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔''

خدا بخش اپنا سانس درست کر رہا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اب ہوا تیزی سے بھاری ہو رہی ہے۔ ''تم نے



www.digestpk.com

Asifzamil

''اطلاع یہ ہے جناب کہ خدا بخش صاحب کے نمبر سے سگنل آنا بند ہو گئے ہیں اور دوسرا موبائل بھی آف ہو گیا ہے۔ ریکارڈنگ دس منٹ میں میرے پاس آجائے گی۔''

شہریار فکرمند ہو گیا۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس جگہ پہنچ گیا ہوں جہاں سے یہ دونوں موبائل استعمال ہو رہے تھے۔ مجھے یہاں موبائل ٹاورز کا لوکیشن میپ مل سکتا ہے؟''

''مشکل ہے لیکن یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس علاقے میں اس کمپنی کے مزید کتنے ٹاورز ہیں۔''

''مجھے فوری طور پر بتاؤ۔'' شہریار نے کہا۔ اس کے ساتھ ایک ایس آئی اور تین کانسٹیبل بھی تھے۔ یہ نفری ناکافی تھی۔ اس نے ہیڈ کوارٹر سے مزید نفری کے ساتھ متعلقہ تھانے سے بھی نفری بھیجنے کو کہا۔ گیارہ بج چکے تھے اور آئی آئی چندریگر روڈ پر گاڑیوں اور انسانوں کا ایک سیلاب بہہ رہا تھا۔ ملک کے تمام بڑے بینکوں اور کمپنیز کے دفاتر یہاں تھے۔ اس کے علاوہ بے شمار مارکیٹیں اور دوسرے تجارتی ادارے بھی یہاں کام کرتے تھے۔ یہاں ہر طرف عمارتیں تھیں اور شاذ ہی کہیں خالی زمین تھی اور جہاں صرف زمین تھی، وہ جگہ بھی خالی نہیں تھی بلکہ اس پر کچھ نہ کچھ کام جاری تھا۔ شہریار سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں کسی شخص کو زمین میں اس طرح دفنایا جا سکتا ہے کہ کسی کو اس کے بارے میں علم ہی نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ دفن کرنے والا خدا بخش کو دھوکا دے رہا ہو، اس نے اسے کہیں بند رکھا ہو اور تاثر دے رہا ہو کہ اسے زمین میں دفن کر دیا ہے؟

☆☆☆

اے ایس آئی رحیم قادر تعلیم یافتہ تھا۔ وہ گریجویشن کر کے پولیس فورس میں آیا تھا اور اب اس کا ارادہ ماسٹرز کرنے کا تھا۔ شہریار کی کال ملتے ہی اس نے چھاپا مار پارٹی تیار کی اور مطلوبہ پتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ پانچ سپاہی تھے۔ وہ سب پولیس موبائل میں بھر کر مطلوبہ پتے پر پہنچے۔ یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی جس کی تیسری منزل پر وہ فلیٹ واقع تھا۔ دو سپاہیوں کو آگے پیچھے کی نگرانی پر چھوڑ کر رحیم قادر خود باقی نفری کے ہمراہ اوپر پہنچا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں کسی عورت نے اندر سے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو..... پولیس۔'' اے ایس آئی نے کرخت لہجے میں کہا۔

''پولیس۔'' عورت سہم گئی لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ ''کیا بات ہے، کیوں آئے ہو؟''

''دروازہ کھولو ورنہ ہم توڑ دیں گے۔'' اے ایس آئی نے دروازے پر لات ماری تو وہ لرز گیا۔ عورت نے اس بار دروازہ کھول دیا اور وہ سب دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ ایک منٹ کے اندر انہوں نے تین چھوٹے کمروں پر مشتمل فلیٹ کی تلاشی لے لی۔ لیکن وہاں عورت اور ایک دس گیارہ سال کی لڑکی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ رحیم قادر نے تقریباً چالیس برس کی عورت سے پوچھا۔ ''حمید لاشاری کہاں ہے؟''

''وہ کام پر گیا ہے۔'' عورت نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو کون ہے؟''

''میں اس کی بیوی ہوں اور یہ حمید کی بچی ہے۔''

''وہ کہاں کام کر رہا ہے؟''

''پتا نہیں، وہ ٹھیکے دار ہے کہیں کام کر رہا ہے۔''

''اس کا کوئی فون نمبر ہوگا؟''

''اس کا فون کل خراب ہو گیا ہے۔ ادھر گھر میں پڑا ہے۔'' عورت بولی اور رحیم قادر کو ایک پرانا گھسا ہوا موبائل لا کر دیا۔ اس نے موبائل میں سے سم نکالی اور اسے اپنے موبائل میں لگایا۔ سم میں درجنوں فون نمبر موجود تھے۔ اس نے تیزی سے ان کو اپنے موبائل کی میموری میں محفوظ کیا اور سم نکال کر عورت کو واپس دے دی۔ ''ہمیں ایک معاملے میں حمید لاشاری کی ضرورت ہے۔''

''وہ شام کو واپس آئے گا۔''

رحیم نے باہر آ کر شہریار کو کال کی اور رپورٹ دی۔

''وہ شام کو گھر آئے گا۔''

''اسے فوری گرفتار کرنا ہے۔ اس کی کانٹیکٹ لسٹ میں موجود افراد کو کال کر کے معلوم کرنا شروع کر دو۔ وہ ٹھیکے دار ہے، اس کے پاس لازمی سامان سپلائی کرنے والوں کے نمبر ہوں گے اور سپلائرز کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں کام کر رہا ہے۔''

''میں سمجھ گیا سر..... میں ابھی فون کرتا ہوں۔''

''اس کی لوکیشن معلوم ہوتے ہی پارٹی سمیت وہاں پہنچ جانا اور اس کے گھر ایک آدمی چھوڑ دو، کوئی اس سے رابطہ نہ کر سکے۔''

''او کے سر۔'' رحیم نے کہا اور اپنے ایک آدمی کو فلیٹ کے دروازے پر چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ



عورت یا لڑکی فلیٹ سے باہر نہ جائیں، جب تک اس کی طرف سے حکم نہ آئے۔ پولیس موبائل میں بیٹھ کر اس نے حمید لاشاری کی سم سے ملنے والے نمبر چیک کرنا شروع کر دیے۔ وہ کال کر کے حمید لاشاری کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔ پانچویں شخص سے اسے کامیابی ملی۔ وہ بجری کے ڈمپر سپلائی کرتا تھا اور اس نے بتایا کہ حمید ان دنوں آئی آئی چندریگر پر ایک جگہ ایک بڑی بلڈنگ کی تعمیر میں شامل ہے۔ اس نے ڈمپر والے سے کئی ڈمپر بجری وہاں ڈلوائی تھی۔ رحیم قادر نے اس کا پتا لیا اور فوری شہریار کو کال کی۔

''سر..... حمید لاشاری کے کام کی جگہ کا علم ہو گیا ہے۔ میں اس طرف جا رہا ہوں۔''

''جگہ کہاں ہے؟'' شہریار نے پوچھا۔

رحیم قادر نے اسے پتا بتایا۔ شہریار اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے رحیم سے کہا۔ ''تم آؤ، میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔ میں اس جگہ سے دس منٹ کے فاصلے پر ہوں۔''

''مجھے آنے میں وقت لگے گا جناب آپ جلد پہنچ سکتے ہیں۔''

شہریار اپنی پارٹی کے ہمراہ اس زیرِ تعمیر عمارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ مین روڈ سے ہٹ کر بن رہی تھی اور اس کی اوپری دو منزلوں کا اسٹرکچر مکمل ہو چکا تھا اور اگلی منزل کی تعمیر کے لیے شیٹرنگ اور دوسرا کام جاری تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمارت کی بیسمنٹ کا کام مکمل ہو چکا تھا اور ویسے بھی وہاں اتنے لوگ نظر آ رہے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے مجرم خدا بخش کو کسی صورت یہاں زمین میں دفن نہیں کر سکتا تھا۔ شہریار گاڑی سے اترا تو اسے دیکھ کر سائٹ سپروائزر دوڑا آیا۔ شہریار اپنی جگہ کھڑا رہا۔ سپروائزر نے پاس آ کر ادب سے سلام کیا اور بولا۔

''حکم سرکار۔''

شہریار نے اسے مخصوص افسرانہ انداز میں دیکھا۔ ''یہاں ایک ٹھیکے دار حمید لاشاری کام کرتا ہے؟''

''جی سرکار..... وہ سپلائی کا سپروائزر ہے.....'' سپروائزر نے جواب دیا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''یہیں موجود ہے، میں اسے بلاتا ہوں۔'' سپروائزر نے کہا اور ایک مزدور کو اشارے سے بلایا۔ ''اندر جا کر حمید لاشاری کو بلا لاؤ۔''

مزدور ایک منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ واپس آیا اور شہریار کو دیکھ کر وہ بھی مؤدب ہو گیا، ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھی سپروائزر کی طرف دیکھا۔ اس نے شہریار کی طرف اشارہ کیا۔ ''صاحب تمہیں پوچھ رہے ہیں۔''

''حکم سرکار۔'' حمید لاشاری نے بنا کسی خوف کے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' شہریار نے کہا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ ذرا دور آ کر اس نے حمید لاشاری سے پوچھا۔ ''تم نذیر لاشاری کو جانتے ہو؟''

''جی سرکار، وہ میرا رشتے دار تھا۔'' حمید لاشاری چونکا۔

''اس کے لڑکے تمہارے پاس ہوتے ہیں؟''

''نہیں سرکار، دو سال پہلے تک تھے، اب انہوں نے اپنا الگ ٹھکانا کر لیا ہے۔ میری بیوی اور بچی ہے۔ میں جوان لڑکوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

شہریار نے محسوس کیا کہ وہ سچ بول رہا ہے لیکن پولیس کی تربیت میں شک شامل ہوتا ہے۔ اس نے حمید لاشاری سے کہا۔ ''پھر بھی تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہیں؟''

''جی سرکار، وہ چاکیواڑہ میں ہی رہتے ہیں۔ آج کل ادھر ہی کام کر رہے ہیں۔ دو بلاک ادھر ایک بڑی عمارت کے لیے کھدائی کا کام جاری ہے، وہاں ہوتے ہیں۔''

''وہ کیا کرتے ہیں؟''

''غریب کے بچے ہیں سرکار..... محنت مزدوری کرتے ہیں۔'' حمید لاشاری نے عاجزی سے کہا۔ ''کیا ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟''

''تم ہمیں ان کے پاس لے چلو۔'' شہریار نے حکم دیا اور حمید لاشاری کے ساتھی سپروائزر سے کہا۔ ''یہ ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔''

ساتھی سپروائزر نے پریشانی سے حمید لاشاری کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے سرکار۔''

گاڑی میں جگہ نہیں تھی اس لیے شہریار نے ایک کانسٹیبل کو وہیں چھوڑا اور حمید کو اپنے ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ریحان مرزا اس غیر ملکی بینک کی پاکستان میں ہیڈ آفس برانچ کا منیجر تھا کیونکہ بینک میں زیادہ تر ان پاکستانیوں کے اکاؤنٹس تھے جو اپنی دولت باہر رکھتے ہیں یا ان کے کاروباری تعلقات بیرونِ ملک ہوتے تھے۔ یہاں..... زرِ مبادلہ میں اکاؤنٹ بھی کھولے جا سکتے تھے۔ اپنی مخصوص بینکاری کی وجہ سے برانچ میں بہت کم لوگ آتے جاتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بینک کے بزنس میں کوئی کمی



www.digestpk.com

Asifzamil

تھی۔ اس جدید عمارت کا پورا گراؤنڈ فلور اس بینک کے پاس تھا۔ بینک اپنے دولت مند گاہکوں کو خاصے مہنگے داموں لاکر بھی مہیا کرتا تھا۔ ان لاکر کو گاہک اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے اور اس سلسلے میں بینکوں کے قوانین کو بھی پسِ پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ خدا بخش کالاکر اس کی ایک مثال تھا۔ خدا بخش نے منیجر سے بات کر..... رکھی تھی کہ اگر وہ کسی شخص کو چابی دے اور اسے کال کر کے اطلاع کرے تو وہ اسے لاکر کھولنے دے گا۔

ریحان مرزا اپنے شیشے کے کیبن میں موجود تھا۔ ایک آفیسر اس سے ایک اکاؤنٹ کے بارے میں بات کر رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی بیل بجی۔ نمبر اجنبی تھا، اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف وڈیرا خدا بخش تھا۔

"منیجر سائیں! کیا حال ہیں؟ خدا بخش بات کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہیں سائیں..... آپ سنائیں کیسے ہیں؟ بہت دنوں سے چکر نہیں لگایا ہے۔" ریحان مرزا نے خوش دلی سے کہا اور اشارے سے آفیسر کو وہاں سے جانے کو کہا۔

"بابا مصروفیات ایسی ہیں، ادھر زمینوں کے معاملات جان نہیں چھوڑتے ہیں، ادھر سیاست کا چکر بھی چلتا رہتا ہے۔ سی ایم تو وزیر بنا رہے تھے، بڑی مشکل سے معافی ملی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" ریحان مرزا نے کہا۔ "حکم فرمائیں..... میرے لائق کوئی خدمت؟"

"ہاں بابا! کچھ دیر میں میرا ایک بندہ آئے گا لاکر کی چابی لے کر، اسے لاکر کھولنے دینا۔"

ریحان مرزا ہچکچایا۔ "سائیں آج ذرا مشکل ہے۔"

"تو اس مشکل کو آسان بناؤ۔" خدا بخش نے رکھائی سے کہا۔

"سائیں سمجھا کریں، آج باہر سے آئے ہوئے بینک افسران برانچ کا دورہ کریں گے اور ایسے وقت میں کوئی معاملہ غلط ہوا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"تو بابا میں کیا کروں..... مجھے اس وقت ضرورت ہے ورنہ مجھے نقصان ہوگا اور اگر نقصان ہوا تو اس کا ذمے دار کون ہوگا؟"

خنک موسم میں ریحان مرزا کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ خدا بخش کیا تھا اور وہ بینک کے بڑے گاہکوں میں سے ایک تھا۔ اگر اس کا اکاؤنٹ بینک سے نکل جاتا تو وہ سچ مچ مشکل میں پڑ جاتا۔ بینک کے فارن افسران کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، اس نے گہری سانس لی اور خدا بخش سے کہا۔ "ٹھیک ہے سائیں..... آپ اپنے آدمی کو فوراً روانہ کر دیں۔ وہ بیس منٹ میں یہاں پہنچ جائے۔"

"میں بھیج رہا ہوں۔" خدا بخش نے کہا تو کال منقطع کر دی گئی۔ ریحان مرزا کو شک نہیں ہوا تھا کیونکہ کال اس کے موبائل پر آئی تھی اور یہ نمبر بہت کم لوگ جانتے تھے۔ دوسرے وہ خدا بخش کی آواز پہچانتا تھا۔ دوسری طرف فون کال کاٹ کر جمال خان نے خدا بخش سے کہا۔

"اب تم انتظار کرو، میں لاکر سے تمہاری دولت نکال کر لاتا ہوں اور اس کے بعد تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

خدا بخش اس کی بات پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا۔ انٹر کام خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس جو سیٹ تھا، اس سے کسی کا نمبر نہیں ملایا جا سکتا تھا۔ وہ کسی کو کال کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ تابوت کے اندر کی ہوا بھاری ہوتی جا رہی تھی اور اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ایک گھنٹے سے پہلے مر جائے گا۔ موت کا سوچ کر وہ کانپنے لگا۔ اغوا کرنے والے کو گئے ہوئے شاید پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ اچانک اس کے مدفن کے اوپر ایک دھماکا سا ہوا اور تابوت کا اوپری تختہ مزید نیچے دب گیا۔ ایسا لگا جیسے تختے ٹوٹ کر اس پر گریں گے اور وہ ان کے نیچے دب کر مر جائے گا۔ مارے خوف کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

حمید لاشاری کو لے کر جاتے ہوئے شہریار کو اچانک خیال آیا اور اس نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ وہ خدا بخش اور اغوا کرنے والے دونوں کے نمبر ملا کر دیکھتا رہے۔ ممکن ہے ان سے رابطہ ہو جائے۔ حمید لاشاری اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ شہریار نے پوچھا۔ "نذیر لاشاری اور اس کی بیوی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

حمید لاشاری نے عاجزی سے کہا۔ "سرکار..... میں غریب آدمی ہوں۔ بڑے لوگوں کے خلاف زبان کیسے کھول سکتا ہوں؟"

"تم فکر مت کرو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ میں چاہتا تو تمہیں گرفتار کر کے بھی لے جا سکتا تھا لیکن میں نے تمہیں صرف ساتھ لیا ہے۔"

"آپ کو میرے بارے میں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں کام کر رہا ہوں؟" حمید لاشاری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"تمہارے گھر سے۔" شہریار نے جواب دیا پھر اسے خیال آیا اور اس نے رحیم قادر کو کال کی۔ "حمید لاشاری



مل گیا ہے۔ اس کے گھر سے اپنا آدمی واپس بلا لو۔" کال ختم کر کے اس نے حمید لاشاری سے کہا۔ "تمہاری بیوی اور بیٹی کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں ہوا ہے اور وہ ٹھیک ہیں۔ میرے آدمی نے تمہارے خراب موبائل سے سم نکال کر اس سے فون نمبر حاصل کر کے تمہارا سراغ لگایا ہے۔"

حمید لاشاری کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "سرکار! میرا رشتے دار نذیر لاشاری اور اس کی بیوی وڈیرا خدا بخش کے ظلم کا شکار ہوئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے اور اس کے بچے کہاں ہیں۔ دس سال پہلے کسی نے مجھے خط لکھ کر بتایا کہ نذیر لاشاری کے لڑکے اس کے پاس ہیں۔ میں گیا اور ان بچوں کو لے آیا۔ اس وقت سب سے بڑا لڑکا تیرہ سال کا تھا اور سب سے چھوٹا نو سال کا۔ میں نے اور میری بیوی نے ان کو پالا۔ دو سال پہلے میں نے ان کو الگ کر دیا کیونکہ اب میری بچی بھی بڑی ہو رہی تھی۔"

"تم ان کے گھر کا پتا جانتے ہو؟"

"مجھے یہ تو معلوم ہے کہ وہ چاکیواڑہ میں رہتے ہیں لیکن ان کا گھر نہیں دیکھا ہے، وہ مجھ سے خود ملنے آتے ہیں۔ میں کبھی ان سے ملنے نہیں گیا۔" حمید لاشاری نے جواب دیا۔

"ان لڑکوں نے اپنے ماں باپ کے بارے میں کیا بتایا؟"

حمید لاشاری جواب دیتے ہوئے ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ "انہوں نے بتایا کہ نذیر لاشاری اور اس کی بیوی کو وڈیرے خدا بخش کے آدمیوں نے ان کے سامنے زمین میں زندہ دفن کر دیا تھا۔"

"لڑکوں کو ماں باپ کی اس طرح موت کا دکھ تو ہو گا؟"

"بہت سائیں..... وہ روتے رہتے تھے، اپنی بہن کو یاد کرتے تھے۔"

"انہوں نے کبھی خدا بخش سے انتقام لینے کی بات کی؟"

حمید لاشاری نے حیرت سے شہریار کو دیکھا۔ "سرکار..... وہ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں؟ خدا بخش وڈیرا ہے، وہ اس کے پاس بھی نہیں جا سکتے۔"

لیکن شہریار کا خیال کچھ اور تھا۔ وہ پولیس افسر تھا اور اس نے اپنی ملازمت میں بے شمار ایسے کیسز دیکھے تھے جب کمزور سمجھے جانے والے افراد نے بہت طاقت ور اور ناقابلِ شکست نظر آنے والے فرعونوں سے انتقام لیا۔ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا ان کو نقصان پہنچایا۔ حمید ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں زمین میں کھدائی کی جا رہی تھی اور وہاں کسی بڑی عمارت کی بنیاد پر کام جاری تھا۔ نذیر لاشاری کے تینوں بیٹے وہاں کام کرتے تھے لیکن جب ان کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ دو دن سے کام پر نہیں آ رہے۔ سائٹ سپر وائزر نے بتایا کہ وہ تینوں مزدور ہیں اور اس کے ساتھ ہی کام کر رہے تھے لیکن دو دن سے وہ بتائے بغیر چھٹی پر ہیں۔ شہریار نے سپر وائزر سے پوچھا۔

"ان کا پتا ہے؟"

"جی سر..... لیکن وہ منشی کی کتاب میں ہے اور منشی ابھی آیا نہیں ہے۔"

شہریار منشی کی آمد کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے... سپر وائزر سے وہاں کام کرنے والے تمام مزدوروں کو بلوا لیا۔ اس نے مزدوروں سے پوچھا کہ ان میں سے کسی کو امیر، کبیر اور اشرف کے گھر کا پتا معلوم ہے؟

ایک مزدور سامنے آیا۔ "مجھے معلوم ہے سائیں۔"

اس دوران میں رحیم قادر اپنی پارٹی کے ہمراہ آ گیا تھا۔ شہریار نے اسے طلب کیا اور مزدور کو اس کے ساتھ کرتے ہوئے حکم دیا۔ "اسے لے کر جاؤ۔ اس نے نذیر لاشاری کے لڑکوں کا گھر دیکھا ہے۔ انہیں لے آؤ، اگر مزاحمت کریں تو گرفتار کر لینا اور پوری طرح ہوشیار رہنا۔"

"یس سر۔" رحیم قادر نے مستعدی سے کہا اور مزدور کو لے کر روانہ ہو گیا۔ شہریار میدان میں کھڑا تھا اور وہ پُرخیال نظروں سے میدان کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں جگہ جگہ زمین کھدی ہوئی تھی اور یہ جگہ بغیر کسی شک کے کسی کو دفن کرنے کے لیے نہایت موزوں تھی۔ کوئی ایک ہزار گز جگہ میں کم سے کم دو سو مقامات پر کھدائی کی گئی تھی اور اکثر گڑھے بعد میں مٹی سے بھر دیے گئے تھے۔ اس وقت بھی وہاں کھدائی اور بھرائی کا کام جاری تھا اور کم سے کم پچاس مزدور لگے ہوئے تھے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی کی طرف سے وہ کانسٹیبل دوڑا آیا جسے اس نے خدا بخش اور اغوا کرنے والے کے نمبر چیک کرنے پر مامور کیا تھا۔ اس نے دور سے کہا۔ "سر! ایک نمبر پر کال جا رہی ہے۔"

شہریار جھپٹ کر آگے آیا اور اس نے نمبر دیکھا۔ یہ خدا بخش کا نمبر تھا اور اس پر کال جا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کال کاٹ کر خدا بخش کا نمبر اپنے موبائل سے ملایا۔ بیل جانے لگی۔ کچھ دیر بعد خدا بخش نے کال ریسیو کی اور چیخ کر



www.digestpk.com

Asifzamil

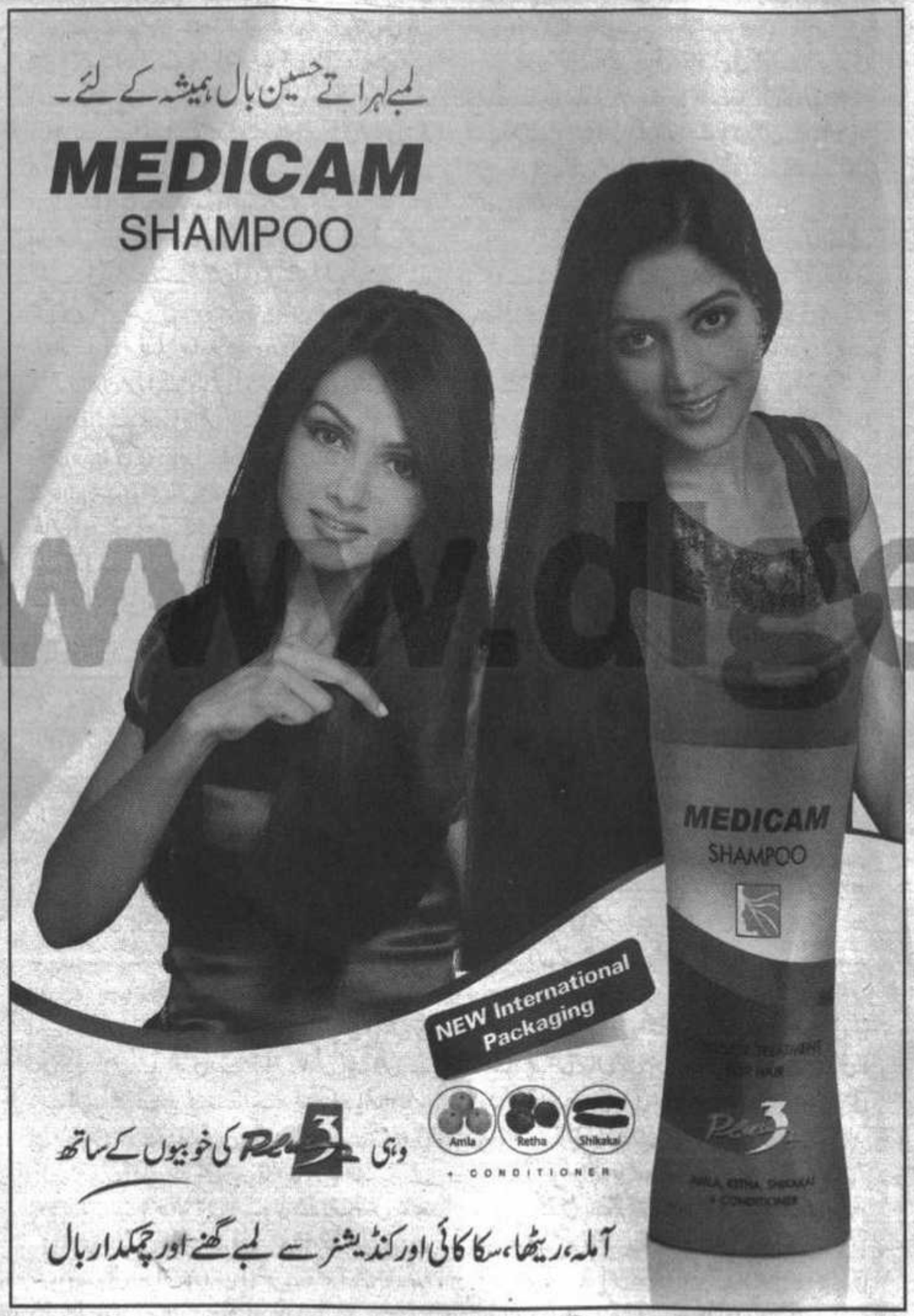




بولا۔ ''بابا میرے کو یہاں سے نکالو۔ میں مرنے والا ہوں، ادھر مٹی بھر رہی ہے۔''

شہریار پریشان ہوگیا۔ اس کی نظر ایک جگہ مٹی گراتے مزدوروں کی طرف گئی۔ وہ ایک گڑھے کو بھر رہے تھے۔ شہریار نے سپر وائزر سے کہا۔ ''ان لوگوں کو روکو..... جلدی۔''

☆☆☆

جمال خان لاشاری اپنی شان دار کار سے اترا اور بریف کیس ہاتھ میں لیے پُراعتماد قدموں سے بینک کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے نفیس تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور بال سلیقے سے پیچھے کی طرف کر کے بنے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر قیمتی سن گلاسز تھے۔ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر گارڈ نے احترام سے اس کے لیے گلاس ڈور کھول دیا اور وہ بے نیازی سے ان کی طرف دیکھے بغیر بینک میں داخل ہوا۔ چھوٹے سے ہال میں داخل ہو کر اس نے ایک نظر بینک کا جائزہ لیا جیسے منیجر کا کیبن تلاش کر رہا ہو حالانکہ اسے معلوم تھا کہ کیبن کہاں ہے۔ پھر اس نے کیبن دیکھا اور اس کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ ایک نوجوان نے اسے راستے میں روکا۔ اس نے بینک کا کارڈ گلے میں پہن رکھا تھا۔

''سر! مے آئی ہیلپ یو؟''

''مجھے منیجر سے ملنا ہے۔'' جمال خان نے آہستہ سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس بار نوجوان نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جمال خان نے منیجر کے کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہوگیا۔ اس نے منیجر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے خدا بخش صاحب نے بھیجا ہے۔''

ریحان مرزا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ غیر ملکی بینک افسران کی آمد کسی وقت بھی متوقع ہے۔ اس نے گرم جوشی سے جمال خان کا ہاتھ تھام لیا اور خود بھی کھڑا ہوگیا۔ ''میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا..... آیئے میرے ساتھ۔''

وہ جمال خان کو اپنے ساتھ لاکر روم کی طرف لایا۔ یہ بینک کے سیف روم کے ساتھ ہی تھا اور اتنے ہی مضبوط فولادی دروازے کے پیچھے تھا۔ دن کے وقت لاکر روم کا دروازہ کھول دیا جاتا تھا اور شام کو جیسے ہی بینک کے اوقات ختم ہوتے تھے، یہ دروازہ لاک کر دیا جاتا تھا اور پھر یہ اگلی صبح نو بجے سے پہلے نہیں کھل سکتا تھا کیونکہ اس پر ٹائم لاک بھی لگ جاتا تھا۔ اگر اسے قانونی طریقے سے کھولنا ہو تو اس کے لیے بینک کے تین اعلیٰ افسران کو آنا پڑتا تھا۔ ریحان مرزا جمال خان کو لاکر روم میں لایا اور اس نے جمال خان سے اس کی شناخت طلب کی۔ جمال خان کی بھویں تن گئیں۔

''کیسی شناخت مسٹر منیجر؟''

''مجھے اپنے اطمینان کے لیے آپ کی ذاتی شناخت دیکھنی ہے۔ آئی ڈی کارڈ تو ہوگا آپ کے پاس؟''

جمال خان نے سر ہلایا اور پرس سے آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ ریحان مرزا نے غور سے آئی ڈی کارڈ دیکھا اور مطمئن ہو کر اپنے پاس موجود لاکر کی چابیوں کا گچھا نکالا اور اس میں سے خدا بخش کے لاکر کی چابی نکال کر اسے لاکر میں لگایا اور تالا کھول دیا۔ پھر اس نے جمال خان کی طرف دیکھا۔ ''میں پانچ منٹ کے لیے باہر جا رہا ہوں، اس دوران میں آپ اپنا کام کر لیں۔''

جمال خان سکون سے کھڑا رہا لیکن جیسے ہی ریحان مرزا لاکر روم کے دروازے سے باہر گیا، وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے خدا بخش کے پرس سے حاصل ہونے والی لاکر کی چابی نکالی اور لاکر کے دوسرے تالے میں داخل کر کے اسے کھول دیا۔ لاکر کھلتے ہی سامنے رکھی مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں۔ اس نے بریف کیس کھولا اور انہیں اس میں منتقل کرنے لگا۔ گڈیاں بہت زیادہ تھیں، انہیں منتقل کرنے میں کچھ وقت لگا اور پانچ منٹ گزرتے ہی دروازے پر ریحان مرزا کی صورت دکھائی دی۔ لاکر اور بریف کیس آڑ میں تھا اس لیے ریحان مرزا نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ لاکر سے کیا نکال کر بریف کیس میں رکھ رہا ہے۔ جمال خان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''پلیز لیو می الون فور تھری منٹس۔''

ریحان مرزا واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جمال خان نے باقی ماندہ گڈیاں منتقل کیں اور پھر سونے کی اینٹیں بریف کیس میں منتقل کرنے لگا۔ بیس اینٹوں کو منتقل کر کے جمال خان نے لاکر میں دیکھا تو اسے ایک چھوٹا سا لفافہ بھی دکھائی دیا۔ اس نے وہ لفافہ نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور بریف کیس بند کر دیا۔ اسی لمحے ریحان مرزا لاکر روم میں داخل ہوا اور اس بار وہ رکا نہیں، اس نے آتے ہی کہا۔ ''پلیز! لاکر بند کر دیں، وقت نہیں ہے۔''

جمال خان نے لاکر بند کر کے چابی گھمائی اور لاک کر دیا۔ ریحان مرزا نے اپنی چابی سے دوسرا لاک بھی بند کر دیا اور جمال خان کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے



www.digestpk.com

Asifzamil

لاکر روم سے نکل گیا۔ جمال خان اس کے ساتھ باہر آیا لیکن اس نے ریحان مرزا کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کا شکریہ ادا کر کے باہر کی طرف چل پڑا۔ ریحان مرزا اسے روکنا چاہتا تھا لیکن اسی لمحے اس کی نظر بینک کے دروازے سے اندر آتے غیر ملکی افسران پر پڑی تو اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ جمال خان نے محسوس کر لیا تھا کہ منیجر اسے روکنا چاہتا ہے، شاید وہ اس سے کسی کاغذ پر دستخط کراتا اور جمال خان کسی صورت ایسا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب تک خطرے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی لیکن خطرہ سامنے آنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ وہ غیر محسوس لیکن تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دروازے کے پاس پہنچا تھا کہ ریحان مرزا کے موبائل کی بیل بجی اور اسی لمحے جمال خان دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا سگنل دینے لگی تھی۔ باہر آتے ہی وہ تیزی سے کار کی طرف بڑھا اور جب وہ اس میں بیٹھ رہا تھا تو اس نے ریحان مرزا کو گلاس ڈور سے باہر آتے دیکھا۔ وہ گارڈ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک گارڈ نے جمال خان کی کار کی طرف اشارہ کیا اور اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دیا۔ اس نے ایک گارڈ کو اپنی شاٹ گن کار کی طرف کرتے دیکھا تھا۔ اس نے ایکسلریٹر دبایا۔ فائر ہوا لیکن گولی کار کو چھو بھی نہیں سکی تھی۔ اس سے پہلے کہ دوسرا فائر ہوتا، کار ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو چکی تھی۔ جمال خان ہر ممکن تیز رفتاری سے کار چلا رہا تھا۔

☆☆☆

خدا بخش کا خوف سے بُرا حال تھا۔ اوپر سے آنے والے بوجھ کی وجہ سے تابوت کی لکڑی دب رہی تھی اور اس کے تختے یوں چرچرا رہے تھے جیسے ابھی ٹوٹ کر اندر گھس جائیں گے۔ تختے دبے تو اس میں موجود رخنے پھیل گئے اور ان سے ریت اندر آنے لگی۔ وہ چیخ رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسے ذرا دیر سے احساس ہوا کہ اس کے موبائل کی بیل بج رہی ہے۔ اس نے جلدی سے موبائل تلاش کیا۔ اس نے جیب میں رکھنے کے بجائے اسے ایک طرف رکھ دیا تھا اور ذرا سی دیر میں تابوت کے فرش پر اچھی خاصی ریت جمع ہو گئی تھی۔ موبائل اسی ریت میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ بہ مشکل موبائل اس کے ہاتھ آیا لیکن جب اس نے اٹھایا تو بیل بند ہو گئی۔ اس نے مس کال چیک کی، یہ اجنبی نمبر تھا لیکن اسی لمحے بیل دوبارہ بجی اور اس بار ایس پی شہریار کا نمبر آنے لگا۔ خدا بخش نے جلدی سے کال ریسیو کی اور چلایا۔

"بابا میرے کو یہاں سے نکالو۔ میں مرنے والا ہوں، ادھر مٹی بھر رہی ہے۔"

خدا بخش نے شہریار کی آواز سن لی کیونکہ وہ کسی کو مٹی ڈالنے سے روکنے کا حکم دے رہا تھا۔ خدا بخش کا دل دھڑکا، اسے لگا جیسے پولیس اس کے مدفن کے پاس کہیں ہے۔ شہریار اس سے بات نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ اسے پکارنے لگا۔

"اوہ بابا ایس پی میری بات سنو۔"

"ایک منٹ جناب۔" شہریار نے اس سے کہا اور پھر کسی سے بات کرنے لگا۔ اس دوران میں خدا بخش کو اوپر سے آتی خوفناک آوازوں میں کمی محسوس ہوئی جیسے مٹی بھرنے کا عمل رک رہا ہو اور پھر آوازیں رک گئیں۔ ساتھ ہی تابوت کے تختے بھی ساکت ہو گئے۔ اب وہ پہلے کی طرح نہیں چرچرا رہے تھے۔ شہریار نے دوبارہ موبائل پر کہا۔ "خدا بخش صاحب! آپ میری آواز سن رہے ہیں؟"

"ہاں بابا ایس پی سن رہا ہوں۔"

"کیا اب مٹی گر رہی ہے؟"

خدا بخش نے محسوس کیا کہ مٹی بتدریج گر رہی تھی۔

"ہاں مٹی گر رہی ہے لیکن اوپر سے آنے والی آوازیں رک گئی ہیں۔ پہلے ایسا لگ رہا تھا اور مٹی ڈالی جا رہی ہے۔"

شہریار پُرجوش ہو گیا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اس جگہ تک پہنچ گئے ہیں جہاں آپ کو دفن کیا گیا ہے۔ آپ کچھ دیر انتظار کریں، آپ کو باہر نکالنے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

یہ سن کر خدا بخش پُرامید ہو گیا۔ "کرو لیکن جلدی کرو، ایسا نہ ہو اتنی دیر میں یہاں ہوا ختم ہو جائے اور پھر میری لاش نکالو۔"

شہریار اس گڑھے کے پاس پہنچ گیا جس میں مزدور کچھ دیر پہلے مٹی بھر رہے تھے۔ اس نے سپروائزر سے پوچھا۔ "اس گڑھے کو کیوں کھودا گیا تھا اور اب کیوں بند کر رہے ہو؟"

"جناب! یہ سول انجینئر نے کھدوایا تھا تاکہ مٹی کی حالت دیکھ سکیں، یہاں بیس منزل اونچی عمارت بنے گی۔ مٹی کا نمونہ لینا تھا کہ وہ اتنی اونچی اور وزنی عمارت کا بوجھ سہار سکتی ہے۔ نمونہ لے لیا گیا ہے اس لیے گڑھا بھر رہے ہیں۔"

"کتنا گہرا گڑھا کھودا تھا؟"

"مجھے صحیح سے تو نہیں معلوم لیکن کم سے کم دس فٹ تو کھودا ہو گا۔" سپروائزر نے جواب دیا۔

شہریار نے پاس موجود دوسرے گڑھوں کا معائنہ کیا لیکن ان کی گہرائی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے۔۔



سپروائزر سے اس بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا۔ "جناب! ان گڑھوں پر وہ تینوں بھائی کام کر رہے تھے جن کو آپ نے بلوایا ہے۔ پرسوں وہ کام کر کے گئے اور ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔"

شہریار نے محسوس کیا کہ وہ درست سمت میں جا رہا ہے۔ خدا بخش کو یقیناً یہیں کہیں دفن کیا گیا ہے۔ اس نے سپروائزر کو حکم دیا۔ "اس گڑھے سے احتیاط سے مٹی نکالو، اس میں ممکنہ طور پر ایک آدمی کو تابوت میں ڈال کر زندہ دفن کیا گیا ہے، وہ ابھی زندہ ہے۔"

یہ سن کر کہ یہاں ایک زندہ آدمی دفن ہے، سپروائزر کی ہوائیاں اڑ گئیں اور مزدور خوف زدہ نظر آنے لگے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" شہریار نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب وقت ضائع کیے بغیر اس گڑھے سے مٹی نکالنا شروع کر دو۔"

سپروائزر اپنے مزدوروں کے ساتھ کام میں لگ گیا اور شہریار ذرا پیچھے آیا کیونکہ کام کی جگہ شور بہت تھا۔ اس نے خدا بخش سے پوچھا۔ "آپ کو اب کوئی شور سنائی دے رہا ہے؟"

"نہیں، اب سناٹا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

شہریار کے خیال میں وہ زمین میں بہت گہرائی میں دفن تھا۔ "جب موبائل کام نہیں کر رہا تھا تو اغوا کرنے والے نے آپ سے رابطہ کیسے کیا؟"

"اس نے یہاں ایک تار والا فون بھی رکھا ہے لیکن اس پر کال صرف آ سکتی ہے، بندہ کال کر نہیں سکتا۔"

شہریار چونکا وہ تیزی سے گڑھے والی جگہ آیا لیکن وہاں کسی قسم کا کوئی تار نظر نہیں آ رہا تھا مگر جو لوگ ایک آدمی کو زمین میں اس طرح زندہ دفن کر سکتے تھے، وہ یقیناً اتنے اہل تھے کہ کہیں سے فون کی تار زیرِ زمین دبا کر یہاں تک لا سکیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ زمین میں کئی سو گز تک تار دبا کر لائی جا سکتی تھی۔ اس پلاٹ کے دائیں بائیں اور عقب میں بڑی عمارات تھیں اور یہ سب کاروباری دفاتر اور دکانوں والی عمارات تھیں۔ فون وائر کہیں سے بھی دبا کر یہاں تک لائی جا سکتی تھی۔ یہ گڑھا عقب والی عمارت سے صرف بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ شہریار نے سپروائزر کو حکم دیا کہ وہ اس پلاٹ کے آس پاس کی عمارتوں کی دیواروں کے ساتھ زمین میں فون وائر تلاش کرے۔ سپروائزر اس کے حکم کی فوری۔۔۔ تعمیل کر رہا تھا۔ اس نے فوراً چند افراد اس کام پر لگا دیے۔

جس وقت شہریار اس کام میں مصروف تھا، موبائل پر خدا بخش اسے مسلسل پکار رہا تھا۔ سپروائزر کو حکم دے کر اس نے موبائل کان سے لگایا۔ خدا بخش کہہ رہا تھا۔

"بابا میری بات تو سنو۔"

"سن رہا ہوں سائیں۔" شہریار نے کہا تو خدا بخش جھنجلا گیا۔

"خاک سن رہے ہو، میں تمہیں اتنی دیر سے پکار رہا ہوں۔"

"مجھے لگ رہا ہے میں اس جگہ تک پہنچ گیا ہوں جہاں آپ کو دفن کیا گیا ہے۔" شہریار نے رسانیت سے کہا۔ "میں مزدوروں کو کھدائی کی ہدایت دے رہا تھا اور فون کی تار تلاش کروا رہا ہوں۔"

جب اوپر سے شور اور مٹی کا بوجھ آنا شروع ہوا تو خدا بخش کو صرف خدا یاد رہ گیا تھا اور موت کے خوف نے اسے ہر چیز بھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر جب شور تھم گیا اور تابوت کے تختے بھی چرچرانا بند ہو گئے تو اسے اپنا بینک لاکر یاد آ گیا۔ اسے اغوا کرنے والا بینک لاکر سے اس کی دولت حاصل کرنے گیا تھا۔ جب اسے لاکر کا خیال آیا تو وہ ایس پی سے

Monthly Digest
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
مکتبہ اعلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications



www.digestpk.com

Asifzamil

بات کرنے کے لیے بے تاب ہو گیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ یہ چند منٹ شہریار مزدوروں اور سپروائزر کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ خدا بخش نے کہا۔

''اغوا کرنے والے نے مجھ سے میرے بینک لاکر میں رکھی چیزوں کا مطالبہ کیا ہے۔ اس نے چابی پہلے ہی حاصل کر لی تھی اور مجھ سے بینک منیجر کو کال بھی کروائی ہے۔ وہ بینک کی طرف گیا ہے۔''

''آپ کا لاکر کس بینک میں ہے؟'' شہریار نے جلدی سے پوچھا۔

خدا بخش نے بینک کا نام بتایا تو شہریار نے فوری طور پر اپنے ساتھ آنے والی پارٹی کو بینک کی طرف روانہ کر دیا۔ پھر اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''آپ کے پاس بینک منیجر کا نمبر ہے تو اسے کال کر کے لاکر کھولنے کی اجازت منسوخ کر دیں۔''

خدا بخش کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ وہ اتنی بُری طرح بدحواس ہو رہا تھا کہ یہ معمولی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے جلدی سے شہریار کو لائن پر رکھتے ہوئے ریحان مرزا کا موبائل نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ''ریحان مرزا! بابا میں خدا بخش بات کر رہا ہوں۔ اس شخص کو لاکر کھولنے مت دینا۔''

''جسے آپ نے بھیجا تھا؟'' ریحان مرزا چونک گیا۔

''ہاں، اسے لاکر کے پاس بھی مت جانے دینا۔ اس نے مجھے اغوا کر کے زبردستی مجھ سے یہ کال کرائی تھی۔''

''میرے خدا۔'' ریحان مرزا بولا۔ ''وہ لاکر کھول کر جا رہا ہے، ایک منٹ.....'' ریحان مرزا ہولڈ پر چلا گیا لیکن پس منظر میں اس کے چلّانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ گارڈز سے اسے روکنے کو کہہ رہا تھا۔ خدا بخش نے شہریار کو کانفرنس کال میں لے لیا تھا۔ وہ بھی سن رہا تھا، اس نے پوچھا۔

''کیا وہ اپنا کام کر کے جا چکا ہے؟''

خدا بخش کے لیے سانس لینا تو محال ہو رہا تھا، ساتھ ہی اب اس کا دل بھی ڈوب رہا تھا۔ اگر اغوا کرنے والا لاکر کھول کر جا چکا تھا تو اس کا مطلب تھا اس کے ہاتھ سے سب نکل گیا تھا اور اب اس کی جان بھی خطرے میں تھی۔ اس نے مُردار لہجے میں کہا۔ ''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔''

اسی اثنا میں فائر کی آواز آئی اور پھر ریحان مرزا نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔ ''وہ فرار ہو گیا۔''

''کس طرف گیا ہے؟'' شہریار نے پوچھا اور اپنا تعارف کرایا۔

''وہ ٹاور سے مخالف سمت میں گیا ہے، ٹریفک کی وجہ سے میرے گارڈز فائرنگ نہیں کر سکے ورنہ وہ اتنی آسانی سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔''

خدا بخش جذباتی ہو رہا تھا۔ ''بابا میرا بہت نقصان ہوا ہے۔ یہ سب بینک کو بھرنا پڑے گا۔''

ریحان مرزا کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ''سائیں! آپ کے نقصان کا تو نہیں پتا لیکن میرا جو نقصان ہوا ہے، وہ کوئی پورا نہیں کر سکے گا۔''

ریحان مرزا نے کال منقطع کر دی۔ خدا بخش اب پریشان تھا، اس نے شہریار سے کہا۔ ''اسے پکڑو بابا ورنہ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''اگر آپ چند منٹ پہلے اس کے بارے میں بتا دیتے تو وہ اب تک پولیس کی گرفت میں ہوتا اور آپ کے بارے میں بتا رہا ہوتا۔''

خدا بخش بولا۔ ''تم کہہ رہے تھے مجھے تلاش کر لیا ہے؟''

''جی سائیں، میں ایک ایسی جگہ ہوں جہاں کسی عمارت کی تعمیر کے لیے کھدائی جاری ہے۔ موبائل سگنل اسی علاقے سے آ رہے ہیں اور یہ آئی آئی چندریگر روڈ ہے۔''

''بابا وہ بینک بھی تو یہیں ہے۔'' خدا بخش بولا۔ ''تبھی وہ ذلیل اتنی جلدی بینک پہنچ کر سب نکال لے گیا۔''

''بینک یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' شہریار نے کہا۔ وہ گڑھے سے ذرا دور تھا۔ دو مزدور اس میں اتر کر مٹی باہر پھینک رہے تھے۔ ''ویسے لاکر میں کیا تھا؟''

''لاکر میں لوگ کیا رکھتے ہیں.... کرنسی تھی اور سونا تھا۔'' خدا بخش جھنجلا کر بولا۔ ''یہ لوگ مجھے کب نکالیں گے یہاں سے؟''

''مزدور کھدائی کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو کھدائی کی آواز آ رہی ہے؟''

''نہیں، یہاں اب سناٹا ہے۔''

شہریار پریشان ہو گیا۔ یہاں خاصا شور ہو رہا تھا اور خدا بخش کہہ رہا تھا کہ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ کیا مزدور غلط جگہ کھدائی کر رہے تھے؟ اس نے سپروائزر کو بلایا۔

''اس گڑھے کے علاوہ وہ تینوں لڑکے اور کس جگہ کام کر رہے تھے؟''

''جناب، وہ اسی جگہ کام کر رہے تھے۔ یہاں کھودے جانے والے تمام گڑھے انہوں نے اور ان کے ساتھ دوسرے لوگوں نے کھودے ہیں۔''



شہریار سوچ میں پڑ گیا۔ یہاں درجنوں کے حساب سے گڑھے تھے اور ان سب کو چیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے سپروائزر سے کہا۔ ''اس گڑھے کے آس پاس کے گڑھوں میں بھی کھدائی شروع کراؤ۔''

سپروائزر کی ہدایت پر آس پاس کے چھ سات گڑھوں میں دو دو مزدور اپنے اوزار سنبھالتے ہوئے اتر گئے اور مٹی نکالنے لگے۔ شہریار نے خدا بخش سے پوچھا۔ ''آپ کو اب کوئی آواز آ رہی ہے؟''

''نہیں بابا، یہاں بالکل سناٹا ہے۔'' خدا بخش سہم گیا۔ ''تم لوگ مجھے کسی غلط جگہ تلاش کر رہے ہو۔''

شہریار بھی یہی سوچ رہا تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ خدا بخش زمین میں اتنی گہرائی میں دفن تھا کہ اس تک آواز نہیں جا رہی تھی۔ لیکن اس صورت میں وہ زندہ کیسے رہتا؟ شہریار نے پہلی بار محسوس کیا کہ مجرم اس کی توقع سے زیادہ چالاک ہے۔ بہ ظاہر وہ ان کو راستہ دے رہا تھا لیکن ساتھ ہی بھٹکا بھی رہا تھا۔ اسی اثنا میں رحیم قادر وہاں آ گیا۔ اس نے سیلیوٹ کر کے شہریار سے کہا۔ ''سر! میں نذیر لاشاری کے لڑکوں کو لے آیا ہوں۔ وہ پولیس موبائل میں ہیں۔''

شہریار نے پلٹ کر موبائل کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

جمال خان ڈرائیونگ کے دوران عقبی آئینے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کوئی پولیس موبائل یا کوئی اور اس کے تعاقب میں آنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن ابھی تک اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر اس نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر گھما دی۔ آس پاس کی ساری سڑکیں ون وے تھیں ان پر صرف چکر لگا کر ہی دوبارہ آیا جا سکتا تھا۔ لیکن اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا، اسے اسی طرف جانا تھا۔ وہ عمارت کچھ دور تھی جہاں مشالِ قید تھی۔ چند منٹ بعد گاڑی اس نے عمارت کے ساتھ والی گلی میں روک دی۔ یہاں سے اسے کوئی آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بریف کیس لے کر کار سے اترا اور عمارت کی گندی اور ویران سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں سے پہلے اسے چند چرسی موالی بیٹھے نظر آئے، وہ نشہ کر رہے تھے۔ وہ ان کے بالکل پاس جا کر گرجا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟''

وہ اچھل پڑے اور اسے دیکھ کر مرعوب ہو گئے۔ ایک نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''جناب! کچھ نہیں، ایسے ہی بیٹھے تھے۔''

''بکواس کرتے ہو، میری پراپرٹی میں بیٹھ کر نشہ کرتے ہو اور اس جگہ کو بدنام کر رہے ہو۔'' اس نے پستول نکال لیا۔ ''گولی مار دوں گا۔''

پستول دیکھتے ہی وہ سب خوف زدہ انداز میں وہاں سے بھاگے۔ انہیں مزید ڈرانے کے لیے جمال خان نے ایک فائر بھی کیا۔ لیکن گولی کسی کو نہیں لگی۔ جمال خان کو اطمینان تھا کہ پستول چھوٹا ہے، فائر کی آواز عمارت سے باہر بھی نہیں گئی ہو گی۔ جب وہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے تو جمال خان اس دفتر کی طرف بڑھا جس کے ایک کمرے میں مشال قید تھی۔ وہ اندر آیا تو مشال شاید تھک ہار کر سو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہاں سے عمارت کے عقب میں واقع ایک ویران چار دیواری نظر آ رہی تھی جس میں کسی تعمیراتی کمپنی کی مشینری موجود تھی۔ ایک بلڈوزر کے عین سامنے ایک تازہ کھدا ہوا گڑھا موجود تھا۔ جمال خان کچھ دیر اس گڑھے کی طرف دیکھتا رہا پھر وہاں سے نکل آیا۔ اس کا رخ اسی عمارت کے ایک اور خالی دفتر کی طرف تھا۔ وہ اندر آیا اور وہاں موجود ایک جدید فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

☆☆☆

شہریار ان تینوں کو دیکھ کر چونکا۔ امیر، کبیر اور اشرف تینوں عام سے مزدور نظر آ رہے تھے اور ان کا حلیہ، صورت اور آنکھوں سے جھانکتی مایوسی بتا رہی تھی کہ وہ اتنے بڑے کام کے اہل نہیں تھے۔ شہریار کے اشارے پر وہ آگے آئے۔

''تم تینوں نذیر لاشاری کے بیٹے ہو؟''

''جی سائیں، میرا نام امیر ہے۔'' امیر نے کہا اور بھائیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کبیر ہے اور یہ اشرف ہے سائیں۔''

''تم تینوں یہاں کام کرتے ہو؟''

''جی سائیں، ہم یہاں کام کرتے ہیں۔'' اس بار بھی امیر نے جواب دیا۔

''تم تینوں دو دن سے کام پر کیوں نہیں آ رہے تھے؟''

امیر نے بھائیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہوں نے پرسوں رات باہر سے کچھ کھایا تھا، اس سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس وجہ سے ہم کام پر نہیں آئے۔ ابھی بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

شہریار نے محسوس کیا کہ کبیر اور اشرف کے چہرے



www.digestpk.com

Asifzamil

مرجھائے ہوئے تھے جیسے سچ مچ بیمار ہوں۔ اس نے پوچھا۔
"وڈیرے خدا بخش کے بارے میں جانتے ہو؟"

"جی سائیں، وڈیرے نے میری ماں اور باپ کو زمین میں زندہ دفن کروادیا تھا۔ اس سے پہلے میری ماں اور بہن کی عزت خراب کی تھی۔" امیر نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں خدا بخش کے لیے نفرت نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ٹریفک حادثے کا ذکر کررہا ہو جس میں اس کا خاندان مارا گیا ہو اور وہ بس یا ٹرک سے نفرت کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

"تم بھائیوں نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا؟"

"اس وقت ہم بچے تھے سائیں اور بڑے ہوتے تب بھی کیا کرلیتے۔ خدا بخش بہت طاقت ور وڈیرا ہے۔"

شہریار نے گہری سانس لی۔ اسے ان لوگوں سے ہمدردی محسوس ہورہی تھی۔ خدا بخش نے اس پورے خاندان کو برباد کردیا تھا۔ ماں باپ کو مار دیا، عورتوں کو بے آبرو کیا اور لڑکوں کو دربدر کردیا لیکن پولیس نے انہیں انصاف نہیں دلایا۔ اب یہی پولیس وڈیرے خدا بخش کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کررہی تھی۔ رحیم قادر خوف ناک نظروں سے تینوں بھائیوں کو گھور رہا تھا۔ اس نے شہریار سے کہا۔ "انہیں میرے حوالے کریں پھر دیکھیں یہ کس طرح فرفر بولتے ہیں۔"

شہریار کا دل نہیں مان رہا تھا کہ ان مظلوم لوگوں پر مزید ظلم کیا جائے۔ لیکن دوسری طرف خدا بخش کی بازیابی کا سوال بھی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ناکامی کا ملبا اس سمیت کئی افراد پر گرے گا۔ مجبوراً اس نے رحیم قادر کو اجازت دے دی لیکن آہستہ سے کہا۔ "ہاتھ ہلکا رکھنا۔ مجھے یقین ہے یہ بے گناہ ہیں اور اس معاملے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

رحیم قادر ان لوگوں کو لے گیا۔ شہریار کے ذہن میں کوئی بات آرہی تھی لیکن وہ اسے گرفت میں نہیں لاپا رہا تھا۔ سپروائزر کھدائی کے کام کی خود نگرانی کررہا تھا۔ اس وقت تک مزدور گڑھوں کو تقریباً اتنا کھود چکے تھے جتنے گہرے وہ پہلے تھے۔ دوسری طرف جن مزدوروں کو عمارتوں کے ساتھ کی زمین پر کسی فون وائر کی تلاش میں لگایا گیا تھا، وہ بھی ناکام رہے تھے۔ ایک مزدور نے آکر سپروائزر کو بتایا۔ "جناب! ادھر کہیں کوئی فون وائر نہیں ہے۔"

اس کی بات سنتے ہی وہ بات شہریار کی گرفت میں آگئی جو اس کے ذہن سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اے ایس آئی سے رابطہ کیا جسے اس نے بینک کی طرف بھیجا تھا، پولیس پارٹی بینک پہنچ گئی تھی۔ شہریار نے اے ایس آئی سے کہا۔ "میری منیجر سے بات کراؤ۔"

"جناب! وہ اندر بینک افسران کے ساتھ ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔"

یہ ایک بڑا غیر ملکی بینک تھا اور دوسرے غیر ملکیوں کی طرح شاید اس بینک نے بھی خود کو قانون سے ماورا سمجھ لیا تھا اس لیے پولیس کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ شہریار نے برہمی سے کہا۔ "ان کا دماغ درست ہے۔"

"نہیں جناب! میرے جیسے لیول کے افسر کو دیکھ کر ان کا دماغ درست نہیں ہوسکتا۔" اے ایس آئی نے صاف گوئی سے کہا۔ "بہتر ہوگا آپ خود آکر ان کا دماغ درست کریں۔"

شہریار کے خیال میں خدا بخش اس جگہ قید نہیں تھا بلکہ وہ کہیں اور تھا۔ اس لیے اب یہاں رہنا فضول تھا۔ اس نے سپروائزر سے کہا۔ "تم گڑھوں میں کھدائی کا کام جاری رکھو اور جیسے ہی کوئی پروگریس ہو، مجھے اطلاع کرنا۔ میرا موبائل نمبر نوٹ کرلو۔"

سپروائزر کو ہدایت اور نمبر دے کر شہریار بینک کی طرف روانہ ہوگیا۔ ڈکیتی کی اطلاع پاکر وہاں مقامی تھانے کی ٹیم بھی آگئی تھی اور جب انہوں نے ایس پی کو دیکھا تو الرٹ ہوگئے۔ بینک افسران کی میٹنگ ابھی تک جاری تھی۔ کسی پولیس والے کو اندر جانے نہیں دیا گیا تھا لیکن کسی کی پروا کیے بغیر شہریار بنا اجازت لیے میٹنگ روم میں پہنچ گیا جس کا غیر ملکی افسران نے سخت بُرا مانا۔

"مسٹر! یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"آپ لوگ پولیس کے کام میں مداخلت کررہے ہیں۔" شہریار نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ "مجھے مسٹر ریحان مرزا سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"آپ کچھ دیر بعد....."

"اتنی دیر میں مجرم پولیس کی گرفت سے نکل گیا تو اس کے ذمے دار آپ ہوں گے۔" شہریار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مسٹر ریحان مرزا! پلیز میرے ساتھ آیئے۔"

شہریار اسے باہر لابی میں لے آیا۔ ریحان مرزا کچھ ہراساں لگ رہا تھا، شاید اس کی ملازمت پر بن آئی تھی اس لیے پریشان تھا۔ شہریار نے بلا تمہید کہا۔ "مجھے وہ فون نمبر چاہیے جس سے تمہیں کال آئی تھی۔"

ریحان مرزا چونکا اور اس نے اپنا موبائل نکال کر اس



میں وہ نمبر دیکھا جس سے خدا بخش نے اسے کال کی تھی.... اس نے نمبر شہریار کو بتادیا۔ شہریار نے فوری طور پر بینک کے ایک لینڈ لائن فون سے کال آپریٹر کا نمبر ملایا۔ کئی منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد آپریٹر نے کال ریسیو کی۔ "مجھے اس نمبر کا پتا درکار ہے۔" شہریار نے نمبر بتایا تو آپریٹر نے اسے فون کا پتا بتادیا۔ ایک کاغذ پر اسے نوٹ کرکے شہریار باہر آیا۔ اس نے اپنی ٹیم کے افراد کو ساتھ لیا اور بینک کا معاملہ مقامی تھانے کی ٹیم پر چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ راستے میں اس نے جمیل احمد کو کال کرکے مختصر رپورٹ دی اور ہیڈ کوارٹر سے مزید نفری اس پتے پر بھیجنے کو کہا جو کال آپریٹر نے بتایا تھا۔

"خدا بخش کا کیا ہوا؟"

"شاید وہ اسی پتے کے آس پاس کہیں موجود ہے سر۔"

☆☆☆

خدا بخش نے موبائل کی بیٹری چیک کی۔ مسلسل استعمال کی وجہ سے وہ آخری دموں پر تھی۔ شہریار سے بات ہوئے کوئی دس منٹ گزر چکے تھے اور اب تک اسے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس اسے غلط جگہ تلاش کررہی تھی۔ اس کی امید، مایوسی میں بدل رہی تھی۔ اسے یہاں قید کرنے والا کامیاب رہا تھا۔ اس نے نہ صرف اس کے لاکر سے دولت حاصل کرلی تھی بلکہ اسے آزاد بھی نہیں کیا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی تو اس نے بے ساختہ موبائل اٹھایا پھر اسے غلطی کا احساس ہوا۔ بیل فون کی بج رہی تھی، اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اغوا کرنے والا تھا، اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"خدا بخش! تم نے پولیس کو اطلاع دے کر اچھا نہیں کیا۔"

خدا بخش اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ "تت..... تمہیں کیسے پتا چلا بابا؟"

"میں نے تمہارے موبائل پر ایک میسج کیا تھا اور جب اس کی ڈیلیوری رپورٹ ملی تو میں سمجھ گیا کہ تمہارا موبائل پھر سے کام کرنے لگا ہے۔ تم نے یقیناً پولیس کو بتادیا ہوگا کہ میں بینک گیا ہوں لاکر کھولنے؟"

خدا بخش مارے خوف کے کانپنے لگا۔ اس نے گھگیا کر کہا۔ "مجھے معاف کردو مجھ سے غلطی ہوگئی۔"

"اچھا، تم سے بس ایک یہی غلطی ہوئی ہے جس پر تمہیں معاف کیا جائے اور زندگی بخش دی جائے؟" جمال خان نے طنز کیا۔ "نہیں خدا بخش! تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے، اگر میں تمہارے ایک ایک جرم کا بتانا شروع کردوں تو اس تابوت کی آکسیجن ختم ہوجائے گی لیکن جرائم کی فہرست ختم نہیں ہوگی۔"

"تم..... تم مجھے مار دو گے؟" خدا بخش نے چلّا کر کہا۔ "تم وعدہ خلافی کررہے ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" جمال خان نے حقارت سے کہا۔ "تم جانتے ہو وعدے کا پاس کیا ہوتا ہے۔ تم ایک جانور ہو اور جانور ہی رہو گے، تمہیں انسان کہنا انسانوں کی توہین ہے۔ تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو جنگل کے کسی آدم خور درندے کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ اب تمہارے پاس صرف دس منٹ رہ گئے ہیں اور اس کے بعد تم لازمی مرجاؤ گے کیونکہ تابوت پر مٹی کا اتنا دباؤ آجائے گا کہ وہ اسے توڑ کر اندر گھس آئے گی اور وہ سارا خلا مٹی سے بھر جائے گا جس میں تم اس وقت سانس لے رہے ہو۔"

"نہیں..... نہیں۔" خدا بخش کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"تم اب پولیس سے رابطہ کرکے اسے بتا سکتے ہو کہ وہ اس فکس فون کی مدد سے تمہارا سراغ لگالے۔ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن اب خدا حافظ تمہارا۔ اس کے پاس جانے سے پہلے اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو، وہ معاف کرنے والا ہے۔ ممکن ہے تمہارے جیسے گناہ گار کو بھی معاف کردے۔" جمال خان نے کہا اور فون بند کردیا۔

خدا بخش نے بوکھلا کر جلدی سے شہریار کا نمبر ملایا اور اسے کانپتی آواز میں بتانے لگا۔ اس کی بات سن کر شہریار نے کہا۔

"آپ حوصلہ رکھیں، ہم نے اس جگہ کا پتا حاصل کرلیا ہے اور ہم اسی طرف آرہے ہیں۔ یقیناً آپ کو جہاں دفن کیا گیا ہے، وہ جگہ اس فون والے پتے کے آس پاس ہوگی۔"

"اس نے کہا ہے میرے پاس صرف دس منٹ کی مہلت ہے۔"

"ہم پہنچنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں آپ کو تلاش کرلیں گے۔" شہریار نے کہا۔ پتا ایک تجارتی عمارت کا تھا۔ پولیس کار اس کے سامنے روک کر شہریار اور اس کے ساتھی تیزی سے اتر کر اندر کی طرف لپکے۔ پتا دوسری منزل کا تھا اور یہ ایک دفتر تھا۔ لیکن جب وہ اس کے سامنے پہنچے تو پتا چلا کہ دفتر کئی مہینے سے بند ہے۔ شہریار نے اپنے



www.digestpk.com

Asifzamil

پستول سے فائر کر کے دفتر کے دروازے کا لاک توڑ دیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ لیکن دفتر واقعی خالی تھا اور وہاں کوئی فون لائن نہیں تھی۔ شہریار نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ فون کا کھمبا عین دفتر کے نیچے سڑک پر تھا اور اس سے تاریں نکل کر عمارت کے مختلف دفتروں اور دکانوں میں جا رہی تھیں۔ گویا یہ ڈی پی صرف اسی عمارت کے لیے مخصوص تھی۔ پھر اس کی توجہ ایک الگ سے تار نے حاصل کی جو کھمبے سے نکل کر سڑک کے پاس ایک پرانی خستہ حال عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ شہریار نے ماتحتوں سے کہا۔ ''یہ سامنے والی عمارت دیکھ رہے ہو، اسے چاروں طرف سے اس طرح گھیرنا ہے کہ کوئی نکل کر نہ جا سکے۔ اگر کوئی فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار کر زخمی کرنا، مارنا مت..... سمجھ گئے؟''

''یس سر۔'' اے ایس آئی نے کہا اور اپنے آدمیوں سمیت باہر نکل گیا۔

☆☆☆

خدا بخش دہشت زدہ تھا لیکن اسے ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔ شاید خدا نے اسے توفیق ہی نہیں دی تھی کہ توبہ کر سکے۔ فون بند ہونے کے بعد اب خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں نہ جانے کتنی دیر گزر گئی پھر اچانک اوپر سے کسی بھاری مشین کے چلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی تابوت میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ اوپر سے مزید مٹی گر رہی تھی۔ مٹی اور پتھر گرنے کا شور اس بند جگہ بے پناہ محسوس ہو رہا تھا۔ خدا بخش دہشت زدہ ہو کر چلا رہا تھا۔ اس شور میں تابوت کے تختوں کے چرچرانے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔ مٹی کے بے پناہ دباؤ سے تختے ٹوٹ رہے تھے اور ان کے رخنوں سے مٹی بہت تیزی سے اندر بھر رہی تھی۔ خدا بخش نے بوکھلا کر موبائل لیا اور شہریار کو کال کرنے لگا لیکن اس دوران میں مٹی بہت تیزی سے بھر کر اس کے سینے تک آ گئی تھی اور سانس لینے کے لیے بہت کم ہوا باقی رہ گئی تھی۔ وہ موبائل بھول کر معافی مانگنے لگا۔ لیکن اب معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ مٹی بہت تیزی سے تابوت میں اس کے سر تک آ گئی۔ اس نے سر تابوت کی اوپری سطح سے لگا دیا لیکن مٹی سے کب تک بچا جا سکتا تھا۔

خدا بخش اور اس جیسے بہت سارے فرعون یہ بات قطعاً بھول جاتے ہیں کہ وہ اس مٹی سے نکلے ہیں اور ایک دن انہیں ہمیشہ کے لیے اسی مٹی میں لوٹ جانا ہے۔ وہ واپسی کو بھول کر خود کو زمین پر خدا سمجھ بیٹھتے ہیں اور جب موت آتی ہے تو ایک جھٹکے میں ان کی ساری امیدوں اور خوش فہمیوں پر مٹی پھیر دیتی ہے۔ خدا بخش اس وقت سانس لینے کے لیے دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا مگر وہاں ہوا کہاں تھی۔ مٹی پہلے اس کی گردن تک آئی پھر کانوں تک پہنچی اور آخر میں اس کے منہ اور ناک تک آ گئی۔ اس نے سانس روک لی مگر کب تک، اس نے بے تاب ہو کر منہ کھولا اور مٹی اس کے منہ میں گھستی چلی گئی۔ سانس لینے کو ہوا نہیں تھی فقط مٹی تھی۔ کتنی عبرت ناک موت تھی۔ لوگ مر کر مٹی میں جاتے ہیں لیکن مٹی اس کے اندر گئی تو اسے موت آئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کو یقین تھا کہ اب وہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ وہ عمارت سے نکل کر باہر آیا تو اس کے ماتحت عمارت کو گھیر رہے تھے لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ اس عمارت کے دونوں اطراف میں عمارتیں تھیں اور عقب میں بھی کچھ تھا۔ یعنی وہ صرف سامنے والے حصے کی نگرانی کر سکتے تھے۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف خدا بخش تھا، وہ بُری طرح چلا رہا تھا اور پس منظر میں بھی ایسا شور سنائی دے رہا تھا جیسے پتھر اور مٹی لڑھک رہے ہوں۔ خدا بخش چلا چلا کر معاف کرنے اور خود کو اس مدفن سے نکالنے کو کہہ رہا تھا۔ شہریار ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا لیکن خدا بخش کو شاید اس کی آواز نہیں جا رہی تھی پھر رابطہ ٹوٹ گیا۔ شہریار نے موبائل جیب میں رکھا اور پستول نکال کر عمارت کی طرف بھاگا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو باہر ہی رکنے کا حکم دیا تھا۔

وہ عمارت میں داخل ہوا تو اس کی سیڑھیاں اور لابی ویران اور گرد آلود تھیں۔ لیکن کہیں کہیں گرد پر نشانات واضح تھے۔ شہریار ان نشانات کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ یہ نشانات ایک دروازے تک گئے تھے۔ اس نے آہستہ سے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا تو دروازہ کھل گیا اس نے اندر جھانکا۔ یہ چھوٹا سا ہال تھا۔ ہال خالی تھا لیکن اس کے ساتھ والے کمرے میں کوئی تھا کیونکہ ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی آدمی ناک کے بل بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ شہریار نے احتیاط سے اندر جھانکا تو اسے ایک لڑکی بستر پر بندھی حالت میں لیٹی نظر آئی، اس کے منہ پر مضبوط ٹیپ چپکا ہوا تھا اور وہ ناک سے آوازیں نکال رہی تھی۔ شہریار نے اندر آ کر اس کے منہ سے لگا ٹیپ اتارا تو اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور چلائی۔

''وہ ابھی پیچھے کی طرف گیا ہے، اس کھڑکی سے اتر کر۔''



شہریار کھڑکی کی طرف لپکا، اس نے دیکھا کہ ایک آدمی دیوار سے دوسری طرف کود رہا ہے اس کی صرف ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ شہریار نے اپنے ماتحت کو کال کی۔ ''ایک آدمی جس نے گرے کوٹ پہن رکھا ہے، عقبی پلاٹ سے نکل کر پچھلی سڑک کی طرف گیا ہے۔ اسے روکو۔''

اپنے آدمیوں کو ہدایت دے کر شہریار واپس لڑکی کے پاس آیا۔ ''تم مشال ہو؟''

''ہاں، پتا نہیں وہ کیسے میرے اپارٹمنٹ میں گھس آیا تھا اور اس نے مجھے کچھ سونگھایا پھر مجھے ہوش آیا تو میں یہاں بندھی ہوئی تھی۔''

''تمہیں پتا ہے، اس نے خدا بخش کو کہاں رکھا ہے؟''

شہریار اس کی ہتھکڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا تو اس کی نظر بستر کے نیچے فرش پر پڑی چابی پر گئی۔ اس نے چابی اٹھا کر ایک ہتھکڑی میں لگائی تو وہ کھل گئی۔ دوسری ہتھکڑی بھی اسی چابی سے کھل گئی۔ مشال نے اپنے ہاتھ مسلے اور بولی۔

''مجھے نہیں معلوم خدا بخش کہاں ہے؟''

''اس نے خدا بخش کو زمین میں کہیں دفن کر دیا ہے۔'' شہریار نے کہا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تب اس کی نظر ایک بلڈوزر کی طرف گئی۔ اس کے پاس ہی فون وائر زمین میں جا رہی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا کھڑکی سے نیچے اترنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے مشال سے پوچھا۔ ''وہ کیسے اترا تھا؟''

مشال، خدا بخش کے بارے میں سن کر خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ ''اس کے پاس رسّی تھی۔ اس نے ایک سرا اپنی کمر سے باندھا اور اسے سلاخ سے گھما کر دوسرا سرا تھام کر نیچے اتر گیا اور پھر رسّی کھینچ لی۔''

شہریار مجرم کی ذہانت پر اش اش کر کے رہ گیا۔ اس نے ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ شہریار ذہین پولیس افسر تھا۔ لیکن مجرم ہر وقت اس سے آگے ہی رہا تھا، اس نے اپنے بہت سارے نشانات چھوڑے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ دس منٹ بعد اے ایس آئی نے اسے کال کی۔ ''سر..... یہاں آپ کے بتائے ہوئے حلیے کا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔''

شہریار کو بھی یہی امید تھی۔ وہ اتنا چالاک تھا کہ اس نے اپنے فرار کا بھی بندوبست کر کے رکھا ہو گا۔ شہریار نے اس سے کہا کہ وہ ہیڈ کوارٹر سے آنے والوں کو لے کر عقبی پلاٹ تک آئے۔ امکان یہی تھا کہ خدا بخش اس پلاٹ میں کہیں موجود تھا اور اس کا زندگی سے ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ مشال کو کمرے میں ٹھہرنے کا کہہ کر وہ باہر آیا اور اس نے جمیل احمد کو کال کر کے اپنی ناکامی کی رپورٹ دی۔ جمیل احمد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا، شہریار نے ہر ممکن کوشش کی ہو گی۔ اس نے کہا۔

''ممکن ہے اوپر سے تمہیں کچھ سننے کو ملے لیکن میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونے دوں گا۔''

''شکریہ سر۔'' شہریار نے کہا اور اندر واپس آیا، اس نے مشال کو لیا اور باہر آ کر اسے ایک گاڑی میں ہیڈ کوارٹر بھیج دیا۔ اس دوران میں مزید نفری آ گئی تھی اور انہوں نے عقبی پلاٹ کی تلاشی لی۔ تار نے ان کا کام آسان بنا دیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد انہوں نے گڑھے سے مٹی بھرے تابوت میں موجود خدا بخش کی لاش نکال لی۔ تار اس دفتر کے برابر والے دفتر سے آ رہا تھا۔ وہاں ایک فون سیٹ موجود تھا جس سے آگے بھی لائن دی جا سکتی تھی۔ لیب والے آ گئے تھے اور وہ فنگر پرنٹس اور دوسرے نشانات اٹھا رہے تھے لیکن شہریار کو امید نہیں تھی کہ ان سے کوئی مدد مل سکے گی۔ پانچ گھنٹے میں یہ سارا ڈراما ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھ صرف ایک لاش کے سوا کچھ نہیں آیا تھا کیونکہ مجرم کے بارے میں وہ کچھ نہیں معلوم کر سکا تھا۔ اس نے رحیم قادر کو کال کر کے حکم دیا۔ ''رحیم! ان تینوں کو چھوڑ دو، وہ بے گناہ ہیں۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' رحیم نے جواب دیا۔ ''ویسے میں نے ہاتھ ہلکا رکھا ہے سر اور مجھے بھی یہ بے گناہ لگ رہے ہیں۔''

وڈیرے خدا بخش کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی جہاں اس کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ رپورٹ کے مطابق اس کی موت دم گھٹنے کے باعث واقع ہوئی تھی۔ وہ صوبائی حکومت کے اہم ترین افراد میں سے ایک تھا اس لیے رات کو اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس میں ایس پی شہریار نے شریک ہو کر اپنی رپورٹ پیش کی اور مجرم ایک نامعلوم شخص کو قرار دیا جو نہایت چالاک اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے پوری مہارت سے منصوبہ بنایا اور پولیس ہر بار اس سے ایک قدم پیچھے رہی۔ اس نے خدا بخش کو پورا موقع دیا کہ وہ پولیس یا جس سے چاہے رابطہ کر سکتا تھا۔ شہریار بخاری نے اگرچہ پوری جانفشانی سے تفتیش کی لیکن وہ نہ تو خدا بخش کو بچا سکا اور نہ اسے اغوا کرنے اور پھر موت کے گھاٹ اتارنے والے مجرم کو پکڑ سکا تھا۔ شہریار بخاری نے ناکامی کا اعتراف کر لیا تھا۔

☆☆☆

''میڈم! ایک گیسٹ آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

گیٹ سیکیورٹی پر موجود گارڈ نے انٹرکام پر کہا۔

مشال نے مانیٹر پر دیکھا۔ یہ مختصر بالوں اور ہلکی داڑھی والا شخص تھا۔ مشال کو اسے پہچاننے میں کچھ دشواری پیش آئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، وہ جمال خان لاشاری تھا۔ مشال کا خون کھول اٹھا اور اس کا دل چاہا کہ فوراً پولیس کو کال کردے لیکن پھر اسے عقل آگئی۔ اگر جمال خان پکڑا جاتا تو وہ کیسے بچ سکتی تھی۔ پولیس سے جان چھڑا کر وہ دن رات بے تابی سے جمال خان کی طرف سے رابطے کی منتظر تھی، اس کے علم میں جمال کے دو موبائل نمبر تھے لیکن دونوں مستقل بند جارہے تھے۔ دو مہینے بعد وہ سو فیصد مایوس ہوچکی تھی تو جمال خان اچانک آگیا۔ مشال نے گارڈ سے کہا۔

''اسے آنے دو۔''

چند منٹ بعد وہ اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر تھا۔ مشال نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ اس نے کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک پرانا سا چرمی بیگ تھامے ہوئے تھا۔ اس حلیے میں وہ بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر مشال کی طرف دیکھا۔ ''یقیناً مجھے دیکھ کر تم نے پولیس کو کال کرنے کا سوچا ہوگا؟''

مشال طنزاً مسکرائی۔ ''مسٹر جینئس، تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ میں نے کال کیوں نہیں کی، ویسے تمہارا نام جمال خان لاشاری ہی ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا نام کیا ہے؟ میں لاشاری ہوں، جمالی ہوں، بگٹی ہوں یا چودھری ہوں۔''

''ہاں اس سے تمہارے جرم پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مشال نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جمال اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں نے ایک شخص کو اغوا کیا تمہاری مدد سے، اسے یہاں سے لے کر نکلا تمہاری مدد سے اور اس سے اس کا تاوان وصول کیا تمہاری مدد سے۔'' اس نے چرمی بیگ مشال کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں تمہارا حصہ ہے کیونکہ تم اس جرم میں برابر کی شریک ہو۔''

مشال حیران رہ گئی۔ ''سچ...؟'' اس نے شک سے کہا۔

''ہاں، کھول کر دیکھ لو۔ پورے پانچ کروڑ روپے ہیں۔ میں مجرم ضرور ہوں، دھوکے باز نہیں ہوں۔''

مشال کے پاس پولیس رپورٹ آئی تھی کیونکہ اس کے کچھ مہربان پولیس میں اعلیٰ عہدوں پر موجود تھے۔ مشال جمال خان کی مشاقی اور مہارت پر حیران رہ گئی تھی۔ اس نے کتنی عرق ریزی سے یہ منصوبہ تیار کیا تھا اور پھر اتنا خطرہ مول لیا کہ خدا بخش کو موبائل تک دے دیا حالانکہ وہ چاہتا تو اسے کسی سے رابطہ نہ کرنے دیتا۔ مشال نے بیگ کھول کر رقم دیکھی۔ یہ پانچ ہزار کے نوٹوں والی پوری سو گڈیاں تھیں۔ جب تک وہ گڈیاں چیک کرتی رہی جمال خان سگریٹ پیتا رہا۔ مشال نے بیگ بند کیا اور گہری سانس لے کر بولی۔

''جمال! تم نے یہ سب کس طرح کیا اور کیوں کیا؟''

''کیا کس طرح کیا اور کیوں کیا؟'' اس نے سادگی سے سوال کیا۔

''یہ منصوبہ تم نے کیسے بنایا؟ سوائے خدا بخش اور بینک منیجر کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ خدا بخش کے لاکر کے سلسلے میں ایک ڈیل ہے؟''

''اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''پھر تم میرے پاس یہ رقم لے کر آئے...... کیوں؟''

''کیونکہ میری تم سے ڈیل ہوئی تھی اور میں ڈیل پوری کرنے والا آدمی ہوں۔'' جمال خان نے کہا اور سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم نے رقم گن لی ہے اور اطمینان کرلیا ہے بنا؟''

''ہاں۔'' مشال بھی کھڑی ہوگئی۔ ''لیکن تم کہاں جارہے ہو؟''

''میں بس اسی کام کے لیے آیا تھا۔'' اس نے جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا، مشال اس کے پیچھے لپکی اور سامنے آکر اسے روک لیا۔

''میں تمہیں ایسے جانے نہیں دوں گی۔'' مشال نے کہا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ ''کیا تم کچھ دیر رک نہیں سکتے...... میرے پاس۔''

جمال خان نے ہمیشہ کی طرح نرمی سے اس کا چہرہ سہلایا۔ ''تم جانتی ہو، میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

مشال مایوس ہوکر پیچھے ہٹ گئی۔ ''تم بہت عجیب آدمی ہو۔ میں نے آج تک تمہارے جیسا دوسرا کوئی نہیں دیکھا۔''

''دنیا میں مجھ جیسے بہت ہوں گے شاید تم کبھی دیکھ لو، لیکن میرا مشورہ ہے آدمی دیکھنے والا یہ دھندا چھوڑ دو اور یہاں سے کہیں اور جاکر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ جس میں تمہیں ماضی میں جاننے والا کوئی نہ ملے۔''

''شاید میں تمہارے مشورے پر عمل کروں۔'' مشال



نے سر جھٹک کر کہا۔ ''یا شاید نہ کروں۔''

''یہ تمہاری مرضی پر ہے۔'' جمال خان نے کہا اور اس کے اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد مشال نے دروازہ بند کرلیا اور واپس آکر چرمی بیگ دیکھا اور خود سے بولی۔

''شاید اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

☆☆☆

ریحان مرزا اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں موجود کافی سے شغل کررہا تھا، اس کا انداز وقت گزاری والا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ چند منٹ بعد ایک شخص آکر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تو وہ چونک گیا۔ آنے والا چھوٹے بالوں اور نفاست سے بنی مونچھوں کے ساتھ کوئی ہائی کلاس بزنس مین لگ رہا تھا۔ اس نے سی گرین رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں بڑی شوخ سی ٹائی تھی۔ اس سے پہلے کہ ریحان مرزا اسے کچھ کہتا اس نے کہا۔ ''یہ میں ہوں۔''

ریحان مرزا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم...... ؟ میں بالکل نہیں پہچان سکا۔''

''اگر پہچان جاتے تو حلیہ بدلنے کا فائدہ ہی کیا ہوتا۔'' جمال خان نے آہستہ سے کہا۔ اس نے ایک شان دار بریف کیس اٹھا رکھا تھا، وہ اس نے اپنے پیروں کے پاس رکھا اور پھر اسے پاؤں سے ریحان مرزا کی طرف سرکا دیا۔ ''اس میں تمہارا حصہ ہے، پورے تین کروڑ روپے ہیں۔''

ریحان مرزا نے سر ہلایا اور شکوے بھرے انداز میں کہا۔ ''میں ڈھائی مہینے سے انتظار کرکے مایوس ہوگیا تھا۔''

''مجھے اندازہ ہے لیکن میں اس لیے سامنے نہیں آرہا تھا سی آئی ڈی والے اس واردات میں شامل ہر شخص کی نگرانی کررہے تھے۔ اب کہیں جاکر یہ نگرانی ختم ہوئی ہے۔ اس سے پہلے میں تم سے نہیں مل سکتا تھا۔ اگر تم چاہو تو رقم کا اطمینان کرسکتے ہو۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے دھوکا کرنا ہوتا تو سرے سے مجھ سے رابطہ ہی نہ کرتے۔'' ریحان مرزا نے سکون سے کہا۔ ''میں معذرت خواہ ہوں لیکن اس وقت میں تمہیں روکنے کی کوشش کرنے پر مجبور تھا۔''

''میں سمجھتا ہوں جب فون کی بیل بجی، تب ہی میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کردیا تھا۔''

ریحان مرزا نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''اس کا مطلب ہے تم مجھ سے متفق ہو؟''

''ہاں تب ہی تو میں یہاں آیا ہوں، اب مجھے



کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک
لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

اجازت ہے؟'' جمال خان کھڑا ہو گیا۔ ریحان مرزا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے چھ مہینے پہلے ریحان مرزا سے رابطہ کیا اور اسے قائل کر لیا تھا کہ وہ خدا بخش کے لاکر تک رسائی میں اس کا ساتھ دے۔ اس کے بدلے جمال خان نے اسے تین کروڑ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ریحان مرزا نے پہلے کبھی بینک میں ایک روپے کا غبن نہیں کیا تھا لیکن وہ اب تک نہیں سمجھ سکا کہ اس شخص نے اسے کس طرح آمادہ کر لیا۔ اس نے صرف اسے خدا بخش اور اس کے ظلم کی کہانی سنائی تھی۔ شاید اس کہانی نے اسے قائل کر لیا تھا کہ خدا بخش اسی انجام کے قابل تھا۔

اس کے مرنے کی خبر سن کر ریحان مرزا نے سکون کا سانس لیا کیونکہ وہ زندہ ہوتا تو اس کے لیے بہت سارے مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ ریحان مرزا کو قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا گیا تھا اور اسے کچھ جرمانہ ہوا تھا لیکن بعد میں یہ بھی معاف کر دیا گیا۔ بینکوں میں اس قسم کی معافیاں عام ہیں کیونکہ بات کھل جانے کی صورت میں بدنامی سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔

☆☆☆

امیر، کبیر اور اشرف تینوں گلشن معمار کے پاس ایک گوٹھ کے اس چھوٹے سے مکان میں گزشتہ ایک مہینے سے رہ رہے تھے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے اور ہمہ وقت گھر میں رہتے کیونکہ گھر سے باہر جانے کی صورت میں امکان تھا کہ کوئی واقف کار انہیں دیکھ لیتا اور بات پولیس تک چلی جاتی۔ پولیس ایک مہینے تک انہیں تنگ کرتی رہی تھی۔ اس دوران میں وہ وہاں سے نکل بھی نہیں سکتے تھے ورنہ مفرور قرار پاتے اور پولیس ان کی تلاش شروع کر دیتی۔ آخر ایک مہینے بعد پولیس نے ان کا پیچھا چھوڑا کہ ان لوگوں کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، تب انہوں نے سکون کا سانس لیا اور گلشنِ معمار کے اس گوٹھ میں چلے آئے جہاں اس چھوٹے سے مکان میں زینب پہلے سے موجود تھی۔ یہاں وہ چھپ کر رہتی تھی اور بلا ضرورت باہر نہیں جاتی تھی۔ گھر میں اس کی ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی بھائی بھی گھر کا چکر لگاتا تھا اور اسے جس چیز کی ضرورت ہوتی، وہ اسے لا دیتا۔ جب وہ مستقل آ گئے تو زینب بے قرار ہو گئی۔ اس نے بھائیوں سے پوچھا۔

''کمال نہیں آیا؟''

''نہیں وہ بس ایک بار ہی ملا تھا، اس کے بعد دوبارہ نہیں آیا۔'' امیر نے بتایا تو زینب کے چہرے پر دکھ کے تاثرات چھا گئے۔ وہ ابھی پچیس برس کی تھی لیکن اس نے فیض خان کے قبضے میں جو وقت گزارا تھا، اس نے اسے اپنی عمر سے دس سال بڑا بنا دیا تھا۔ وہ خوب صورت ..... تھی لیکن اس کی خوب صورتی کو حالات نے دبا دیا تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد جب حالات نے اسے فیض خان جیسے درندے کی قید میں دے دیا تو اس نے زندگی سے ہار مان کر خود کو حالات کے تیز دھارے پر چھوڑ دیا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں اس نے خدا بخش کا جبر سہا تھا پھر فیض خان اور اس کے دوستوں نے اسے مالِ غنیمت سمجھ لیا تھا۔ دس سال اس نے کیسے گزارے، یہ وہی جانتی تھی۔ پھر ایک رات اچانک ہی کمال اس کے گھر آیا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکی۔ کمال نے نشے میں دھت فیض خان کو باندھا اور پھر زینب کو یاد دلایا۔

''زینب! مجھے پہچان، میں تیرا منگیتر ہوں۔''

زینب نے اسے ایک دو بار ہی دیکھا تھا اور وہ بھی سرسری سا لیکن اس کی صورت زینب کے دل پر نقش تھی۔ یہ اور بات تھی کہ مسلسل مظالم نے اس کی یادداشت دھندلا دی تھی۔ جب اس نے کمال کو پہچانا تو اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ''کمال! تو کہاں تھا، تجھے پتا نہیں کہ مجھ پر کیا گزری؟''

''مجھے معلوم ہے۔ اس وقت میں شہر میں تھا، امتحان دے رہا تھا لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں اکیلا اور کمزور تھا۔ میرے ہاتھ خالی تھے اس لیے میں نے پہلے خود کو طاقتور بنایا۔ اب میں اکیلا تو ہوں لیکن خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ تو دیکھے گی تیری عزت اور تیرے ماں باپ کے قاتلوں سے کیسا انتقام لیتا ہوں۔''

زینب کو لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ لیکن کمال خواب نہیں تھا۔ اس نے اپنے انتقام کی ابتدا فیض خان سے کی اور اسے ہوش میں لانے کے بعد اس کی فردِ جرم سنا کر کلہاڑی کے ایک ہی وار سے اس کا سر اتار دیا۔ زینب نے یہ منظر دیکھا تو بہت عرصے بعد اس کے سینے میں ٹھنڈ پڑی۔ اس نے کمال سے کہا۔ ''اصل مجرم وڈیرا خدا بخش ہے، اسے کب سزا دو گے؟''

''اسے بھی سزا ملے گی اور ایسی ملے گی کہ دنیا یاد رکھے گی۔ وہ اتنی آسان سزا کا حق دار نہیں ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''زینب! تیار ہو جا..... تجھے ہمیشہ کے لیے یہاں سے جانا ہے۔''

وہ کمال کے ساتھ وہاں سے نکل آئی۔ کمال نے اسے اس گوٹھ کے چھوٹے سے مکان میں لا کر ٹھہرایا۔ یہاں سب غریب طبقے کے کام کرنے والے لوگ تھے جو اپنے کام سے



کام رکھتے تھے۔ کمال نے اسے اس کے بھائیوں سے بھی ملوایا تھا لیکن فی الحال اس نے زینب کو بھائیوں کے ساتھ رہنے سے منع کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ فیض خان کے قتل کے بعد پولیس زینب کی تلاش میں ہوگی اور اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ابھی اکیلی اور چھپ کر رہے۔ زینب اور اس کے بھائی کمال کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے عمل کرتے تھے۔ کمال نے تینوں بھائیوں سے کہا کہ وہ وڈیرے خدا بخش سے انتقام لینے میں اس کی مدد کریں اور وہ دل و جان سے تیار ہو گئے۔ خدا بخش کے لیے قبر انہوں نے تیار کی تھی لیکن وہ کسی بھی مرحلے پر سامنے نہیں آئے۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس ان پر شک نہیں کر سکی۔

پولیس سے جان چھوٹی تو وہ زینب کے پاس آ گئے۔ چاکیواڑہ میں وہ کرائے کے مکان میں تھے اور معمولی سا اثاثہ تھا جسے چھوڑ کر آنا ان کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ کمال نے ان سے کہا تھا کہ وہ گوٹھ والے مکان میں ٹھہریں، وہ جلد ان سے وہاں ملے گا۔ لیکن کمال ابھی تک نہیں آیا تھا۔ زینب اور تینوں بھائیوں کو شدت سے اس کا انتظار تھا کیونکہ ان کے پاس جو رقم تھی، وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی اور کچھ عرصے بعد انہیں کھانے کے لیے کمانا پڑتا۔ اس میں خطرہ تھا کہ وہ پولیس یا خدا بخش کے کسی جان پہچان والے کی نظر میں آ جاتے، ممکن ہے وڈیرے کی اولاد انہیں تلاش کر رہی ہوتی۔ ہو سکتا ہے وہ انہیں اپنے باپ کا قاتل سمجھتی ہو۔

ایک مہینا مزید گزر گیا تو وہ مایوس ہونے لگے۔ زینب کی مایوسی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کا کمال سے ایک رشتہ اور بھی تھا اور وہ اس حوالے سے اسے دیکھتی تھی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اب وہ ایک پامال شدہ عورت ہے اور کمال کے لائق نہیں رہی ہے لیکن پھر کمال کا واپس آنا اور اس کے لیے اس حد تک جانا اسے امید دلاتا تھا کہ شاید وہ اب بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ اسی امید و یاس کے درمیان وہ کمال کا انتظار کر رہی تھی۔ آخر ایک مہینے بعد بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کمانے کے لیے باہر جائیں گے۔ جس روز انہیں جانا تھا اسی دن صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ زینب کو بے اختیار خیال آیا کہ دروازے پر کمال ہے۔ اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو سچ مچ کمال کو دیکھ کر اسے سکتہ ہو گیا، اس نے شلوار کرتے کے ساتھ اجرک لے رکھی تھی۔ سر پر سندھی ٹوپی اور سیاہ عینک کی وجہ سے وہ اس کمال سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جس سے وہ کئی مہینے پہلے ملی تھی۔

''ہٹ نا کیا باہر کھڑا رکھے گی؟'' کمال نے کہا تو وہ جلدی سے ہٹ گئی۔ کمال اندر آیا۔ ''امیر، کبیر اور اشرف کہاں ہیں؟''

وہ اندر تھے۔ کمال کی آواز سن کر نکل آئے۔ وہ اس سے لپٹ گئے..... امیر نے شکوے بھرے انداز میں کہا۔ ''ادا ہم سمجھے تم ہمیں بھول گئے ہو۔''

''بھولنے کے لیے دس سال بہت ہوتے ہیں۔'' کمال نے سادگی سے جواب دیا۔ ''تب نہیں بھولا تو اب کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''تو نے ناشتا کیا؟'' زینب نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے سوچا آج تیرے ہاتھ کا ناشتا کروں گا۔'' کمال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور الفاظ کے ساتھ نظروں سے سب کہہ دیا۔ زینب کھل اٹھی۔ وہ ناشتا بنانے گئی تو کمال نے کہا۔ ''تم سب تیار ہو جاؤ، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اب تم یہاں نہیں رہو گے۔''

تینوں بھائی فکر مند ہو گئے۔ امیر نے کہا۔ ''پھر کہاں رہیں گے؟''

''شاہراہ فیصل کے ساتھ ایک چھوٹا فلیٹ لیا ہے، وہاں رہو گے۔ اور سنو، تم تینوں کے لیے ایک گیراج میں ملازمت کا بندوبست کیا ہے۔''

''تنخواہ کیا ہوگی؟'' اشرف نے پوچھا۔

''تنخواہ چھوڑو، وہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں وہاں کام سیکھنا ہے اور دل لگا کر سیکھنا ہے۔''

کمال عمر اور مرتبے میں ان سے بڑا تھا۔ لیکن وہ جاننا چاہتے تھے کہ اب زینب سے اس کے رشتے کا کیا بنے گا۔ امیر نے بڑا ہونے کے ناتے جھجکتے ہوئے اس سے یہ سوال پوچھ لیا تو اس نے حیرت سے کہا۔ ''زینب میری منگ ہے اور میں اپنی منگ کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ اسی کی خاطر تو میں نے یہ سب کیا ہے۔''

تینوں بھائیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کبیر نے خوش ہو کر کہا۔ ''ادا تم عظیم آدمی ہو۔''

''نہیں... میں بس آدمی ہوں۔'' کمال نے جواب دیا۔ ''میں زینب سے نکاح کر کے اسے یہاں سے دبئی لے جاؤں گا اور چھ مہینے بعد تم لوگوں کو بھی وہاں بلا لوں گا جب تک تم کام سیکھ چکے ہو گے۔''

''دبئی کیوں کمال ادا؟'' اشرف نے پوچھا۔ ''وہ اپنا ملک تو نہیں ہے۔''

''ہاں یار، اپنا ملک تو نہیں ہے۔'' کمال نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''پر اب اپنا ملک رہنے والا نہیں رہا ہے۔

یہاں صرف خدا بخش جیسے درندے رہ سکتے ہیں اور ہم جیسے عام لوگ صرف ان کے جوتے تلے رہ سکتے ہیں۔ اس سے بہتر نہیں ہے، ہم کہیں اور جا کر رہیں۔ جہاں بے شک عزت نہ ہو لیکن کوئی بے عزتی کرنے والا بھی نہ ہو۔ اور دوسرے تم لوگ بھول رہے ہو، یہاں ہمیں ہمیشہ خدا بخش کو اغوا اور قتل کرنے کے جرم کا سامنا رہے گا۔"

وہ جانتے تھے، کمال ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جمال خان لاشاری اس کا بنایا ہوا نام تھا۔ اشرف نے کہا۔ "پر اداز زینب کو تو پولیس تلاش کر رہی ہے..... وہ باہر کیسے جائے گی؟ اس کے کاغذات کیسے بنیں گے؟"

کمال مسکرایا۔ "جیسے میرے بنے ہیں اور ملک میں نہ جانے کتنی زینب ہوں گی..... پولیس کو اس کے بارے میں کیا معلوم۔"

کچھ دیر بعد زینب کمال کے لیے ناشتا بنا کر لے آئی۔ اسے آتا دیکھ کر تینوں بھائی مختلف بہانوں سے وہاں سے چلے گئے۔ زینب نے بھی جانا چاہا لیکن کمال نے اسے روک لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو نے سب سن لیا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔

"تجھے میری کسی بات پر اعتراض تو نہیں ہے؟"

زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں خود کو تیرے قابل نہیں سمجھتی ہوں۔"

کمال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "زینب! آئندہ یہ بات مت کہنا۔ تو میرے لیے آج بھی پندرہ سال کی معصوم لڑکی ہے۔ جو ہوا اس میں تیرا قصور نہیں ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔"

زینب شرما گئی پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اب میں پندرہ سال کی نہیں ہوں۔ بوڑھی ہو گئی ہوں۔"

"زینب! تو نے زندگی میں مشکلیں دیکھی ہیں۔ مشکلوں نے تجھ پر اثر ڈالا ہے۔ اب اللہ نے چاہا تو اچھی زندگی دیکھے گی اور اس کا اثر بھی ہوگا۔ تو دیکھنا ایک سال بعد جب خود کو آئینے میں دیکھے گی تو پہچان بھی نہیں سکے گی۔"

زینب خوش ہو گئی پھر اس نے کمال سے پوچھا۔ "تو نے یہ سب کیسے کر لیا؟"

کمال نے یہ سب بہت محنت اور عرق ریزی کے بعد کیا تھا۔ اس نے خدا بخش کی جاسوسی کر کے اس کے لاکر اور اس میں موجود دولت کا پتا چلایا اور پھر اسے اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے لاکر سے بہت بڑی دولت حاصل کر لی تھی لیکن ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ اب ملک میں رہنا اس کے اور زینب کے بھائیوں کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے کیونکہ اگر وہ خوشحال نظر آتے تو پولیس یا خدا بخش کی اولاد چونک سکتی تھی۔ وہ چھپ نہیں سکتے تھے، کبھی نہ کبھی ان کا راز کھل جاتا۔ زینب کو پولیس تلاش کر رہی تھی اس لیے وہ کبھی منظر عام پر نہیں آ سکتی تھی۔

اس صورت میں کمال نے فیصلہ کیا کہ وہ ملک سے چلے جائیں گے۔ سب سے موزوں ٹھکانا یو اے ای ہے جہاں دولت کے بل پر کوئی بھی آسانی سے آباد ہو سکتا ہے۔ کمال نے وہاں کا بزنس ویزا حاصل کر لیا۔ اس کی مدد سے وہ یو اے ای میں بزنس کر سکتا تھا اور مزید چار افراد کو ویزا دے کر وہاں بلا سکتا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ایک چھوٹا لیکن تمام سہولتوں سے آراستہ گھر لے لیا تھا۔ پھر اس نے اپنی کمپنی رجسٹرڈ کرائی اور جائزہ لے کر گاڑیوں کی ری کنڈیشننگ کا کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے پاس رقم کی کمی نہیں تھی۔ لاکر سے اس نے جو حاصل کیا تھا، سب کو حصہ دے کر بھی اس کا چوتھا حصہ خرچ نہیں ہوا تھا۔ باقی رقم اس نے مختلف بینکوں میں اکاؤنٹ کھول کر وہیں جمع کرا دی تھی۔ اس کے بعد وہ واپس آیا اور یہاں کے معاملات نمٹائے۔ اب اسے زینب کے کاغذات بنوانے تھے اور اس سے نکاح کر کے ساتھ لے جانا تھا۔ زینب کی خاطر اس نے اس کے بھائیوں کے لیے بھی فیصلہ کیا تھا کہ انہیں وہیں بلا لے گا۔ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے اس لیے ان کا کوئی ہنر سیکھ لینا ہی مناسب تھا۔

خدا بخش سے اس نے تاوان وصول کیا تھا۔ ساتھ ہی اسے لاکر سے ایک چھوٹا سا لفافہ ملا تھا۔ اس میں ایک ڈائری تھی جس میں خدا بخش کے بیرون ملک خفیہ اکاؤنٹس کے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ یہ اکاؤنٹس کمال یا کسی اور کے لیے بے کار تھے کیونکہ انہیں صرف خدا بخش ہی آپریٹ کر سکتا تھا۔ اس کی نامعلوم دولت ان اکاؤنٹس میں ہمیشہ کے لیے پڑی رہ جاتی اور بالآخر، بینک کو مل جاتی۔ کمال یہ سب زینب کو نہیں بتا سکتا تھا، اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"زینب! میں نہیں جانتا کہ میں نے یہ سب کیسے کر لیا۔ بس یوں سمجھ لے کہ قدرت نے خود میرا راستہ بنایا اور مجھے اس پر چلاتی رہی۔ آگے بھی وہی میری راہنمائی کرے گی۔ پر اب میں کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ محنت سے کماؤں گا اور تجھے اپنی محنت کی کمائی کھلاؤں گا۔"

زینب کی بجھ جانے والے آنکھوں میں امیدوں کے دیے جل اٹھے۔